ایک دریا ایک کہانی

مصنّف۔ مارک ٹوین

مترجم۔ ڈاکٹر آر۔ کے۔ سیکسینہ

پبلشر

انڈین اکیڈمی ۲۹ نریندرا پلیس نئی دہلی

Title of the original : LIFE ON THE MISSISSIPPI
Author : Mark Twain

بار اوّل

قیمت

سود لیتھو پریس دہلی

ترتیب

نمبر شمار	عنوان	نمبر صفحہ

پہلا باب

دریا اور اُس کی تاریخ

دریا مسسپی کی داستان واقعی پڑھنے کے قابل ہے۔ یہ کوئی معمولی دریا نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ ہر اعتبار سے ممتاز اور قابل ذکر ہے۔ اگر اس کی مرکزی شاخ مسوری کو بھی مدِ نظر رکھا جائے تو یہ دنیا کا سب سے لمبا دریا ہے یعنی تقریباً چار ہزار تین سو میل۔ یہ بھی کہنا غلط نہ ہوگا کہ مسسپی دنیا کا سب سے ٹیڑھا میڑھا دریا ہے کیونکہ اپنے سفر کے ایک حصے میں یہ تقریباً ایک ہزار تین سو میل کا فاصلہ طے کرتا ہے جبکہ وہی فاصلہ اگر سیدھا ناپا جائے تو صرف چھ سو پچھتر میل رہ جاتا ہے۔ اس دریا میں سینٹ لارنیس سے تگنا، لاتی سے پچیس گنا، اور ٹیمس سے تین سو اڑتیس گنا پانی بہتا ہے۔ پانی کے اخراج کا اتنا وسیع علاقہ کسی اور دریا کا نہیں ہے اس میں اٹھائیس ریاستوں اور علاقاؤں کا پانی ... شامل ہے اس کی نشیبی زمین بحر اوقیانوس کے ساحل پر واقع ڈیلاویئر سے لیکر اس تمام علاقے میں جو بحرالکاہل کے ڈھال کی طرف ڈیلاویئر اور ایڈاہو کے درمیان واقع ہے ۴۵ ڈگری طول البلد تک پھیلی ہوئی ہے۔ مسسپی میں چوّن ایسے معاون دریاؤں کا پانی آتا ہے جن میں دخانی کشتیاں چل سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ سو لیسے دریاؤں کا جن میں چپٹے تلے کی کشتیاں اور چوبی یا آہنی پیندے والے جہاز چل سکتے ہیں۔ یہ سب پانی خلیج میں جا کر گرتا ہے۔ اس دریا کے اخراج کی نشیبی زمین کا رقبہ انگلینڈ، ویلز، اسکاٹ لینڈ، آئرلینڈ، فرانس، اسپین، پرتگال، جرمنی، آسٹریا، اٹلی اور ترکی کے مجموعی رقبے کے برابر ہے۔ یوں تو قریب قریب یہ سارا خطّہ زرخیز ہے۔ تاہم مسسپی کی وادی تو خاص طور پر زرخیز ہے۔

یہ دریا اسلئے بھی قابل ذکر ہے کہ یہ دہانے کی طرف وسیع ہونے کے بجائے تنگ ہوتا جاتا ہے اور جتنا یہ تنگ ہوتا جاتا ہے اتنا ہی گہرا ہوتا جاتا ہے۔ اوہیو کے سنگم سے لے کر سمندر تک کے فاصلے کے وسط تک دریا کی اوسط چوڑائی اسوقت جبکہ پانی چڑھا ہوتا ہے' قریب ایک میل ہوتی ہے بعدازاں یہ چوڑائی بتدریج کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہانتک کہ دہانے پر واقع 'پاسز' پر یہ چوڑائی صرف نصف میل سے کچھ ہی زیادہ رہ جاتی ہے۔ اوہیو کے سنگم پر مسیسپی کی گہرائی ستاسی فٹ ہے مگر گہرائی بتدریج بڑھتی چلی جاتی ہے اور دہانے کے ٹھیک اوپر یہ ایکسو انیتس فٹ ہوجاتی ہے۔

دریا کے اوپری حصے میں تو نہیں البتہ نچلے حصے میں پانی کے چڑھاؤ اور اتار کا فرق بھی قابل ذکر ہے۔ 'نیچز' تک جو دہانے سے تین سو ساٹھ میل اوپر واقع ہے یہ چڑھاؤ قریب قریب یکساں ہی رہتا ہے اور اسکی اونچائی تقریباً پچاس فٹ ہوتی ہے لیکن 'بایو لافورشے' پر اس دریا کا پانی صرف چوبیس فٹ تک چڑھتا ہے جبکہ 'نیو آرلینز' میں اس کی بلندی گھٹ کر صرف پندرہ فٹ اور ٹھیک دہانے کے قریب صرف ڈھائی فٹ رہ جاتی ہے۔

'نیو آرلینز ٹائمس ڈیموکریٹ' کے ایک مضمون کے مطابق جو قابل انجینیروں کی رپورٹ پر مبنی ہے یہ دریا ہر سال چالیس کروڑ ساٹھ لاکھ ٹن کیچڑ میکسیکو کی کھاڑی میں پھینکتا ہے۔ اس سے ہمارے ذہن میں وہ بھدا سا نام ابھرنے لگتا ہے جو کپتان میریٹ نے مسیسپی کے لئے رکھا تھا۔ وہ اس دریا کو 'عظیم گندہ نالا' کہا کرتے تھے۔ اگر یہ کیچڑ جم جائے تو ایک ایسا تودہ بن جائے گا جسکا رقبہ ایک مربع میل اور جس کی اونچائی دو سو اکتالیس فٹ ہوگی۔

کیچڑ کے جمع ہونے سے زمین میں بتدریج توسیع ہوتی رہتی ہے۔ مگر یہ عمل بہت آہستہ آہستہ ہوتا ہے۔ دو سو سال میں یعنی جب سے اس دریا کی تاریخ شروع ہوتی ہے اس زمین میں تہائی میل کا بھی اضافہ نہیں ہو پایا ہے۔

سائنسدانوں کا خیال ہے کہ مسیسپی کا دہانہ کسی زمانے میں 'بیٹن روج' کے مقام پر تھا جہاں پہاڑیاں ختم ہوجاتی ہیں۔ ان کا یہ بھی خیال ہے کہ دہانے سے کھاڑی تک دو سو میل کا رقبہ اس دریا سے ہی بنا ہے۔ اس سے ہمیں نہایت آسانی سے اس علاقے کی عمر کا پتہ لگ

جاتا ہے۔ اس حساب سے یہ علاقہ ایک لاکھ بیس ہزار سال پہلے وجود میں آیا تھا۔ تاہم اس علاقے میں یہ سب سے نوخیز ٹکڑا ہے۔

ایک اور پہلو سے بھی مسیسپی قابلِ ذکر ہے، اور وہ پہلو اس دریا کا یہ خاصّہ ہے کہ جہاں کہیں میدان تنگ ہوتا ہے یہ اس کو آر پار کاٹ کر اور غیر معمولی تیزی سے اُچھل کر اپنے راستے کو سیدھا اور کم کر لیتا ہے کئی جگہ اس نے ایک ہی جست میں تیس ۳۰ میل تک کا فاصلہ کم کر ڈالا ہے۔

اسطرح کے کٹاؤ سے عجیب و غریب نتائج رونما ہوئے ہیں۔ کئی شہر جو اس دریا کے ساحل پر آباد تھے وہ اب دور دیہاتی علاقوں میں جا پڑے ہیں اور ان کے مقابل ریت کے ٹیلے اور جنگلات نمودار ہو گئے ہیں۔ مثلاً ڈیلٹا کا شہر کسی زمانے میں ہوکسبرگ سے نیچے کی طرف تین میل کی دوری پر واقع تھا، اس کے محلِ وقوع میں ابھی حال کے کٹاؤ سے ایک اہم تبدیلی ظہور پذیر ہوئی ہے اور وہ یہ کہ اب یہ شہر وکسبرگ سے دو میل اوپر کی جانب واقع ہے۔

اس کٹاؤ کی وجہ سے یہ دونوں شہر جو اس دریا کے کنارے پر آباد تھے اب دیہاتی علاقے میں جا پڑے ہیں۔ ایسے کٹاؤ کا اثر ریاستوں کی سرحدوں اور ان کے حلقۂ اختیارات کے لئے ہنگامہ خیز ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر آج ایک شخص ریاست مسیسپی کا باشندہ ہے اور آج ہی رات کو دریا اپنا راستہ کاٹ کر بدل دیتا ہے تو اگلی صبح اس شخص کو معلوم ہوگا کہ وہ اپنی زمین سمیت دریا کی دوسری جانب پہونچ گیا ہے اور اب وہ ریاست لوئیانا کی سرحد اور اسکے دائرہ اختیارات میں آگیا ہے۔ اگر پرانے زمانے میں دریا کے اوپری حصے میں ایسی تبدیلی آئی ہوتی تو ریاست مسوری میں رہنے والا غلام ریاست "الی نوائے" میں پہونچکر آزاد شہری بن جاتا۔

دریا مسیسپی کا مقام وقوع محض اس کٹاؤ سے ہی تبدیل نہیں ہوتا بلکہ اس میں ویسے بھی تبدیلی آتی رہتی ہے، کیونکہ یہ دریا برابر دائیں یا بائیں ہٹتا رہتا ہے۔ "لوئیانا" میں "ہارڈ ٹائمز" کے مقام پر یہ اس علاقے سے جہاں یہ پہلے بہتا تھا اب مغرب کی جانب دو میل ہٹ آیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ جگہ جہاں یہ شہر پہلے آباد تھا اب ریاست

لوئیانا میں نہیں ہے بلکہ دریا کی دوسری جانب ریاست [illegible] میں واقع ہے۔ دریائے مسیسپی کا تقریباً ایک ہزار تین سو میل کا پرانا راستہ جسکو لاسیلے نے سو سال پہلے اپنی کشتیوں میں بیٹھ کر طے کیا تھا اب خشک اور سخت زمین میں تبدیل ہو چکا ہے اور دریا کہیں کہیں اس راستے کے داہنی اور کہیں کہیں بائیں جانب بہتا ہے۔

دہانے پر نشیب میں مسیسپی کی کیچڑ سے نئی زمین دھیرے دھیرے تعمیر ہوتی ہے کیونکہ کھاڑی کی موجیں اس عمل میں رکاوٹ پیدا کرتی ہیں۔ مگر دہانے سے اوپر کی جانب دوران مقامات میں جو موجوں سے نسبتاً محفوظ ہیں کیچڑ اپنا کام تیزی سے کرتی ہے مثلاً "پرافٹس آئی لینڈ" میں تیس سال پہلے ایک ہزار پانچسو ایکڑ زمین تھی اسوقت سے ابتک اس دریا نے اس زمین میں سات سو ایکڑ زمین کا اضافہ کر دیا ہے۔

فی الحال اس زبردست دریا کی بے مرکزیت کی یہ چند مثالیں ہی کافی ہیں تاہم آگے چل کر میں اس کتاب میں کچھ اور مثالیں پیش کروں گا۔

آئیے اب مسیسپی کی داستان کے مادی پہلو کا تذکرہ یہیں چھوڑ کر اس کے تاریخی پہلو پر نظر دوڑائیں۔ اس کتاب کے پہلے دو مختصر ابواب میں ہم اس دریا کے اوّلین پرسکون دور پر ایک سرسری نظر ڈالیں گے پھر اگلے دو ابواب میں اس کے دوسرے اور نسبتاً زیادہ سرگرم دور کا مطالعہ کریں گے اور بعد ازاں کئی ابواب میں اس کے سیلابی اور سرگرم ترین دور کا۔ اور کتاب کے باقی ماندہ حصے میں اس کے موجودہ دور کا جو مقابلتاً زیادہ پرسکون ہے تذکرہ کرینگے۔

ہمارے ملک کے بارے میں لفظ "نئے" کا استعمال ساری دنیا اور تمام کتابوں میں اتنی کثرت سے ہوتا ہے کہ ہمارے دلوں میں یہ خیال بہت جلد اثر کر جاتا ہے اور مستقل طور پر بنا بھی رہتا ہے کہ ہمارے ملک میں کوئی چیز پرانی نہیں ہے۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ امریکہ کی تاریخ میں نسبتاً کچھ قدیم دور بھی ہیں تاہم صرف ان کے اعداد و شمار سے ہمارے ذہن میں اس مدت کا جس کی نمائندگی ان ادوار سے ہوتی ہے کوئی قطعی تصور یا واضح شعور نہیں آتا مثلاً یہ کہنا کہ دریائے مسیسپی کو سب سے پہلے ایک گورے آدمی ڈی سوٹو نے ۱۵۴۲ء میں دیکھا ایک ایسی بات ہے جس میں ایک واقعہ کا ذکر تو آجاتا

ہے لیکن بغیر کسی تشریح کے۔ یہ تو گویا ایسی بات ہوئی جیسے کوئی غروب ہوتے ہوئے آفتاب کے طول و عرض کی پیمائش علم ہیئت کے پیمانے سے کرے اور اس کے رنگوں کی فہرست ان ناموں سے تیار کرے جو سائنس میں مستعمل ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کو غروب آفتاب کے متعلق ایک خشک سی حقیقت تو معلوم ہو جائے گی مگر آپ کو غروب آفتاب کا نظارہ میسر نہیں ہوگا۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ آپ کے سامنے غروب آفتاب کی ایک تصویر سی کھینچ کر رکھ دی جاتی۔

۱۵۴۲ء کی تاریخ بذات خود ہمارے لئے کوئی مفہوم نہیں رکھتی لیکن جب کوئی شخص اس زمانے کو کچھ اور نزدیکی تاریخوں اور حقائق سے منسلک کر دیتا ہے تو اس میں ایک ایسا ظاہری تناسب اور کیفیت پیدا کر دیتا ہے کہ ہمیں محسوس ہونے لگتا ہے کہ یہ دور امریکہ کی تاریخ کا ایک ایسا دور ہے جو اپنی قدامت کی وجہ سے قابل تعظیم ہے۔

مثال کے طور پر جب مسیسپی کو ایک گورے آدمی نے پہلی مرتبہ دیکھا تو اس زمانے تک فرانسس اوّل کی شکست بمقام پیویہ، ریفیل اور بے خوف اور بے داغ بیارڈ کی وفات ترکوں کے ہاتھوں روڈس سے ان سرداروں کے (جنھوں نے یروشلم میں زائرین کے لئے شفاخانہ قائم کیا تھا) نکالے جانے کا واقعہ، نیز آن پچانوے تجویزوں کی تشہیر جن سے اصلاح دین کی تحریک کا آغاز ہوا تھا، ان سب واقعات کو گذرے ہوئے چوتھائی صدی سے کچھ ہی کم عرصہ ہوا تھا۔ جب ڈی سوٹو نے اس دریا کی جھلک دیکھی تو اس وقت اگنیشس لویولا کے نام سے کوئی واقف نہ تھا، یسوعیوں کے فرقے کو قائم ہوئے ایک سال بھی نہ ہوا تھا اور سسٹائن کے گرجا گھر میں مائیکل اینجیلو نے روز قیامت کی جو تصویر بنائی تھی اس کا رنگ و روغن ابھی سوکھ بھی نہیں پایا تھا۔ اس وقت تک اسکاٹ لینڈ کی ملکہ میری پیدا بھی نہیں ہوئی تھی، البتہ اس سال کے ختم ہونے سے پہلے ہی وہ پیدا ہو گئی۔ کیتھرائن ڈی میڈیسی ابھی بچہ ہی تھی۔ انگلینڈ کی ملکہ ایلزبتھ ابھی عنفوان شباب کی وادی میں داخل نہیں ہوئی تھی، کیلون بین وینوٹو سیلینی، اور شاہنشاہ چارلس پنجم اپنی شہرت کے عروج پر تھے اور یہ سب لوگ اپنے اپنے مخصوص ڈھنگ سے اپنی اپنی تاریخ

تیار کر رہے تھے۔ مارگیریٹ آف نوار، ہیپٹیمرن اور دوسری مذہبی کتابیں لکھ رہا تھا، جن میں سے پہلی کتاب آج تک موجود ہے جبکہ دوسری کتابیں فراموش ہو چکی ہیں۔ بسا اوقات ادب، تقدس کی نسبت ظرافت اور ناشائستگی کی خوبیوں کی وجہ سے زیادہ محفوظ رہتا ہے۔ ان دنوں مبہم قسم کے درباری اخلاق اور بہادری کے بے معنی کارناموں کا بڑا زور تھا۔ ممتاز اور خوش وضع شریف زادے، نیزہ بازی اور دوسرے کھیلوں کے مقابلوں میں اپنا بیشتر وقت گذارتے تھے۔ یہ لوگ نوشت و خواند کے بجائے جنگ و جدل میں زیادہ ماہر تھے اور مذہب کا جذبہ صرف ان کی مستورات ہی میں پایا جاتا تھا جو اپنی فرصت کا وقت اپنی اولاد کو اعلیٰ مرتبہ یا اعلیٰ فوجی منصب سے ممتاز کرانے میں صرف کرتی تھیں۔ دراصل مذہب ہر طرف ایک عجیب سے شباب پر تھا۔ ٹرینٹ کی مجلس طالب کی جا رہی تھی۔ اسپین میں عدالتی تحقیقات کے ذریعہ بے مذہب لوگوں کو بے دریغ آگ میں بھونا جا رہا تھا۔ انھیں طرح طرح کی ایذا دی جا رہی تھی، اور سپرد آتش کیا جا رہا تھا یورپ میں قوموں کو قتل و غارت کے زور پر پاک زندگی گذارنے کی ترغیب دی جا رہی تھی انگلینڈ میں ہنری ہشتم خانقاہوں کو کچل چکا تھا فشر اور دوسرے دو ایک پادریوں کو جلوا چکا تھا اور اس نے انگلستان میں اصلاح دین اور اپنی حرم سرا کا نہایت موثر ڈھنگ سے آغاز کر دیا تھا جس وقت ڈی سوٹو مسسپی کے کنارے پر کھڑا تھا وہ لوتھر کی وفات سے دو سال سروٹیس کے جلائے جانے سے گیارہ سال اور سینٹ بارتھولومیو کی ہلاکت سے تیس سال پہلے کا زمانہ تھا رابلے کی نگارشات ابھی شائع نہیں ہوئی تھیں۔ ڈان کوئیکزوٹ ابھی تک نہیں لکھی گئی تھی۔ شیکسپیر ابھی پیدا بھی نہیں ہوا تھا اور انگریزوں کو اولیور گولڈ سمتھ کا نام سننے کیلئے ابھی ایک سو سال کی طویل مدت درکار تھی۔

اسمیں کوئی شک نہیں کہ مسسپی کا انکشاف ایک ایسا واقعہ ہے جس کی تاریخ معین کی جا سکتی ہے۔ اس واقعہ سے ہمارے ملک کے تابناک نئے پن میں کچھ دھندلا پن اور تبدیلی آ جاتی ہے اور اس میں کہنہ پن اور قدامت کا ایک ایسا خارجی عنصر داخل ہو جاتا ہے جو انتہائی درجہ قابل احترام ہے۔

ڈی سوٹو نے دریائے مسسپی کی صرف ایک جھلک دیکھی اور جب وہ مر گیا تو اسی دریا میں اس کے پادریوں اور سپاہیوں نے اسے دفن کر دیا۔ بعض حضرات کو یہ توقع ہو گی کہ اسپین

کے رواج کے مطابق پادریوں اور سپاہیوں نے اس دنیا کے طول و عرض کو دس گنا بڑھا چڑھا کر بتایا ہوگا تاکہ دنیا کے دوسرے حصوں والے اس داستان سے تحریک پا کر اس دریا کی تحقیقات کے لئے فوراً روانہ ہوں۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ جب وہ لوگ واپس پہنچے تو ان کے بیانات سے لوگوں میں ایسا تجسّس اور اشتیاق پیدا نہیں ہوا۔ مسیسپی کو دیکھنے کے لئے دوسرے گورے لوگ اتنی مدت تک نہیں آئے کہ جس کا آج ہمارے سرگرم زمانے میں تصور بھی آنا محال ہے۔ کوئی بھی اس وقفے کا اندازہ اس کو اس طرح تقسیم کرکے لگا سکتا ہے کہ جب ڈی سوٹو نے اس دریا کو دیکھا تو اس کے قریب چوتھائی صدی سے کچھ کم عرصہ کے بعد شیکسپیئر پیدا ہوا جو نصف صدی سے کچھ زیادہ زندہ رہا۔

جب وہ مر گیا اور اسے دفن ہوئے نصف صدی سے زیادہ عرصہ ہو گیا تو پھر ایک گورے آدمی نے مسیسپی کو دیکھا۔ ہم اپنے زمانے میں کسی عجیب و غریب شے کے دو مرتبہ دیکھے جانے کے درمیان ایک سو تیس سال کے عرصے کا گذر جانا گوارا نہیں کر سکتے۔ آجکل اگر کوئی شخص قطب شمال کے ملک کے پاس والے ملک میں ایک چھوٹے سے چشمے کی کھوج کرے تو یورپ اور امریکہ والے اس طرف پندرہ ایسی مہمیں بھیج دیں گے جن پر کثیر رقم خرچ ہوگی۔ ان میں سے ایک مہم تو اس چشمے کی کھوج کے لئے ہوگی اور باقی چودہ مہمیں ایک دوسرے کی تلاش کے لئے ہوں گی۔

ہمارے بحر اوقیانوس کے ساحلوں پر ایک سو پچاس سال سے زائد عرصے سے گوری قوموں کی آبادیاں قائم ہوتی رہی ہیں۔ ان قوموں اور قبائلیوں کے مابین گہرا ربط ضبط تھا۔ جنوب میں ہسپانیہ والے انھیں لوٹ رہے تھے، قتل کر رہے تھے، غلام بنا رہے تھے اور ان کا مذہب تبدیل کر رہے تھے اور ہر کی جانب انگریز ان لوگوں سے معاوضہ لیکر موتیوں اور کمبلوں کی تجارت کر رہے تھے اور ان کو بجائے اس انھیں تہذیب بھی سکھاتے تھے اور رم بھی مہیا کرتے تھے۔ کناڈا میں فرانسیسی ان لوگوں کو ابتدائی تعلیم دے رہے تھے، اپنے مذہب کی تبلیغ کر رہے تھے اور ان کی ساری آبادی کو ان سے سمور خریدنے کیلئے پہلے کیوبک اور اسکے بعد مانٹریال بھیج رہے تھے۔ اسلئے لازمی طور پر ان گوری قوموں کے مختلف گروہوں نے مغرب میں کے اس دریائے عظیم کا نام ضرور سنا ہوگا اور واقعی انھوں نے مبہم طور پر سنا بھی لیکن اتنے مبہم اور غیر یقینی طور پر کہ اس سے دریا کے راستے، اسکی لمبائی چوڑائی اور جائے وقوع کے بارے میں مشکل سے ہی کوئی قیاس آرائی کی جا سکتی ہے۔ محض اس مسئلہ کے پراسرار ہونے کے باعث لوگوں کے دلوں میں آتش اشتیاق مشتعل ہونی چاہیئے تھی اور انکو تجسس تفتیش پر آمادہ ہو جانا چاہیئے تھا مگر ایسا نہیں ہوا۔ بظاہر کسی شخص کو اس دریا کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی نہ کسی کو اس کی ضرورت

تھی اور نہ کسی کو اس کے دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ چنانچہ قریب ڈیڑھ صدی تک مسیسپی دنیا کے جھگڑوں سے دور اور پرسکون رہا۔ جب ڈی سوٹو نے اس دریا کو دیکھا تو وہ اس وقت اسکی تلاش میں نہیں تھا اور نہ یہ تلاش کرنے کا موقع ہی تھا۔ اس لئے اس نے اس دریا کی نہ قدر کی اور نہ اس کی طرف خاص توجہ دی۔

لیکن بالآخر فرانسیسی لاسیلے کو اس دریا کی تلاش کرنے اور تحقیقات کرنے کا خیال آیا۔ ہمیشہ ہوتا آیا ہے جب کوئی انسان کسی فراموش شدہ مگر اہم تصور کو گرفت میں لے آتا ہے تو دوسرے لوگ اس خیال سے تحریک پاکر اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اس دریا کی تحقیقات کے معاملے میں بھی یہی ہوا۔ اسلئے فطری طور پر یہ سوال اٹھتا ہے کہ لوگ اس دریا کی ضرورت اب کیوں محسوس کرنے لگے۔ جبکہ پچھلی پانچ نسلوں سے کسی شخص کو اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ بظاہر اس کی وجہ یہ تھی کہ اتنے عرصے بعد لوگوں کی سمجھ میں یہ آگیا تھا کہ وہ اس دریا کو اپنے لئے مفید بنا سکتے ہیں کیونکہ اب لوگوں کو یقین ہو چلا تھا کہ مسیسپی کیلفورنیا کی کھاڑی میں گرتا ہے اور اس کے ذریعے کناڈا سے چین جانے کے لئے ایک مختصر راستہ میسر آجاتا ہے۔ اس سے پہلے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ یہ دریا بحراوقیانوس یا ورجنیا کے سمندر میں گرتا ہے۔

دوسرا باب

دریا کا پتہ لگانے والے

لاسیلے نے اپنے لئے عہدہ اعلیٰ درجہ کے حقوق حاصل کرنے کے لئے عرضداشت کی اور اُسے یہ حقوق فرانس کے بادشاہ لوئی چہاردہم نے عطا کر دیئے۔ جو حقوق لاسیلے کو عطا کئے گئے ان میں ایک خاص حق کی رو سے اسکو دور دراز جگہوں کا پتہ لگانے، قلعہ جات تعمیر

کرنے اور بڑے بڑے جزیروں پر قبضہ کرکے بادشاہ فرانس کے حوالے کردینے کی اجازت مل گئی —
ان تمام امور کے سلسلے میں ہونے والے کل اخراجات کی ذمہ داری بھی خود لاسیلے پر تھی جس کے عوض
میں اس کو کسی نہ کسی صورت سے تھوڑا بہت فائدہ حاصل ہوتا تھا۔ اس فائدہ کی ایک
صورت یہ تھی کہ اس کو بھینسوں کی کھال کے کاروبار کا واحد اختیار مل گیا تھا۔ تلاش و
تجسس کے کام میں اس نے کئی سال صرف کئے اور قریب قریب اپنا سارا سرمایہ لگادیا۔ اس
نے مانٹریل اور ایک قلعہ کے درمیان جو اس نے الی نوے میں تعمیر کرایا تھا کئی بڑے خطرناک
اور تکلیف دہ سفر کئے اور بالآخر وہ اپنی مہم میں اتنا کامیاب ہوا کہ اس نے دریائے مسیسپی
کی مہم سر کرنے کی تیاری کرلی۔

اسی دوران میں کچھ دوسرے مہم بازوں کی قسمت نے لاسیلے کے مقابلے میں ان کا زیادہ
ساتھ دیا تھا۔ یہ ۱۶۷۳ء کا زمانہ تھا۔ جب سوداگر جولیٹ اور پادری مارکویٹ ملک کا طول و
عرض طے کرکے مسیسپی کے ساحل پر وارد ہوئے۔ یہ لوگ گریٹ لیکس کے راستے سے گئے۔ "گرین بے"
سے یہ لوگ ڈونگیوں میں بیٹھ کر دریائے فاکس اور وسکانسن کے راستے روانہ ہوئے۔ مارکویٹ
نے "مقدس حمل" کی تقریب کے موقع پر صدق دلی کے ساتھ یہ عہد کیا کہ اگر دوشیزہ مریم اسے
اس عظیم الشان دریا کی تلاش کی توفیق عطا فرمائیں تو وہ ان کے اعزاز میں اس دریا کو
کنسیپشن (حمل) کے نام سے موسوم کرے گا۔ اس نے وعدہ پورا کیا۔ اس روز سالہ سے مہم
باز پادریوں نے اپنے لوازمات کے ساتھ سفر کا آغاز کیا ڈی سوٹو کے ساتھ چوبیس پادری
تھے اور لاسیلے کے ساتھ بھی کئی پادری تھے۔ ان مہموں میں کھانے پینے کی اکثر قلت ہو جاتی
تھی۔ علاوہ اس کے ان لوگوں کے پاس کپڑے بھی تھوڑے ہوتے تھے لیکن عشائے ربانی کے لئے
کرسی و میز اور دوسری ضروری چیزیں ان کے ساتھ ہمیشہ رہا کرتی تھیں اور جیسا کہ اس زمانے کے
ایک واقعہ نگار نے ان پادریوں کے بارے میں لکھا ہے یہ لوگ دوسرے لوگوں کو دوزخ سے
ڈرانے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔

۱۷ جون ۱۶۷۳ء کو جولیٹ اور مارکویٹ اور ان کے پانچ ماتحت وسکانسن اور
مسیسپی کے سنگم پر پہونچے۔ مسٹر پارکمین کا بیان ہے کہ ان لوگوں کے سامنے ایک نہایت

چوڑا اور تیز رفتار دریا اونچی اونچی پہاڑیوں کے دامن میں جو گھنے جنگلوں سے ڈھکی ہوئی تھیں بہہ رہا تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ جنوب کی طرف ایک سنسان وادی سے گذرتے ہوئے جہاں آدم زاد کا کہیں نشان بھی نہیں تھا' ان لوگوں نے اپنی کشتی اس تیز رفتار دھارے میں بہاؤ کی طرف ڈال دی۔

اتفاق سے ایک بڑی مچھلی مارکوپٹ کے ڈونگے سے ٹکرا گئی جس سے وہ یکا یک چونک پڑا اور اس کا یہ چونکنا بجا بھی تھا کیونکہ قبائلیوں نے اسے پہلے سے ہی متنبہ کر دیا تھا کہ اس کا یہ سفر حماقت آمیز ہی نہیں بلکہ مہلک بھی ثابت ہوگا کیونکہ دریا میں ایک بھوت رہتا ہے جس کی گرجدار آواز بڑی دور سے سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے ان مہم بازوں کو یہ کہہ کر بھی ڈرایا تھا کہ بھوت انھیں اسی جگہ جہاں وہ رہتا ہے ڈبو دے گا۔ میری نظر سے سیپی کی ایک مچھلی گذری ہے جس کی لمبائی چھ فٹ سے بھی زیادہ تھی اور جس کا وزن دو سو پونڈ تھا جس مچھلی سے مارکوپٹ کو سابقہ پڑا تھا اگر وہ اسی مچھلی کے برابر تھی جو میں نے دیکھی تھی تو مارکوپٹ کا یہ ڈر درست اور حق بجانب تھا کہ وہ گرجنے والا بھوت اسکے سر پر آپہونچا ہے۔

"آخر کار ان لوگوں کو کچھ بھینسیں نظر آنا شروع ہوئیں جنگلے دریا کے کنارے وسیع چراگاہوں میں چر رہے تھے مارکوپٹ نے ان بوڑھے سانڈوں کی خوفناک اور مضحکہ خیز شکل و صورت کا یوں ذکر کیا ہے کہ انکا گردنوں پر الجھے ہوئے گھنے بال تھے جن سے ان کی آنکھیں قریب قریب ڈھکی ہوئی تھیں اور اسی لئے انھیں دیکھنے میں دقت ہوتی تھی۔ ان نوواردوں کو یہ سانڈ اپنے بالوں کی آڑ سے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے نوواردوں نے آہستہ آہستہ قدم بڑھایا۔ یہ لوگ رات کے وقت ساحل پر اترے تھے۔ انھونے اپنا کھانا تیار کرنے کے لئے آگ جلائی اور پھر اُسے بجھا دیا۔ بعد ازاں وہ کشتی پر سوار ہوئے اور اُسے کچھ دور تک چلا کر لے گئے۔ پھر انھوں نے کشتی کا لنگر ڈال دیا اور ایک آدمی کو پہرہ دینے کے لئے تعینات کر دیا جو صبح تک اپنی ڈیوٹی پر رہا۔"

مسلسل کچھ دنوں اور راتوں تک انھوں نے ایسا ہی کیا۔ دو ہفتوں تک تو انھیں کسی انسان کی صورت دکھائی نہیں دی۔ دریا اس وقت بالکل سنسان اور بھیانک لگ

رہا تھا۔ دُور دُور تک یہی عالم تھا۔

آخر کار دو ہفتوں کے اختتام پر انھیں کچھی گھاٹ کی دلدل میں کچھ آدمیوں کے پاؤں کے نشانات دکھائی دیئے۔ ان کا یہ تجربہ بالکل اُس تجربے کے مطابق تھا جو رابنسن کروسو کو ہوا تھا۔ کیونکہ سنسان بیابان میں آدم زاد کے پیروں کے نشان دیکھ کر ہر انسان یکایک ٹھٹھک جائے گا اور اس کے جسم میں بجلی کی سی لہر دوڑ جائے گی۔ ان لوگوں کو یہ پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ دریا کے قریب رہنے والے قبائلی دریائی بھوتوں کی ہی طرح خشمناک اور بے رحم ہوتے ہیں اور بلا اشتعال نو واردوں کو مار ڈالتے ہیں، لیکن جولیٹ اور مارکوٹ نے ان باتوں کی کچھ پروانہ کی اور دونوں ان لوگوں کی تلاش میں، جن کے پاؤں کے نشانات انھیں نظر آئے تھے اس علاقے کے اندر داخل ہوگئے اور انھوں نے تھوڑے ہی عرصہ میں ان قبائلیوں کو تلاش کر لیا۔ وہ لوگ اِن لوگوں سے بڑے تپاک سے ملے اور ان کی بڑی خاطر تواضع کی مگر جو خیر مقدم اور خاطر تواضع ان لوگوں نے کی وہ غالباً ہماری سمجھ میں نہیں آئے گی۔

نو واردوں کا خیر مقدم کرنے کے لئے قبائلیوں کے سردار نے خود کو بالکل برہنہ کر لیا اور کھانے میں مہمانوں کو مچھلی، جو کا دلیا اور جانوروں کا گوشت، جس میں کتے کا گوشت بھی شامل تھا، دیا اور اس پر طرّہ یہ کہ مہمانوں کے حلق میں یہ چیزیں ایک قبائلی نے بلا دستانے پہنے ہوئے ہاتھ کی انگلیوں سے ٹھونسیں۔ صبح نو واردوں کو الوداع کہنے کے لئے قبائلیوں کا سردار اپنے قبیلے والوں کے ساتھ جنکی تعداد چھ سو تھی دریا کے ساحل تک آیا۔

اِن سیاحوں نے "ایلٹن" کے موجودہ شہر کی پہاڑیوں پر قبائلیوں کی بنائی ہوئی بھدّی سی مگر عجیب و غریب مصوّری دیکھی اس کا انھوں نے کہیں ذکر بھی کیا ہے۔ تھوڑی دُور نشیب میں مسیسپی کے پرسکون اور نیلگوں دھارے میں ملنے کے لئے سامنے سے زرد رنگ کی کیچڑ کا ایک تیز دھارا نہایت تیزی سے بہتا چلا آرہا تھا اور اس کے بہاؤ میں لپٹے، شاخیں اور اکھڑے ہوئے درخت "اچھلتے" اور بہتے چلے آرہے تھے۔ یہیں اس وحشی دریا "مسوری" کا دہانہ تھا۔ یہ دریا ایک بہت بڑے بیابان سے جس کی وحشت کا کسی نے کبھی ذکر بھی نہ سنا ہوگا، اپنی مجنونانہ رفتار سے اچھلتا کرتا گزرتا تھا اور پھر اپنی آہستہ خرام

بہن مسیسپی کے دامن میں اپنا گدلا پانی انڈیلتا تھا۔

چند دن بعد یہ لوگ اوہایو کے دہانے سے گذرے۔ انھوں نے جھاڑیوں کو پار کیا۔ جہاں انھیں مچھروں سے کشمکش کرنی پڑی۔ وہ اس خاموش ویران و سنسان دریا میں اپنی کشتی کو ساحل کے کنارے چلائے جا رہے تھے۔ کبھی وہ کشتی کے پچھلے حصے میں شامیانے کے سائے میں اونگھنے لگتے اور ان کا جسم گرمی سے جھلسنے لگتا۔ ان کی ملاقات قبائلیوں کی ایک اور جماعت سے بھی ہوئی۔ دونوں طرف سے پرتپاک علیک سلیک ہوئی۔ بالآخر یہ لوگ آرکنسا کے دہانے تک جا پہونچے۔ ان کو اپنے مقام روانگی سے چلے ہوئے ایک ماہ کا عرصہ ہوگیا تھا۔ یہاں ان کا مقابلہ کرنے اور ان کو جان سے مار ڈالنے کے لئے جنگجو قسم کے وحشیوں کے غول کے غول جمع تھے۔ لیکن اِن لوگوں نے مقدس مریم سے دعا مانگی کہ وہ ان کو بخیریت رکھے۔ دعا کا نتیجہ یہ ہوا کہ جماعتوں کے درمیان جنگ چھڑنے کے بجائے دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا اور سب لوگ آپس میں گپ شپ کرنے لگے۔

ان لوگوں کو اپنی تسلی کے لئے خاطر خواہ ثبوت مل گیا تھا دریائے مسیسپی کیلفورنیا کی خلیج میں نہیں گرتا تھا۔ انھیں یقین ہوگیا کہ مسیسپی خلیج میکسیکو میں گرتا ہے اور واپسی میں انھوں نے یہ اہم اطلاع کناڈا میں دی۔

لیکن محض یقین کرنے سے ہی کوئی بات لازمی طور پر پایۂ ثبوت کو نہیں پہونچتی اسکا ثبوت بہم پہونچانے کا فخر لاسیلے کو ہی حاصل ہونا تھا۔ لیکن لاسیلے کی مہم بہت دیر سے شروع ہوئی، جسکے متعدد اسباب تھے۔ لاسیلے پر یکے بعد دیگرے بہت سی مصیبتیں نازل ہوتی رہیں۔ لیکن آخرکار ۱۶۸۱ء میں اس کی مہم کا آغاز ہو ہی گیا۔ ان دنوں میں کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ ایسی حالت میں لاسیلے اور ہنری ٹانٹی جو لارینزو ٹانٹی "ٹینن حیاتی شرکت" کے موجد کے بیٹے تھے اور اسکا نائب "ڈالی لوا" سے دریا کے بہاؤ کی طرف روانہ ہوئے۔ ان کے ہمراہ اٹھارہ قبائلی بھی تھے جنھیں یہ لوگ نیو انگلینڈ سے لائے تھے۔ اس کے علاوہ تئیس فرانسیسی بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ منجمد دریا کی سطح پر جلوس کی شکل میں پا پیادہ روانہ ہوئے اپنے پیچھے وہ اپنی ڈونگیوں کو برف پر چلنے والی

گاڑیوں میں رکھ کر کھینچے چلے جا رہے تھے۔

پیورپا جھیل میں پہنچنے کے بعد کشتی کھلے پانی میں پہنچ گئی اور وہ وہاں سے مسیسپی کی طرف چل دیئے۔ اب انھوں نے اپنی کشتیاں جنوب کی جانب موڑ دیں۔ برف کے تیرتے ہوئے تودوں کے درمیان سے گذرتے ہوئے انھوں نے مسوری اور اوہیو کے دہانے پار کئے اور پھر اس سے ملحق دلدلی زمین پر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے وہ ۲۴ رفروری کو تھرڈ چکا سا بلغس کے مقام پر اترے اور یہاں کچھ دن قیام کرنے کے بعد انھوں نے قلعہ 'پرودھوم' تعمیر کیا۔

مسٹر پارک مین کا بیان ہے کہ یہ لوگ کشتی پر سوار ہو کر اس مقام سے روانہ ہوئے۔ جیسے جیسے وہ اپنے مہم کی ہر منزل سے گذرتے تھے ویسے ویسے ان پر اس وسیع و عریض نئی دنیا کے اسرار زیادہ سے زیادہ منکشف ہوتے جاتے تھے۔ آگے سارا علاقہ پُربہار تھا۔ یہاں کی ہلکی ہلکی خوشگوار دھوپ گرم اور خواب آور ہوا' بکھرے ہوئے نرم نرم پتے اور ان کے درمیان شگفتہ پھول قدرتی نظاروں کی یاد تازہ کر رہے تھے۔

روز بروز گھنے جنگلوں کے سائے میں بڑے بڑے موڑوں سے گذرتے ہوئے یہ لوگ ٹھیک وقت پر 'ارکنسا' کے دہانے پر پہنچ گئے۔ یہاں کے باشندوں نے جس طرح مارکویٹ کا خیرمقدم کیا تھا اسی طرح اس مرتبہ انھوں نے فوجی طبلوں کی صداؤں اور چمکتے ہوئے ہتھیاروں سے ان کا بھی استقبال کیا۔ مارکویٹ کے معاملے میں تو مقدس مریم نے مشکل آسان کی تھی لیکن لاسیلے کے لئے یہ کام امن کی شہنائی نے انجام دیا۔ تین روز تک برابر ایک طرف گورے انسانوں اور دوسری طرف سرخ انسانوں نے باہم مصافحہ و ملاقات اور خاطر و تواضع کی۔ اس کے بعد لاسیلے نے ایک صلیب نصیب کر کے اُسے فرانسیسی ہتھیاروں سے سجایا۔ اس سے وہاں کے صحرائی باشندے بہت خوش ہوئے۔ پھر ان لوگوں نے سارا ملک بادشاہ کے حق میں حاصل کرلیا۔ یہ اس زمانہ کا سہل سا دستور تھا۔ اس موقع پر بڑے پادری نے نہایت پارسائی کے ساتھ اس چوری کو متبرک اور حلال کرنے کے لئے بارگاہِ الٰہی میں مناجات پیش کی۔ نیز پادریوں نے ان صحرائی باشندوں کی نجات کے لئے عقیدوں کے مخفی رازوں کی تشریح' علامات کے ذریعہ کی اور اُن کو تشفی دی کہ جو دنیاوی جاگیر ان سے ابھی ابھی لوٹی گئی ہے اس کا معاوضہ انھیں

جنت میں مل جائے گا۔ اشارات و کنایات سے لاسیلے نے ان صحرا نشادوں سے یہ اقرار کرالیا کہ وہ سمندر پر لوئی دی پیوٹرڈ کی وفاداری کا حلف لیں گے اور اس کا دم بھریں گے۔ لطف یہ کہ اس ستم ظریفی پر کسی کے ہونٹوں پر نام کو بھی مسکراہٹ نہ آئی۔

یہ سب رسمیں ارکنسا کے علاقے میں اس مقام پر ہوئیں جہاں بعد میں نیپولین کا شہر آباد ہوا۔ اس مقام پر دریا کے کنارے اس جبریہ استحقاق کی اوّلین یادگار میں صلیب نصب کی گئی۔ مارکویٹ اور جولیٹ نے دریائے مسیسپی کی کھوج میں جو سمندری سفر اختیار کئے تھے ان کا اختتام بھی اسی مقام پر ہوا تھا۔ یہاں مستقبل میں نیپولین نام کا شہر آباد ہونا تھا۔ اس سے پہلے ڈی سوٹو نے شروع میں دریا کا سرسری طور پر نظارہ اسی مقام سے کیا تھا۔ اس عظیم دریا کی تلاش میں چار بڑے بڑے واقعات پیش آئے ان میں سے تین اتفاق سے اسی مقام پر ظہور پذیر ہوئے تھے۔ اگر کوئی اس بات پر غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس مقام کو ایک عجیب و غریب امتیاز حاصل ہے۔ فرانس نے اس وسیع ملک کا سرقہ اسی مقام پر کیا تھا یعنی جہاں بعد میں نیپولین نام کا شہر آباد ہوا۔ مگر رفتہ رفتہ ایک دن ایسا آیا کہ خود نیپولین کو یہ ملک اس کے مالکوں کے بجائے اس کے گورے رنگ کے امریکی وارثوں کے حوالے کرنا پڑا۔

ان بحری سیاحوں نے اپنا سفر برابر جاری رکھا۔ یہ لوگ کبھی اس مقام سے گذرے کبھی اس مقام سے۔ وہ وکسبرگ اور گرانڈ گلف کے تاریخی مقامات سے بھی گذرے۔ اسی دوران میں انھوں نے دیکھے، کہ ایک جلیل القدر قبائلی تاجدار سے ملاقات کی۔ اس تاجدار کی راجدھانی بڑی مضبوط اور پائیدار تھی اور اس کے مکانات دھوپ میں سینکی ہوئی اینٹوں سے جن میں بھوسا ملا ہوا تھا بنے تھے۔ یہ مکان آجکل کے مکانات کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اچھے تھے۔ اس تاجدار کے محل میں چالیس فٹ مربع کا ایک ایوان بنا ہوا تھا جہاں تاجدار لوگوں کو شرفِ باریابی بخشتے تھے۔ اسی ایوان میں اس نے لوٹنی کو بڑی آن بان کے ساتھ شرفِ ملاقات بخشا۔ اس کے گرد و پیش ساٹھ سن رسیدہ لوگ موجود تھے جو سفید لباس میں ملبوس تھے۔ شہر میں ایک پرستشگاہ تھی جس کے چاروں طرف مٹی کی دیوار تھی اور جس کو ان دشمنوں کی

کھوپڑیوں سے سجایا گیا تھا جنھیں ان لوگوں نے سورج دیوتا کو بھینٹ چڑھایا تھا۔

بعدازاں یہ بحری مسافر نیچز کے قبائلیوں سے اس مقام پر ملے جہاں اب نیچز کا شہر آباد ہے۔ یہاں مذہبی اور سیاسی مطلق العنانی پائی جاتی تھی۔ یہاں کے لوگوں کو خاص مراعات حاصل تھیں۔ یہ لوگ سورج بنشی تھے۔ یہاں ایک مندر بنا ہوا تھا اور ایک مقدس ہون کنڈ بھی تھا۔ اس مقام پر پہونچ کر ان لوگوں کو آرام ملا اور ایسا محسوس ہوا گویا وہ دوبارہ اپنے وطن میں پہونچ گئے ہوں۔ اس وطن میں ان کو ایک فائدہ اور بھی محسوس ہو رہا تھا، اور وہ یہ کہ یہاں فرانس کا بادشاہ لوئی چاردہم نہیں تھا۔

کچھ دن اور بڑی تیزی سے گذر گئے۔ ایک دن لاسیلے استحقاق بالجبر والی صلیب کے سائے میں کھڑا تھا۔ یہاں ڈیلا ڈیرا اور اٹاسکا نیز بحرالکاہل کے قریب والے پہاڑی سلسلے سے خارج ہونے والا پانی آکر خلیج میکسیکو میں گرتا تھا۔ آج لاسیلے کا کام پایۂ تکمیل کو پہونچ چکا تھا۔ اُسے حیرت انگیز کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ مسٹر پارک مین نے اپنے دلکش بیان کے آخر میں لکھا ہے کہ "اس روز حکومت فرانس نے ایک چرمی مخطوطے پر ایک عظیم الشان اقرار نامہ کو شرف قبولیت بخشا۔ ٹیکساس کے زرخیز میدان، مسیسپی کی طویل و عریض وادی جو شمال کے منجمد چشموں سے لے کر خلیج کی گرم اور خشک سرحدوں تک اور الی گنی کی پہاڑیوں سے راکی پہاڑوں کی تنگ چوٹیوں تک پھیلی ہوئی تھی۔ کل علاقہ یعنی وہ علاقہ جس میں لق و دق میدان جنگل اور دھوپ سے تپتے ہوئے ریگستان و چراگاہ واقع ہیں جو ہزاروں دریاؤں سے سیراب ہوتا ہے اور جس میں ہزاروں جنگجو قبیلے آباد تھے، یہ سب سلطان ورسلیز کی قلمرو میں آگئے اور وہ بھی ایک نحیف و نزار انسانی آواز کی بدولت جو نصف میل کے فاصلے تک بھی نہیں پہونچ سکتی تھی۔

تیسرا باب

عہدِ ماضی کی کچھ تصویریں

بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس دریا کے ذریعہ اب کاروبار ہو سکتا ہے لیکن درا صل ایسی بات نہیں تھی۔ اس کے ساحلوں پر آبادی کی تقسیم کے کام کے لئے اتنا ہی سکون، احتیاط اور وقت درکار تھا جتنا اسکی دریافت کے سلسلے میں۔

دریا کی دریافت کے ستر برس بعد اس کے ساحلوں پر گورے لوگوں کی اتنی آبادی ہو سکی جسے لائق توجہ کہا جا سکے۔ تجارت کا سلسلے شروع ہونے میں، تو پچاس سال اور لگے۔ جس زمانے میں لاسیلے نے اس دریا کی تلاش کی اُس زمانے سے لے کر اس وقت تک جب اس کے ذریعہ باقاعدہ اور عملی طور پر تجارت کا سلسلہ شروع ہوا، انگلستان کے تختِ حکومت پر سات بادشاہ تخت نشین ہو چکے تھے، امریکہ آزاد ہو چکا تھا۔ لوئی چہاردہم اور لوئی پنجدہم زوال پذیر ہو کر مر چکے تھے۔ فرانس کی شہنشاہیت خونی انقلاب کا شکار ہو چکی تھی اور نپولین کا نام لوگوں کی زبان پر آنا شروع ہو گیا تھا۔ سچ پوچھئے تو اس زمانے میں بڑی سست رفتاری سے کام ہوا تھا۔

شروع شروع میں دریا کی تجارت چوڑے اور چپٹے پیندے والی کشتیوں یا آہنی پیندے والی کشتیوں کے ذریعہ ہوتی تھی۔ یہ کشتیاں بالائی دریاؤں سے نیو آرلیز کی طرف جاتی تھیں۔ وہاں مالِ تجارت کا تبادلہ کیا جاتا تھا اور ہاتھوں سے انھیں رسّی کے ذریعہ کھینچ کر بلّیوں سے باندھ دیا جاتا تھا۔ بعض اوقات اس طرح کی آمد و رفت میں نو نو مہینے لگ جاتے تھے۔ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا یہ تجارت بڑھتی چلی گئی حتیٰ کہ اس کی وجہ سے خانہ بدوش گنوار

اور محنت کش لوگوں کو روزگار میسّر ہونے لگا ان لوگوں میں نہ شائستگی تھی اور نہ یہ تعلیم یافتہ تھے مگر یہ لوگ بہادر تھے اور جہازرانوں کے سے تحمّل اور استقلال سے کام لیتے تھے، وہ بلا کے جفاکش تھے شراب بہت پیتے تھے، گندے مذاق کرتے تھے اور رنگ رلیاں مناتے تھے اور اس زمانے کے "نیچز انڈر دی ہل" جیسے مکانوں میں رہتے تھے۔ وہ بلا کے لڑاکو اور اوباش قسم کے لوگ تھے۔ ہر شخص مست و بے پرواہ تھا۔ یہ لوگ بہت ہی خوش مزاج گھٹیا اور غیر شائستہ قسم کے مذاق کرنے والے اور فضول خرچ تھے۔ سفر ختم ہوتے ہوتے ان کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں بچتا تھا۔ یہ لوگ پرانے زمانے کے کپڑوں اور زیورات کے بہت شوقین تھے اور انتہائی شیخی خور تھے مگر ان میں خاص خوبی یہ تھی کہ وہ بڑے ایماندار، قابلِ اطمینان، وفادار، وعدے کے پکے اور فراخدل تھے۔

بتدریج دخانی کشتیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ مگر اس کے بعد بھی پندرہ یا بیس سال تک دریا کے بہاؤ کی طرف تو آپنی چپٹے پیندے والی کشتیاں چلاتے رہے جبکہ دریا کے اوپری حصّے میں سارا کاروبار اسٹیمروں یعنی دخانی کشتیوں کے ذریعہ ہونے لگا تھا۔ چپٹی کشتیوں کے ملاّح اپنی کشتیاں نیو آرلینز میں فروخت کر ڈالتے تھے اور پھر اسٹیمروں میں سوار ہو کر گھر واپس چلے جاتے تھے۔

تھوڑے ہی دنوں کے بعد اسٹیمروں کی تعداد میں اتنا اضافہ ہو گیا اور ان کی رفتار اتنی تیز ہو گئی کہ ساری تجارت انہی کے ذریعہ ہونے لگی۔ اس طرح چپٹی کشتیاں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئیں۔ ان کشتیوں کے ملاّح اسٹیمروں میں کام کرنے لگے۔ یا تو وہ ان کشتیوں کے عرشے پر مامور ہوتے یا پھر مزدور یا پائلٹ کی حیثیت سے کام کرتے تھے، اور اگر انھیں اسٹیمروں میں جگہ نہ مل پاتی تو وہ پٹس برگ کے کوئلہ لیجانے والے ڈونگوں یا جنگل کی چیڑ کی لکڑی کے بنے ہوئے بیڑوں پر بیٹھ کر مسیسپی کے منبع کی طرف چل دیتے تھے۔

جس زمانے میں اسٹیمروں کا استعمال فراوانی کے ساتھ ہوتا تھا اس وقت اس دریا میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوئلہ لیجانے والی کشتیوں اور شہتیر لے جانے والے بیڑوں کا جمگھٹا سا لگا رہتا تھا۔ ان کشتیوں کو ہاتھ سے چلایا جاتا تھا اور ان میں ہزاروں

گنوار لوگ کام کرتے تھے۔ میں نے اس باب میں ان لوگوں کا حال بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں اپنے بچپن میں دیکھا کرتا تھا کہ بھاری بھاری بیڑے قطار در قطار ہر سال "ہینی بال" کے پاس سے گذرتے تھے ان بیڑوں میں ایک ایکڑ کی پیمائش کے سفید اور بھینی بھینی خوشبو دینے والے تختے لدے رہتے تھے اور دو درجن یا اس سے بھی زیادہ ملاح ہر بیڑے پر کام کرتے تھے بیڑے کے وسیع اور کشادہ فرش پر تین یا چار خیمے نصب ہوتے تھے جن میں طوفان کے وقت پناہ لی جا سکتی تھی۔ اِن بیڑوں کے بوڑھے ملاحوں یا پرانے کشتی چلانے والوں یا ان کے عجیب و غریب جانشینوں کے عجیب و غریب طور و طریقے اور شیخیاں مجھے اب تک یاد ہیں۔ ہم لوگ اکثر چوتھائی یا تہائی میل تک تیر کر ان بیڑوں کو پکڑ لیتے تھے اور ان پر سواری کا لطف اٹھاتے تھے۔

ان ڈونگوں پر کام کرنے والوں کی گفتگو اور ان کے طور و طریق و نیز بیڑے سے متعلق قدیم اور فراموش شدہ زندگی کو ایک واقعہ کے ذریعہ سمجھانے کے لئے میں یہاں اپنی ایک اور کتاب کے ایک باب کو شامل کروں گا۔ یہ کتاب میں پانچ چھ سال سے وقتاً فوقتاً سپرد قلم کر رہا ہوں اور شاید میں اسے آئندہ پانچ چھ سال کے اندر ختم کرسکوں گا اس باب میں میں نے ایک غیر تعلیم یافتہ دیہاتی لڑکے ہک فن کی زندگی کے کچھ حالات قلمبند کئے ہیں۔

ہک فن قصبے کے ایک شرابی کا لڑکا تھا جو اس زمانہ میں قصبے کے شمال میں رہتا تھا وہ اپنے جابر و ظالم باپ اور ایک نیک مگر سختی کرنے والی بیوہ کے ہاتھوں پریشان ہو کر گھر سے بھاگ آیا ہے۔ یہ بیوہ اسکو ایک اچھا استبار اور قابل عزت آدمی بنانا چاہتی تھی۔ اس لڑکے کیساتھ اس بیوہ کا حبشی غلام بھی فرار ہو جاتا ہے ------------

---------- ان دونوں کو عمارتی لکڑی لے جانے والی کشتی کا ایک کونا ہاتھ آجاتا ہے

{ اس وقت دریا میں پانی چڑھا ہوا ہے۔ اور شدید گرمی کا موسم ہے۔ } یہ دونوں رات کو کشتی کے تختے پر سفر کرتے اور دن کے وقت بید کے درختوں کی آڑ میں چھپ جاتے ہیں۔

ان کی منزل مقصود "کیرو" ہے کیونکہ آزاد ریاستوں کے مرکز پہنچ کر یہ حبشی غلام آزادی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ کہرا چھا جاتا ہے اور یہ لوگ لاعلمی میں کیرو سے گذر جاتے ہیں۔ مگر رفتہ رفتہ انھیں کچھ شبہ ہوتا ہے اور پھر حقیقت ان پر روشن ہونے لگتی ہے۔

ہک فن کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں نہ اس تذبذب کی حالت کو ختم کیا جائے اور کیوں نہ اس کی تاریکی کے عالم میں تیر کر ایک بڑے بیڑے پر جو ان کے آگے کچھ فاصلے پر جا رہا ہے سوار ہوا جائے؟ چنانچہ وہ چوری چوری اس بیڑے کے پاس تیر کر پہونچتا ہے اور کسی طرح یہ معلوم کر لیتا ہے کہ وہ بیڑا کہاں جا رہا ہے۔ ہک فن اپنے قصے کو اس طرح بیان کرتا ہے:۔

"لیکن آپ جانتے ہی ہیں جب ایک نوجوان آدمی کسی بات کی تفتیش کے لئے کمربستہ ہو جاتا ہے تو اس کو موقع اور محل کا انتظار کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم نے اس بارے میں آپس میں کافی گفتگو کی۔ جم نے کہا کہ اس تاریک رات میں اس بیڑے کی طرف تیر کر پہونچنا اور پیٹ کے بل گھسٹ کر اس پر چڑھنا اور وہاں ان لوگوں کی گفتگو کو چوری چوری سننا خطرے سے خالی نہیں۔ ان لوگوں میں کیرو کے بارے میں بات چیت ہوتی ہوگی غالباً وہ وہاں شراب پینے کے لئے ساحل پر جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ بہر حال وہ لوگ اپنی کشتی کو ساحل کی طرف لے جانا چاہیں گے تاکہ وہاں جا کر وہسکی یا تازہ گوشت یا اور کوئی چیز خرید سکیں۔ جم ایک حبشی تھا اور اس میں غضب کی مستقل مزاجی تھی۔ اگر کسی کو کوئی منصوبہ بنانے کی ضرورت ہوتی تو جم فوراً اس کی مدد کرتا اور ایک اچھا خاصا منصوبہ بنا کر فوراً اسے پیش کر دیتا۔

بالآخر میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنے کپڑے اُتارے اور دریا میں کود پڑا اور اس طرف تیرنے لگا جدھر سے بیڑے کی روشنی آرہی تھی۔ آخر کار جب میں بیڑے کے قریب پہونچ گیا تو وہاں تھوڑی دیر کے لئے سستانے رکا اور پھر آہستہ آہستہ احتیاط کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ صورت حال میرے حق میں تھی۔ چپو کے پاس کوئی نہیں تھا۔ میں بیڑے کے ساتھ ساتھ تیرتا ہوا آگے بڑھا حتیٰ کہ کشتی کے وسط میں خیمے کے پاس تک پہونچ گیا جہاں آگ جل رہی ...... تھی۔ تب میں پیٹ کے بل چل کر کشتی میں ...... داخل ہو گیا اور ایک ایک انچ بڑھ کر اس جگہ پہونچ گیا جہاں کنکروں اور پتھروں کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ میں اس ڈھیر کے بیچ میں آگ کے اس طرف جدھر سے ہوا آرہی تھی چھپ کر بیٹھ گیا۔ یہاں تیرہ[۱۳] آدمی موجود تھے۔ یہ لوگ عرشے پر اپنی اپنی ڈیوٹی پر تعینات تھے۔ ان لوگوں کی شکل وصورت بڑی بھدی تھی۔ ان کے پاس ایک صراحی اور ٹین کے پیالے بھی تھے۔ یہ لوگ صراحی کو گردش میں رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک شخص گا رہا تھا"

بلکہ یہ کہیئے کہ دھاڑ رہا تھا۔ جو گیت وہ گا رہا تھا وہ کم از کم کسی اچھی محفل کے لئے موزوں نہ تھا۔ وہ ناک میں سے باآواز بلند گا رہا تھا اور ہر مصرع کے آخری لفظ کو بہت کھینچ تان کر ادا کر رہا تھا۔ جب وہ گا چکا تو ان لوگوں نے مل کر ایک جنگلی نعرہ بلند کیا اور پھر دوسرا گانا شروع ہوا۔ یہ گانا اس طرح کا تھا:۔

ہمارے گاؤں میں تھی ایک عورت	یہیں رکھتی تھی وہ اپنی سکونت
دیا کرتی تھی وہ خاوند پر جان	نظر میں اس کی تھا مگر اک اور انسان
عجب آواز سے گاتی تھی گانا	تنا نا نا تنا نا ناتنانا
دیا کرتی تھی وہ خاوند پہ جان	نظر میں اس کی تھا مگر اک اور انسان

اس گانے میں چودہ مصرعے تھے۔ اس گانے سے پست مذاقی ظاہر تھی اور جب اس شخص نے دوبارہ گانا شروع کرنا چاہا تو ایک شخص بول اٹھا کہ اسی دھن پر تو ایک بڈھی گائے مر گئی تھی۔ اب دوسرے شخص نے کہا "اچھا، اچھا، اب ہمیں ذرا دیر آرام کرنے دو۔" ایک اور شخص نے کہا بھئی اب ذرا کہیں گھوم پھر آؤ۔" دراصل اِن لوگوں نے اس کا تماشا بنا دیا حتیٰ کہ وہ خبط الحواس ہو گیا۔ وہ اچھل پڑا اور اس نے مجمع کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ وہ بولا کہ اگر مجمع میں ذرا کبھی چپ رہے تو وہ اس کی ٹانگ توڑ دے گا۔ یہ سن کر سب لوگ اس کا سر پھوڑنے کو تیار ہو گئے لیکن انمیں جو سب سے بڑا آدمی تھا اس نے ایک چھلانگ لگائی اور بولا "صاحبو تم لوگ یہ کیا کر رہے ہو۔ اس کو چھوڑ دو۔ میں اکیلا اس سے نپٹ لونگا۔ یہ تو میرا شکار ہے۔"

تب وہ تین مرتبہ ہوا میں اُچھلا اور ہر مرتبہ اس نے اپنی ایڑیاں چٹخائیں۔ اس نے بھینس کی کھال کا بنا ہوا ایک جھالر دار کوٹ انگنی پر سے جھٹک کر اتارا اور بولا "جب تک میں اس شخص کو ٹھکانے نہ لگا دوں تب تک تم لوگ وہیں رہو" یہ کہہ کر اس نے اپنی فیتے لگی ہوئی ہیٹ اٹھا کر پھینک دی اور پھر بولا "جب تک اس بد معاش کا کام تمام نہ ہو جائے تم لوگ وہیں رہو" ایک مرتبہ پھر اس نے ہوا میں چھلانگ لگائی اور اپنی ایڑیوں کو ایک دوسرے سے ٹکرایا۔ پھر اس نے چلا کر کہا۔

"تم لوگ جانتے ہو کہ میں یہاں کا پرانا باشندہ ہوں اور میرے جبڑے لوہے کی

طرح مضبوط ہیں، میرے پٹھے غضب کے طاقتور ہیں، میرا پیٹ تانبے کا بنا ہوا ہے، میں ارکنسا کے درندوں کی لاشوں کو اپنی خوراک بناتا ہوں۔ میری طرف دیکھو میں ہی وہ انسان ہوں جسے مرگ ناگہانی اور قیامت عالمگیر کہتے ہیں۔ طوفان میرا باپ ہے، زلزلہ میری ماں ہے، ہیضہ میرا سوتیلا بھائی ہے اور ننہال کی طرف سے چیچک میری قریبی رشتہ دار ہے دیکھو میری طرف۔ جب میں تندرست اور ہٹا کٹا ہوتا ہوں تو انیس[19] مگرمچھ اور ایک پیپا وہسکی میرا ناشتہ ہوتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو ایک بُشل سانپ کا گوشت اور ایک لاش سے میں اپنے پیٹ کی آگ بجھاتا ہوں۔ میں ایک نظر اٹھا کر دیکھ لوں تو لاتر وال چٹانوں کے پرخچے اُڑ جائیں۔ جب میں بولتا ہوں تو بادلوں کی گرج میرے سامنے ماند پڑ جاتی ہے (کھانس کر) تم لوگ سب پیچھے ہٹ جاؤ اور مجھے میری طاقت کے مطابق جگہ دو۔ خون میری قدرتی خوراک ہے اور مرنے والوں کی آہ و بکا میرے کانوں کے لیے موسیقی کا کام دیتی ہے۔ صاحبو، میری طرف نظر اٹھا کر دیکھو اور پھر زمین پر لیٹ جاؤ۔ اپنی سانس روک لو کیونکہ اب میں خود کو بالکل آزاد چھوڑنا چاہتا ہوں۔"

اس دوران میں جب وہ اپنے آپے سے باہر ہو رہا تھا تو اسکے چہرے سے بڑی ہیبت ٹپکتی تھی۔۔۔۔ وہ برابر سر ہلا رہا تھا اور اس کا چہرہ پھولا ہوا سا تھا۔ وہ اپنی آستینوں کو برابر اوپر چڑھا رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ سینہ تان کر کھڑا ہو جاتا اور اپنے سینے کو مٹھیوں سے کوٹنے لگتا۔ پھر کہتا "صاحبو میری طرف نظر اٹھا کر دیکھو۔ جب وہ یہ کہہ چکا تو پھر ایک مرتبہ اُچھلا اور اس نے پھر تین مرتبہ اپنی ایڑیاں ٹکرائیں اور پھر بڑی زور سے کھانسا اور دہاڑ کر کہنے لگا "میں جنگلی بلاؤ کی خونخوار ترین اولاد ہوں۔"

تب اس آدمی نے جس نے مجمع کو اپنے گانے سے برانگیختہ کیا تھا، اپنی کہنہ اور خمدار ہیٹ اپنی دائیں آنکھ کی طرف جھکا لی۔ پھر وہ آگے کی جانب قدم بڑھا کر جھکا۔ اس کی پیٹھ جھک گئی اور اس کے جسم کا نچلا حصہ آگے کی طرف بڑھ آیا اس نے اپنی مٹھیاں تان لیں اور پھر اپنی طرف کھینچ لیں۔ پھر وہ تین مرتبہ ایک دائرے کے اندر گھوما۔ اس وقت وہ غصہ میں پھولا ہوا تھا اور دقت کے ساتھ سانس لے رہا تھا پھر اس نے اپنا جسم

سیدھا کیا اور ایک چھلانگ لگائی، اپنی دونوں ایڑیاں تین مرتبہ ٹکرائیں اور اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں جسے دیکھ کر سب لوگ تالیاں بجانے لگے۔ پھر اس نے چلا کر کہا: "کھو کھو کھو۔ اپنی اپنی گردنیں جھکاؤ اور لیٹ جاؤ کیونکہ سب پر مصیبت نازل ہونے والی ہے۔ مجھے پکڑ کر زمین پر لٹا دو کیونکہ غصے میں میں قابو سے باہر ہو رہا ہوں۔ کھو۔ کھو۔ کھو۔ میں گناہ کی اولاد ہوں۔ ایسا کرو کہ میں اپنا کام شروع نہ کر پاؤں۔ دیکھو یہ دھوئیں سے میلا چشمہ تم سب کے لیے ہے۔ مجھے اپنی ننگی آنکھوں سے مت دیکھو۔ جب میری طبیعت کھیلنے کو چاہتی ہے تو میں زمین کے سارے طول و عرض میں مچھلیاں پکڑتا پھرتا ہوں اور وہیل مچھلی کی تلاش میں بحر اوقیانوس کو کھنگال ڈالتا ہوں۔ جب میں اپنا سر کھُجانے لگتا ہوں تو بجلی چمکنے لگتی ہے اور جب میں خراٹے لیتا ہوں تو بادل گرجنے لگتا ہے۔ جب مجھے سردی لگتی ہے تو خلیج میکسیکو کے پانی کو اپنے پیٹ سے گرم کر کے اس میں نہانے لگتا ہوں، اور جب مجھے گرمی لگتی ہے تو خطِ استوا کے طوفان سے پنکھا جھلتا ہوں، جب پیاس سے میرا حلق خشک ہونے لگتا ہے تو کسی بادل کو اسپنج کی طرح چوس کر خشک کر ڈالتا ہوں، اور جب کھانے کی تلاش میں زمین پر چلتا ہوں تو قحط میرے پیچھے پیچھے آتا ہے۔ کھو۔ کھو۔ کھو۔ اپنی اپنی گردنیں جھکاؤ اور دراز ہو جاؤ۔ میں آفتاب کے چہرے کو اپنے ہاتھ سے ڈھک لیتا ہوں . . . . جس سے تمام روئے زمین پر رات ہو جاتی ہے۔ جب میں چاند کا ایک ٹکڑا تراش لیتا ہوں تو موسم جلد جلد تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ جب میں خود کو جنبش دیتا ہوں تو پہاڑ ٹوٹ ٹوٹ کر بکھرنے لگتے ہیں۔ اپنی آنکھوں پر چہرا ڈھک کر مجھے آڑ سے دیکھو اپنی بے پردہ آنکھوں سے میرے غضبناک چہرہ کو دیکھنے کی جرأت نہ کرو۔ بس وہ انسان ہوں جس کا دل پتھر کی طرح سخت ہے۔ میری آنتیں سخت فولادی ہیں جب میرے پاس کچھ کام نہیں ہوتا تو دل بہلانے کے لئے اِن آبادیوں میں قتل عام کرتا ہوں جو دور دراز تنہائی میں واقع ہیں۔ قوموں کو تاخت و تاراج کر دینا میری زندگی کا ایک سنجیدہ ترین مشغلہ ہے۔ امریکہ کے صحرائے اعظم کی بیکراں وسعتیں میری محصور ملکیت میں داخل ہیں۔ میں اپنے مُردوں کو اپنے ہی گھر کے احاطے میں دفن کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ پھر اچھلا

اور اس نے تین مرتبہ اپنی ایڑیاں ٹکرائیں اس کی آنکھوں کو خوشی سے چمکتا دیکھ کر لوگوں نے بھی تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا۔ اور جیسے ہی وہ اچھل کر گرا اس نے ایک چیخ ماری۔ کھو۔ کھو۔ کھو۔ کھو اپنی گردنیں جھکاؤ اور لیٹ جاؤ کیونکہ مصیبت سر اٹھائے چلی آرہی ہے پھر وہ اپنا جسم پھیلائے غصے میں پھنکارتا اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔

اب پہلا شخص جسکو 'باب' کہتے تھے آیا اور اِدھر دوسرا شخص جسکو چائلڈ آف کیلیمٹی کہتے تھے پھر آدھمکا۔ اس کا قد و قامت پہلے سے کہیں زیادہ گیم و گیم معلوم ہوتا تھا۔ دونوں شخص جسم پھلا پھلا کر ایک دوسرے کے گرد چکر لگانے اور اپنی اپنی مٹھیاں ایک دوسرے کے چہرے کی طرف تاننے لگے ان کی سانسیں پھول رہی تھیں اور وہ تبائلیوں کی طرح ایک دوسرے کو پھنکارنے اور چلّانے لگے۔ تب باب نے چائلڈ کو گالیاں دیں۔ جواب میں چائلڈ نے بھی باب کو گالیاں دیں۔ پھر باب نے ڈھیروں سخت الفاظ کہہ ڈالے اور جواب میں چائلڈ نے بھی باب کو خراب سے خراب لب ولہجہ میں جواب دیا۔ بعد ازاں باب نے چائلڈ کی ہیٹ کو دھکا دے کر پھینک دیا۔ چائلڈ نے اسے اٹھا لیا اور باب کے خیتے وار ہیٹ کو ٹھکرا کر چھ فٹ دور پھینک دیا۔ باب دوڑ کر ہیٹ اٹھا لایا اور بولا" اچھا کوئی مضائقہ نہیں۔ ابھی لڑائی کا خاتمہ تو نہیں ہوا۔ میں تو اس قسم کا انسان ہوں جو کبھی کوئی بات بھولتا نہیں اور نہ کبھی کسی کو بخشتا ہے۔ اسلئے بہتر ہے کہ چائلڈ کہ میدان سے ہٹ جاؤ۔ نہیں تو تمہیں اپنی پوری طاقت سے باب کا مقابلہ کرنا پڑے گا۔ یہ بات اتنی ہی یقینی ہے جتنا کہ میرا وجود" چائلڈ نے جواب دیا کہ وہ پہلے سے تیار ہے اور وہ باب کو ایسا سبق سکھائے گا کہ پھر کبھی وہ اسکے راستے میں نہیں آئے گا وہ جب تک باب کے خون سے ہاتھ نہیں دھوئے گا اسکو چین نہیں لے گا۔ اس کی ذات بڑی خونخوار ہے۔ وہ تو باب کو صرف اس کے بال بچوں کے خیال سے چھوڑے دے رہا تھا (بشرطیکہ اس کے بال بچے ہوں)

دونوں حریف غرّاتے۔ سر ہلاتے اور غالباً اپنی آئندہ کارروائی کے متعلق سوچتے ہوئے مختلف سمتوں میں چل دیئے۔ اتنے میں ایک سیاہ گل مچھوں والا نوجوان اچھل کر کھڑا ہوگیا اور بولا" لوٹ آؤ بزدلو۔ میں تم دونوں کی مرمت کروں گا اور واقعی اس شخص نے ان دونوں کی بری طرح خبر لی۔

اس نے زبردستی انھیں اپنی طرف کھینچ لیا، ادھر اُدھر جھٹکے دیئے، جوتے سے ٹھوکریں لگائیں اور پھر اتنے زور سے انھیں مار گرایا کہ وہ اٹھنے کے قابل ہی نہ رہے۔ دو ہی منٹ بعد یہ لوگ کتوں کی طرح اس کے سامنے گڑگڑانے لگے۔ اب اور لوگ بھی زور... زور سے چلانے اور ہنسنے لگے۔ لوگ برابر دونوں ہاتھوں سے تالیاں بجا رہے تھے اور چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے "ادھر آ بے! مُردہ خور! لعنت ہے اس چانلڈ پر۔ اور اے پستہ قد ڈیوی یہ تمہیں محض ڈرا رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک بڑا ہنگامہ رہا۔ جس وقت باب اور چانلڈ آمنے سامنے آئے تو ان کی ناکیں سرخ اور آنکھیں سیاہ ہو رہی تھیں۔ پستہ قد ڈیوی نے ان سے تسلیم کرالیا کہ وہ لوگ چڑ چڑے قنوطیے اور انتہائی درجے کے بزدل ہیں۔ اور وہ کتے کے ساتھ کھانا کھانے یا حبشی کے ساتھ شراب پینے کے قابل بھی نہیں ہیں۔ تب چانلڈ اور باب دونوں نے بڑی متانت سے مصافحہ کیا، اور کہا کہ وہ دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کا احترام کرتے رہیں گے اور معاملے کو رفع دفع کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس کے بعد انھوں نے دریائی پانی سے منہ دھویا۔ عین اسی وقت سب لوگوں کو حکم ملا کہ دریا پار کرنے کو تیار رہیں۔ کچھ لوگ چپو سنبھالنے کے لئے آگے بڑھ گئے اور باقی لوگ چپو کے پیچھے اپنی اپنی ڈیوٹی پر چلے گئے۔

میں خاموشی سے لیٹا رہا اور پندرہ منٹ انتظار کرتا رہا۔ میں نے اس حقّہ کا جو لوگ وہاں چھوڑ گئے تھے کش لیا۔ جب دریا کے عبور کرنے کا حکم ختم ہو گیا تو وہ لوگ جا جا کر قدم رکھتے ہوئے پیچھے ہٹے اور پھر گپ شپ ہونے لگی شراب کا دور چلنے لگا اور گانا شروع ہو گیا۔

انھوں نے ایک سارنگی نکالی اور ایک شخص اُسے بجانے لگا اور دوسرا ناچنے لگا۔ باقی لوگوں نے ایک پرانے فیشن کا ملاحوں کا ناچ شروع کیا۔ مگر یہ سلسلہ بہت دیر جاری نہ رہا کیونکہ وہ لوگ تھک چکے تھے، اسلئے وہ رفتہ رفتہ پھر صراحی کے گرد جا بیٹھے۔

پھر انھوں نے فرطِ مسرت سے یہ گیت گانا شروع کیا:-

"مجھے پسند ہے بانکپن کی زندگی بے حد"

یہ گانا سب لوگوں نے ایک ساتھ مل کر گایا۔ پھر وہ سوروں کی مختلف قسموں اور انکی مختلف عادات کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ اسکے بعد ان کے تذکرے کا موضوع مستورات اور انکے مختلف طور طریقے ہو گیا۔ پھر انھوں نے یہ ذکر چھیڑ دیا کہ اگر کسی مکان میں آگ لگ جائے

تو اس کو کس طرح بجھایا جا سکتا ہے۔ پھر یہ گفتگو ہونے لگی کہ قبائلیوں کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ بادشاہ کا کیا فرض ہے۔ اس کو کتنی آمدنی ہوتی ہے۔ یہ بھی ذکر چھڑا کہ بلیوں کو کس طرح لڑایا جاتا ہے یا یہ کہ جب کسی آدمی کو دورے پڑنے لگیں تو کیا کرنا چاہیئے۔ پھر وہ صاف پانی اور گدلے پانی والے دریاؤں کے فرق کا ذکر کرنے لگے۔ جس شخص کو یہ لوگ ایڈ کے نام سے پکارتے تھے اسکا بیان تھا کہ دریائے اوہائیو کے صاف ستھرے پانی کے مقابلے میں مسیسپی کا گدلا پانی زیادہ فائدہ مند ہے۔ اس نے بتایا کہ اگر مسیسپی کا زرد پانی ایک پینٹ لے کر اس کو رکھ کر نتھار لیا جائے تو دریا کی حالت کے بموجب اس پانی کی تہہ میں نصف یا ایک تہائی انچ موٹی مٹی کی تہہ جم جائے گی۔ مگر ایسا نتھرا ہوا پانی اوہائیو کے پانی سے کسی طرح بھی بہتر نہ ہوگا آپ کو تو یہ کرنا چاہیئے کہ پانی کو متحرک رکھیئے اور جب دریا کی سطح نیچی ہو تو اس کی مٹی کو ہتھیلی پر رکھکر اس کو پانی میں گھول کر گاڑھا گاڑھا مرکب پی جایئے۔

جانلڈ نے اس بات کی تصدیق کی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس مٹی میں غذائیت ہوتی ہے اور جو شخص مسیسپی کا پانی پیتا رہے گا وہ اگر چاہے تو اپنے معدہ میں غلہ بھی اگا سکتا ہے اس نے کہا:۔ ذرا ان قبرستانوں کو دیکھیئے۔ ان سے اس امر کی تصدیق ہو جائے گی دیکھیئے سِن سناٹی کے قبرستان میں جو درخت اگتے ہیں ان کی قیمت وہاں کے کنکر پتھروں سے زیادہ نہیں ہوتی مگر سینٹ لوئی کے قبرستان میں جو درخت پیدا ہوتے ہیں ان کی اونچائی آٹھ سو فٹ تک جاتی ہے کیونکہ قبروں میں دفن کئے جانے سے پہلے وہاں کے لوگ جو پانی پیتے ہیں اس میں دریائے مسیسپی کی کیچڑ ہوتی ہے جس کی بدولت وہاں کے درختوں کی نشوونما اتنی اچھی ہوتی ہے جبکہ سِن سناٹی کے قبرستان میں جن لوگوں کی لاشیں دفن کی جاتی ہیں انھوں نے مسیسپی کی کیچڑ والا پانی نہیں پیا ہوتا جس کی وجہ سے ان کے معدوں میں وہ زرخیز مٹی نہیں ہو پہنچتی۔

بعدازاں ان لوگوں میں یہ گفتگو بھی چھڑی کہ اوہائیو کا پانی مسیسپی کے پانی سے ملنا پسند کیوں نہیں کرتا۔ ایڈ نے بتایا کہ چڑھاؤ کی حالت میں اگر آپ مسیسپی کو دیکھیں جبکہ اوہائیو کے پانی کی سطح نیچی ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ مسیسپی کے مشرق میں سو میل یا اس سے زیادہ فاصلہ تک ایک چوڑی پٹی صاف پانی کی چلی جارہی ہے لیکن یوں ہی اس پٹی کو چھوڑا ئی

ہیں صرف چوتھائی میل پار کرکے آپ آگے بڑھتے ہیں تو آپ کو ادھر ساحل تک بد بو دار گدلا اور زرد پانی ملتا ہے۔ پھر ان لوگوں میں یہ ذکر چھڑ گیا کہ تمباکو کو خراب ہونے سے کیسے بچایا جائے۔ بعد ازاں وہ بھوتوں کے متعلق باتیں کرنے لگے اور دوسرے لوگوں کی دیکھی ہوئی وارداتیں بیان کرنے لگے۔ تب ایڈ نے کہا: "تم لوگ خود اپنی آنکھوں دیکھی باتوں کا ذکر کیوں نہیں کرتے۔ اچھا اب میں کچھ کہوں گا:۔

پانچ سال کا عرصہ ہوا کہ میں ایک بیڑے پر جو اس بیڑے جتنا ہی بڑا تھا سفر کر رہا تھا۔ اس وقت آج جیسی ہی چاندنی رات تھی۔ میں کشتی چلا رہا تھا اور میرے ساتھ میرا ایک ساتھی بھی تھا جس کا نام ڈِک آل برائٹ تھا وہ میرے پاس کشتی میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ جمائیاں لینے اور ہاتھ پیر پھیلانے لگا۔ پھر بیڑے کے کنارے سے اس نے اپنا سر لٹکایا اور دریا کے پانی سے منہ دھویا اور پھر میرے پاس آکر بیٹھ گیا اور اپنا پائپ نکالا اس میں تمباکو بھرا اور اوپر دیکھ کر کہنے لگا "ذرا دیکھنا تو کیا سامنے والے موڑ پر بک ملر کا مکان ہے۔؟" میں نے جواب دیا "ہاں۔ ہے تو۔ لیکن کیوں؟ کیا بات ہے؟"۔ اس نے پائپ ہاتھ سے رکھ دیا اور سر جھکا کر کہنے لگا۔ "میرا خیال تھا کہ ہم آگے نکل چکے ہیں" میں نے کہا "جب میں ڈیوٹی سے ہٹا تھا تو میرا بھی ایسا ہی خیال تھا کہ ہم چھ گھنٹے ٹھہرے رہے ہیں۔ چھ گھنٹے کی چھٹی رہی۔ ملازمین نے مجھے بتایا کہ بیڑا پچھلے ایک گھنٹے سے چل نہیں رہا ہے حالانکہ اب وہ دھیرے دھیرے ٹھیک چل رہا ہے" اس پر اس نے کراہتے ہوئے کہا:" میں نے اس سے پیشتر بھی ایک بیڑے کو اس طرح چلتے دیکھا ہے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے دو سال میں اس موڑ کے میرے پر دریا نے اپنا رُخ بدلا ہے۔" اس کی بات ابھی ختم نہ ہو پائی تھی کہ اس نے دو تین بار اٹھ کر دور تک نظر دوڑائی اور دریا کے پانی کو چاروں طرف دیکھا۔ میں یہ دیکھ کر چونک اٹھا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ وہ وہی کام کرنے لگتا ہے جو وہ دوسروں کو کرتے دیکھتا ہے خواہ ایسا کرنا بے معنی ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ بس بھی پانی کی طرف دیکھنے لگا اور تھوڑی ہی دیر میں میں نے کوئی کالی سی چیز پانی پر تیرتی دیکھی جو دائیں طرف سے آکر ہمارے پیچھے رک گئی۔ ڈِک بھی یہ کیفیت دیکھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا "یہ کیا چیز ہو سکتی ہے؟" اس نے جواب دیا "دیکھو نا خوشگوار سی ۔۔۔ ارے۔ کوئی پرانا خالی پیپا ہوگا" اس کے علاوہ اور کچھ

نہیں ہوسکتا۔" میں نے کہا " خالی پیپا! غالباً دوربین لگاکر تو تم اور بھی احمق بن جاتے ہو۔ تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ ایک خالی پیپا ہے۔؟" اس نے کہا مجھے نہیں معلوم ہے میرا بھی خیال تھا کہ یہ پیپا نہیں ہوسکتا پھر بھی میں نے سوچا شاید ایسا ہی ہو" میں نے کہا " ہاں۔ یہ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہوسکتا۔ کوئی شخص بھی اتنے فاصلہ سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا چیز ہوسکتی ہے۔" بہر حال ہم سوا اس کے کہ اس چیز کو غور سے دیکھتے رہیں اور کر بھی کیا سکتے تھے اور ایسا ہی ہم نے کیا۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا " دیکھو ڈِک آل برائٹ وہ چیز رفتہ رفتہ ہماری طرف آرہی ہے ایسا میرا خیال ہے۔" اس کے بعد اس نے کچھ نہ کہا۔ وہ چیز اور آگے بڑھتی ہی چلی آرہی تھی۔ اب میں نے یہ خیال کیا کہ یہ کوئی کتا ہے جو تھک کر چور ہوگیا ہے۔ ہم موڑ سے گذر کر نیچے کی طرف آئے اور وہ چیز بھی چاند کی روشنی کی رو پہلی لکیر کے درمیان تیرتی ہوئی ہمارے مقابل آگئی اور جارج کی قسم یہ تو ایک پیپا ہی نکلا۔

میں نے پھر کہا " ڈِک آل برائٹ جب یہ چیز یہاں سے نصف میل کے فاصلے پر تھی تو تم نے کیسے بتادیا تھا کہ یہ ایک پیپا ہے۔؟"

اس نے کہا " مجھے کچھ نہیں معلوم۔"

میں نے کہا۔ ڈِک تمہیں بتانا ہی پڑے گا۔"

پھر وہ بولا " مجھے معلوم تھا کہ یہ ایک پیپا ہے۔ میں نے اسے پہلے بھی دیکھا تھا اور نہ جانے یہ کتنے اور اشخاص کی نظروں سے گذر چکا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ یہ پیپا آسیب زدہ ہے۔"

میں نے دوسرے لوگوں کو جو ڈیوٹی پر تھے بلایا۔ وہ وہاں آئے اور کھڑے ہوگئے ڈِک نے جو کچھ مجھ سے کہا تھا وہ میں نے انھیں بتادیا۔ اب وہ پیپا تیر کر آگے بڑھ آیا تھا۔ اس وقت یہ ہم سے بیس فٹ کی دوری پر ہوگا کچھ لوگوں نے چاہا کہ اس کو پکڑ کر کشتی میں رکھ لیں مگر دوسروں کو یہ بات پسند نہ آئی ڈِک آل برائٹ نے بتایا جو کشتیاں اس پیپے کے قریب گئیں انھیں بدقسمتی کا شکار ہونا پڑا اور ان پر کوئی نہ کوئی مصیبت نازل ہوئی۔ ہمارے کپتان نے کہا کہ انھیں ان باتوں پر بالکل یقین نہیں۔ اس نے کہا کہ پیپا ہماری طرف اس

لئے بڑھا چلا آرہا تھا کیونکہ وہ تیز بہاؤ کی رفتار کی زد میں تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ کچھ دیر بعد یہ پیپا ہم سے آگے بڑھ جائے گا۔"

اس کے بعد ہم لوگوں میں دوسرے مسائل پر باتیں چھڑ گئیں۔ ہم نے ایک گیت گایا اور ہم ناچتے رہے۔ کپتان نے ایک اور گانے کی فرمائش کی لیکن اب طبیعت ابرآلودہ ہو چکا تھا۔ اور وہ پیپا وہیں آکر رک گیا تھا۔ اسی وجہ سے ہمارے گانے میں کوئی گرمجوشی پیدا نہیں ہوئی۔ لوگوں نے تالیاں بھی نہیں بجائیں۔ سامعین پر ایک قسم کی خاموشی چھا گئی۔ ایک منٹ تو کوئی نہیں بولا۔ اس کے بعد ہر شخص باتوں میں مشغول ہو گیا۔ ایک نوجوان نے دل لگی کے لئے ایک شوشہ چھوڑا۔ مگر یہ مذاق بے سود رہا۔ اس پر بھی کسی کو ہنسی نہ آئی۔ جس لڑکے نے مذاق کیا تھا وہ بھی نہیں ہنسا۔ اور یہ بات خلافِ معمول تھی۔ ہم سب افسردہ دل بیٹھے ہوئے تھے اور پیپے کی طرف نگاہ لگائے ہوئے تھے کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ اس وقت ہمیں بڑی بے چینی ہو رہی تھی۔ ایک عجب اضطراب کا عالم تھا۔ اس کے بعد تاریکی چھانے لگی اور ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ پھر ہوا سرد آہیں بھرنے لگی اور بجلی چمکنے لگی۔ بادلوں نے گڑگڑانا شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں باقاعدہ طوفان آگیا۔ اسی طوفان میں پھنس کر ایک آدمی جو عرشے پر دوڑ رہا تھا لڑکھڑا کر گر پڑا، اس کے ٹخنے میں چوٹ آگئی اور اسے بستر سنبھالنا پڑا۔

یہ نظارہ دیکھ کر لوگ زمین سر ہلانے لگے۔ جب بجلی چمکتی تو وہ پیپا نظر آنے لگتا اور اس کے چاروں طرف سے نیلے رنگ کی روشنی جھلکنے لگتی۔ ہم لوگ برابر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ لیکن دھیرے دھیرے صبح ہونے تک وہ پیپا غائب ہو گیا۔ دن نکلنے پر وہ پیپا پھر ہم کو کہیں نظر نہیں آیا اور اس کا ہمیں کوئی افسوس بھی نہیں ہوا۔

لیکن دوسرے روز جب رات کے ۹ بجے خوب گانا بجانا ہو رہا تھا، ہنسی مذاق جاری تھا اور خوب رنگ رلیاں منائی جا رہی تھیں تو وہ پیپا پھر آن موجود ہوا اور کشتی کی جانب اپنے پرانے اڈے پر آکر رک گیا۔ فوراً ہنسی مذاق رک گیا اور ہر شخص سنجیدہ ہو گیا۔ کوئی کسی سے بول نہیں رہا تھا اور نہ کوئی کسی سے کام کے لئے کہہ رہا تھا سوا اس کے کہ خاموش بیٹھے رہو اور پیپے کی طرف دیکھتے رہو اسی وقت بادل پھر منڈلانا شروع ہو گئے۔

جب ملاحوں کی ڈیوٹی بدلی تو جن کو چھٹی ملی تھی وہ بھی وہیں رُکے رہے۔ پہلے کی طرح طوفان نے آج پھر زور پکڑ لیا رات بھر بادل گرجتے رہے۔ اسی عالم میں آج ایک شخص اور گر پڑا۔ اس کا بھی ٹخنہ ٹوٹ گیا اور وہ وہیں دراز ہو گیا۔ دن نکلتے نکلتے وہ پیپا پھر وہاں سے چلا گیا اور کسی نے اس کو جاتے نہیں دیکھا۔

تمام دن ہر شخص متین و سنجیدہ بنا بیٹھا رہا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی سنجیدگی شراب کے خمار کے اُتار والی سنجیدگی تھی۔ یہ لوگ معمول سے زیادہ شراب پئے ہوئے تھے اور پھر بھی بالکل خاموش تھے البتہ آج انھوں نے ایک ساتھ پینے کا شغل نہیں کیا تھا۔ ہر شخص نے الگ الگ جاکر چوری سے پی تھی۔

اندھیرا ہونے پر جن لوگوں کی ڈیوٹی ختم ہوئی وہ بھی وہیں رُکے رہے نہ کسی نے گانا گایا۔ اور نہ کوئی بات چیت کی۔ چھوکرے بھی اِدھر اُدھر منتشر نہیں ہوئے وہ سب ایک جگہ اکٹھے ہو گئے اور دو گھنٹے تک بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ یہ لوگ سب ایک ہی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتے رہے۔ کبھی کبھی وہ ایک سرد آہ بھر لیتے تھے۔ اتنے ہی میں انھوں نے دیکھا کہ وہ پیپا پھر دوبارہ موجود ہے۔ وہ اپنی اُسی پرانی جگہ پر آکر رک گیا اور رات بھر وہیں ٹھہرا رہا۔ اب وہاں کوئی اسے دیکھنے نہیں آیا۔ آدھی رات کے بعد طوفان پھر آیا۔ اُسوقت بڑی خوفناک تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ موسلا دھار پانی برسنے لگا' اولے بھی گرنے لگے۔ بادل بڑے زور سے گرج رہے تھے' طوفانی ہوا چل رہی تھی بجلی کی کڑک اور چمک دُور دُور تک پھیل جاتی تھی اور اس روشنی میں بیڑا اتنا ہی صاف نظر آتا تھا جتنا دن میں۔ دریا کا پانی بھی تاحدِّ نظر دودھ جیسا سفید نظر آرہا تھا۔ دریا میں موجیں بڑے زور شور سے اٹھ رہی تھیں اس عالم میں وہ پیپا جُوں کا تُوں ڈگمگاتا رہا۔ کپتان صاحب نے حکم دیا کہ دریا کو پار کرنے کے لئے ملّاح چپّو پر جائیں۔ مگر کوئی شخص ڈیوٹی پر جانے کو تیار نہیں تھا کوئی بھی کشتی کے عقبی حصّے کی طرف قدم بڑھانے پر آمادہ نہ تھا۔ لوگوں نے کہا کہ اب اُن میں سے کوئی اور اپنا ٹخنہ تڑوانے کے لئے تیار نہیں۔ اتنے ہی میں بجلی کی کڑک سے آسمان پھٹا اور بجلی گرنے سے دو پہرہ دار ہلاک ہو گئے اور دو آدمی لنجے ہو گئے کیونکہ اُن کے ٹخنے ٹوٹ چکے تھے۔ ا---

دن نکلنے کے قریب جبکہ ابھی اندھیرا ہی تھا تو وہ پیپا پھر وہاں سے غائب ہو گیا۔ اس روز

کسی نے صبح کا ناشتہ بھی نہیں کیا۔ یہ لوگ دو دو تین تین کے گروہ میں بیٹھ کر آپس میں گپیں لڑانے لگے۔
لیکن ڈِک آل برائٹ کے پاس کوئی نہیں بیٹھا۔ اس سے ہاتھ بھی بڑی سرد مہری کے ساتھ ملائے گئے۔
اگر آل برائٹ کسی ایسی جگہ جاتا جہاں لوگ بیٹھے ہوتے تو اُسے دیکھ کر وہ لوگ تتر بتر ہو جاتے اور
اِدھر اُدھر کھسک جاتے۔ وہ اس کے ساتھ چپّو چلانے کے کام میں بھی شریک نہیں ہونا چاہتے تھے۔
کپتان صاحب نے تمام چھوٹی چھوٹی کشتیوں کو بیڑے کے پاس لاکر اس جگہ اکٹھا کر لیا، جہاں اُن
کا خیمہ لگا ہوا تھا۔ جو لوگ مر جاتے تھے ان کی لاشوں کو وہ دریا کے کنارے دفنانے کی اجازت
نہیں دیتا تھا۔ اس کا یہ اعتقاد نہیں تھا کہ جب آدمی کی لاش کو دریا کے کنارے لیجایا جائے گا وہ پھر
واپس آجائے گا اور اس کا یہ خیال ٹھیک بھی تھا۔

جب رات ہوئی تو یہ واضح تھا کہ اگر وہ پیپا پھر آگیا تو کوئی نہ کوئی آفت ضرور آئے گی۔ لوگوں
کے درمیان آہستہ آہستہ اسی قسم کی گفتگو جاری تھی۔ بہت سے لوگ تو ڈِک آل برائٹ کو قتل کر دینے
پر تُلے ہوئے تھے کیونکہ اس نے اپنے دوسرے سفروں میں بھی اس پیپے کو دیکھا تھا اور اس وجہ سے
وہ خود دیکھنے میں بڑا کریہہ الصورت لگتا تھا۔ بعض لوگوں کی یہ رائے تھی کہ ڈِک کو دریا کے ساحل
پر کہیں اُتار دیا جائے اور کچھ لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ اگر وہ پیپا پھر آجائے تو ہم سب کو ایک ساتھ ساحل
پر اتر جانا چاہیئے۔

اس طرح کی سرگوشیاں ابھی چل ہی رہی تھیں کہ لوگوں کو پیپے کے تجسس نے انھیں پہلے ہی
عرشے پر اکٹھا کر دیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ وہ پیپا پھر اس طرح بہتا ہوا چلا آرہا ہے آہستہ آہستہ مگر بغیر رُکے
یہ ادھر ہی آرہا تھا۔ اپنی پرانی جگہ پر آکر وہ رک گیا اس وقت ایسا سنّاٹا چھایا ہوا تھا کہ سوئی کے گرنے
کی آواز بھی سنائی دے سکتی تھی۔ اس کے بعد کپتان آیا اور کہنے لگا "لڑکو! دیکھو بچپنے سے کام نہ
لینا اور حماقت نہ کر بیٹھنا۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ پیپا ہمارے ساتھ آرلنز تک بہتا جائے اور تم بھی
یہ نہیں چاہتے تو پھر اس کے روکنے کی سب سے اچھی تدبیر کیا ہے۔ اس کی تو بس ایک ہی ترکیب ہے
اور وہ یہ کہ اُسے جلا دیا جائے۔ میں اُسے کھینچ کر کشتی پہ لئے آتا ہوں اور پیشتر اس کے کہ کوئی اور
کچھ کہے وہ اسے لانے چلا گیا۔

کپتان تیر کر پیپے کے پاس پہونچا۔ جب وہ اسے دھکا دیکر بیڑے کی طرف لا رہا تھا تو سب

لوگ ایک طرف کو ہٹ گئے۔ آخر کار اس بڈھے نے پیپے کو کشتی پر چڑھا ہی لیا۔ اس نے ڈھکن میں ایک چھید کیا تو معلوم ہوا کہ اس کے اندر ایک بچہ بند ہے یہ بچہ مادر زاد ننگا تھا۔ یہ ڈک آل برائٹ کا ہی بچہ تھا اور اس نے اسے تسلیم کر لیا۔

ڈک نے بچے کی جانب جھکتے ہوئے کہا " ہاں ہاں یہ میرا ہی لختِ جگر ہے جو اب اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔ یہ میرا گمشدہ بچہ ہے چارلس ولیم آل برائٹ جو مر چکا ہے دراصل ڈک آل برائٹ بڑا جھوٹا شخص تھا جو ڈرانے کے لئے سخت سے سخت الفاظ استعمال کرتا تھا اور برابر بغیر رکے بولتا رہتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ تاسف کا اظہار کرتے ہوئے سچ سچ کہہ رہا تھا " میں یہیں دریا کے موڑ کے قریب ہی رہتا تھا۔ ایک رات کو میں نے اپنے روتے ہوئے بچے کا گلا گھونٹ دیا" گو اس نے یہ بھی کہا کہ اس کا بچے کو مارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر یہ بات غلط معلوم ہوتی ہے۔ بالآخر اس پر دہشت طاری ہو گئی اور اس نے اپنی بیوی کے گھر پہونچنے سے قبل ہی بچے کو ایک پیپے میں بند کر کے اِسے دریا میں پھینک دیا اور خود شمالی راستے سے ہو کر وہاں جا پہونچا جہاں یہ بیڑا لنگر انداز تھا اور اس بیڑے پر سفر کرنے لگا۔ اس واقعہ کو تیسرا سال ہو گیا۔ تب سے وہ پیپا برابر اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کی بدقسمتی ہمیشہ دھیرے دھیرے آتی ہے اور اس وقت تک جاری رہتی جب تک چار آدمیوں کی جان نہ چلی جائے۔ اس کے بعد پیپا ادھر نہیں آتا۔ اس نے بتایا کہ اگر لوگ ایک رات اور اس پیپے کو برداشت کرتے جیسا کہ ہونے جا رہا تھا تو مصیبت ختم ہو جاتی۔ مگر لوگ بالکل اُکتا چکے تھے۔ انھوں نے طے کر لیا تھا کہ ڈک کو ایک کشتی میں زبردستی ساحل پر لے جا کر اُسے قتل کر دیں لیکن اس نے دفعتاً جھپٹا مار کر ننھے بچے کو چھین لیا اور اس کو سینے سے چمٹائے اور آنسو بہاتے ہوئے دریا میں چھلانگ ماردی پھر ہم نے اُسے کبھی نہیں دیکھا۔ نہ اس مصیبت زدہ ڈک کو اور نہ اس کے بچے چارلس ولیم کو۔

'باب' نے دریافت کیا " آنسو کس کی آنکھ سے بہہ رہے تھے، ڈک آل برائٹ کی آنکھ سے یا بچے کی آنکھ سے "

اس پر ایڈ نے کہا " ڈک آل برائٹ کی آنکھ سے۔ کیا میں نے تمہیں ابھی یہ نہیں بتایا کہ

بچہ تین سال پہلے مر چکا تھا پھر بچے کے رونے اور آنسو بہانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔
اس پر ڈیوی نے دریافت کیا "اگر وہ رو نہیں سکتا تھا تو اتنے دنوں اس کی لاش پیپے کے اندر کیسے رہ سکتی تھی؟ مجھے اس بات کا جواب دو۔؟"
ایڈ بولا۔ مجھے اس کی کچھ خبر نہیں کہ وہ اتنے دنوں کیسے رہی۔ بہر حال وہ کسی نہ کسی صورت سے رہی۔ میں تو بس اتنا ہی جانتا ہوں "
چائلڈ نے پوچھا۔ پھر اس پیپے کا لوگوں نے کیا کیا؟ جواب ملا کہ ان لوگوں نے اسے کشتی سے نیچے دریا میں پھینک دیا اور وہ ایک سیسے کے ڈلے کی مانند فوراً پانی میں غرق ہو گیا۔
ایک شخص نے سوال کیا "ایڈ، یہ بتاؤ کہ کیا واقعی یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس بچے کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا" ایک دوسرے شخص نے پوچھا "کیا اس بچے کے بال منڈے ہوئے تھے" اور بل نامی ایک اور شخص نے پوچھا۔ اس پیپے پر کیا تجارتی نشان بنا تھا۔
اور جمی نے پوچھا "ایڈمنڈ۔ یہ بتاؤ کہ کیا تمہارے پاس اس واقعے سے متعلق کوئی کاغذات ہیں" پھر ڈیوی بولا "ایڈون صاحب، یہ تو بتا دیجئے کہ کیا آپ ان دو آدمیوں میں سے ایک ہیں جو بجلی سے ہلاک ہوئے تھے۔؟" باب بولا "ایک نہیں۔ اسے دونوں ہی سمجھئے" اس پر سب لوگ ہنس پڑے۔ چائلڈ نے پوچھا "ایڈورڈ، کیا تم یہ محسوس نہیں کرتے کہ تمہیں دوا کی ایک گولی کھانی چاہیئے۔ تمہاری طبیعت خراب معلوم ہوتی ہے۔ کیا تمہیں محسوس نہیں ہوتا کہ تم زرد پڑ گئے ہو۔؟"
جمی بولا "آؤ اٹھ کر چلو اور ہمیں دکھاؤ کہ تمہارے پاس اس پیپے کی کوئی نشانی موجود ہے یا نہیں۔ ہمیں وہ ڈاٹ والا سوراخ دکھاؤ تب ہمیں تمھاری ساری باتوں پر یقین آجائیگا۔"
اس پر بل نے مزید کہا کہ آؤ لڑکو ہم لوگ ٹولیوں میں بٹ جائیں ہم لوگ تیرہ آدمی ہیں۔ اگر سب تیار ہوں تو میں اپنا تیرھواں حصہ بخوشی انجام دے سکتا ہوں "
ایڈ پھر اکرا اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے کہا "جاؤ جنگلوں میں چلے جاؤ۔ وہاں تمہارے لئے میں نے جنگلات کو صاف کر کے رہنے کے قابل جگہ بنادی ہے اور تب وہ اپنے آپ کو کوستا اور برا بھلا کہتا ہوا وہاں سے چل دیا۔ لوگ اسکے پیچھے چلاتے اور اس کا مذاق اڑانے لگے اور اتنی

زور زور سے چلانے کے اُن کی آواز ایک میل سے سنائی دے سکتی تھی۔

بعد ازاں چاٹنڈے نے سب سے کہا " آؤ لڑکو۔ ایک تربوز توڑیں اور اندھیرے میں چیزیں ٹٹولتا ہوا وہ ان لنگروں پتھروں کے پاس آیا جہاں میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے میرے جسم پر اپنا ہاتھ رکھا۔ میرا جسم اسوقت گرم اور ملائم تھا اور میں ننگا بھی تھا۔ مجھے چھوتے ہی وہ چونک کر بولا " ارے " اور ایکدم پیچھے ہٹ گیا۔ پھر بولا " لڑکو ایک لالٹین یا کوئی جلتی لکڑی لے آؤ۔ یہاں لنگر کے برابر ایک سانپ معلوم ہوتا ہے

اس کی بات سنتے ہی لوگ لالٹین لے کر دوڑ پڑے اور اکٹھے ہو کر میری طرف دیکھنے لگے۔ ایک شخص بول اٹھا " بھک مٹگے۔ باہر نکل آ ... دوسرے نے پوچھا " تم کون ہو؟ تیسرے نے پوچھا " تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ فوراً جواب دو۔ ورنہ کشتی سے باہر پھینک دیئے جاؤ گے۔ ایک اور شخص بولا " لڑکو۔ اس سانپ کو یہاں لے آؤ اس کو ایڑی سے پکڑ کر گھسیٹو "

میں نے گڑگڑانا شروع کر دیا اور تھر تھر کانپتا ہوا لوگوں کے درمیان سے کھسک کر باہر آ گیا۔ ان لوگوں نے میری جانب دیکھا۔ چاٹنڈے نے کہا " مردود چور کہیں کا۔ لوگو ذرا آگے بڑھو آؤ۔ آؤ اسے کشتی سے نیچے پھینک دیں " مگر عظیم باپ نے کہا " نہیں پھینکو مت۔ ذرا رنگ کا برتن اٹھا لاؤ اور سر سے پیر تک اسے نیلے رنگ سے رنگ دو پھر اس کو ساحل پر کہیں چھوڑ دو " سب بولے " ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ جلدی جاؤ، رنگ لے آؤ "

جب رنگ آ گیا اور باپ نے برش لے کر مجھے رنگنا چاہا تو لوگ قہقہہ لگا کر ہنسنے لگے اور اپنے اپنے ہاتھ ملنے لگے۔ میں نے چلانا شروع کر دیا جس سے ڈیوی کو رحم آ گیا۔ وہ بولا " یہ لڑکا وہاں چھپا تھا۔ ارے یہ تو غریب بلّے کی طرح بیکس ہے۔ اسے چھوڑ دو نہیں تو میں اُس آدمی کو رنگ دوں گا جو اسے چھوئے گا "

اب میں ان لوگوں کی طرف دیکھنے لگا۔ ان میں سے بعض لوگ بڑے چیں بہ چیں ہوئے اور غرانے لگے۔ باپ نے رنگ کا برتن رکھ دیا اور پھر کسی نے اُسے ہاتھ نہیں لگایا۔

اب ڈیوی نے مجھ سے کہا " آؤ۔ یہاں آگ کے پاس آ جاؤ۔ بتاؤ کہ تم یہاں کس مقصد سے آئے تھے۔ وہاں بیٹھ جاؤ اور اپنا حال بیان کرو۔ تم یہاں کشتی پر کتنی دیر سے

ہو۔ "میں نے جواب دیا" چوتھائی منٹ سے زیادہ نہیں ہوا " اس نے پوچھا " اتنی جلد تمہارا جسم خشک کیسے ہوگیا" میں نے جواب دیا " جناب مجھے اس کے متعلق کوئی علم نہیں۔ میں تو ہمیشہ سے ہی خشک رہتا ہوں۔" اس نے پوچھا " ٹھیک۔ اچھا۔ تمہارا نام کیا ہے ؟ میں اپنا نام بتانے کے لئے تیار نہ تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیا کہوں کیا نہ کہوں۔ بالآخر میں بولا "جناب میرا نام چارلس ولیم آل برائٹ ہے۔"

اس پر سب لوگ قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ میں بھی بہت خوش ہوا کیونکہ میرا خیال تھا کہ ممکن ہے کہ ان لوگوں کا مزاج ہنسنے سے ٹھیک ہو جائے۔ جب وہ ہنس چکے تو ڈیوی نے کہا " چارلس ولیم، اس سے کام نہیں چلے گا۔ پانچ سال کے اندر تم اتنے بڑے ہرگز نہیں ہو سکتے تھے جب تم پیپے سے برآمد ہوئے تھے اس وقت تو تم بالکل نونہال تھے اور مرے ہوئے تھے۔ اچھا اب تم اپنی سچی کہانی سناؤ۔ اگر تم نے جھوٹ نہ بولا تو تم کو کوئی نقصان نہیں پہونچایا جائے گا۔ اچھا بتاؤ۔ تمہارا اصلی نام کیا ہے۔؟

میں نے جواب دیا " ایلک ہاپکنس ایلک جمس ہاپکنس"

سوال ہوا " اچھا ایلک تم کہاں سے آئے ہو ؟

میں نے جواب دیا " ایک تجارتی کشتی سے جو اس موڑ کے آگے بندھی ہوئی ہے۔ میری ولادت اسی کشتی میں ہوئی تھی۔ میرے والد تمام زندگی اسی طرف کاروبار کرتے رہے اور انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تیر کر یہاں اس بیڑے پر چلا آؤں۔ کیونکہ جب آپ لوگ ادھر سے گذر رہے تھے تو میرے والد نے یہ خواہش کی تھی کہ آپ لوگوں میں سے کوئی مجھے کیرو پہونچا دے اور وہاں ایک صاحب جو کس ٹرنر سے میرا تعارف کرا دیں ۔"

" اچھا تو یہ بات ہے۔"

میں نے پھر کہا " جناب یہ سب باتیں اتنی ہی سچی ہیں جتنا کہ دنیا کا وجود۔ میرے والد کہتے تھے ...." " ہاں جتنی تمہاری دادی " اس پر وہ سب پھر ہنس پڑے۔ میں نے پھر بولنے کی کوشش کی لیکن بیچ میں ٹوک کر ان لوگوں نے مجھے روک دیا۔

اب ڈیوی صاحب بولے " دیکھو بھئی تم ڈرے ہوئے ہو اسی لئے تم بہکی بہکی باتیں کر رہے

ہو۔ اب ایمانداری کی بات کرو۔ کیا تم واقعی اس تجارتی کشتی میں رہتے تھے یا یہ سب لغو ہے۔"
میں نے کہا "ہاں جناب۔ وہ تجارتی کشتی تھی۔ وہ اس موٹر کے بیرے پر لنگر انداز ہے
البتہ میں اس کے اندر پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہ تو میرا پہلا سفر ہے۔
"اب تم ٹھیک بات کر رہے ہو۔ اچھا تم یہاں کشتی پر کس لئے آئے؟ کیا چوری کرنے کا
ارادہ تھا"
میں نے کہا "نہیں جناب میں چوری کرنے کے لئے نہیں آیا۔ میں صرف اس بیڑے پر
سواری کرنا چاہتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ لڑکوں کی یہ فطرت ہوتی ہے۔"
"ہاں ٹھیک ہے، مگر تم نے چھپنے کی کوشش کیوں کی۔"
میں نے جواب دیا "کیونکہ اکثر لوگ لڑکوں کو بھگا دیا کرتے ہیں۔"
"ہاں ٹھیک ہے۔ ایسا ہی ہوتا ہے اس خیال سے کہیں وہ کسی مسافر کی چوری نہ کرلیں
اچھا دیکھو، اگر ہم اس مرتبہ تمہیں چھوڑ دیں تو تم پھر اس طرح نہیں آؤ گے اور ان حرکتوں سے باز
رہو گے۔" میں نے کہا "جی ہاں ضرور۔ آپ مجھے آزما کر دیکھ لیں۔ اچھا تو پھر ٹھیک ہے تم ساحل
سے تھوڑی دور دریا میں کود پڑو۔ آئندہ ادھر مت آنا اور ایسی حماقت پھر مت کرنا۔ بھاگ جا
لڑکے۔ نہیں تو ملاح تیری درگت بنا دیں گے اور اتنی پٹائی کریں گے کہ تجھے چھٹی تک کا دودھ یاد
آجائے گا۔"
چنانچہ میں رخصتی سلام کئے بغیر ہی سمندر میں کود پڑا اور ساحل کی طرف تیرنے لگا اور جب
تک تم وہاں آہستہ آہستہ پہونچا اس وقت تک یہ بیڑا نگاہ سے اوجھل ہو گیا تھا۔ میں فوراً اتر کر جم
کے پاس اس کشتی پر پہونچ گیا اور گھر پہونچ کر بہت خوش ہوا۔"
اگرچہ اس لڑکے کو جو باتیں دریافت کرنا تھیں وہ اُسے معلوم نہ ہو سکیں مگر ہمیں اسکی
اس مہم کے واقعات سے اس بیڑے کے ملاحوں اور چپٹے پیندے والی کشتیوں کے پرانے ملاحوں کی زندگی
کی ایک جھلک دیکھنے کا موقع ملتا ہے اور میں یہاں یہی بتانا چاہتا تھا۔
اب مجھے دریا مسیسپی کی زندگی کے اس دور کا ذکر کرنا ہے جب اس میں دخانی کشتیوں کا
رواج عام ہو گیا تھا۔ میرے خیال سے اس کا یہ پہلو مکمل تجزیہ کا محتاج ہے۔ یعنی دخانی کشتیوں

کی حیرت انگیز سائنس پر نظر ڈالنا جس کا مظاہرہ وہاں کیا جاتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ دنیا میں اور کہیں سائنس کا ایسا حیرت انگیز کرشمہ اب تک دیکھنے کو نہیں ملا۔

چوتھا باب

لڑکپن کی اُلوالعزمی

جب میں لڑکا تھا تو دریائے مسسپی کے مغربی کنارے پر ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ وہاں میرے ہم عمر نوجوانوں کے دلوں میں ایک ہی ارمان ہمیشہ رہتا تھا اور وہ تھا دخانی کشتی کے ملّاح بننے کا۔ ہر نوجوان یہی چاہتا تھا کہ وہ دخانی کشتی کا پائلٹ بن جائے۔ میری بھی یہی خواہش تھی گو بظاہر میری اور بھی خواہشیں تھیں لیکن وہ سب محض عارضی تھیں۔

ایک مرتبہ میرے گاؤں میں ایک سرکس آیا جب وہ چلا گیا تو اس کے بعد ہمیں بھی یہ دُھن سوار ہوئی کہ ہم سب کسی سرکس میں نقّال یا جوکر بن جائیں۔

جب پہلی مرتبہ ہمارے یہاں ایک حبشی مُغنّی شاعر کا گانا ہوا تو ہم سب کے دل میں بھی یہ خیال چٹکیاں لینے لگا کہ ہم بھی اس قسم کی زندگی بسر کریں۔ نیز آتے دن ہمیں یہ توقع رہا کرتی تھی کہ اگر ہم زندہ رہے تو خدا ہم کو بحری ڈاکو بننے کا موقع عطا کرے گا۔ مگر یہ سب ارمان یکے بعد دیگرے ماند پڑنے لگے۔ فقط ایک ہی ارمان مستقل طور پر دل میں بنا رہا۔ اور وہ تھا دخانی کشتی میں ملّاح بننے کا۔

ایک روز دو سستے قسم کے چمکدار جہاز (ان میں سے ایک سنیٹ لوئی سے اوپر کی طرف سے اور دوسرا اکیوکک سے نیچے کی طرف) آتے دکھائی دیے۔ اس سے پیشتر اس دریا کے ساحل پر دخانی

جہاز دیکھنے کی امید میں دن بڑی شان سے گذرتا تھا۔ مگر ان جہازوں کی آمد سے تو وہ سب امیدیں ختم ہوگئیں اور زندگی بے کیف سی ہو کر رہ گئی۔ اس تغیر سے صرف لڑکوں کو ہی نہیں بلکہ سارے گاؤں والوں کو صدمہ ہوا۔ مگر اتنے سال گذرنے کے بعد بھی میری آنکھوں کے سامنے قدیم زمانے کی تصویر کھنچ سی جاتی ہے۔ یہ مرقع اس حالت کا ہے جو اس زمانے میں پائی جاتی تھی۔ گرمی کے موسم میں صبح کے وقت دھوپ سے چمکتی ہوئی سفید عمارتوں والے اس قصبے میں غنودگی کا عالم طاری رہتا تھا سڑکوں پر آمدورفت یا تو بالکل نہیں ہوتی تھی یا برائے نام ہوتی تھی۔ یہاں واٹر اسٹریٹ کے اسٹور کے سامنے دو ایک کلرک لکڑی کی سیٹ والی کرسیوں کو دیوار کی طرف سر جھکائے اپنی ٹھوڑی کو سینے سے ملائے اور چہرے کو ہیٹ سے ڈھکے سوتے رہتے تھے۔ اُن کے اردگرد کنکروں اور پتھروں کا ڈھیر لگا رہتا تھا جس سے ان کی کاہلی اور سستی کا پتہ لگتا تھا۔ ان کی بغل کی گلیوں میں سوار گھومتے رہتے جو تربوز کے چھلکوں اور بیجوں سے اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ دریا کے کنارے پشتے کے اِدہر اُدہر سامان کے دو تین ڈھیر لگے رہتے تھے۔ ایک گھاٹ کے نشیب پر جہاں پتھر بچھے ہوئے تھے ایسی لکڑی کے ڈھیر لگے تھے جو پشتہ بنانے کے کام آتی تھیں اس وقت شہر میں رہنے والے شرابی لوگ جنکے منہ سے شراب کا بھبکا آتا ہوتا یہاں سوتے ہوتے تھے۔ گھاٹ کے سرے پر دو تین لکڑی کے مکان بنے ہوئے تھے لیکن وہاں کوئی شخص موجود نہ تھا جو ان مکانوں سے ٹکرانے والی موجوں کے سکون آمیز بہاؤ کی آواز سنتا عظیم اور شاندار دریائے مسی سپی میں ایک ایک میل چوڑی لہریں اٹھتی تھیں۔ دریا دھوپ میں خوب چمکتا تھا اس کے دوسرے ساحل پر گھنا جنگل تھا۔ یہاں سے نظر آنے والا ایک مقام دریا کی بالائی جانب تھا اور دوسرا نیچے کی جانب۔ یہاں سے کچھ دریا کا نظارہ محدود سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہاں پر دریا اپنی وسعت بیکراں کی وجہ سے سمندر میں تبدیل ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے باوجود یہ مقام نہایت خاموش اور ویران لگتا تھا۔ ان دور دراز مقامات میں سے ایک پر کالے دھوئیں کا بادل نمودار ہوا۔ فوراً ہی ایک ٹھیلے والا حبشی جو اپنی تیز آنکھوں اور بلند آواز کے لئے بہت مشہور تھا چلا چلا کر کہنے لگا "ارے وہ اگن بوٹ آرہا ہے"۔ اس کے اس طرح چلانے سے اس وقت کا منظر کچھ سے کچھ ہو گیا۔ قصبے کے شرابیوں کو ہوش آگیا۔ کلرک جاگ اٹھے۔ اس کے بعد ٹھیلوں کی تیز کھڑکھڑاہٹ

سنائی دینے لگی۔ ہر گھر اور ہر دکان سے کچھ انسان باہر نکل آئے اور چشم زدن میں اُسی شہر میں جس میں مُردنی چھائی ہوئی تھی یکایک زندگی آ گئی۔ اس میں لوگ چلنے پھرنے لگے۔ شراب کے ٹھیلے۔ چھکڑے۔ آدمی لڑکے مختلف جگہوں سے نکل نکل کر ایک عام مرکز کی طرف یعنی گھاٹ کی طرف رواں دواں ہو گئے۔ وہاں آنے والے اگن بوٹ کی طرف ٹکٹکی لگائے اُسے حیرت سے دیکھنے لگے گویا اگن بوٹ ایک عجوبہ روزگار تھا جو ان کو پہلی مرتبہ نظر آیا تھا واقعی اگن بوٹ کا نظارہ بڑا حسین ہوتا ہے۔ اگن بوٹ لمبا۔ تیز رفتار۔ آراستہ و پیراستہ اور بہت خوبصورت ہوتا ہے اس میں لمبی لمبی دو چمنیاں لگی ہوتی ہیں جنکے اوپری سرے بہت نفیس ہوتے ہیں ان دونوں چمنیوں کے درمیان جھولے کے قسم کی کوئی سنہری سی چیز لٹکتی رہتی ہے۔ اس میں پائلٹ کے رہنے کے لئے ایک خوبصورت گھر بھی بنا ہوتا ہے۔ بعض حصے میں کھانے کے کمرے میں شراب کے گلاس اور ادرک کی ٹکیاں سجی رہتی ہیں۔ اگن بوٹ کی چرخی کے ڈھکن بڑے خوبصورت ہوتے ہیں جن پر ایک تصویر بنی ہوتی ہے۔ کشتی کے نام کے اوپر سنہری کرنیں جھلکتی ۔ ۔ ۔ ہیں۔ بوائلر ڈیک ہریکین ڈیک اور ٹیکساز ڈیک ہر ایک کے چاروں طرف علیحدہ علیحدہ گھر بنا ہوتا ہے۔ جسکے چاروں طرف خوبصورت سفید رنگ کے جنگلے ہوتے ہیں، جھنڈے کے ڈنڈے پر نہایت شان سے پرچم لہراتا ہے۔ بھٹی کے دروازے کھلے ہوتے ہیں اس میں آگ بڑی تیزی سے دہکتی رہتی ہے اوپری عرشہ مسافروں کی بھیڑ سے کالا نظر آتا ہے بڑے گھنٹے کے پاس کپتان چپ چاپ کھڑا ہے۔ یہ بڑا رعب دار آدمی ہوتا ہے۔ سب لوگ اُسے رشک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ سیاہ دھوئیں کے بڑے بڑے مرغولے گھوم گھوم کر چمنی سے نکلتے ہوتے ہیں۔ شہر تک پہونچنے سے قبل ساحل پر کھڑے ہوئے صنوبر کے سیاہ درختوں کے بیچ کھڑے جہاز کی خوبصورتی قدرتی ماحول میں اور بھی بڑھ جاتی ہے کشتی کے اگلے حصے میں ملاح جمع ہو جاتے ہیں اور کشتی کا وسیع عرشہ ساحل تک جہاں سامان اُتارتے چڑھاتے ہیں، پھیل جاتا ہے۔ عرشہ پر کام کرنے والا ایک اور شخص ہے جو سب کی نگاہوں میں رہتا ہے۔ یہ عرشے کے آخری حصے میں ہاتھ میں ایک رسّی لپیٹے کھڑا ہے۔ چمنی کے دہانے سے رُکی ہوئی بھاپ سے ایک چیخ کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ نبھی کپتان اپنا ہاتھ اٹھاتا ہے اور ایک گھنٹی بجنے لگتی ہے اس سے پہیے چلتے چلتے رُک جاتے ہیں اور پھر وہ پیچھے کی طرف گھومنے لگتے

ہیں اور دریا کے پانی میں جھاگ اٹھنے لگتے ہیں اور اسٹیمر رُک جاتا ہے۔ سب کے سب بیک وقت کشتی پر سوار ہونے یا اترنے یا سامان کو چڑھانے یا اتارنے کے لئے دھکم دھکا ہوتے ہیں اور ہر طرف شور وغل اور چیخ پکار ہونے لگتی ہے۔ مگر مزدوروں کی مدد سے ہر کام آسانی سے انجام پا جاتا ہے۔ دس منٹ کے بعد اسٹیمر پھر روانہ ہو جاتا ہے مگر اسوقت جھنڈے کے بانس پر نہ جھنڈا لہراتا ہے اور نہ چمنیوں سے سیاہ دھواں ہی نکلتا ہوتا ہے۔ دس منٹ کے بعد ہی قصبہ پھر سنسان ہو جاتا ہے۔ زندگی کے آثار رخصت ہو جاتے ہیں اور شہر کے شرابی ... لکڑیوں کے تودوں کے سہارے پھر سو جاتے ہیں۔

میرے والد صاحب جج تھے۔ انھیں سزائے موت دینے یا زندگی بخش دینے دونوں ہی طرح کے اختیارات حاصل تھے۔ کسی بھی ایسے شخص کو جو ان کی نگاہوں میں مجرم ہوتا تھا وہ سولی چڑھا سکتے تھے۔ میرے باپ کا یہ عہدہ میرے لئے بھی اعزاز و امتیاز کا باعث تھا لیکن کسی اسٹیمر کے جہازراں بننے کا خیال میرے دل میں برابر موجزن رہا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ اسٹیمر کی کوٹھری میں بیٹھ کر دفتر کا کام کروں تاکہ سفید چوغہ پہن کر باہر آسکوں اور میز پوش کو ایک جانب سجا کر لگاؤں جہاں میرے ساتھی اُسے دیکھ سکیں۔ مگر اس کے بعد مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں عرشے پر کام کروں اور ہاتھ میں رسّی لپیٹے ڈیوٹی پر کھڑا رہوں اور بالخصوص سب کو نمایاں طور پر نظر آؤں۔ مگر یہ سب محض خیالی پلاؤ ہی تھا جس کو عملی جامہ پہنا نا ممکن معلوم نہیں ہوتا تھا اور یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ ان خواہشات کو عملی جامہ میسر بھی ہو سکے گا یا نہیں۔ چند دن بعد ہم میں سے ایک لڑکا چلا گیا۔ مدتوں اس کے بارے میں کوئی خبر نہ ملی آخر کار وہ ایک روز واپس آ گیا اب بار وہ دخانی کشتی کے اُمیدوار انجینیر یا اسٹرائکر کی حیثیت سے آیا تھا۔ اس لڑکے کی مثال سے اس مذہبی تعلیم کی جو ہمیں اتوار کے روز اسکول میں دی جاتی تھی بنیاد ہی کھوکھلی ہو گئی۔ یہ لڑکا اپنی بے دینی اور دنیاوی حرص و ہوس کی وجہ سے بہت بدنام تھا اس کے برعکس میں اپنی مذہب پرستی اور دینداری کے لئے بہت مشہور تھا۔ مگر اس ... لڑکے کو تو اتنا بڑا مرتبہ حاصل ہو گیا اور میں گمنام اپنی بدقسمتی کے اندھیروں میں چھپا رہا۔

حالانکہ اس لڑکے کا مرتبہ اب بڑا عظیم تھا مگر اس میں فیاضی کا نام و نشان بھی نہ تھا۔
جب کبھی اس کی کشتی ہمارے گاؤں کی طرف آتی تو وہ ایک زنگ خوردہ پولٹ کو رگڑنے کے لئے لے آتا اور اندر پہیے پر بیٹھ کر اس کو رگڑنے لگتا اور ہم سب لوگ اس کو دیکھتے اور اس کے مرتبے پر حسد کرتے مگر اس کی کنجوسی کی ہجو بھی کرتے۔ جب کبھی اس کی کشتی ہمارے گاؤں کے قریب لنگر انداز ہوتی تو وہ گھر آتا اور سیاہ اور بے حد چکنے کپڑے پہنے قصبے میں ہر طرف گھومتا پھرتا تاکہ ہر شخص کو یاد آ جائے کہ فلاں لڑکا اسٹیمر چلانے والا ملاح بن گیا ہے۔ جب گفتگو کرتا تو دخانی کشتی کے متعلق عام تکنیکی اصطلاحات استعمال کرتا۔ اس طرح کی گفتگو کا وہ اتنا عادی ہو گیا تھا کہ یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ یہ بھول گیا ہے کہ عوام ان اصطلاحوں کو نہیں سمجھتے۔ وہ بڑی سہولیت کے ساتھ اور قدرتی انداز میں گھوڑوں کی خوبیوں کا ذکر کرتا جس کا لوگوں پر بڑا اثر ہوتا۔ وہ ایک قدیم شہری کی طرح سینٹ لوئی کے بارے میں گفتگو کرتا اور دوران سفر میں جب وہ فورتھ اسٹریٹ کی طرف سے آتا یا پلانٹرز ہاؤس سے گذرتا ہوا آتا یا جب کہیں آگ لگی دیکھتا یا قدیم اور عظیم مسوری کی جھاڑیوں میں سے ہو کر آتا تو ان واقعات کا ذکر ضرور کرتا اور اس میں مبالغہ بھی ضرور کرتا۔ وہ یہ بتاتا کہ ہمارے قصبے جیسے نہ معلوم کتنے شہر اس روز نذر آتش ہو گئے۔ ہم میں دو یا تین لڑکے یہ سب باتیں جانتے تھے کیونکہ وہ دو ایک مرتبہ سینٹ لوئی ہو آئے تھے اور ان کو وہاں کے عجائبات کے متعلق مبہم سی معلومات بھی تھیں۔ لیکن اب یہ لڑکے بڑے حلیم اور خاموش ہو گئے تھے کیونکہ ان کی شان و شوکت کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ اس ظالم انجینئر کے آنے سے ان کی معلومات کا وقار ختم ہو گیا تھا۔ اب اس شخص کے پاس روپیہ پیسہ۔ بالوں میں ڈالنے کے لئے تیل وغیرہ سب سامان .... تھا اس کے قبضے میں چاندی کی ایک گھڑی اور پیتل کی ایک نمائشی زنجیر تھی وہ چمڑے کی پیٹی باندھتا تھا مگر گیٹس استعمال نہیں کرتا تھا۔ یہی ایک ایسا نوجوان تھا جسکے دوست بیک وقت اس کی تعریف اور اس سے نفرت بھی کرتے تھے۔ مگر اس کے خدوخال اتنے دلکش تھے کہ ہر لڑکی اس پر فوراً فریفتہ ہو جاتی تھی۔ گاؤں کے ہر لڑکے کو وہ مقابلے میں ہرا چکا تھا۔ آخر کار جب اس کی کشتی ٹکرا گئی تو ہم لوگوں کو ایسی راحت اور اتنا سکون ملا جتنا کسی اور بات میں کئی مہینوں سے نہیں ملا تھا۔ لیکن ایک ہفتے بعد جب وہ زندہ گھر واپس آیا تو اس کی شہرت میں چار چاند لگ چکے تھے۔ گو اس وقت اس کا جسم زخمی

تھا اور وہ مرحوم ہی کردا کے آیا تھا پھر بھی اس کے چہرے پر ایک غازی کی سی تابناکی تھی جب وہ چاق و چوبند لباس میں گرجا گھر پہونچا تو ہر شخص اسے ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہا اور حیران رہ گیا۔ اُسے اسقدر کامیاب دیکھ کر ایسا خیالی ہونے لگا کہ ایک رینگنے والے حقیر کیڑے کو اللہ تعالیٰ نے جانبداری سے اتنے بڑے رتبے پر پہونچا دیا ہے کہ وہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بن گیا ہے۔

اس شخص کی ترقی دیکھ کر صرف ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا اور وہ نتیجہ جلد ہی نکل آیا۔ اسے دیکھ کر یکے بعد دیگرے نہ جانے کتنے لڑکے سستی پہونچے۔ وزیر صاحب کا لڑکا انجینیر ہو گیا' ڈاکٹر اور ڈاک منشی کے لڑکے منشی کے عہدوں پر مامور ہو گئے۔ تھوک فروش کلال کا لڑکا ایک کشتی کا محافظ شراب خانہ ہو گیا۔ ایک بڑے تاجر کے چارٹرے اور ایک کاونٹی جج کے دو لڑکے پائلٹ بن گئے۔ اسوقت پائلٹ کا منصب سب سے زیادہ جلیل القدر منصب تھا۔ اس زمانے میں جب ایک مزدور کو بہت تھوڑی مزدوری ملتی تھی ایک پائلٹ کی تنخواہ بہت کثیر ہوا کرتی تھی یعنی ڈیڑھ سو سے لیکر ڈھائی سو ڈالر ماہانہ تک علاوہ اس کے کھانا مفت۔ اس کی دو مہینے کی تنخواہ کی رقم اتنی ہو جاتی تھی کہ اس سے ایک واعظ کی سال بھر کی تنخواہ ادا کی جا سکتی تھی۔

مگر ہم جیسے کچھ نوجوان محروم رہ گئے۔ ہماری رسائی دریا تک نہ ہو سکی کم از کم ہمارے والدین نے ہمیں ایسا کرنے کی اجازت نہ دی۔ کافی انتظار کے بعد میں ایک روز گھر سے بھاگ گیا۔ میں نے دل میں ٹھان لی کہ جب تک میں پائلٹ نہیں بن جاؤں گا اور ٹھاٹ باٹ سے لوگوں کے سامنے آنے کے قابل نہیں بن جاؤں گا اسوقت تک گھر لوٹنے کا نام بھی نہ لوں گا لیکن کسی نہ کسی وجہ سے میں جلد کامیاب نہ ہو سکا۔ بہت . . . ڈر ڈر کر میں ان چند کشتیوں پر سوار ہوا جو سینٹ لوئی گھاٹ پر ان چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کی طرح جو تیل میں ڈال کر رکھی جاتی ہیں' پڑی ہوئی تھیں۔ میں نے بڑی عاجزی کے ساتھ پائلٹوں کے بارے میں پوچھ تاچھ شروع کی۔ لیکن میرے ساتھ ہر شخص سرد مہری سے پیش آیا۔ مزدوروں اور کلرکوں نے اگر کچھ بتایا بھی تو بہت مختصر سا۔ اس وقت تو مجھے اسی سلوک پر قناعت کرنی پڑی لیکن آنیوالے خوشگوار دنوں کے خیال سے مجھے بڑا سکون ملتا تھا جب مجھے ایک عظیم اور ممتاز پائلٹ بننے کا فخر حاصل ہوگا اور جب میرے پاس کثیر مال و دولت ہو گی اور جب میں اِن مزدوروں اور کلرکوں میں سے کچھ کو موت کے گھاٹ اتار کر انکا خون بہا دے سکوں گا۔

پانچواں باب

میری خواہش ایک امیدوار پائلٹ بننے کی

اس کے بعد کئی مہینوں تک پائلٹ بننے کی خواہش میرے دل میں چٹکیاں لیتی رہی مگر بالآخر یہ امید دم توڑ گئی اور میرے دل سے سب ارمان رخصت ہوگئے لیکن مجھے گھر واپس جاتے ہوئے شرم محسوس ہوتی تھی۔ میں اس زمانے میں سنسناٹی کے مقام پر تھا اور یہاں میں نے اپنے لئے ایک نیا خاکہ تیار کرنا شروع کر دیا۔ میں بہت دنوں سے دریائے آمیزن کے سلسلے میں تحقیق کا تذکرہ پڑھ رہا تھا۔ یہ تحقیق بھی حال میں کی گئی تھی اسکے لئے ہماری حکومت کی جانب سے ہم روانہ کی گئی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ متعدد مشکلات کے باعث دریا کے دہانے سے قریب چار ہزار میل اوپر کے اس علاقہ کی تلاش نہ ہو سکی جو آمیزن کے اوپری معاون دریاؤں کا علاقہ ہے سن سناٹی سے نیو آرلینز کا فاصلہ تقریباً پندرہ سو میل تھا جہاں جاکر بلاشبہ مجھے جہاز مل سکتا تھا۔ میرے پاس صرف ۳۰ ڈالر رہ گئے تھے میں نے سوچا کہ میں آمیزن کی تحقیقات مکمل کروں گا۔ اس معاملہ میں میں نے بس یہی سوچا۔ کام کی تفصیلات پر میں نے بالکل غور نہیں کیا۔ میں نے اپنے سفری تھیلے میں سب سامان رکھا اور پھر میں ایک قدیم جہاز پر جس کا نام پال جونز تھا نیو آرلینز کے لئے روانہ ہوگیا۔ سولہ ڈالر میں جو کمرہ مجھے ملا وہ اس جہاز کا مرکزی کمرہ تھا اگرچہ اس . . . کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ دراصل کوئی بھی عقلمند آدمی ایسے جہاز میں سفر کرنا پسند نہیں کرتا۔

جب ہم بیچ راستے میں تھے اور وسیع اوہائو کی حدود میں داخل ہو رہے تھے تو میں اپنے آپ میں ایک نئی اُمنگ پا رہا تھا اور مجھے خود اپنی عقل پر فخر ہو رہا تھا۔ اب میں ایک بحری مسافر تھا۔ ہم مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اتنا مزہ زندگی میں پہلے کبھی نہیں آیا میرے دل میں ایک خاص قسم کا

احساس برتری پیدا ہو رہا تھا کہ میں دُور دراز کے پُر اَسرار ممالک کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ ایسا فرحت انگیز احساس اس سے پہلے مجھے کبھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ میری شخصیت اسقدر ممتاز اور جلیل القدر ہو گئی تھی کہ میرے دل میں سے تمام کثیف و کمینہ قسم کے خیالات رخصت ہو گئے تھے۔ اب میں اس قابل ہو گیا تھا کہ ان لوگوں کو جنھوں نے کبھی سفر نہیں کیا تھا قابل رحم سمجھوں۔ رحم کے اس جذبے میں حقارت کا شائبہ تک نہ تھا۔ پھر بھی جب ہمارا جہاز دیہات یا جنگلات کے کنارے پر ٹھہرتا تو میں بڑی بے نیازی سے پوائنٹ ڈیک پر لوہے کے جنگلے کے سہارے ضرور کھڑا ہوتا تاکہ دیہات کے لڑکے مجھے رشک کی نگاہوں سے دیکھیں اور میں اس سے حظ اٹھاؤں۔ اور اگر پھر بھی دیکھنے والوں کا خیال میری طرف متوجہ نہ ہوتا تو میں اس کی توجہ اپنی طرف کھینچنے کے لئے چھینک دیتا یا کسی ایسی جگہ جا کر کھڑا ہو جاتا جہاں وہ لوگ مجھے دیکھے بغیر نہ رہ سکیں۔ جیسے ہی مجھے معلوم ہو جاتا کہ انھوں نے مجھے دیکھ لیا ہے تو میں جمہائی لینے لگتا یا منہ کھول کر ایسی ایسی علامتوں کا اظہار کرتا جن سے یہ ظاہر ہوتا کہ میں سفر سے بہت اکتا چکا ہوں۔

اس اثنا میں میں سر سے ہیٹ اُتار کر رکھتا اور ایک ایسی جگہ جا کر کھڑا ہو جاتا جہاں ہوا اور دھوپ مجھ تک پہونچ سکے کیونکہ میں چاہتا تھا کہ میرا جسم سنولا جائے اور میرے چہرے پر امتداد وقت کی پرچھائیاں نظر آئیں جس سے لوگوں کو یہ احساس ہو کہ میں بہت دنوں سے سفر کر رہا ہوں۔ ابھی دوسرا دن نصف بھی نہیں گذرا تھا کہ میرا دل خدا کے حضور جذبۂ احسان مندی سے سرشار سجدے کرنے لگا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری کھال میں آبلے پڑ گئے ہیں اور میرا چہرہ نیز میری گردن کی کھال اُدھڑ سی گئی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ میرے وطن کے لڑکے اور لڑکیاں مجھے اسوقت دیکھتے۔

ہم لوگ لوئی ویل یا کم از کم اس کے گرد و نواح میں ضرور پہونچ گئے تھے۔ ہم لوگوں نے وسط دریا میں ایک چٹان سے اپنی کشتی مضبوطی سے باندھ دی اور وہاں چار دن تک ٹھہرے رہے۔ اب مجھے بڑی شان سے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ میں بھی کشتی میں سوار لوگوں کے خاندان کا ایک فرد ہوں۔ گویا میں کپتان صاحب کا لڑکا ہوں اور دوسرے افسروں کا چھوٹا بھائی۔ اس اُنس و محبت کے جذبے کا جو کشتی کے لوگوں کے لئے میرے دل میں ابھرنے لگا اندازہ

لگانا محال ہے۔ مگر ایک دخانی کشتی کا اعلیٰ مرتبہ ملاح خشکی پر چلنے والے انسان کو جو اتنا ہی بڑا
مرتبہ پانا چاہتا ہے کیوں حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میرے
دل میں خاص طور پر یہ ارمان تھا کہ جہاز کا بڑا افسر یعنی نائب کپتان جس کے چہرے سے ہیبت ٹپکتی
تھی کسی طرح مجھے نظرِ عنایت سے دیکھے اور میں ہر وقت ایسے موقع کی تلاش میں رہتا تھا جبکہ
میں اُسے خوش کرنے کے لئے اس کی کچھ خدمت کرسکوں۔ آخرکار یہ موقع مجھے مل ہی گیا اگلے
عرشے پر ایک مستول لگانے کے بارے میں بڑے زور زور سے گفتگو ہو رہی تھی میں بھی اس طرف
گیا اور باہر کی جانب ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں نائب کپتان نے تیز آواز میں حکم دیا کہ
کوئی لنگر اٹھانے والی سلاخ لائے۔ میں فوراً اُچھل کر اس کے پاس پہونچا اور بولا "مجھے بتایئے
سلاخ کہاں ہے۔ میں اُسے لے آؤں گا"

اگر کوئی بوری ڈھونے والا مزدور شہنشاہ روس کے روبرو اپنی حکمتِ عملی کی کوئی خدمت
پیش کرنے کی جرأت کرتا تو اُسے اتنا تعجب نہ ہوتا جتنا نائب کپتان صاحب کو میری اس جرأت
پر ہوا۔ بلکہ وہ قسم کھاتے کھاتے رک گیا۔ وہ کھڑا ہو کر میری طرف گھورنے لگا۔ اپنا بگڑا ہوا
مزاج سنبھالنے میں اسے دس سیکنڈ لگے ہوں گے۔ تب اس نے بڑے مؤثر انداز میں کہا
"یہ لڑکا ضرور غضب ڈھائے گا اور پھر ایسے انداز میں جیسے کہ اُسے کوئی بہت پیچیدہ مسئلہ درپیش
ہو اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں وہاں سے کھسک گیا اور باقی تمام دن میں نے تنہائی میں بسر کرنا چاہا۔ میں کھانا کھانے
کے لئے بھی نہیں گیا اور جب تک ہر شخص شام کے کھانے سے فراغت نہ پا گیا میں الگ تھلگ
ہی رہا۔ اب میں پہلے کی طرح خود کو کشتی کے عملے کا ایک فرد نہیں سمجھ رہا تھا۔ مگر اس کے باوجود
جوں جوں ہم دریا میں آگے بڑھتے گئے رفتہ رفتہ میری کھوئی ہوئی قوت بحال ہونے لگی۔ مجھے، اس بات
کا رنج ضرور تھا کہ نائب کپتان کے لئے میرے دل میں اتنی نفرت کیوں پیدا ہو گئی کیونکہ کسی
نوجوان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اس شخص کی تعریف نہیں کرے گا۔ وہ قد آور
اور گٹھیلے بدن کا آدمی تھا اور ڈاڑھی رکھتا تھا اور اس کے گالوں پر بڑے بڑے گلمچھے تھے اس کے
دائیں بازو پر ایک سرخ رنگ کی اور ایک نیلے رنگ کی عورت کی تصویر منقش تھی۔ ان دونوں کے

درمیان ایک بنے لنگر کی شکل بنی ہوئی تھی اور دونوں طرف گودنے سے لنگر تک ایک سرخ لکیر کھنچی ہوئی تھی مکاری میں وہ سب سے آگے تھا۔ جب کسی جگہ ساحل پر وہ سامان اتارنے لگتا تو میں وہاں جاکر کھڑا ہو جاتا تاکہ میں اسے دیکھ سکوں اور اس کی باتیں سن سکوں۔ اسکو اپنے عظیم منصب کی شان و شوکت کا بڑا احساس تھا اور وہ چاہتا تھا کہ لوگ بھی اسے بڑا سمجھیں۔ معمولی سے معمولی حکم دینے کے لئے بھی اسکی آواز میں بجلی کی کڑک پیدا ہوتی تھی جس میں مکاری کی گونج دیر تک محسوس ہوتی رہتی تھی۔ اسوقت خواہ مخواہ میں خشکی پہ رہنے والے افسر کے حکم دینے کے طریقے کا مقابلہ کشتی کے اس حاکم کے طریقے سے کرنے لگتا۔ اگر خشکی کے حاکم کو ایک بڑا تختہ مزدوروں سے اٹھوانا ہوتا ہے تو وہ گرج کے حکم دے گا" فوراً اس تختے کو آگے دھکیلو۔ ہمت سے کام لو۔ کیا کر رہے ہو؟ پکڑو۔ گھسیٹو تختے کو۔ ادہر لے جاؤ۔ اُدہر لے جاؤ۔ تم سنتے نہیں ہو کیا؟ ایکدم زور لگاؤ۔ کیا سوچ رہے ہو؟ زور سے اٹھاؤ۔ زور سے۔ میں تم سے کیا کہہ رہا ہوں؟ آگے سے زور کیوں نہیں لگاتے؟ اس پیچے کو لے کر کہاں جا رہے ہو۔ قبل اس کے کہ میں زبردستی کروں اس تختے کو آگے دھکیل دو۔ چلو۔ زور لگاؤ۔ دھکا دو۔ دھکا دو۔ دلدل میں پھنسے ہوئے کچھوے یا مردہ گاڑی کھینچنے والے لنجے گھوڑے کی طرح مت چلو۔"

کاش میں بھی اسی انداز سے گفتگو کر سکتا۔!

جب نائب کپتان کے ساتھ میرے تعلقات کی تلخی کم ہونے لگی تو میں نے ڈرتے ڈرتے کشتی کے ادنیٰ ترین ملازم یعنی رات کے چوکیدار کے ساتھ ربط و ضبط پیدا کرنا شروع کیا۔ شروع شروع میں تو وہ بھی میرے ساتھ بے رخی سے پیش آیا لیکن جب میں نے اُسے مٹی کا ایک نیا سفید حقہ پیش کیا تو وہ خوش ہو گیا اور میرے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے لگا۔ اس نے مجھے اپنے ساتھ ہری کین ڈیکسیر بڑے گھنٹے کے پاس بیٹھنے کی اجازت دیدی اور تھوڑے دنوں کے بعد وہ مجھ سے بات چیت کرنے لگا۔ وہ ایسا کرنے پر مجبور تھا کیونکہ جو بات وہ مجھ سے کہتا تھا میں اُسے ادب کے ساتھ مان لیتا تھا اور اس پر یہ واضح کر دیتا تھا کہ میں اس کی توجہ کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتا ہوں۔ اس نے مجھے اِن دھندلی راسوں اور سایہ دار جزیروں کے نام بتائے جن سے ہو کر ہم رات کے سناٹے میں جب آسمان پر تارے ٹمٹماتے تھے گذرا کرتے تھے پھر رفتہ رفتہ وہ مجھ سے اپنے بارے میں گفتگو کرنے

لگا۔ اس نے ایسے شخص کی حالت کا جسے صرف چھ ڈالر فی ہفتہ تنخواہ ملتی تھی نقشہ بڑی جذبات بھری
زبان میں کھینچا اگر کوئی مجھ سے عمر میں بڑا اس کی باتیں سنتا تو اُسے اس چوکیدار پر ترس آتا۔ میں
بھی بڑے اشتیاق سے اور ایسی عقیدت کے ساتھ اسکی باتوں کو سنتا کہ جیسے سامنے کوئی بات نا ممکن
نہیں بشرطیکہ اس کا استعمال مناسب موقع و محل پر کیا جائے۔ اگر وہ میلا کچیلا تھا یا اس کے منہ سے بو
آتی تھی تو اس سے مجھے کیا واسطہ یا اگر اس کی بول چال ... گرامر کی رُو سے غلط تھی یا اس کے جملوں کی
ساخت ناقص تھی یا اس کی ذہنیت سلیقے سے اتنی مبرا تھی کہ اس کی گفتگو میں بجائے خوبی کے خامی نظر
آتی تھی تو اس سے میرا کیا بگڑتا تھا۔ اس شخص کے ساتھ بے انصافی کی گئی تھی۔ اس کو طرح طرح کی
مصیبتوں کا شکار بننا پڑا تھا۔ اور میری ہمدردی کی یہی وجہ تھی۔ جب وہ آہیں بھر بھر کر اپنی دکھ
بھری کہانی سنانے لگتا تو اس کے آنسو آنکھوں سے نکل کر لالٹین پر جو اس کی گود میں رکھی ہوتی تھی
گرتے رہتے میں بھی اسکے ساتھ مارے ہمدردی کے رونے لگتا تھا۔ اس کا بیان تھا کہ وہ ایک
شریف النسل انگریز کا لڑکا تھا۔ اس کو یہ یاد نہیں تھا کہ اس کا شریف النسل باپ ارل تھا یا
ایلڈرمین۔ اس کے خیال میں وہ دونوں ہی منصبوں پر رہ چکا تھا۔ اس کا باپ اس سے بہت محبت
کرتا تھا۔ لیکن اس کی ماں بچپن سے ہی اس سے نفرت کرتی تھی۔ اسلئے جبکہ وہ ابھی چھوٹا ہی تھا
اُسے ایک پرانے فیشن کے سکول میں بھیج دیا گیا۔ اس کو یہ یاد نہیں کہ اس سکول کا نام کیا تھا۔
دھیرے دھیرے وقت گذرتا رہا اور اس کا باپ مر گیا اور اس کی ماں نے ساری جائداد پر قبضہ کر کے
اس کو حقِ وراثت سے محروم کر دیا۔ جب وہ بیکس و یتیم ہو گیا تو کچھ شریف آدمیوں نے جنھیں وہ
جانتا تھا اثر و رسوخ استعمال کر کے اُسے ایک جہاز میں سرجن کے مددگار کے عہدے پر ملازم کرا
دیا۔ اس کے بعد اس چوکیدار نے تاریخ اور مقام سے گریز کرتے ہوئے ایسے واقعات سنانا شروع
کر دیئے جو ناقابلِ یقین تھے کیونکہ اِن میں ناقابلِ اعتبار رہزنوں کا ذکر تھا جن کو سُن کر انسان کے
رونگٹے کھڑے ہو جائیں اس کی یہ داستان خون خرابے اور بال بال موت سے بچ جانے اور ایسے واقعات
سے بھری ہوئی تھی۔ جن میں کبھی کی شرارت اور مظالم کا ذکر تھا۔ یہ داستان اتنی دلچسپ تھی کہ
میں خاموش بیٹھا دلچسپی سے سُنتا رہا۔ جذبات کے زیر اثر میں کبھی کانپنے بھی لگتا۔ کبھی اس پر
تعجب کرتا اور کبھی دل ہی دل میں اسکی تعریف کرنے لگتا۔

لیکن بعد میں یہ معلوم ہونے پر مجھے سخت مایوسی ہوئی کہ وہ شخص نہایت حقیر، بے ہودہ جاہل، جذباتی اور نیم احمق قسم کا بے تُکا انسان تھا۔ وہ الی نوا ے کے جنگلوں کا باشندہ تھا۔ جس نے کبھی سفر نہیں کیا تھا۔ اس نے غیر مذہب لوگوں کے قصے کہانیاں پڑھ یا سُن رکھی تھیں اور ان کی انوکھی اور ناقابل اعتبار باتوں کو کچھ تصرف کے ساتھ اپنی بنا کر سنایا کرتا تھا یہاں تک کہ کچھ عرصے میں اس نے متفرق واقعات کو اکٹھا کر کے اُن سے یہ داستان بنا ڈالی تھی اور اسے وہ مجھ جیسے ناتجربہ کاروں کو سنایا کرتا تھا۔ بار بار سنانے کی وجہ سے خود اُسے بھی یہ یقین ہو گیا تھا کہ یہ اسی کی داستانِ حیات ہے۔

چھٹا باب

ایک اُمیدوار پائلٹ کا تجربہ

چار روز تک لوئی ڈلے میں چٹان پر پڑے رہنے اور کچھ اور وجوہات کی بنا پر تاخیر ہو جانے سے ہمارے جہاز پال جونز کو سنناٹی سے نیو آرلینز تک کے بھٹکتے ہوئے سفر میں دو ہفتے لگ گئے اس دوران میں میری ایک پائلٹ کے ساتھ جان پہچان ہو گئی اس نے مجھے کشتی چلانا سکھا دیا، جس کے باعث میرے دل میں دریائی زندگی کے لئے ایسی زبردست کشش پیدا ہو گئی کہ ایسی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔

اس سفر میں میری ملاقات ایک نوجوان سے بھی ہوئی جو ڈیک پر سفر کر رہا تھا۔ زیادہ افسوس کی بات یہ تھی کہ اس نے بڑی آسانی کے ساتھ مجھ سے چھ ڈالر اس وعدے پر ادھار لے لیے تھے کہ وہ اِس کشتی پر لوٹ کر آئے گا اور جس دن میں نیو آرلینز پہنچوں گا اس کے دوسرے ہی

دن وہ مجھے میرا پیسہ لوٹا دے گا لیکن غالباً وہ مر گیا یا اسکو اپنا وعدہ بھول گیا کیونکہ اسکے بعد وہ کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔ یقین غالب تو یہی ہے کہ وہ مر گیا ہوگا کیونکہ اس کے بیان کے مطابق اسکے والدین کے پاس بہت دولت تھی۔ اس نے ڈیک پر سفر محض اسلئے کیا تھا کہ وہاں نسبتاً زیادہ ٹھنڈک تھی۔ بہت جلد مجھے دو باتیں معلوم ہو گئیں، ایک تو یہ کہ آئندہ دس یا بارہ سال کے دوران میں کسی جہاز کا آمیزن کے دہانے کی جانب روانہ ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا اور دوسری یہ کہ اگر میں جہاز کا انتظار کروں بھی تو میری جیب میں ابھی تک جو نو یا دس ڈالر کی رقم موجود تھی وہ اتنی بڑی مہم کے لئے جس کا منصوبہ میں نے بنالیا تھا ناکافی تھی۔ اس لئے یہ ضروری تھا کہ میں اب کوئی دوسرا منصوبہ بناؤں۔ پال جونس جہاز اب سینٹ لوئی کی طرف روانہ ہونے والا تھا۔ میں نے پائلٹ سے درخواست کی کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لے چلے تین دن تک برابر کوشش کرنے پر اس نے میری درخواست قبول کر لی اور نیو آرلینز سے سینٹ لوئی تک مسسپی کے متعلق مجھے پوری تعلیم دینے کے لئے اس شرط پر راضی ہو گیا کہ میں اُسے پانچسو ڈالر معاوضہ میں دوں گا البتہ یہ بھی طے ہوا کہ یہ رقم میرے پائلٹ بن جانے پر میری پہلی تنخواہ میں سے واجب الادا ہوگی۔ بڑی آسانی سے مجھے اب یقین ہو گیا کہ میں اپنی زندگی میں دریائے مسسپی کے بارہ یا تیرہ سو میل کی لمبائی کا سارا حال معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور اس لئے میں تعلیم کی اس چھوٹی سی مہم پر گامزن ہو گیا۔ اگر فی الواقع مجھے اس بات کا علم ہوتا کہ مجھے اپنی قوتوں سے کیسا کام لینا ہے تو غالباً مجھے اس مہم کا آغاز کرنے کی جرأت نہ ہوتی میرا خیال تھا کہ پائلٹ کا کام صرف دریا میں کشتی ڈال دینا ہوتا ہے۔ میں یہ نہیں سمجھتا تھا کہ اس کام کے لئے کسی خاص ہنر کی بھی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ دریا کافی چھوٹا ہوتا ہے۔

ہماری کشتی نیو آرلینز سے سہ پہر کو قریب چار بجے واپس لوٹی۔ ہمیں آٹھ بجے شام تک پہرہ دینا تھا۔ ہمارے افسر مسٹر بکسبی نے کشتی کو... سیدھا کیا اور اسے کھینچ کر دوسری کشتیوں کے پیچھے سے جو بڑے پشتے کے پاس کھڑی تھیں نکال لائے۔ پھر انھوں نے مجھ سے کہا اس کشتی کو ان جہازوں کے پاس سے ایسے نکال لے جاؤ جیسے کوئی سیب کے چھلکے کو سیب سے اتار کر پھینک دیتا ہے۔ میں نے پہیہ پکڑا۔ اس وقت میرے دل کی دھڑکن بےحد تیز ہو گئی تھی۔ مجھے

ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہمارا جہاز ہر جہاز سے چھوتا اور گھسٹتا ہوا چلے گا کیونکہ سب جہاز اتنے پاس پاس کھڑے تھے۔ میں نے سانس روک لی اور کشتی کو خطرے سے نکالنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ ہمارے پائلٹ یعنی مسٹر بکسبی تو ایسی حالت میں ہمیں لازمی طور پر خطرے میں ڈال دیتے لیکن میں نے یہ عقلمندی کی کہ یہ بات کہی نہیں۔ آدھے منٹ میں میں نے اپنا کام ختم کر لیا اور پال جونس اور دوسرے جہازوں میں اتنا فاصلہ کر دیا کہ ہم حادثے سے محفوظ رہیں۔ اس کے دس سیکنڈ بعد ہی مجھے ذلیل کر کے الگ کر دیا گیا اور مسٹر بکسبی کشتی کو پھر خطرے میں ڈالنے لگے اور ساتھ ہی ساتھ مجھے میری بزدلی پر ڈانٹنے بھی لگے اس سے مجھے سخت اذیت پہنچی لیکن میں انھیں اس بات پر داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ کس اعتماد کے ساتھ پہیے کو ادھر ادھر گھما رہے تھے اور بار بار اپنا جہاز دوسرے جہازوں کے اتنے قریب سے نکالتے تھے کہ ٹکر سے جہاز ٹوٹنے کا خطرہ برابر لگا رہتا تھا۔ جب مسٹر بکسبی کا غصہ ٹھنڈا پڑا تو مجھ سے بولے کہ ساحل کے پاس دریا کی رفتار دھیمی ہے اور بیچ میں تیز، اسلئے دریا کے چڑھاؤ پر چلتا ہو تو ساحل کے ساتھ چلنا چاہیئے جس سے دھیمی دھارا کا فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اور اگر دریا کے بہاؤ کی طرف جانا ہو تو بیچ دھارا میں چلنا چاہیئے۔ جس سے ہمیں پانی کی رفتار سے فائدہ ہو سکے۔ میں نے اپنے دل میں یہ طے کیا کہ میں تو دریا کے بہاؤ پر جہاز چلایا کروں گا۔ دریا کے چڑھاؤ پر جہاز رانی وہ پائلٹ کریں جن میں عقل نہ ہو۔

مسٹر بکسبی اکثر میری توجہ مختلف باتوں کی طرف مبذول کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے کہا "یہ چھ میل کا نشان ہے۔ میں نے ان کی بات تسلیم کر لی۔ اطلاع تو مفید تھی مگر میں ان کا منشا نہیں سمجھ سکا۔ آگے چل کر انھوں نے کہا "یہ نو میل کا نشان ہے پھر کچھ اور آگے چل کر کہا یہ بارہ میل کا نشان ہے"۔ یہ سب نشانات قریب قریب ساحل کی سطح پر واقع تھے۔ مجھے یہ سب نشان قریب قریب یکساں بھدے اور غیر دلچسپ لگتے تھے مجھے توقع تھی کہ مسٹر بکسبی اپنا موضوع بدل دیں گے اور وہ ایک ہی نقطے کے گرد اپنے خیالات مجتمع کرتے رہے۔ وہ بڑی دلچسپی سے ساحل کے ہی موضوع پر ڈٹے ہوئے تھے۔ انھوں نے پھر فرمایا "یہاں ان چینی درختوں کے پاس دریا کی سست رفتاری ختم ہو جاتی ہے ہم یہاں سے موڑ پار کریں گے۔

لہٰذا ۔۔۔۔۔۔ موڑ پار کر کے انھوں نے ایک دو بار پہیہ پھر میرے حوالے کر دیا لیکن تقدیر نے میرا ساتھ نہ دیا۔ یا تو میں گنّے کے کھیتوں کے قریب ساحل سے ٹکرا جاتا یا پھر ساحل سے بہت دُور چلا جاتا۔ اسلئے مجھے پھر توہین و تحقیر کا شکار ہونا پڑا اور مجھے صلواتیں سننی پڑیں ۔۔۔

آخر کار ہم لوگوں کی ڈیوٹی ختم ہوئی اور ہم شام کا کھانا کھا کر سونے کے لئے چلے گئے تقریباً آدھی رات کے میری آنکھوں پر لالٹین کی روشنی پڑی جو شخص اس وقت پہرہ پر تھا اس نے مجھ سے کہا "آؤ ، باہر نکلو"۔

اس کے بعد وہ شخص چلا گیا۔ میں اس غیر معمولی واقعہ کو سمجھ نہ سکا ، اور نہ میں نے اُسے سمجھنے کی کوشش کی ۔ میں پھر اونگھنے لگا اور میری آنکھ لگ گئی۔ فوراً ہی چوکیدار پھر واپس آیا اس وقت اُس کے لہجے میں دُرشتی تھی ۔ مجھے بڑی جھنجھلاہٹ ہوئی۔ میں نے کہا "تم اسوقت آدھی رات گئے ہم لوگوں کو کیوں پریشان کر رہے ہو۔ آخر تمہارا منشا کیا ہے۔ اب مجھے رات بھر نیند نہیں آئے گی "

چوکیدار نے کہا "اگر ایسا ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی" جو لوگ اپنی ڈیوٹی ختم کر کے اَن رآرام کرنے جا رہے تھے ان کے وحشیانہ قہقہے میں نے سُنے ۔ وہ کہہ رہے تھے "کیوں بھائی چوکیدار ، کیا وہ نیا پائلٹ ابھی واپس نہیں آیا۔ غالباً وہ بہت نازک اندام ہے ۔۔۔ اس کو شکر کی پوٹلی دیدو اور اس نوکرانی سے کہو کہ اس بچّے کو لوریاں دیکر سلا دے۔

عین اسی وقت مسٹر بکسبی اِدھر آ نکلے اور ایک منٹ کے اندر ہی اٹھ کر میں پائلٹ ہاؤس کے زینہ پر چڑھنے لگا۔ کچھ کپڑے تو میں پہنے ہوئے تھا باقی میرے ہاتھ میں تھے۔ مسٹر بکسبی میرے پیچھے پیچھے تھے اور کچھ بڑبڑا رہے تھے ۔ یہ نئی بات تھی کہ آدھی رات کو اٹھا کر کام پر بلا یا جائے۔ لیکن پائلٹ کے کام میں ایسی ضرورتیں پیش آیا ہی کرتی ہیں۔ لیکن اس وقت میرے قیاس میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ کشتیاں رات پھر چلا کرتی تھیں لیکن کسی بھی وجہ سے مجھے یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ کشتی کو چلانے کے لئے کسی نہ کسی کو آرام دہ بستر سے بھی اٹھنا پڑتا ہے۔ اب مجھے یہ اندیشہ ہونے لگا کہ پائلٹ کا کام اتنا رومان خیز نہیں ہے جتنا میں سمجھتا تھا۔ پائلٹ کے کام کو اگر اس پہلو

سے دیکھا جائے تو اس کے لیے مطلوبہ محنت کا احساس ہوگا اور اس کے عملی رُخ کا پتہ چلے گا۔

حالانکہ اس وقت ستارے چھٹکے ہوئے تھے پھر بھی رات کسی قدر تاریک معلوم ہوتی تھی بڑا نائب کپتان پہیہ سنبھالے ہوئے تھا۔ اس کے پاس ہی ایک قدیم قسم کی ناند تھی جس کا رُخ ایک ستارے کی طرف تھا۔ وہ کشتی کو ٹھیک وسط دریا میں رُو کے کھڑا تھا۔ دریا کے دونوں ساحل آدھے آدھے میل سے زیادہ دُوری پر نہ ہوں گے مگر اس وقت وہ اتنے دور اور دھندلے سے دکھائی دے رہے تھے کہ انھیں دیکھ کر تعجب معلوم ہوتا تھا نائب کپتان نے کہا۔

"جناب ہمیں مسٹر جونز کے باغات پر رُکنا ہے" یہ سنکر میرا جذبۂ انتقام عود کر آیا اور مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے دل میں کہا "حضرت بکسبی میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اس کام میں مسرت حاصل ہو۔ ایسی تاریک رات میں مسٹر جونز کے باغات کو تلاش کرنا مذاق نہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ تمام زندگی آپ کو یہ جگہ نہیں ملے گی"

مسٹر بکسبی نے نائب کپتان سے کہا۔

"باغات کے بالائی سرے پر یا نچلے سرے پر" جواب ملا "بالائی پر"

"نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ وہاں پیڑوں کے تنے پانی سے باہر نکلے ہوئے ہیں اور کشتی اُن سے ٹکرا سکتی ہے۔ نچلے سرے سے اوپری سرا زیادہ دور نہیں ہے۔ اس لئے آپ کو نچلے سرے پر چلنا ہوگا"

"اچھی بات ہے۔ اگر جونس کو یہ بات پسند نہیں ہے تو اسے یہ برداشت کرنا ہوگی"

اس کے بعد نائب کپتان چلا گیا۔ میرا جوش اب ٹھنڈا پڑنے لگا اور بجائے اس کے جذبۂ حیرت ابھرنے لگا کیونکہ مسٹر بکسبی نے نہ صرف ان باغات کا ایسی تاریک رات میں پتہ لگانے کی تجویز کی تھی بلکہ یہ بھی کہا تھا کہ جس سرے پر لوگ چاہیں گے وہیں وہ کشتی کو پہونچا دیں گے۔ اب میں ڈرتے ڈرتے مسٹر بکسبی سے ایک سوال کرنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے مجھے اتنے مختصر جواب مل چکے تھے کہ اسکے بعد اب کوئی اور سوال پوچھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اسی لئے میں خاموش رہا۔ میں مسٹر بکسبی سے ایک سیدھا سادہ سوال پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا واقعی وہ اتنے بے وقوف ہیں کہ باغات کا پتہ اندھیری رات میں لگانا چاہتے ہیں جبکہ سارے باغات ایک ہی رنگ کے نظر آئیں گے۔ لیکن

میں خاموش رہا۔ اِن دِنوں میں دوراندیشی سے کام لے رہا تھا۔

مسٹر بکسبی ساحل کی طرف چل دیئے۔ دوسرے ہی لمحہ وہ بڑے اطمینان سے جہاز کو ساحل کے ساتھ ساتھ چلا رہے تھے۔ گویا کہ دن پوری آب و تاب کے ساتھ نکلا ہوا ہو۔ یہی نہیں وہ گنگنا بھی رہے تھے۔

"اے آسمانی۔۔باپ۔ دن ڈھلنے لگا ہے۔"

مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے ایک عجیب آوارہ منش انسان کی حفاظت میں اپنی زندگی دے دی ہے اتنے میں مسٹر بکسبی میری طرف مخاطب ہو کر بولے۔

"نیو آرلینز کے اُوپر جو پہلا مقام ہے اس کا نام کیا ہے۔

مجھے اطمینان تھا کہ میں مسٹر بکسبی کی بات کا فوراً جواب دینے کی صلاحیت رکھتا تھا اور میں نے جواب دے بھی دیا یعنی کہ "مجھے نہیں معلوم"

مسٹر بکسبی نے پھر حیرت سے پوچھا "کیا تمہیں نہیں معلوم۔؟"

مسٹر بکسبی نے جس انداز سے یہ سوال کیا اس سے مجھے بڑا دھکا لگا۔ ذرا دیر کو میں بیٹھ گیا بہرحال مجھے کہنا وہی تھا جو میں پہلے کہہ چکا تھا۔

اب مسٹر بکسبی بولے "تم بڑے چست معلوم ہوتے ہو" اچھا یہ بتاؤ دوسرے نشان کا نام کیا ہے۔؟

میں نے پھر وہی جواب دیا "مجھے پتہ نہیں۔"

مسٹر بکسبی نے کہا۔ جواب نہیں تمہارا بھی ــ اچھا جو بھی نشانات یا جگہیں میں نے تم کو بتلائی ہیں ان میں سے کسی ایک کا نام بتاؤ۔"

میں تھوڑی دیر سوچتا رہا اور پھر بولا "مجھے علم نہیں۔"

مسٹر بکسبی نے کہا۔ ندی پار کرنے کے لئے بارہویں میل والے نشان سے اوپر تم کس جگہ سے چلے تھے۔؟

میں نے وہی جواب دیا' مجھے کچھ علم نہیں۔

اس پر مسٹر بکسبی نے میرے چبا چبا کر بات کرنے کے طریقے کی نقل اُتارتے ہوئے کہا "تم کو

کچھ نہیں معلوم۔ کیا کہا۔؟ پھر تم کو کیا معلوم ہے۔؟

میں نے جواب دیا "کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ قطعی طور پر کچھ بھی نہیں۔"

اس پر مسٹر بکسبی نے کہا "قیصر اعظم کی رُوح کی قسم۔ مجھے تمہاری بات کا یقین ہے تمہارے جیسا احمق اور کوڑھ مغز آدمی میں نے آجتک نہ دیکھا نہ سُنا۔ میرے موسیٰ! میری مدد کیجئے۔ یہ خیال کرنا کہ تم پائلٹ بنو گے ایک عجیب سی بات ہے۔ تم کو تو یہ بھی نہیں معلوم کہ گائے کو گلی میں سے کیسے نکالتے ہیں۔"

اب مسٹر بکسبی غصّے سے آگ بگولا ہو رہے تھے۔ وہ جلد گھبرا اٹھنے والے آدمی تھے۔ وہ اپنے پہیے پر ادھر اُدھر پہلو بدلنے لگے گویا فرش بہت گرم ہو تھوڑی دیر وہ دل ہی دل میں پیچ تاب کھاتے رہے پھر ایک دم غصّے سے اُبل پڑے اور مجھے لعن وطعن کرنے لگے "دیکھو... میاں۔ میں نے تم کو ان نشانات کے نام آخر کس لئے بتائے تھے۔؟

میں کانپتے ہوئے تھوڑی دیر تک سوچتا رہا اس کے بعد نہ جانے مجھے کس جذبے نے یہ کہنے کی ترغیب دی۔ میں تو سمجھا تھا کہ آپ جو کچھ بتلا رہے تھے وہ محض میری تفریح طبع کی خاطر بتا رہے تھے۔"

میرا جواب سُن کر وہ اور آگ بگولا ہو گئے۔ اِن کو بڑا طیش آیا اور وہ اتنے چراغ پا ہوئے (اس وقت دریا کے کسی موڑ سے گذر رہے تھے) کہ میرے اندازے کے مطابق اس غضبناکی کے عالم میں ان کو آگا پیچھا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور اسی رو میں ایک تجارتی کشتی کے چپّو کے قریب جا پہونچے۔ اس کشتی کے تاجروں نے انکو بُری طرح صلواتیں سنائیں۔ مسٹر بکسبی اتنے شرمندہ غالباً کبھی نہیں ہوئے ہونگے انھیں بے حد ندامت ہو رہی تھی کیونکہ ان کا سابقہ ایسے آدمیوں سے پڑ گیا تھا جو انھیں ترکی بہ ترکی جواب دے رہے تھے۔ اب انھوں نے ایک کھڑکی کھولی اور اس سے اپنا سر باہر نکالا اور پھر اُن میں اور کشتی کے ملاحوں میں ایسی کہا سُنی ہوئی کہ اس سے پیشتر میں نے کبھی نہیں سُنی تھی۔ اس تجارتی کشتی کے ملاحوں کی گالیاں اب جتنی مدھم ہوتی جاتی تھیں اُتنی ہی مسٹر بکسبی کی آواز بلند ہوتی جاتی تھی اور ان کی گالیوں کی تیزی اور تلخی بڑھتی جاتی تھی۔ جس وقت انھوں نے اپنی کھڑکی بند کی، ان کا سارا غصّہ کافور ہو گیا۔ اِس

وقت اگر آپ ان سے کتنے ہی سوال کرتے انکے منہ سے ایک بھی گالی آپکے یا آپکے والدین کے لئے نہیں نکلتی۔ فوراً ہی وہ مجھ سے بڑے نرم لہجے میں بولے ۔

"صاحبزادے تم ایک چھوٹی سی ڈائری اپنے پاس رکھا کرو اور جب میں کوئی بات تمہیں بتاؤں تم اسکو فوراً ڈائری میں نوٹ کر لیا کرو۔ پائلٹ بننے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ تم دریا کے متعلق شروع سے آخر تک تمام باتیں حفظ یاد کرلو۔ تم کو یہ سب باتیں ابجد کی طرح یاد ہونی چاہیئے ۔"

میرے لیے یہ انکشاف بڑا مایوس کن تھا کیونکہ میری یادداشت میں خالی کارتوسوں کے ذکر کے علاوہ اور کسی چیز کے ذکر کے گنجائش نہیں تھی لیکن میری ناامیدی زیادہ دیر تک نہ رہی اور میری سمجھ میں یہ بات آگئی کہ مجھے مسٹر بکسبی کی کچھ باتیں گمان لینی چاہیئں البتہ اس میں شک نہیں کہ مسٹر بکسبی کچھ مبالغہ بھی کرتے تھے اتنے ہی میں انھوں نے ایک رستہ لے کر بڑے گھنٹے پر چند چوٹیں لگائیں۔ اس وقت آسمان سے تارے رخصت ہو چکے تھے اور رات بالکل تاریک تھی۔ ساحل کے کنارے مجھے پہیوں کے گھومنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن مجھے اس بات کا کامل طور پر یقین نہیں تھا کہ ساحل واقعی دکھائی بھی دے رہا تھا یا نہیں ۔ اتنے ہی میں ہریکین ڈیک سے چوکیدار نے جو مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا آواز دی "وہ یہ کیا ہے جناب؟" جواب ملا " جونز کے باغات ۔

میں نے دل ہی دل میں کہا یہ غلط ہے کیوں نہ میں اس بات کی شرط لگالوں کہ یہ جونز کے باغات نہیں ہیں۔ لیکن میں خاموش ہی رہا اور اس بات کا منتظر رہا کہ دیکھئے اب کیا ہوتا ہے۔ مسٹر بکسبی نے انجن کی گھنٹیاں بجائیں اور جلد ہی کشتی ساحل سے جا لگی۔ آگے والے کمرے میں ایک ٹارچ جل رہی تھی۔ ایک آدمی ساحل پر اترا اور کنارے سے ایک جبلشی کی آواز آئی "وہ یہ جونز کے باغات ہیں" تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم پھر دریا کے چڑھاؤ کی طرف چلنے کو تیار تھے۔ میں بڑے غور سے کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر میں دھیرے سے بولا۔ اس جگہ کو تلاش کرنے میں کامیابی محض حسنِ اتفاق تھی غالباً آئندہ سو سال تک قسمت پھر اس طرح ساتھ نہیں دے گی۔ مجھے یقین کامل تھا کہ یہ محض اتفاقیہ امر تھا کہ ہمیں اس جگہ کا پتہ چل گیا۔

اب تک ہم دریا کے چڑھاؤ پر سات یا آٹھ سو میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے تھوڑا بہت مجھے دن میں دھارے کے چڑھاؤ پر کشتی چلانا آ گیا تھا اور سینٹ لوئی پہنچنے سے قبل میں نے رات میں بھی کام کرنے کی تھوڑی بہت مہارت حاصل کر لی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ یہ ترقی بہت معمولی تھی۔ میرے پاس ایک ڈائری تھی جس میں قصبوں، نشانوں، ریت کے کناروں، جزیروں، موڑوں اور موڑوں کے بیچ والے حصّوں کے نام بھرے پڑے تھے۔ لیکن یہ معلومات میں صرف ڈائری دیکھ کر ہی بتا سکتا تھا۔ ان سب چیزوں کے نام میرے دماغ میں نہیں تھے۔ جب میں یہ سوچتا کہ ابھی تو مجھے دریا کے صرف نصف حصّے کی باتیں معلوم ہوئیں ہیں تو میرا دل رنجیدہ ہونے لگتا تھا اور چونکہ ہمیں دن رات میں صرف چار گھنٹے ڈیوٹی اور پھر چار گھنٹے کا آرام ملتا تھا لہٰذا آرام والے چار گھنٹوں میں میری نوٹ بک میں کچھ بھی نوٹ نہیں ہو پاتا تھا۔ آغازِ سفر سے ہی یہ معمول رہا تھا ان ہی دنوں میرے حاکم (مسٹر بکسبی) کی خدمت بھاری رقم پر نیو آرلینز کی ایک بڑی کشتی کے لئے طلب کر لی گئیں۔ میں بھی اپنا سامان باندھ کر ان کے ساتھ چل دیا۔ یہ کشتی بہت شاندار تھی۔ جب میں پائلٹ ہاؤس میں کھڑا ہوا تو اس وقت میں پانی کی سطح سے اتنا بلند تھا گویا کسی پہاڑی پر کھڑا ہوں۔ اس کے وسیع عرشے میرے آگے اور پیچھے دُور دُور تک پھیلے ہوئے تھے۔ اب مجھے حیرت ہوتی تھی کہ میں نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ چھوٹا سا جہاز "پال جونز" ایک بڑا جہاز تھا۔ دونوں جہازوں میں اور بھی کئی فرق تھے۔ پال جونز کا پائلٹ ہاؤس ایک گھٹیا قسم کا تاریک اور خراب وخستہ کمرہ تھا جو سانپ کے بل کی طرح تنگ بھی تھا۔ اس کے برعکس آرلینز کی کشتی کا پائلٹ ہاؤس ایک عالیشان شیش محل تھا یہ اتنا کشادہ تھا کہ اس کے اندر رقص بھی کیا جا سکتا تھا۔ کھڑکیوں کے پردے خوبصورت سرخ اور سنہرے رنگ کے تھے۔ اس میں ایک شاندار صوفہ سیٹ بھی مہیا کیا گیا تھا۔ اس میں چمڑے کے تکیے لگے تھے اونچی بینچ میں پشت بھی بنی ہوئی تھی تاکہ مہمان پائلٹ آرام سے بیٹھ سکیں۔ مہمان پائلٹ اس بینچ پر بیٹھ کر قصے کہانیاں کہتے اور دریا کا نظارہ کرتے تھے۔ اس پائلٹ ہاؤس میں تھوکنے کے لئے برادہ بھرے ہوئے لکڑی کے صندوقوں کے بجائے چمکدار اور خوبصورت اگالدان رکھے تھے جو یہاں کی زیب و زینت میں چار چاند

لگار ہے تھے۔ فرش پر بالکل نیا اور نفیس قسم کا روغنی کپڑا بچھا ہوا تھا۔ موسم سرما میں مہمان نوازی کے لئے ایک بڑا اسٹور کھا رہتا تھا سینٹرل دہیل میرے سر کے برابر اونچا تھا اور اپنی مرصع کاری کی وجہ سے کافی قیمتی بھی تھا۔ آہنی تاروں کی بٹی ہوئی رسی اور گھنٹوں کے لئے پیتل کی چمکدار گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں۔ صاف ستھری وردی پہنے ہوئے ایک حبشی ملازم بھی تھا جس کا کام رات دن پہرے پر کام کرنے والے لوگوں کے لئے میٹھے سموسے۔ برف اور قہوہ وغیرہ لانا تھا۔ یہ سب دیکھ کر میرے دل میں ایک بار پھر حوصلہ پیدا ہوا اور میں سوچنے لگا کہ واقعی پائلٹ کا پیشہ بڑا ارمان پرور ہے۔ جب اسٹیمر چل رہا تھا تو میں اس کے اندر ادہر اودہر گھوم کر لطف اٹھا رہا تھا۔ یہ اسٹیمر نہایت شفاف تھا۔ جب میں اس کے وسیع اور سنہرے رنگ والے مسافروں کے کمروں کو دیکھ رہا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں کسی شاندار سرنگ کے اندر جھانک کر دیکھ رہا ہوں۔ اس کے ہر کمرے کے دروازے پر روغنی رنگوں سے بنی ایک تصویر لٹکی تھی جسے کسی قابل مصور نے بنایا ہوگا۔ کشتی کے کمروں میں جھاڑ فانوس لگے تھے جن کے چاروں طرف سہ پہلو بلوری شیشے جگمگا رہے تھے۔ کلرک کے دفتر میں بھی خاص سجاوٹ تھی۔ شراب خانے کو تو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اس کے ملازمین قالین اور پردوں پر اتنا پیسہ خرچ کیا گیا تھا جس کا صحیح اندازہ لگانا ممکن نہ تھا، میرے خیال سے بوائلر ڈیک جسے کشتی کی دوسری منزل کہنا چاہیئے ایک گرجا گھر کی طرح کشادہ اور وسیع تھا۔ ملاحوں کے رہنے کے لئے جہاز کا اگلا حصہ بھی بہت کشادہ تھا۔ عرشے پر کام کرنے والے مزدوروں کی، فائر مینوں اور گھاٹ پر کام کرنے والوں کی تعداد کچھ کم نہ تھی بلکہ وہاں آدمیوں کے دل کے دل کام کر رہے تھے بھٹیوں کی لمبی قطاروں میں خوفناک آگ تیزی سے دہک رہی تھی۔ ان بھٹیوں کے اوپر آٹھ بڑے بڑے بوائلر رکھے تھے۔ کشتی کی شان و شوکت کا اظہار زبان سے کرنا ممکن نہیں۔ انجن بھی بڑے بڑے تھے۔ لیکن اب داستان کو کہاں تک طول دیا جائے۔ اس سے پیشتر مجھے اتنی خوشی کہیں بھی اور کبھی نہیں ملی تھی۔ اور جب میں نے دیکھا کہ سلیقہ مند صاف ستھرے ملازمین کی پلٹن مجھے "جناب" کہہ کر خطاب دیتی ہے تو میں اپنی موجودہ حالت سے پوری طرح مطمئن ہو گیا۔

ساتواں باب

ایک دلیرانہ کارنامہ

جس وقت میں واپس پائلٹ ہاؤس میں آیا، سینٹ لوئی سے ہماری کشتی گذر چکی تھی۔ اس وقت میں حواس باختہ ہو رہا تھا کیونکہ دریا کے جس حصّے میں ہم اب سفر کر رہے تھے اس کے متعلق ساری معلومات میری نوٹ بک میں درج تھیں لیکن میں اس کا کچھ مطلب نکال نہیں پا رہا تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ دریا نے یہاں اپنا رُخ بدل دیا تھا۔ میں نے یہ حصّہ اس وقت دیکھا تھا جب میں دریا کے چڑھاؤ کی جانب جا رہا تھا لیکن دریا کے بہاؤ پر سفر کرتے ہوئے میں نے گردن گھما کر یہ دیکھنے کی کبھی ضرورت نہیں سمجھی کہ اس طرح دریا کیسا نظر آتا ہے۔ میرا دل پھر بیٹھنے لگا کیونکہ اب یہ ظاہر تھا کہ مجھے اس پریشان کُن دریا کے متعلق دونوں اطراف سے معلومات حاصل کرنی ہیں۔

پائلٹ ہاؤس پائلٹوں سے بھرا پڑا تھا۔ یہ لوگ دریا کا بغور مطالعہ کرنے کے لئے اس کے بہاؤ کی طرف سفر کر رہے تھے۔ دریا کے جس رخ کو بالائی رخ کہتے ہیں (یعنی سینٹ لوئی اور کیرو کے درمیان کا دو سو میل کا حصّہ جہاں دریائے او ہیو مسیسپی سے آکر ملتا ہے)۔ اس کی سطح نشیبی تھی اور دریائے مسیسپی اپنے راستہ کو پے در پے بدلتا رہتا تھا پائلٹوں کو ہمیشہ اس بات کی ضرورت رہا کرتی تھی کہ اگر کہیں پانی کم ہونے کی وجہ سے اُن کی کشتیاں بندرگاہوں میں ایک بھی ہفتہ ٹھہر جائیں تو وہ کیرو جاکر دریا کا از سر نو معائنہ کریں۔ یہ کام اِن بدنصیبوں کو کرنا پڑتا تھا جن کو جہاز میں شاذ و نادر ہی کرنے

کی جگہ ملتی تھی ۔ ان کو سونے کی جگہ ملنے کی امید ہو سکتی تھی ۔ اگر انھیں از سرِ نو تعینات کیا جائے۔ لہٰذا صرف ایک طرف کے سفر کے لئے وہ کسی ایسے مشہور پائلٹ کی جگہ کام کرنے کا موقع تلاش کرتے تھے جو اتفاقیہ بیمار ہو گیا ہو یا اُسے اتفاقیہ چھٹی کی ضرورت پیش آگئی ہو۔ بہت سے پائلٹ محض دریا کا معائنہ کرنے کے لئے متواتر اِدھر اُدھر رواں دواں رہتے تھے اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انھیں سونے کی جگہ ملنے کی کوئی امید ہوتی ہو بلکہ یہ تھی کہ چونکہ یہ لوگ کشتی میں مہمان کی حیثیت سے ہوتے تھے اور ان کے لئے کشتی میں بیٹھ کر دریا کو بغور دیکھنا اور وہیں کھانا کھانا کنارے پر بیٹھنے اور وہاں ہوٹل میں کھانے سے کہیں سستا پڑتا تھا ۔ لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا یہ لوگ زیادہ ذائقہ دار کھانا پسند کرنے لگے اور صرف اُن ہی کشتیوں میں سفر کرنے لگے جہاں اچھا کھانا ملنے کی امید ہوتی تھی ۔ ایسے مہمان پائلٹ جہاز رانوں کے لئے بڑے مفید ثابت ہوتے تھے کیونکہ جاڑا ہو یا گرمی، دن ہو یا رات یہ لوگ ہمیشہ خوشی خوشی مدد کرنے کے لئے مستعد رہتے تھے ۔ یہ لوگ دریا کی گہرائی کا پتہ لگانے میں یا اور جس کام میں پائلٹوں کو مدد کی ضرورت ہوتی تھی مدد دیتے رہتے تھے ۔ ان کا خیر مقدم اس وجہ سے بھی کیا جاتا تھا کیونکہ سب پائلٹ بڑے باتونی ہوتے ہیں جب وہ مل بیٹھتے ہیں تو باتیں کرتے کبھی تھکتے ہی نہیں اور چونکہ ان کی باتیں عموماً دریا کے متعلق ہی ہوتی تھیں اس لئے سب کی سمجھ میں آجاتی تھیں اور سب انہیں دلچسپی لیتے تھے ۔ جو شخص حقیقی معنوں میں پائلٹ ہوتا ہے وہ دریا کے علاوہ دنیا کی کسی اور چیز کو خاطر میں نہیں لاتا ۔ اس کو اپنے پیشے پر جتنا فخر ہوتا ہے اتنا کسی بادشاہ کو اپنی بادشاہت پر بھی نہیں ہوتا

اس سفر میں ہمیں ان دریائی انسپکٹروں کی بڑی دلچسپ صحبت نصیب ہوئی ۔ ان کی تعداد آٹھ یا دس ہوگی ہمارے وسیع پائلٹ ہاؤس میں ان کے لئے بہت جگہ تھی ان میں سے دو یا تین صاحبان چمکدار ریشمی ہیٹ پہنے ہوئے تھے ۔ ان کی قمیصوں کے دامن لمبے چوڑے تھے اور ان کے سینوں پر ہیروں کی پنیں لگی ہوئی تھیں ، وہ ہاتھوں میں بکری کی کھال کے دستانے پہنتے تھے اور پیروں میں عمدہ قسم کے چمڑے کے جوتے ۔ یہ لوگ شستہ انگریزی بولتے اور پائلٹ کی باوقار حیثیت سے بڑی شان و شوکت سے رہتے تھے ۔ ان کی یہ شان و شوکت اِن لوگوں جیسی تھی جنکے ذرائع بڑے معقول ہوں اور جو شہرت کے مالک ہوں ۔ باقی اور پائلٹوں کی پوشاک ڈھیلی ڈھالی تھی ان کی اونچی اونچی نیلٹ

کی لوٹپیاں مخروطی شکل کی تھیں جن کو دیکھ کر دولتِ مشترکہ کے دنوں کی پوشاک یاد آجاتی تھی۔

ان معزز اور بلند اقبال ہستیوں کے مقابلے میں میری حیثیت کچھ بھی نہیں تھی گو میں بالکل بے حس و حرکت تو نہیں بیٹھا تھا تاہم مجھے اپنی پستی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ جب عجلت میں پتوار کو جلدی سے گھمانے کی ضرورت ہوتی تھی تو میں اچھا معاون ثابت نہیں ہو پاتا تھا۔ اسوقت جو بھی معزز مہمان میرے قریب کھڑا ہوتا وہ حسب ضرورت میری مدد کر دیتا۔ میری مدد اُسے قریب قریب لگاتار ہی کرنی پڑتی تھی کیونکہ اس حصہ میں دریا کا راستہ عجیب اور ٹیڑھا میڑھا سا تھا اور پانی بھی یہاں کم تھا۔ ایک بار میں ایک کونے میں کھڑا تھا یہاں کھڑے کھڑے جو باتیں میں نے سنیں ان سے تو میری رہی سہی امیدیں بھی جاتی رہیں۔ ایک مہمان نے دوسرے سے کہا۔

"جم، چڑھاؤ پر آتے ہوئے تم نے پلم پوائنٹ کیسے پار کیا۔؟

اس نے جواب دیا " اسوقت رات تھی اور میں نے وہ پوائنٹ ڈائینا کو کے ایک لڑکے کی ہدایت کے مطابق پار کیا۔ میں لکڑی کے ڈھیر سے پچاس گز اوپر سے روانہ ہوا جہاں فالس پوائنٹ تھا۔ پلم پوائنٹ کے پاس آکر میں کیبن میں کھڑا ہو گیا اور اس وقت تک کھڑا رہا جب تک میں نے بادبان کے سرے کو پونے دو فیدم[1] اوپر نہ اٹھا لیا اور تب درمیانی ریت کی قطار میں سیدھا چلا گیا یہاں تک کہ میں موڑ کے پاس والی کپاس کی جھاڑی تک پہونچ گیا۔ تب میں نے دنبالۂ جہاز کو کپاس کی جھاڑی کے اوپر سے نکالا اور اس کے سرے کو پلم پوائنٹ کے پاس والی نشیبی جگہ کے اوپر سے لے جا کر ساڑھے نو فیدم تک آگیا۔

" تب تو تم بہت کامیاب رہے "۔

" لیکن بالائی ریتیلا ساحل نیچے کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے " پھر دوسرا پائلٹ بولا " جب میں چلا تھا تو پانی اس سے زیادہ تھا۔ میں کشتی کو ایکدم نیچے لے گیا میں نے فالس پوائنٹ سے چلنا شروع کیا اور دو فیدم چلا گیا پھر بادبان کا دوسرا کونا اٹھا دیا کیونکہ اس کے پہلو میں ہی دریا کے موڑ پر ایک رکاوٹ تھی اور پانی پونے دو فیدم ہی تھا "۔ پھر ایک اور ذی مرتبہ مہمان پائلٹ بولا۔

---

[1] فیدم۔ چھ فٹ لمبا پیمانہ جو پانی ناپنے کے کام آتا ہے۔

"میں تمھارے رہنماؤں کی عیب جوئی نہیں کرنا چاہتا لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پلم نشان پر پانی کافی مقدار میں ہے۔"

یہ بات سب لوگوں نے مان لی اور اسکا اعتراف کرتے ہوئے انھوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس سے اس کشتی خورے پر ایک خاموش پھٹکار پڑی اور اس کے بعد وہ کچھ نہ بولا۔ پھر یہ لوگ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس دوران میں جو بات میرے ذہن میں گھوم رہی تھی وہ یہ تھی کہ اگر یہ باتیں سب ٹھیک ہیں تو مجھے نہ صرف شہروں، جزیروں اور موڑوں کے نام ہی یاد رکھنے ہیں بلکہ ہر قدیم پیڑ اور جھاڑی اور لکڑی کے ڈھیر کو جو کناروں پر بارہ میل تک پھیلے ہوئے ہیں یاد رکھنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ چیزیں اندھیرے میں کیسے تلاش کرتے ہیں جب تک کسی کو ایسی آنکھیں میسر نہ ہوں جو دو میل تک گہری تاریکی میں دیکھ سکتی ہوں۔ کاش کہ یہ پائلٹ کا کام میں 'جیریکو' میں کرتا۔ پہلے مجھے اس کا خیال بھی نہ آیا تھا۔

جب شام کی تاریکی چھانے لگی تو مسٹر بکسبی نے تین مرتبہ بڑے گھنٹے کو حرکت دی (یہ خشکی پر اُترنے کا اشارہ تھا)۔ کپتان اپنی نشستگاہ سے جو کشتی کے سب سے اگلے حصّے میں تھی باہر نکل آیا اور اس نے مسٹر بکسبی کی طرف مستفسرانہ انداز سے دیکھا۔

مسٹر بکسبی نے کہا "کپتان صاحب۔ آج رات بھر ہم لوگ یہیں آرام کریں گے۔"

کپتان نے جواب دیا "ٹھیک ہے جناب۔"

بات یہیں ختم ہوگئی۔ کشتی کنارے پر لگ گئی اور رات بھر کے لئے اسے باندھ دیا گیا۔

مجھے یہ بات بہت اچھی معلوم ہوئی کہ پائلٹ کو کپتان ایسے اعلیٰ عہدیدار کی اجازت کے بغیر حسب مرضی ہر کام کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ میں نے شام کا کھانا کھایا اور فوراً بستر پر دراز ہوگیا۔ دن بھر کے مشاہدوں اور تجربوں کی وجہ سے میرا حوصلہ ٹوٹ گیا تھا۔ پچھلے سفر میں جو نام میں نے ڈائری میں لکھے تھے وہ کچھ مہمل اور بے معنی معلوم ہوتے تھے۔ میں نے جب کبھی اس ڈائری پر نظر ڈالی، میں عجیب اُلجھن میں پڑ گیا۔ مجھے اُمید تھی کہ سونے سے مجھے کچھ آرام ملے گا، لیکن ایسا نہیں ہوا دوسرے روز آفتاب کے طلوع ہونے تک یہ سب باتیں میرے ذہن میں گھومتی رہیں اور میں بڑے اضطراب میں رہا، مجھ پر ایک مسلسل خوفناک خواب کا سا عالم طاری تھا۔

جب میں اگلی صبح اٹھا تو میرا حال بہت خستہ تھا ۔ میرا دل بیٹھا جا رہا تھا ہم لوگ پھر کشتی چلانے میں جُت گئے ۔ اس دوران میں ہم نے کئی موافق حالات سے فائدہ اٹھایا کیونکہ ہم چاہتے تھے کہ رات ہونے سے پہلے ہی اس جگہ سے جتنی جلدی نکل سکیں نکل جائیں ۔ کیونکہ ہم جلدی کیرو پہونچنا چاہتے تھے ۔ لیکن مسٹر بکسی کے ساتھی نے جو ایک پائلٹ تھا، کشتی کو دریا کی تہہ میں پھنسا دیا اور ہمیں اسے وہاں سے نکالنے میں اتنی دیر لگ گئی کہ دہانے تک پہونچنے سے پہلے تاریکی کا چھا جانا یقینی معلوم ہونے لگا ۔ یہ انتہائی بدقسمتی کی بات تھی خاص کر ہمارے جہاں پائلٹوں کے لئے تو یہ اور بھی پریشان کن تھی کیونکہ ان کی کشتیاں وہاں ان کا انتظار کر رہی تھیں اور ان کو ...
بغیر لئے خواہ کشتی میں دیر کیوں نہ لگ جائے، وہ کشتیاں دہانے سے روانہ نہیں ہو سکتی تھیں ۔ اس فکر سے ان لوگوں کی گفتگو میں بڑی سنجیدگی آ گئی تھی ۔ دریا کے خلاف جاتے ہوئے پائلٹوں کو نہ تو پانی کی اونچی نیچی سطح کا خیال ہوتا ہے اور نہ کسی قسم کی تاریکی کا ۔ کہرے کے سوا ان کے راستے میں اور کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی ۔ لیکن بہاؤ کی طرف کئی مشکلات ہوتی ہیں ۔ تیز دھارے کی رو میں کشتی کچھ کام نہیں کرتی ۔ تیز دھارا اس کو مسلسل دھکیلتا رہتا ہے ۔ اسی لئے عام طور پر بہاؤ کی طرف جہاں پانی کی سطح نیچی ہوتی ہے رات کشتی کو نہیں چلائی جا سکتی ۔

بہرحال ابھی کچھ امید باقی تھی اور وہ یہ کہ اگر ہم صاف ہونے سے قبل ہیٹ آئی لینڈ کے پیچیدہ اور خطرناک مقام کو عبور کر لیں، تو پھر بقیہ سفر کے لئے ہمارا حوصلہ بندھ سکتا ہے ۔ کیونکہ اس مقام سے آگے پانی ساکن ہونے کی وجہ سے کشتی آسانی سے چلائی جا سکتی تھی ۔ علاوہ بریں وہاں پانی نسبتاً زیادہ تھا ۔ لیکن رات کے وقت ہیٹ آئی لینڈ تک پہونچنے کی کوشش کرنا محض پاگل پن تھا ۔ اسلئے دن بھر سب لوگ [illegible] گھڑیوں کی طرف دیکھتے رہے ۔ جس رفتار سے ہم آگے بڑھ رہے تھے ۔ اسکا ہر لمحہ حساب لگاتے جاتے تھے ۔ اس وقت جزیرہ ہیٹ کے موضوع پر ہی گفتگو ہو رہی تھی ۔ کبھی تو ہمارے حوصلے بلند ہو جاتے تھے اور کبھی راستہ خراب ہونے کی وجہ سے رفتار سست ہونے لگتی تھی ۔ تاہم کچھ دیر بعد کشتی پھر چلنے لگی ۔ گھنٹوں تمام لوگ اس کشمکش میں مبتلا رہے ۔ مجھے کئی یہ دقتیں بڑھائی گئیں اور جزیرہ ہیٹ کے متعلق میں بھی اسقدر فکرمند ہوا اور مجھے ذمہ داری کے احساس نے اسقدر دبا یا کہ میرے دل میں یہ زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ کسی طرح جزیرہ ہیٹ پہونچ کر اطمینا

کی سانس لیں اور پھر آگے بڑھیں۔ ہم لوگ باقاعدہ ڈیوٹی بھی نہیں دے رہے تھے۔ ہر پائلٹ اتنے ہی فاصلے تک کشتی چلاتا تھا جتنے میں نے دریا کے چڑھاؤ پر جاتے ہوئے چلائی ہوتی کیونکہ وہی وہاں کے نشیب وفراز سے بخوبی واقف ہو سکتا تھا۔ تاہم پائلٹ ہاؤس میں دونوں پائلٹ برابر موجود رہتے تھے۔

غروب آفتاب سے ایک گھنٹہ پہلے مسٹر بکسبی نے پہیہ اپنے ہاتھ میں لیا اور مسٹر ڈبلو بٹ گئے۔ پھر تیس منٹ تک ہر شخص اپنے ہاتھ میں گھڑی تھامے بے چین اور خاموش بیٹھا رہا۔ آخر کار سرد آہ بھر کر ایک شخص بولا۔ "ہیٹ آئی لینڈ ابھی دور ہے اور اب ہمارا وہاں تک پہونچنا مشکل ہے۔"

سب لوگوں نے ایک ساتھ اپنی اپنی گھڑیاں رکھ دیں۔ ہر شخص سرد آہیں بھر رہا تھا اور منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا "یہ تو بڑی بری بات ہے۔ یہاں تو بڑی نامناسب بات ہے۔ کاش ہم یہاں آدھ گھنٹہ پہلے پہونچ گئے ہوتے اس وقت وہاں انتہائی مایوسی کن فضا طاری تھی۔ بعض لوگ باہر جاکر کھڑے ہو گئے بعض ادہر ادہر گھومنے لگے۔ خشکی پر اترنے کے لئے ابھی تک کوئی گھنٹی سنائی نہیں دی تھی آفتاب افق کے پیچھے غروب ہو چکا تھا اور کشتی چلی جارہی تھی۔ ہر شخص ایک دوسرے کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ ایک شخص ایک دروازے کے دستے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا اور اس کو گھمارہا تھا۔ شاید وہ کسی بات کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ اٹھا لیا اور دستہ پھر پیچھے چلا گیا۔ ہم لوگ دریا کے موڑ پہ مستعدی کے ساتھ چلے جارہے تھے لوگ برابر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سب حیرت بھرے انداز سے سر ہلا کر کبھی کبھی پائلٹ کی تعریف کرتے مگر سب کے سب خاموش تھے۔

جب آسمان پر تاریکی چھا گئی اور دو چار دھندلے سے ستارے نکل آئے تو لوگ حواس باختہ سے ہو کر مسٹر بکسبی کے گرد جمع ہو گئے۔ گہری خاموشی اور انتظار بے حد کرب ناک ہو گیا تھا۔ اچانک مسٹر بکسبی نے رسی کھینچی اور بڑے گھنٹے کی زوردار مگر خوشگوار آوازرات کے سناٹے میں دوبار سنائی دی پھر کچھ دیر رک کر گھنٹے کی آواز ایک بار اور آئی اس کے بعد ہم کیدار نے ہریکین ڈیک سے چلا کر کہا۔ بائیں طرف چلئے۔ دائیں طرف چلئے اب دور سے بنسال انداز وں کی

آوازیں آئیں اور ان آوازوں کو سیری کین ڈیک پر تعینات قاصدوں نے بڑے تند لہجے میں دہرایا۔

"تین فیدم۔ا۔ تین فیدم۔ا۔ پونے تین فیدم۔ا۔ ڈھائی فیدم۔ا۔ سوا دو فیدم۔ا۔ دو فیدم ا۔ پونے دو فیدم"

مسٹر بکسبی نے دونوں گھنٹیوں کے رسوں کو کھینچا اور انجن کے کمرے سے دھیمی دھیمی آواز آئی اور بھاری رفتار دھیمی پڑ گئی۔ گیج کاک (بھاپ نکلنے کا منہ) سے بھاپ تیزی سے نکلنے لگی۔ پیمائش اندازوں کی چیخ و پکار جاری تھی۔ رات کے وقت انکی آوازیں عجیب و غریب معلوم ہوتی تھیں ہر پائلٹ اب ٹکٹکی باندھے اور سانس روکے یا آہستہ آہستہ بات کرتے ہوئے بڑے انہماک سے انتظار کر رہا تھا۔ سوائے مسٹر بکسبی کے کسی آدمی کو چین نہیں تھا۔ مسٹر بکسبی بھی اپنا پہیہ کھڑا کر کے اس کے ایک ڈنڈے پر کھڑے ہو گئے۔ اس کے بعد جہاز نے ان نشانات کی طرف رخ کیا جو مجھے نظر نہیں آ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ہم ایک وسیع اور تاریک سمندر کے وسط میں کھڑے ہوں یہاں آ کر مسٹر بکسبی کشتی کو روکنا چاہتے تھے لوگوں کی بڑبڑاہٹ میں کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا البتہ کبھی کبھی ایک دو صاف جملے سنائی پڑ جاتے تھے۔ مثلاً

"دیکھو، دیکھو، پہلے بادبان کے پاس کشتی صحیح و سلامت ہے"

تھوڑی دیر ٹھہر کر دوسری دبی ہوئی سی آواز سنائی دی

"جارج کی قسم کشتی کا دنبالہ بالکل ٹھیک نیچے آ رہا ہے"

"اب وہ نشانات کی حدود میں ہے اور ان سے اوپر اٹھ رہی ہے"

ایک اور شخص نے بڑبڑاتے ہوئے کہا "یہ تو کمال ہے۔ کمال ہے"

اب انجن بالکل روک دئے گئے اور کشتی دھارا کے ساتھ بہنے لگی۔ دراصل میں نے کشتی کو دھارا میں بہتے ہوئے نہیں دیکھا اور میں دیکھ بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ ستارے اوجھل ہو چکے تھے۔ کشتی کا اس طرح بہنا خطرناک تھا اس سے دل بیٹھتا ہوا محسوس ہوا۔ اسی اثنا میں مجھے اس سے بھی زیادہ المناک حادثہ کا احساس ہوا۔ کشتی کسی جزیرے کے قریب تھی اور اسی طرف بڑھی جا رہی تھی اور ہم اس کے گہرے سایہ میں پہنچ گئے تھے اور اب کشتی ٹکرانے کا خطرہ اتنا قریب

تھا کہ میرا تو اسکے تصور سے ہی دم گھٹا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ میرے دل میں یہ جذبہ بھی زور پکڑ رہا تھا کہ ہمت کر کے کسی نہ کسی طرح کشتی کو بچایا جائے مگر مسٹر بکسی اسوقت بھی پہلے کے پاس خاموش کھڑے تھے وہ بلی کی طرح کسی چیز کی تاک میں تھے اور دوسرے پائلٹ شانہ بشانہ ان کے پیچھے کھڑے تھے۔ کسی نے سرگوشی کی۔

"کشتی وہاں نہیں پہونچ سکے گی۔"

پنسال اندازوں کے مطابق پانی اتھلا ہوتا جا رہا تھا یہانتک کہ آواز آئی "ساڑھے آٹھ ـــ آٹھ فٹ ـــ آٹھ فٹ ـــ سات فٹ اور ---

اب مسٹر بکسی نے اپنی بولنے والی نلی کے ذریعہ انجلینر کو آگاہ کرنے کے لئے کہا "اب یہیں کھڑے ہو کر انتظار کرو۔"

جواب ملا "اچھا جناب"

پھر آواز آئی "ساڑھے سات! سات!! اور اب چھ-----"

کشتی اب دریا کی تہ سے جا لگی تھی اتنے ہی میں مسٹر بکسی نے متعدد مرتبہ گھنٹیاں بجائیں اور نلی کے ذریعہ چلا کر کہا "اب اسے تہ سے لگنے دو۔ تم نے اپنی پوری کوشش کر لی اور تم کچھ نہ کر سکے۔" پھر انھوں نے اپنے ساتھی پائلٹ سے کہا "کشتی زور سے دبا کر گھسیٹو۔ زور سے کھینچو" اب کشتی دریا کی تہ سے رگڑ کھانے لگی اور ریت میں پھنس گئی اب وہ کسی بھی لمحہ تباہی سے ہمکنار ہو سکتی تھی۔ وہ برابر دھنستی چلی جا رہی تھی۔ مسٹر بکسی کے پیچھے کھڑے لوگوں کی زبردست چیخ پکار سے پائلٹ ہاؤس کی چھت لرز گئی۔ ایسا حادثہ اس سے پیشتر کبھی پیش نہ آیا ہوگا۔

لیکن اسکے بعد کوئی مصیبت نازل نہیں ہوئی اور مسٹر بکسی اس رات کے ہیرو ثابت ہوئے کم از کم تھوڑی دیر تک تو ملاحوں میں ان کی جانب زور کا چرچا رہا۔

اس بات کا مکمل اندازہ کرنے کے لئے کہ دریا کے تاریک حصے میں ایک بڑے اسٹیمر کو حیرت انگیز مستعدی کے ساتھ کس طرح ٹھیک جگہ پر رکھا جائے صرف یہ جاننا ہی ضروری نہیں ہے کہ رکاوٹوں اور ریت کے تاریک ڈھیروں سے بچا کر اس کے لئے کس طرح راستہ نکالا جائے اور کس طرح جزیرے کو چھوتے ہوئے نکلنا چاہئے کہ جہاز کا اگلا حصہ صرف جزیرے کے اوپر

اُگی ہوئی نباتات کو چھوئے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ کیسے ایک پوشیدہ چٹان سے اُسے بال بال بچایا جائے کیونکہ اگر کشتی کو اس سے ٹکراگئی تو اس کا ڈھانچہ اس میں پھنس جائے گا اور اس طرح ڈھائی لاکھ ڈالر کی قیمت کا سامان پانچ ہی منٹ میں ضائع ہوجائے گا اور ہو سکتا ڈیڑھ سو جانیں بھی اس کے ساتھ ضائع ہوجائیں۔

اس روز رات کو میں نے جو آخری بات سُنی وہ مسٹر بکسی کی تعریف تھی خود سے کلام کرتے ہوئے ہمارے ایک مہمان بڑے جذباتی لہجے میں یہ فرما رہے تھے ۔

"ہم بلاشبہ موت کے سایہ میں آگئے تھے مگر یہ پائلٹ غضب کا ہے ۔"

آٹھواں باب

پریشان کُن سبق

اس مصیبت سے گذرنے کے بعد میں نے جزیروں، شہروں۔ ساحلوں کے نشانوں اور موڑوں کے نام حفظ کرنے شروع کر دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عجیب اور بیکار سا بوجھ دماغ پر سوار ہوگیا۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ جب میں آنکھیں بند کر کے سوچتا تو ناموں کی ایک لمبی فہرست میرے دماغ میں آجاتی ہر پچاس میل کے فاصلے میں زیادہ سے زیادہ دس میل کے فاصلے سے مقامات کے نام میرے ذہن سے محو ہوئے ہوں گے ۔ اب مجھے محسوس ہونے لگا تھا کہ میں نیو آرلینز تک کشتی لے جا سکتا ہوں بشرطیکہ میں اُسے بیچ کے چھوٹے چھوٹے فاصلوں سے (جن سے میری واقفیت کم تھی) نکال کرلے جا سکوں۔ لیکن ایسا موقع مشکل سے ہی ملتا تھا جب میں اپنی خود اعتمادی کے بھروسہ پر کام کرسکوں کیونکہ اگر ذرا بھی میں خود مختار ہونے کی کوشش کرتا تو مسٹر بکسی

فوناد بانے کی کوشش کرتے تھے۔

ایک دن مسٹر بکسی دفعتاً میرے پاس آپہونچے اور انھوں نے ایک سوال پوچھ کر مجھ پر بڑی کراری چوٹ کی۔ اس نے پوچھا "وانٹ بیڈ کی شکل کیسی ہے۔؟ پوچھنے کو تو وہ مجھ سے کیسا ہی بیڈ ھب سوال کر سکتے تھے۔ ہوسکتا ہے وہ مجھ سے پوچھ بیٹھتے۔ "تمھاری دادی کی رائے مادۂ حیات کے بارہ میں کیا تھی۔؟

میں نہایت احترام کے ساتھ ان کے سوال پر غور کرنے لگا اور پھر میں نے جواب دیا مجھے اس بات کا علم نہیں کہ وانٹ بیڈ کی کوئی خاص صورت ہے "مسٹر بکسی جو آگ بگولا ہو رہے تھے گرج پڑے اور مجھ پر گالیوں کی بوچھار شروع کر دی اور اسوقت تک بکتے رہے جب تک ان کا گالیوں کا خزانہ ختم نہ ہوگیا۔ مجھے یہ بھی علوم تھا کہ میرے افسر کے پاس گالیوں کا کتنا بارود ہے اور یہ کہ جب وہ ختم ہو جائیں گی تو وہ خود ہی ٹھنڈے پڑجائیں گے اور ان کا دل نرم ہو جائے گا۔ پھر یہ بزرگ اپنی حرکت پر پچھتانے بھی لگیں گے۔ 'بزرگ' کا لفظ تو میں نے ان کے لئے محض محبت کی وجہ سے استعمال کیا ہے ورنہ ان کی عمر ۳۲ سال سے زیادہ نہ تھی۔ میں انتظار کر رہا تھا کہ کب ان کا غصہ ٹھنڈا ہو۔ جب ان کا غصہ ٹھنڈا ہوگیا تو وہ مجھ سے بولے "صاحبزادے تم کو دریا کی ہیئت کا مکمل علم ہونا چاہیئے۔ کسی بہت ہی تاریک رات میں اس کشتی چلانے کے لئے دریا کی شکل کو یاد رکھنے کی بہت ضرورت پڑتی ہے۔ باقی اور باتیں تو دماغ سے اتر جاتی ہیں لیکن اس بات کا دھیان رکھنا کہ دریا کی شکل رات کے وقت کچھ اور ہوتی ہے اور دن میں کچھ اور، بہت ضروری ہے۔"

میں نے پوچھا " تو پھر میں یہ باتیں کیسے سیکھ سکتا ہوں ؟

مسٹر بکسی نے جواب دیا " رات کے وقت اپنے گھر کے اندھیرے کمرے میں تم کیسے پتہ لگا لیتے ہو کہ کون چیز کہاں رکھی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ تمہارے دماغ میں اس کمرے کی شکل محفوظ رہتی ہے اگرچہ اسوقت وہ کمرہ تمہیں نظر نہیں آتا۔"

میں نے دریافت کیا " کیا آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے اس بیکراں دریا کی لاکھوں جزئیات کا علم بالکل اسی طرح ہونا چاہیئے جس طرح مجھے اپنے گھر کے صدر کمرے کی ساخت کا پتہ

ہے۔ مسٹر بکسبی بولے "اپنی عزت کی قسم تم کو ان جزیات اور تفصیلات کا اس سے زیادہ علم ہونا چاہیئے جتنا کسی شخص کو اپنے ذاتی مکان کے کمرہ ہال کی ساخت کا ہوتا ہے۔"

میں کہہ اٹھا "کاش مجھے موت آجاتی۔"

مسٹر بکسبی نے پھر کہا "میں تمہارا دل نہیں توڑنا چاہتا مگر..... بیچ ہی میں میں بولا۔ "اچھا اچھا۔ میرے سر پر ان معلومات کا انبار لگادیجئے میں ابھی سب باتیں یاد کر لوں گا۔ کسی اور وقت کے لئے نہ اٹھا رکھوں گا۔" مسٹر بکسبی نے فرمایا "دیکھو ان سب باتوں کا علم تو حاصل کرنا ہی ہوگا۔ اس سے کسی طرح مفر نہیں۔ ایک صاف ستھری رات میں جبکہ آسمان پر ستارے خوب جگمگا تے ہوں تو دریا کے ساحلوں پر ایسے گھنے سائے ہوتے ہیں اگر تم کو ساحل کی ہیئت کا ٹھیک ٹھیک علم نہ ہو تو تم شہتیروں کے ڈھیر کو ہاتھ سے نوچنے لگو گے کیونکہ تم اسے ٹھوس زمین والی راس سمجھو گے۔

اور پھر تم دیکھو گے کہ تم پر ہر پندرہ منٹ کے بعد موت کی دہشت بھی طاری ہو جائیگی اور دہشت کے مارے تم کنارے سے ہمیشہ پچاس گز کی دوری پر رہو گے جبکہ تمہیں رہنا چاہیئے صرف پچاس فٹ دور۔ ان سایوں میں اگر کوئی رکاوٹ ہوگی تو تمہیں وہ بھی نہیں دکھائی دیگی گو ویسے تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ رکاوٹ کہاں ہے اور دریا کی شکل جوں جوں تم اس میں چلو گے تمہیں بتائے گی کہ خطرہ کہاں ہے۔ اب کسی تاریک دریا کا تصور کرو جب گھنگھور اندھیرا چھایا ہو۔ ایسی رات میں دریا کی ہیئت اس رات سے بالکل مختلف ہوتی ہے جبکہ آسمان پر ستارے جگمگا رہے ہوتے ہیں۔ ایسی حالت میں تمام کنارے سیدھی لکیروں کی شکل میں نظر آتے ہیں اور وہ بہت دھندلے بھی ہوتے ہیں اگر تمہیں دریا کی شکل کا مجموعی علم نہیں ہے تو تم سب کناروں کو سیدھا تصور کرو گے۔ اگر تم ہمت سے کام لے کر اپنی کشتی کو ساحل کی طرف لے جاتے ہو جو ایک مضبوط اور سیدھی دیوار معلوم ہوتی ہے (اگرچہ تم کو یہ بخوبی معلوم ہے کہ درحقیقت اس مقام پر کنارا ٹیڑھا ہے) تو وہ دیوار گر جاتی ہے اور اس کے گرنے سے تمہارے جانے کے لئے راستہ صاف ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد تم کو سیاہی مائل سفید کہرے سے سابقہ پڑتا ہے۔ اب تم ایک ایسی رات کا تصور کرو جبکہ خاکی رنگ کا کہرا چھایا ہو یا ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہو اور سیاہی

مائل سفید کہرا چھایا ہو اور ساحل کی کوئی خاص شکل نظر نہ آرہی ہو تو اس وقت دنیا کے سب سے زیادہ سن رسیدہ انسان کا سر بھی چکرا جائے گا کہ کیا کیا جائے۔ علاوہ اس کے مختلف قسم کی چاندنی سے بھی دریا کی شکل میں مختلف طرح کی تبدیلی واقع ہو جاتی ہے اور دیکھو......"
میں فوراً بات کاٹ کر بول اٹھا "رہنے دیجئے۔ اب آپ براہ مہربانی کچھ نہ کہئے۔ کیا واقعی مجھے ان پچاس لاکھ حالتوں میں دریا کی ہیئت میں جو تبدیلیاں آتی ہیں ان سب کو یاد رکھنا ہوگا۔ اگر میں یہ تمام بوجھ اپنے سر پر لاد کر چلوں گا تو میرے کندھے جھک جائیں گے۔"

مسٹر بکسبی نے جواب دیا۔ ارے نہیں۔ تم صرف دریا کی شکل یاد کرلو اور اسے اسقدر وثوق کے ساتھ یاد رکھو کہ تم اسے یاد رکھتے ہوئے کشتی کو چلا سکو تمہیں صرف دریا کی ہیئت کے مطابق چلنا ہے جو تمہارے دماغ میں نقش ہو جائے گی نہ کہ اسکے مطابق جو تمہاری نظر کے سامنے ہو۔"

میں نے جواب دیا۔ بہت اچھا۔ میں کوشش کروں گا۔ لیکن میں اس پر اعتبار اسی وقت کروں گا جب مجھے سب کچھ یاد ہو جائے گا، مگر کیا اس کی شکل بدستور ویسی ہی رہے گی اس میں کوئی ردوبدل نہ ہوگی جس کی وجہ سے میں بیوقوف بن جاؤں؟"

قبل اسکے کہ مسٹر بکسبی میری بات کا جواب دیں، مسٹر ڈبلوڈ یوٹی پر آپہونچے اور انھوں نے کہا " بکسبی تم کو پریذیڈینٹ آئی لینڈ اور اولڈ ہین، اور چکنس سے اوپر کے تمام علاقے کو بغور دیکھتے ہوئے چلنا ہے کیونکہ دریا کے ساحل پر گڈھے بنتے جا رہے ہیں اور ان کی شکل میں بڑی جلدی جلدی تبدیلی ہو رہی ہے۔ کیا آپ کو نشان ۶۸ کے اوپر دلے مقام کا حال معلوم ہے جہاں پہلے پرانا انجیر کا درخت رکاوٹ بنا پڑا تھا اب وہ وہاں ..... نہیں ہے اور تم اب اس موڑ کے بیچ سے ہو کر نکل سکتے ہو۔"

اور یوں میرے سوال کا جواب مل گیا۔ ساحل کئی کئی میل تک ہیئت بدل رہا تھا۔ میری ہمت پھر جواب دینے لگی۔ مجھے دو باتیں واضح طور پر نظر آرہی تھیں، ایک تو یہ کہ پائلٹ کی معلومات ایک عام آدمی سے کہیں زیادہ ہونی چاہئیں اور دوسری یہ کہ پائلٹ کو یہ سب باتیں

ہر ۴ گھنٹے کے بعد پائلٹ کو اپنی معلومات پر نظرِ ثانی کرنی چاہیئے۔

اس روز ہم لوگ ۱۲ بجے رات تک ڈیوٹی پر رہے۔ ڈیوٹی بدلتے وقت دو پائلٹوں کا آپس میں تھوڑی دیر بات چیت کرنا دریائی زندگی کا بہت پرانا دستور ہے۔ ڈیوٹی پر آنے والا پائلٹ اپنے دستانے پہنے گا اور اپنا سگار سلگائے گا اور ڈیوٹی سے سبکدوش ہونے والا پائلٹ کچھ اس قسم کی باتیں کرے گا۔ "میرا خیال ہے کہ ہیلز ہوائنٹ پر اوپر کی جانب جو ریت کا پشتہ تھا وہ کچھ نیچا ہو رہا ہے۔ اب وہ نیچے کی پنسال کے مطابق سوا دو فیدم اور اور دوسری پنسال کے مطابق صرف دو فیدم ہے۔"

"ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔ پچھلے سفر کے وقت وہ کسی قدر نشیب میں جا رہا تھا کیا آپ کو کوئی اور کشتیاں ملیں۔"

"ہاں اکیسویں نشان پر ایک کشتی ملی تھی لیکن وہ دور ساحل پر رکی ہوئی تھی اور میں اُسے اچھی طرح سے نہیں پہچان سکا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ یہ سنّی ساؤ تھ ہوگی۔ کیا چمنی کے آگے کوئی روشندان نہیں تھا۔

اسی طرح دونوں میں باتیں ہوتی رہیں گی اور جب ڈیوٹی پر آنیوالا پائلٹ پہیہ ہاتھ میں لے لے گا تو اس کا ساتھی کہے گا کہ ہم لوگ فلاں موڑ سے ہو کر آئے ہیں اور فلاں شخص کے جنگلی علاقہ جات یا فلاں شخص کی بستیوں کے برابر چل رہے تھے۔ اسے حُسنِ اخلاق سمجھا جاتا ہے لیکن میرے خیال میں اس قسم کی گفتگو بہت ضروری ہوتی ہے۔ لیکن مسٹر ڈبلو خاص طور پر اس رات کو پہرے پر پورے بیس منٹ کے بعد آئے یہ بات آداب کے خلاف تھی اور سچ تو یہ ہے کہ ایک پائلٹ کے لئے ایسی غلطی ناقابلِ معافی تھی اسلئے مسٹر بکسبی نے مسٹر ڈبلو سے علیک سلیک بھی نہیں کی۔ انھوں نے صرف پہیہ ان کے حوالے کر دیا اور ایک لفظ بھی زبان سے کہے بغیر پائلٹ ہاؤس سے چلے گئے۔ اس سے مجھے بھی دُکھ ہوا۔ تاریکی کے اعتبار سے یہ بڑی خراب رات تھی اس وقت ہم لوگ دریا کے اس حصے میں تھے جو کافی چوڑا اور تاریک تھا جہاں تاریکی کے باعث کوئی شکل یا کوئی چیز بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ لیکن یہ بات بھی قابل قیاس نہیں تھی کہ مسٹر بکسبی نے اس غریب کو اس اندھیرے میں ایسے چھوڑ دیا ہو کہ وہ اس مقام کے بارے میں جاننے کی

کوشش میں کشتی کو تباہ کر دے۔ لیکن میں نے اپنے دل میں تہیہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو میں اس شخص کا ساتھ دوں گا تاکہ اس کو یہ نہ محسوس ہو کہ اس کا کوئی مونس و مددگار نہیں ہے۔ اس لئے میں کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا کہ آخر ہم لوگ کس جگہ پر تھے۔ لیکن مسٹر ڈبلو سنجیدگی سے تاریک آسمان کے ہولناک ماحول میں چپ چاپ کھڑے رہے اور وہ کچھ نہ بولے۔ میں نے سوچا یہ کوئی مغرور قسم کا شخص ہے جو میرے احسان سے زیر بار ہونے کی بجائے ہم لوگوں کو تباہی کے غار میں ڈال دینا بہتر سمجھتا ہے۔ میری حیثیت بہت معمولی تھی اور مجھے اس بات کا حق نہیں تھا کہ کپتانوں کو ڈانٹ ڈپٹ سکوں اور کشتی کی ہر چیز پر خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان، اپنی حکومت جتاؤں میں بینچ پر چڑھ گیا کیونکہ میں نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ جب تک وہ خبط الحواس پھرے پر ہے، میں جا کر سو جاؤں۔

مگر باوجود اس کے کچھ دیر کے بعد میں سو گیا کیونکہ جب میری آنکھ کھلی تو دن نکل رہا تھا۔ مسٹر ڈبلو چلے گئے تھے اور مسٹر بکسی پھر پہیے پر آ گئے تھے۔ اس وقت چار بجے تھے اور سب خیریت تھی لیکن میرا حال خراب تھا۔ میں خشک ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ معلوم ہو رہا تھا اور یہ تمام ہڈیاں درد کی شدت سے چور تھیں۔

مسٹر بکسی نے مجھ سے دریافت کیا کہ آخر میں کس لئے وہاں کھڑا تھا۔ میں نے جواب میں تسلیم کیا کہ میں مسٹر ڈبلو کی مدد کرنے کے لئے کھڑا تھا۔ اور انکو بتانا چاہتا تھا کہ اس وقت وہ کس مقام پر ہیں۔ پانچ منٹ کے اندر مسٹر بکسی سمجھ گئے کہ بات کیا تھی اور مجھ سے کیا غلطی ہوئی تھی۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ انکا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ انھوں نے مجھے ایسا سخت سست کہا جیسا کبھی پیشتر نہیں کہا تھا۔ وہ بولے " جہاں تک میں سمجھتا ہوں تم میں عقلی خوبیاں ہیں وہ سب ایک گدھے کی ہیں تمھارے جیسا میں نے اور کوئی جانور نہیں دیکھا آخر مسٹر ڈبلو تم سے کیا جاننا چاہتے تھے میں نے جواب دیا " مجھے خیال ہوا کہ شاید انکو میری وجہ سے کچھ سہولت ہوگی۔ بکسی بولے " سہولت۔ یہ بالکل لغو بات ہے کیا میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ ایک پائلٹ کو رات کے وقت دریا کے متعلق ویسی ہی معلومات حاصل ہوتی ہیں جیسی کسی کو اپنے گھر کے صدر کمرے کے متعلق ہوتی ہے۔"

میں بولا "اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ وہ کونسا کمرہ ہے تو میں اندھیرے ہی میں اس کا
پتہ لگا سکتا ہوں۔ لیکن فرض کیجئے کہ اگر آپ اندھیرے میں مجھے کسی بھی کمرے میں یہ بتائے
بغیر کہ وہ کونسا کمرہ ہے بٹھا دیں تو مجھے اس کا پتہ کیسے لگ سکتا ہے۔؟
بکسبی نے کہا "تمہیں پتہ لگانا پڑے گا اور خاص طور سے دریا میں تو یہ بہت ضروری
ہوتا ہے" میں نے جواب دیا "بہت اچھا۔ تو پھر مجھے اس بات سے خوشی ہے کہ میں نے
مسٹر ڈبلو کو کچھ نہیں بتایا۔"
مسٹر بکسبی بولے "مجھے یہ کہنا چاہیئے کہ غنیمت ہے کہ مسٹر ڈبلو نے تمہیں کھڑکی سے باہر
دھکیل کر ایکدم کھڑکی بند کرکے سو ڈالر کے شیشوں اور دوسرے سامان کا نقصان نہیں کیا"
مجھے خوشی ہے کہ یہ نقصان ہونے سے بچ گیا کیونکہ اگر یہ نقصان ہوجاتا تو میں اسٹیمر
کے مالکوں کی نظروں سے گر جاتا اور ان لوگوں کو مجھ جیسے آدمیوں سے ہمیشہ کے لئے نفرت
ہوجاتی جو بے پرواہی سے کام کرتے ہیں اور چیزیں توڑ دیتے ہیں۔
چنانچہ اب میں دریا کی ہیئت حفظ کرنے میں لگ گیا۔ ان سب چیزوں میں جو میری
سمجھ سے باہر تھیں یا جنھیں میں بھول جاتا تھا سب سے زیادہ اہمیت میں دریا کی شکل یاد
رکھنے کو دیتا تھا۔ میں اپنی نظر کسی نکیلے جھاڑی والے نشان پر جماتا جو کئی میل آگے دریا میں
نظر آتا تھا اور اپنے ذہن میں اس کی تصویر کھینچ لیتا۔ جوں جوں مجھے اس کام میں خاطر خواہ
کامیابی ہوتی نظر آتی اتنا ہی میں آگے بڑھتا جاتا اور پھر وہ پریشان کرنے والی چیزیں کم ہوتے ہوتے دریا
کے کنارے میں غائب ہوجاتیں۔ اگر کسی راس کے سرے پر کسی درخت کا ٹھنٹھ نمایاں
طور پر نظر آتا تو آگے چل کر یہ معلوم ہوتا کہ وہ ایک جنگل میں غیر نمایاں طور پر مدغم ہو گیا ہے۔
اور جب میں اسکے برابر پہونچتا تو معلوم ہوتا کہ وہ ایک سیدھے کنارے کے وسط میں واقع
ہے۔ دراصل کوئی بھی دکھائی دینے والی پہاڑی اتنی مدت تک اپنی ہیئت پر قائم نہ رہتی کہ
میں اس کی ہیئت کا اندازہ لگا سکوں۔ وہ اتنی جلدی تحلیل اور تبدیل ہونے لگتی گویا
وہ منطقۂ حارہ کے کسی گرم تر خطے میں رکھا ہوا مکھن کا پہاڑ ہو۔ جب میں دریا کے بہاؤ کی طرف
آتا تو اس وقت کسی چیز کی وہ پہلی سی شکل قائم نہ رہتی جو دریا کے چڑھاؤ کی طرف جاتے وقت ہوتی

تھی۔ جب میں نے اِن چھوٹی چھوٹی مشکلات کا ذکر مسٹر بکسبی سے کیا تو وہ بولے "یہی تو سبی کی خاص خوبی ہے۔ اگر یہ ہیئتیں ہر تین تین سیکنڈ کے بعد تبدیل نہ ہوں تو پھر اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ مثال کے طور پر اسی مقام کو لے لو جہاں ہم کھڑے ہیں جس وقت تک وہ سامنے والی پہاڑی واحد پہاڑی ہے میں سیدھے اسی راستے سے اس تک پہونچ جاؤں گا جو میں نے اختیار کیا ہے لیکن جونہی اس کی چوٹی کے کئی حصے ہو جائیں گے اور اس کی شکل انگریزی حرف لام کی طرح ہو جائے گی تو مجھے معلوم ہو جائے گا کہ مجھے جلد ہی سے کشتی کو موڑ دینا ہے ورنہ کشتی کسی چٹان سے ٹکرا کر ٹوٹ جائے گی اور پھر جوں ہی اس وی (V) شکل کی ایک شاخ دوسری شاخ کے پیچھے ہو جائے تو میں سمجھ لوں گا کہ مجھے پھر بائیں طرف کو مڑنا ہے نہیں تو کشتی کسی بہتے ہوئے پیڑ سے ٹکر ہو جائے گی جو کشتی کے پیندے کو توڑ کر اسے اس طرح باہر نکال دے گا جیسے کوئی تمہارے ہاتھ سے چاندی کا ٹکڑا چھین لے۔ اگر خراب راتوں میں اس چٹان کی ہیئت میں کوئی تبدیلی نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیئے کہ سال بھر کے اندر یہاں کسی بڑی دھانی کشتی کا خوفناک قبرستان بن جائے گا۔"

اب یہ واضح ہو گیا تھا کہ مجھے دریا کی ان سب ہیئتوں کو جو تصور میں آسکتی تھیں یاد رکھنا ہو گا خواہ وہ چیز الٹی معلوم ہو، غلط سیرا پہلے نظر آتا ہو یا اندر کا حصہ باہر کی طرف دکھائی دے۔ آگے، پیچھے غرضیکہ سب اطراف کا علم ہونا ضروری ہے۔ پھر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ کہرے والی راتوں میں جب دریا کی کوئی مخصوص ہیئت نہیں ہوتی تو کیا کرنا چاہیئے۔"

بالآخر میں نے اپنا سبق یاد کرنا شروع کر دیا اور آہستہ آہستہ اس پیچیدہ سبق کو یاد کرنے میں مجھے کامیابی ہونے لگی اور مجھے اسقدر خود اعتمادی حاصل ہو گئی کہ میں پھر کام کرنے کیلئے آمادہ ہو گیا۔ مسٹر بکسبی کو بہت تعجب ہوا اور وہ پچھلا سبق مجھ سے پھر دریافت کرنے لگے۔ اس مرتبہ وہ مجھ سے اس طرح مخاطب ہوئے "پچھلے سفر سے پہلے والے سفر میں ہوٹل۔ این۔ دی وال کے بیچ والے موڑ پر کتنا پانی تھا۔

مسٹر بکسبی کے اس سوال پر مجھے اپنی توہین محسوس ہوئی اور میں بول اٹھا "ہر سفر میں خواہ وہ ندیا کے چڑھاؤ پر تھا یا بہاؤ پر آپ نے دیکھا تھا کہ پنسال اندا زاس پیچیدہ مقام

پر پوں گھنٹے تک برابر شور و غل کرتے رہتے تھے۔ آپ مجھ سے یہ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ میں اس غل غپاڑے میں یہ یاد رکھ سکتا ہوں کہ کتنا پانی وہاں تھا۔

مسٹر بکسبی نے کہا "لیکن صاحبزادے اتنا تو تمہیں یاد رکھنا ہی چاہیئے۔ تمہارے لئے یہ لازمی ہے کہ ان مقامات کو ٹھیک سے یاد رکھو۔ تمہیں یہ بھی یاد رکھنا پڑے گا کہ سینٹ لوئی سے نیو آرلینز تک پانچسو[۵] اتھلے پانی کے مقامات میں سے کس مقام پر پانی سب سے زیادہ پایاب تھا اور کشتی کونسے نشان پر ٹھہری تھی۔

تمہیں چاہیئے کہ ایک سفر کی اتھلے پانی کی آواز اور نشان کو دوسرے سفر کی اتھلے پانی کی آواز اور نشانات سے غلط ملط نہ کرو کیونکہ اکثر وہ ایک سے نہیں ہوتے۔ تمہیں ان کے امتیاز کا علم ہونا چاہیئے۔

جب مجھے کچھ ہوش آیا تو میں نے پوچھا "جب مجھ میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جائیگی تب میں مُردوں کو بھی زندہ کر دوں گا۔ پھر مجھے روز کمانے کے لئے دخانی کشتی کو چلانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ میں اس کاروبار سے سبکدوش ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے تو ایک گارے کی بالٹی اور برش چاہیے۔ میں تو صرف گھاٹ پر مزدوری کا کام کرنے کے لائق ہوں۔ پائلٹ بننے کے لئے میرے پاس دماغ نہیں ہے اور اگر دماغ ہوگا تو بھی اس کام کو سرانجام دینے کی سکت مجھ میں اسوقت تک نہ ہوگی جب تک میں بڈھا ہو کر بیساکھی پر نہ چلنے لگوں۔"

مسٹر بکسبی نے کہا "اچھا چھوڑو اس قصّے کو۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ میں ایک آدمی کو دریا کے متعلق ساری باتیں سکھا دوں گا تو یہ بات میں پوری سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہوں اور تم میری بات پر بھروسہ کر سکتے ہو۔ یا تو میں سب باتیں سکھا کر چھوڑتا ہوں یا پھر آدمی کی جان لے لیتا ہوں۔"

نواں باب

مسلسل اُلجھنیں

مسٹر بکسبی جیسے شخص کے ساتھ بحث مباحثہ کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ میں نہایت مستعدی کے ساتھ اپنے حافظے پر اتنا زور دینے لگا کہ مجھے پایاب پانی کی جگہیں اور دریا عبور کرنے کے نشانات تک یاد رہنے لگے۔ لیکن نتیجہ وہی ہوا جو میں سوچ رہا تھا۔ میں بمشکل ایک پیچیدہ مسئلے کو ذہن نشین کرتا کہ دوسرا سامنے آجاتا۔ میں نے اکثر پائلٹوں کو پانی کی طرف بڑے غور سے دیکھتے ہوئے دیکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے پانی کی بجائے ان کی نگاہیں کسی کتاب پر جمی ہوں۔ کم از کم ظاہر وہ یہی کرتے تھے۔ لیکن اس کتاب سے میرے پلّے کچھ نہیں پڑتا تھا۔ آخرکار وہ وقت بھی آیا جب مسٹر بکسبی کو میرے متعلق یہ خیال ہونے لگا کہ میں اتنی ترقی کر چکا ہوں کہ پانی کے مطالعہ کی صلاحیت مجھ میں آگئی ہے ایک دن انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا تمھیں پانی کی سطح پر وہ لمبی اور ٹیڑھی لکیر دکھائی دیتی ہے۔ یہ پانی کے اندر والی چٹان ہے، علاوہ ازیں یہ ایک دھوکہ دینے والی چیز بھی ہے اس کے نیچے مضبوط ریت کی دیوار ہے اور اُوپر سے نیچے تک یہ اتنی سپاٹ ہے جیسے کسی مکان کی بغلی دیوار ہو۔ اس کے قریب ہی پانی کافی ہے لیکن اس کی چوٹی کے اوپر پانی بہت تھوڑا ہے۔ اگر کشتی اس سے ٹکرا جائے تو اس کے انجر پنجر ڈھیلے ہو جائیں۔ کیا تمہیں دکھائی دیتا ہے اس لکیر کا اوپری سرا کہاں سے شروع ہوتا ہے اور دوسرا کہاں غائب ہو جاتا ہے۔؟"

"ہاں جناب۔"

مسٹر بکسی بولے "دیکھو وہ ایک نشیبی مقام ہے یہ چٹان کی چوٹی ہے۔ تم اس پر چڑھ سکتے ہو۔ اس سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ اب اسے عبور کر دو اور چٹان کے پاس اسکے دامن میں چلو۔ پانی کا دھارا بہت تیز نہیں ہے اور چلنا آسان ہے۔ میں چٹان کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اس جگہ پہونچ گیا جہاں وہ لکیر ختم ہوتی تھی۔ تب مسٹر بکسی نے کہا" اب رُکو اور جب تک میں حکم نہ دوں انتظار کرو۔ کشتی کے لئے چٹان پر چڑھنا مشکل ہوگا کشتی پایاب پانی میں کام نہیں کرتی۔ پاس ہی کھڑے رہو۔ صبر سے کام لو اور کشتی اچھی طرح پکڑے رہو۔ اب اسے نیچے دبا کر زور سے گھسیٹو! زور سے گھسیٹو!"

مسٹر بکسی نے پہیے کا دوسرا سرا پکڑ لیا اور اسے چکر دینا شروع کیا یہانتک کہ وہ بہت سخت ہو گیا ہم اسے پکڑے رہے۔ کشتی رک گئی اور تھوڑی دیر تک اُسے ذرا بھی جنبش نہ ہوئی اور تب وہ ایک لہر سے حرکت میں آکر سیدھی طرف کو ہٹی۔ چٹان پر چڑھ گئی اور اس کے اگلے حصے سے پانی میں زور دار جھاگ اٹھنے لگے۔ مسٹر بکسی نے کہا اور اب کشتی پر اس طرح غور سے نگاہ رکھو جیسے بلی اپنے شکار کو تاکتی رہتی ہے ورنہ کشتی تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ جب کشتی کو بہت زور لگانا پڑے اور وہ اپنی جگہ سے جھٹکا دے دیکر پھسلے تو اس وقت اس کو ذرا سا.... اوپر اٹھاؤ۔ اس طریقے سے رات کے وقت تمہیں یہ معلوم ہو جائے گا کہ کہاں پانی بہت اُتھلا ہے لیکن کشتی کو تھوڑا تھوڑا چلاتے برابر رہو اور اسے مقام مقصود کی طرف لے کر چلو۔

اب تم ریت کے پشتے پر پہونچ گئے ہو۔ ہر نشان کے نیچے ایک ریت کا پشتہ ہوتا ہے کیونکہ جو پانی اس پشتے کے ارد گرد آتا ہے وہ گرداب کی شکل اختیار کر لیتا ہے اور اس میں جو گاد ہوتی ہے وہ تہہ پر بیٹھ جاتی ہے۔ تمہیں پانی کی سطح پر وہ باریک سی لکیریں تو نظر آتی ہوں گی جو پنکھے کی تیلیوں یا ڈنڈوں کی طرح پھیلی ہوئی ہیں وہ چھوٹی چھوٹی چٹانیں ہیں۔ تمہیں شاید ان کے سرے دکھائی نہ دیتے ہوں لیکن تمہیں اُن کے قریب ہی چلنا چاہیئے۔ اب ذرا باہر کی طرف دیکھو۔ اس صاف ہموار اور چمکدار مقام پر نہ جانا وہاں پانی نو فٹ گہرا بھی نہیں ہے کشتی وہاں نہ چل سکے گی۔ کشتی کو اس کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اور ذرا جلدی سے نظر اٹھا کر دیکھو وہاں وہ روشنی سی دکھائی دیتی ہے اس طرف چلو۔ دائیں طرف والا پہیہ روک دو۔ جلدی کرو۔

کشتی کو پیچھے ہٹاؤ - !"

انجن کی گھنٹیاں بجیں اور انجن فوراً چالو ہو گیا۔ اسوقت اس کی نلکیوں سے بھاپ کے سفید بادل بلند ہو رہے تھے، لیکن اب کافی دیر ہو چکی تھی اور کشتی ریت کی پہاڑی کے پاس پہونچ چکی تھی اور اسکے اگلے حصے سے اٹھتا ہوا جھاگ ختم ہو چکا تھا۔ اسی وقت ایک تیز لہر امڈتی ہوئی آئی اور کشتی کے آگے سے نکل گئی۔ کشتی بائیں جانب جھکنے لگی اور پانی کو کاٹتی ہوئی دوسرے کنارے جا پہونچی جیسے کوئی موت کے ڈر سے بھاگ کر کہیں پناہ لے لے۔ حالانکہ کشتی دوبارہ ہمارے قابو میں آگئی پھر بھی اس .... جگہ سے جہاں ہم پہونچنا چاہتے تھے ابھی ہم ایک میل دُور تھے۔

دوسرے روز سہ پہر میں پہر کے درمیان مسٹر بکسی نے مجھ سے دریافت کیا کہ میں کشتی کو کچھ میل تک چلا سکوں گا۔ میں نے جواب دیا " اس نشان کے اوپر پہلے درخت سے اندر کی طرف اور دوسرے درخت سے باہر کی طرف چلیئے۔ پھر بگنز کے جنگلی علاقہ جان کے نیچے والے سرے سے روانہ ہوجایئے اور وہاں سے ندی کے دوسری کنارے پر چل دیجئے مسٹر بکسی نے بات کاٹ کر کہا " ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، جب تک تم دوسرے نشان تک پہونچو گے میں واپس بھی آجاؤں گا "

مگر مسٹر بکسی واپس نہیں آئے وہ ابھی تک کشتی کے نچلے حصے میں رہے تھے۔ اسی وقت میں نے کشتی کو چکر دیا اور دریا کے حصے میں داخل ہو گیا جسکے متعلق میرے دل میں طرح طرح کے اندیشے تھے۔ مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ مسٹر بکسی چمنی کے پیچھے چھپے ہوئے یہ دیکھ رہے تھے کہ میں کس طرح کشتی چلاتا ہوں۔ مگر میں خوشی خوشی اپنا کام انجام دے رہا تھا۔ مجھے اب اپنے اوپر اور زیادہ اعتماد ہونے لگا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسٹر بکسی نے اس سے پیشتر کبھی کشتی کو اتنی دیر تک میرے نگرانی میں نہیں چھوڑا تھا۔ میں کشتی کو پوری رفتار پر لے آیا اور پہیئے نے پہیئے کو بالکل چھوڑ دیا۔ میں نے غرور سے پیٹھ پھیر لی اور کشتی کے پچھلے حصے کو غور سے دیکھنے لگا اور ایک خاص دھن میں گنگنانے لگا۔ اس سے ایک قسم کی بے نیازی کا اظہار ہوتا تھا۔ اسی خوبی کے لئے میں مسٹر بکسی اور دوسرے حضرات کا مداح تھا۔ اس مرتبہ میں بڑی دیر تک

دریا کا معائنہ کرتا رہا اور پھر جب میں نے سامنے کی طرف رخ کیا تو میرا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا اگر میں منہ نہ بھینچ لیتا تو شاید مجھے دل سے ہی ہاتھ دھونا پڑتا ان خوفناک اور دھوکہ دینے والی چٹانوں میں سے ایک چٹان لمبائی کے لحاظ سے بڑی دور تک ہماری کشتی کے اگلے حصّے کے سامنے پھیلی ہوئی تھی دوسرے ہی لمحے میرے ہوش و حواس رخصت ہو گئے۔ مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ میں کس پر کھڑا ہوں۔ میری سانس پھول رہی تھی میں نے اتنے زور سے پہیئے کو گھمایا کہ وہ مکڑی کے جالے کی طرح چکر کھانے لگا۔ اس سے کشتی کو حرکت ہوئی اور وہ چٹان کی طرف سے بالکل گھوم گئی، لیکن چٹان ابھی برابر دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے کشتی بھگائی مگر پھر بھی وہ برابر دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا رخ میری کشتی کے اگلے حصّے کی داہنی جانب ہی تھا۔ اسوقت مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ میں کدھر جا رہا ہوں میں تو بھاگا جا رہا تھا۔ کشتی کے ٹکرانے کی خوفناک آثار نظر آ رہے تھے۔ میں دل ہی دل میں کہہ رہا تھا " وہ بدمعاش آیا کیوں نہیں "؟ اگر میں گھنٹی بجانے کا جرم کرتا تو غالباً مجھے سمندر میں پھینک دیا جاتا لیکن کشتی تباہ ہونے سے تو یہی اچھا تھا لہٰذا میں نے مایوسی اور بے بسی کی حالت میں زور سے گھنٹی بجا کر نیچے کشتی میں ایسی خوفناک آواز پیدا کر دی کہ میرے خیال سے دنیا میں کسی انجینیر نے نہ سنی ہوگی اور نہ اُسے اتنی حیرت ہوئی ہوگی۔ گھنٹیوں کی کان پھاڑنے والی تیز آوازوں کے درمیان کشتی کے انجن بڑے غضبناک انداز سے پیچھے ہٹنے لگے اور ان میں پانی بھرنے لگا جس سے میری عقل گم ہو گئی اور میں حواس باختہ ہو گیا۔ ہماری کشتی دریا کے دوسری طرف جنگل سے ٹکرانے ہی والی تھی کہ اتنے میں مسٹر بکسبی نہایت سکون سے عرشے پر نمودار ہوئے ــــ اس وقت میری روح ان کی بے حد احسان مند تھی کیونکہ ان کی آمد سے میری پریشانی ختم ہو گئی تھی اگر مسٹر بکسبی عرشے پر کھڑے ہوں تو میں نیاگرا کے آبشار میں بھی اپنے آپ کو محفوظ سمجھونگا۔

انھوں نے نہایت اطمینان اور دلجمعی کے ساتھ اپنے منہ سے خلال کو نکال کر انگلیوں کے درمیان سگار کی طرح رکھ لیا۔ کشتی ایک بڑے اور دور تک پھیلے ہوئے درخت سے ٹکرانے ہی والی تھی اور ڈرے ہوئے مسافر چوہوں کی مانند ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔

مسٹر بکسبی نے بڑی نرمی سے مجھے یہ حکم دیا: "کشتی کو دائیں بائیں دونوں طرف سے روکو اور پیچھے ہٹاؤ"۔

کشتی رُک گئی ۔ آگے نہیں بڑھی ۔ اس کا اگلا سرا درخت کی شاخوں میں اُلجھ گیا ۔ وہ بڑی مشکل سے پیچھے کی طرف ہٹی ۔

مسٹر بکسبی نے پھر کہا ۔ کشتی کو بائیں جانب سے روک دو آگے آکر بیٹھ جاؤ پھر اسے دائیں جانب سے روکو اور ادھر اُدھر جا کر بیٹھو اور اس کا رُخ ریت کے پشتے کی طرف کر دو "

اب میں نے ایسے پرسکون طریقے سے کشتی چلانا شروع کی جیسے موسم گرما میں صبح کے وقت چلاتے ہیں اتنے میں مسٹر بکسبی میرے پاس آگئے اور انھوں نے مصنوعی سادگی سے کہا ۔

" اب جب تمہیں کسی کو بلانا مقصود ہو تو ساحل پر پہنچنے سے قبل تین مرتبہ گھنٹی بجانا تاکہ انجینیر تیار ہو جائیں "

اس طنز سے میں جھینپ سا گیا اور میں نے کہا کہ میں نے کسی کو آواز نہیں دی ۔

" اچھا تو آواز جنگل جانے کے لئے دی گئی ہوگی ۔ پھر یہ حاکم تمہیں بتائے گا کہ وہ جنگل کب جانا چاہتا ہے "

میں برابر جھینپ رہا تھا ۔ میں نے کہا " میں جنگل میں نہیں جا رہا تھا "

مسٹر بکسبی پھر بولے " اچھا ٹھیک ہے مگر تم اس موڑ پر کیوں اور کس لئے رُکے تھے ۔ کیا تم نے کبھی سُنا ہے کہ کوئی کشتی دریا کی موجود حالت میں چڑھاؤ کی طرف اس موڑ سے ہو کر گئی ہو ؟ "

میں بولا " نہیں جناب ۔ میں تو یہ سمجھ ہی نہ رہا تھا ۔ میں تو ایک پوشیدہ چٹان سے دور ہٹ رہا تھا ۔

مسٹر بکسبی بولے " مگر وہاں تو ایسی کوئی چٹان نہیں تھی ۔ جس مقام پر تم تھے وہاں سے تین میل تک بھی ایسی کوئی چٹان نہیں تھی "

میں نے کہا " لیکن میں نے تو دیکھی تھی ۔ یہ ویسی ہی خطرناک تھی جیسی کہ وہ سامنے والی "

" اچھا اسے پار کر جاؤ "

" کیا یہ حکم ہے ؟ "

" ہاں ۔ اسے پار کر جاؤ "

" اور اگر میں نہ کروں ؟ کاش مجھے موت آجائے "

"ذمہ داری میری ہے۔" مسٹر بکسی نے کہا۔

جس طرح میں پہلے کشتی کو بچانے کے لئے فکرمند تھا اس طرح اب اسے نباہ کرنے پر آمادہ تھا۔ میں نے یہ حکم اپنے ذہن میں نوٹ کر لیا تاکہ اگر کبھی جواب طلبی کا موقع آئے تو اس سے فائدہ اٹھایا جائے۔ میں پھر چٹان کی طرف بڑھا لیکن یہ دیکھ کر میں دم بخود ہو گیا کہ چٹان ہماری کشتی کے نیچے سے بالکل غائب ہو گئی اور ہم اس کے اوپر سے ایسے پھسل گئے جیسے کسی روغنی چیز سے پھسل رہے ہوں۔"

مسٹر بکسی نے کہا۔" اب تمہیں چٹان چٹان کا فرق معلوم ہو گیا۔ یہ چٹان تو ہوائی چٹان تھی، ہوا سے ایسی چٹانیں اکثر بن جایا کرتی ہیں۔"

میں نے کہا" اب میں سمجھ گیا۔ یہ تو محض دھوکہ دینے والی چٹان تھی۔ اس میں اور اصل چٹان میں فرق کا علم کیسے ہو۔؟"

بکسی نے کہا۔" یہ تو میں نہیں بتا سکتا۔ یہ تو محض ادراک سے جانا جا سکتا ہے۔ رفتہ رفتہ تم کو دونوں کی پہچان ہو جائے گی لیکن تم کبھی یہ نہیں بتا سکو گے کہ دونوں علیحدہ علیحدہ کیسے پہچانی جاتی ہیں؟"

اور بات ٹھیک ہی نکلی۔ تھوڑے دنوں بعد پانی کی سطح میرے لئے ایک حیرت انگیز کتاب بن گئی یعنی ایک ایسی کتاب جس کی زبان جاہل مسافر نہیں سمجھ سکتے تھے۔ لیکن مجھے وہ اپنا سب حال بلاکم و کاست بتا دیتی تھی۔ اس کتاب نے مجھے بہت پرانے راز ایسی وضاحت کے ساتھ بتائے گویا وہ ہر بات خود زبان سے کہہ رہی ہو۔ مگر یہ ایسی کتاب نہیں تھی جو ایک ... مرتبہ پڑھ لینے کے بعد پھینک دی جائے کیونکہ اس میں ہر روز ایک نئی داستان پڑھنے کو ملتی ہے۔ اس کتاب کی بارہ سو میل کی لمبائی میں ایک صفحہ بھی ایسا نہیں جو غیر دلچسپ ہو۔ کوئی صفحہ ایسا نہ تھا جسے آپ کچھ نہ کچھ گنوائے بغیر چھوڑ سکیں اور کوئی بھی صفحہ ایسا نہ تھا جسے آپ اس خیال سے درمیان میں چھوڑ دینا چاہتے ہوں کہ اس کے مقابلے میں کسی دوسرے میں زیادہ لطف آئے گا۔ انسان کی تصنیف کردہ ایسی کوئی کتاب نہ ہوگی جس کی دلچسپی میں پڑھنے والا اتنا کھو جائے کہ اسے کسی قسم کی اکتاہٹ نہ ہو۔ برخلاف اس کے یہ قدرتی کتاب اتنی دلچسپ اور فرحت بخش تھی جس کو بار بار پڑھنے پر

بھی ہر بار ایک نئی تازگی حاصل ہوتی تھی۔ جب مسافر کو اسکے مطالعہ کی صلاحیت نہ تھی وہ بھی اسکی سطح پر نمودار ہونے والے عجیب و غریب ہلکوروں سے مسحور ہو جاتا تھا۔ (بشرطیکہ وہ اتفاق سے دریا کی طرف دیکھ لے) لیکن ایک پائلٹ کے لئے دریا کی سطح ایک مخصوص عبارت کا کام کرتی ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس کے لئے تو یہ ایک ایسی داستان تھی جو جلی حروف میں لکھی ہوئی تھی۔ جس میں جگہ جگہ مسرت آمیز فقرے بھی پڑھنے کو ملتے تھے۔ اس کا مفہوم یہ تھا کہ دریا میں جگہ جگہ ایسی چٹانیں چھپی پڑی ہیں جن سے ٹکرا کر مضبوط سے مضبوط جہاز ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے تھے (یہ دریا کی فتح کی نشانی تھی) اسے دریا کا سب سے لطیف اشارہ سمجھئے یا اس کا اسلوب بیان جسے پائلٹ کی نگاہ بڑا خطرناک سمجھتی ہے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ جس مسافر کو اس کتاب کے مطالعہ کی صلاحیت نہ ہوتی تھی اس کو تو پانی میں محض گوناں گوں تصویریں ہی دکھائی دیتی تھیں جو آفتاب کی شعاؤں اور بادلوں کی چھاؤں سے بنتی رہتی تھیں مگر ایک تربیت یافتہ آنکھ کے لئے یہ تصویریں ایک سنجیدہ اور ہیبت ناک واقع کے آثار ہوتے تھے جن کو وہی سمجھ سکتی تھی۔

جب میں نے پانی کی زبان کو اچھی طرح سمجھ لیا اور اس عظیم دریا کے متعلق چھوٹی چھوٹی باتیں بھی اتنی اچھی طرح میری سمجھ میں آگئیں جیسے کوئی حروف تہجی سمجھ لے تو میری معلومات میں ایک گرانقدر اضافہ ہو گیا۔ لیکن دوسری طرف مجھے ایک چیز سے ہاتھ بھی دھونا پڑا۔ میں ایک ایسی چیز سے محروم ہو گیا جو مجھے آخری دم تک پھر دستیاب نہ ہو سکتی تھی۔ اس پر وقار دریا کی ساری عظمت اور اس کا سارا حسن اور اس کی ساری شاعری میرے لئے ختم ہو چکی تھی۔.. ابھی تک مجھے غروب آفتاب کا وہ عجیب و غریب نظارہ یاد ہے جو میں نے اس زمانے میں دیکھا تھا جب دخانی کشتی کو چلانا میرے لئے نئی بات تھی۔ دریا کی وسیع رقبے میں پانی کا رنگ خون کی مانند سرخ ہی سرخ تھا درمیان میں زیادہ چمک کی وجہ سے گہرے سرخ رنگ کے بجائے اس کا رنگ سنہرا ہو جاتا تھا۔ اتفاق سے اسی پانی میں ایک شہتیر بہتا ہوا چلا آرہا تھا جو کالا کالا سا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ایک مقام پر کسی چیز کا چمکتا ہوا لمبا اور خمدار سایہ دریا کی سطح پر پڑ رہا تھا۔ ایک دوسرے مقام پر اس کی سطح کے اوپر کئی حلقے سے پڑ رہے تھے جن میں پانی ابلتا اور اچھلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ان حلقوں میں سفید دودھیا پتھر کی طرح کئی کئی رنگ نظر آرہے تھے۔ جس مقام

پر پانی کا بہاؤ بالکل ہلکا تھا وہاں ایک ہموار سی جگہ تھی جو دلکش حلقوں اور آفتاب کی شعاؤں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ یہ دائرے اور شعاعوں کے خطوط بڑے ہی خوبصورت معلوم ہوتے تھے۔ ہمارے بائیں طرف کے ساحل پر بڑا گھنا جنگل تھا اور اس جنگل کے خاموش سائے میں ایک مقام پر ایک لمبی اونچی، نیچی لہر اُٹھ رہی تھی جو چاندی کی طرح چمکتی تھی۔ اس جنگل کے درختوں کی قطار سے بہت اونچائی پر ایک سوکھا ہوا درخت تھا جس میں صرف ایک ہی ہری پتے والی شاخ رہ گئی تھی جو آفتاب کی روشنی میں شعلے کی طرح دہک رہی تھی۔ اس مقام پر بڑے خوبصورت موڑ پانی میں چیزوں کے خوبصورت سائے، جنگلوں سے بھری ہوئی پہاڑیاں اور آسانی پگڈنڈیاں تھیں اور ان سب چیزوں سے زیادہ خوبصورت نزدیک اور دور رنگ جلد جلد رنگ بدلتی ہوئی سورج روشنی جو لگاتار گھٹتی اور بڑھتی رہتی تھی اس طرح ہر لمحہ رنگوں کے عجیب و غریب منظر نظر آتے تھے۔

میں وہاں اسطرح کھڑا تھا جیسے کسی نے مجھ پر جادو کر دیا ہو۔ میں بالکل مبہوت ہو گیا خاموش و گنگ مجھ پر بیخودی سی طاری ہو گئی۔ دنیا مجھے نئی نظر آ رہی تھی۔ ایسا نظارہ گھر پر میری نظر سے کبھی نہیں گذرا تھا لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں آخر کار ایک دن ایسا آ ہی گیا جب میں نے اس حسن اور دلکشی سے متاثر ہونا بالکل چھوڑ دیا جس سے چاند، سورج اور ستارے کی روشنی میں دریا کے چہرے پر اور ہی نکھار آ جاتا تھا اور پھر ایک ایسا بھی دن آیا جب میں نے ان باتوں پر غور کرنا بھی چھوڑ دیا۔ بعد ازاں جب کبھی غروب آفتاب کا منظر دوبارہ سامنے آتا تو اسکو دیکھکر میرے دل میں مسرت کی لہر نہ اٹھتی بلکہ دل ہی دل میں اس پر اس طرح تبصرہ کر اسطرح کے غروب آفتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ کل ہوا چلے گی اور یہ تیرتے ہوئے لٹھے اس بات کی علا ہیں کہ دریا کا پانی چڑھاؤ پر ہے اور اس کے لئے ہمیں تھوڑا بہت شکر گزار ہونا چاہیئے۔ پانی پر جو تر ساسا سائے کا نشان ہے وہ اس بات کی علامت ہے کہ یہاں کوئی چھپی ہوئی چٹان ہے اور اگر یہ نشان اسی طرح پھیلا رہے تو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ آج یا کل کسی رات کو کسی دخانی کشتی کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ ان اچھلتے ہوئے بلبلوں سے پتہ چلتا ہے کہ کوئی ساحل کہیں سے کٹ رہا ہے اور دریا اپنا رخ بدل رہا ہے۔ اس صاف ستھرے پانی کے اندر جو حلقے اور خطوط بن رہے ہیں

وہ اس خطرے سے آگاہ کرتے ہیں کہ اس مقام پر پانی بہت کم ہو رہا ہے جس سے کشتی کو خطرہ ہے اور وہ جنگل کے سائے میں جو روپہلی دھاری پڑ رہی ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی درخت ٹوٹ کر بہہ رہا ہے اور وہ ایسی جگہ بہہ کر رک گیا ہے جہاں وہ کسی بھی دُخانی کشتی کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہے اور وہ لمبا خشک درخت جس میں صرف ایک ہری شاخ رہ گئی ہے زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہے گا پھر کوئی اس تاریک جگہ سے رات کے وقت بلا کسی جانے پہچانے سرحدی نشان کے کیسے گزر سکے گا۔؟

ہاں، اب دریا کی ساری خوبصورتی اور رنگینی کافور ہو چکی تھی۔ اب اگر میری نگاہوں میں کسی پہلو سے بھی اس کی کوئی قدر و قیمت تھی تو وہ صرف اس امر پر مبنی تھی کہ اس سے مجھے دُخانی کشتی کو حفاظت سے چلانے میں کیا مدد مل سکتی تھی۔ اس وقت تک مجھے ڈاکٹروں کی عقل پر رحم آتا تھا۔ ان کی نگاہوں میں کسی دوشیزہ کے گالوں کی زیادہ چمک کسی خوفناک بیماری کی علامت ہوتی ہے۔ کیا اس حسینہ کی تمام دلکشی اور حُسن کسی پوشیدہ بیماری کی علامت ہی ہو سکتا ہے؟ کیا وہ اس کے حسن و جمال کی بھی کبھی داد دیتا ہے۔؟ وہ تو محض پیشہ ورانہ نگاہ سے اس کی بگڑتی ہوئی حالت کے متعلق اپنے دل ہی دل میں ایک قطعی رائے قائم کر لیتا ہے کیا وہ کبھی یہ بھی سوچتا ہے کہ اس کام کو سیکھ کر اس نے کیا حاصل کیا ہے اور کیا گنوایا ہے۔؟

دسواں باب

تحصیلِ علم کی تکمیل

جن اصحاب نے ازرہِ عنایت میرے تحریر کردہ پچھلے ابواب کا مطالعہ کیا ہے ان کو یہ دیکھ کر غالباً تعجب ہوا ہوگا کہ میں نے جہاز رانی کا تذکرہ اتنی تفصیل سے کیا ہے جیسے یہ کوئی باقاعدہ سائنس ہو۔ ان ابواب کو قلمبند کرنے کا مقصد یہی تھا اور ابھی تک اس مقصد کی تکمیل نہیں ہوئی۔ میں بہت ہی استقلال اور جانفشانی سے یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ یہ سائنس بھی کتنی حیرت انگیز ہے۔ جہازوں کے راستوں میں جگہ جگہ پیراک پیپے لگائے جاتے ہیں اور ان راستوں پر روشنی کا بھی انتظام ہوتا ہے۔ اسلئے جہاز رانی سیکھتے وقت ان چیزوں سے مدد ملتی ہے اور آسانی رہتی ہے صاف وشفاف پانی والے وہ دریا جنکی تہہ کنکریلی پتھریلی ہوتی ہے بہت آہستہ آہستہ اپنا رُخ بدلتے ہیں اور اسی لئے اِن میں کشتی چلانے کا کام صرف ایک تجربہ سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن مسیسپی اور مسوری جیسے بڑے دریاؤں میں کشتی چلانا بالکل مختلف نوعیت کا کام ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دریاؤں کے سیلابی کناروں میں گڑھے پڑتے رہتے ہیں اور ان میں مسلسل تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ان کے اندر کے درخت یا دوسری رکاوٹیں مسلسل جگہ تبدیل کرتی رہتی ہیں۔ اور ان کے ریتیلے ساحل ایک حالت میں نہیں رہتے اور نہ ان کے بہاؤ کا رُخ کبھی یکساں ہی رہتا ہے۔ یہ آئے دن بدلتا رہتا ہے۔ ان دریاؤں میں تمام دشواریوں کا مقابلہ ہر رات کو اور ہر موسم میں کرنا پڑتا ہے جب نہ تو روشنی کے مینارے ہوتے ہیں اور نہ پیراکی کے.......... میرا خیال ہے کہ میں جہاز رانی کی عظیم سائنس کے بارے میں کسی قدر وضاحت کے ساتھ تمام باتوں کا ذکر کرنے میں حق بجانب

ہوں کیونکہ ابھی تک کسی ایسے شخص نے، جس نے خود جہازرانی کی ہو اور اس موضوع کے متعلق علمی طور پر واقفیت حاصل کی ہو، اس ضمن میں ایک حرف بھی قلمبند نہیں کیا۔ اگر یہ موضوع فرسودہ ہوتا تو میں قارئین کی خاطر اس کا کم ذکر کرتا لیکن چونکہ موضوع قطعی طور پر نیا ہے اسی لئے مجھے ضرورت محسوس ہوئی کہ میں اس موضوع پر بالتفصیل لکھوں۔ مجھے دریا کے متعلق ہر بات اور ہر مقام کے نام سے واقفیت ہو گئی تھی اور میں اس کی ہیئت جاننے میں اتنا ماہر ہو گیا تھا کہ آنکھیں بند کر کے سینٹ لوئی سے نیو آرلینز تک ہر جگہ کا پتہ لگا سکوں۔ اب مجھے دریا کی سطح کو سرسری دیکھ کر دیسے ہی ہر بات کا علم ہو جاتا تھا جیسے کوئی صبح اخبار دیکھ کر اس کی چیدہ چیدہ خبروں کو جلدی سے معلوم کر لیتا ہے۔ اب میں نے اپنی یاداشت کو اس قابل بنا لیا تھا کہ مختلف قسم کی آوازوں اور عبور کرنے کے نشانات کو اس میں محفوظ کر سکوں اور ان کو دیر تک قائم رکھ سکوں۔ تب مجھے یہ محسوس ہوا کہ میری تعلیم مکمل ہو گئی ہے لہٰذا میں نے ترچھی ٹوپی پہننا اور پہیے پر کام کرتے وقت منہ میں خلال رہانا شروع کر دیا۔

مسٹر بکسبی میرے یہ انداز و اطوار دیکھتے رہتے تھے۔ ایک روز انھوں نے پوچھا "برگیبس کے مقام پر ساحل کی اونچائی کیا ہے۔؟"

میں نے جواب دیا "میں یہ کیسے بتا سکتا ہوں۔ ابھی تو وہ یہاں سے پون میل دور ہے۔"

مسٹر بکسبی نے کہا "تمہاری نظر بہت کمزور ہے، بہت کمزور۔ شیشے سے دیکھو۔" میں نے شیشہ لے لیا اور فوراً کہا "میں اب بھی نہیں بتا سکتا۔ میرے خیال میں وہ ساحل ڈیڑھ فٹ اونچا ہو گا۔"

مسٹر بکسبی بولے "صرف ڈیڑھ فٹ ہی۔ نہیں۔ وہ تو چھ فٹ اونچا ساحل ہے۔ پچھلے سفر کے وقت یہاں کے ساحل کی اونچائی کتنی تھی۔؟"

میں نے کہا "مجھے پتہ نہیں۔ میں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا۔"

مسٹر بکسبی بولے تم نے کبھی اس کا اندازہ نہیں لگایا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ لیکن آئندہ ہمیشہ ان باتوں کا خیال رکھنا۔"

میں نے سوال کیا "آخر کیوں۔؟"

مسٹر بکسبی بولے۔ اس سے تمہیں نہ جانے کتنی اور باتیں معلوم ہوں گی اور سب سے مقدم بات یہ کہ اس سے تمہیں یہ پتہ چل جائے گا کہ دریا کی حالت کیا ہے اور یہ کہ پہلے سفر کے مقابلے میں اس مقام پہ آب پانی زیادہ ہے یا کم ہے "

میں نے کہا "یہ تو پنسال سے معلوم ہو جاتا ہے" یہ کہہ کر میں نے سوچا کہ اس جواب سے میں نے مسٹر بکسبی کے منھ پر کراری چپت لگائی ہے۔ مگر بکسبی نے جواب دیا "فرض کرو کہ پنسال غلط بتاتا ہے۔ اس حالت میں اس کا صحیح پتہ تو تم کو ساحل سے ہی چل پائے گا اور پھر تم ان پنسال برداروں کو چوکنا کر سکو گے۔ پچھلی مرتبہ یہاں ساحل دس فٹ اونچا تھا مگر اسوقت صرف چھ فٹ اونچا ہے۔ یہ کس بات کی علامت ہے۔؟

" اس مرتبہ دریا میں پانی چار فٹ زیادہ اونچا ہے "

مسٹر بکسبی بولے " بہت خوب۔ اچھا یہ بتاؤ کہ دریا میں اس وقت چڑھاؤ ہے یا اُتار؟"

" چڑھاؤ "

مسٹر بکسبی بولے۔ " نہیں ایسا تو نہیں ہے "

" میرا خیال ہے کہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ آگے ایک لٹھا دریا کے بہاؤ کی طرف بہتا چلا جا رہا ہے "

" دریا میں چڑھاؤ ہونے سے لٹھا ادھر اُدھر چل پڑتا ہے لیکن جب چڑھاؤ ختم ہو جاتا ہے تو تھوڑی تھوڑی دیر تک سطح پر تیرتا رہتا ہے۔ پتہ نہیں اسکے ساحل پر لگنے تک انتظار کرنا پڑے گا اور دیکھنا پڑے گا کہ وہ کنارے پر کہاں آکر ٹھہرتا ہے۔ اب دیکھو کیا تم کو یہاں جمی ہوئی مٹی کی ایک تنگ پٹی دکھائی دیتی ہے۔ یہ مٹی یہاں اس وقت جم گئی تھی جب پانی بہت اونچا تھا۔ تم دیکھتے ہو کہ بہتی ہوئی لکڑی ساحل پر جانے لگتی ہے۔ ساحل سے کچھ اور بھی مدد ملتی ہے۔ کیا تم کو " فالس پوائنٹ " پر وہ ٹھنٹھ دکھائی دیتا ہے۔؟"

" جی ہاں "

" دیکھو پانی اس کی جڑ تک ہے۔ تمہیں اس بات کو غور سے دیکھنا چاہیئے "

" کیوں۔؟"

"کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈھلان نمبر ۳۰ پر پانی کی گہرائی سات فٹ ہے۔"

"ڈھلان نمبر ۳۰ تو یہاں سے دریا کے چڑھاؤ کی طرف کافی دور ہے"

"ہاں لیکن ساحل کا فائدہ وہیں سے شروع ہوتا ہے۔ ڈھلان نمبر ۳۰ پر ابھی بہت کافی پانی ہے لیکن ہمارے وہاں پہونچنے تک شاید پانی اتنا نہ رہے لیکن ہمیں سارے ساحل کے ساتھ ساتھ چلنا ہوتا ہے۔ اگر دریا اونچائی سے گرتا ہو تو اس کے چڑھاؤ کی طرف تنگ ڈھلان کے کنارے کنارے نہ چلو اور اُتار پر ہو تو شاید ہی کوئی ایسا ڈھلان ہوگا جس کے سہارے تم کو چلنے کی اجازت ہو۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں اسکے خلاف ایک قانون بھی رائج ہے جب تک ہم ڈھلان نمبر ۳۰ پر پہونچیں گے تب تک شاید دریا میں پانی زیادہ ہوجائے۔ اس حالت میں تم ڈھلان نمبر ۳۰ کے کنارے کشتی چلا سکتے ہو۔ اب ہم جائے مقصود کے قریب پہونچ رہے ہیں۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ ہم کتنے آگے بڑھے ہیں۔"

"چھ فٹ پیچھے اور ساڑھے چھ فٹ آگے"

"اب معلوم ہوتا ہے کہ تم کچھ جاننے لگے ہو"

"لیکن میں خاص طور پر یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیا اس بارہ سو میل لمبے دریائی ساحل کی پیمائش مجھے ہمیشہ اور ہر ماہ کرنی پڑے گی"

"اور نہیں تو کیا"

تھوڑی دیر تک میری جذباتی کیفیت کچھ ایسی رہی کہ میں کچھ بول نہ سکا۔ لیکن اس کے بعد فوراً ہی میں نے پوچھا "اوران ڈھلانوں کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں۔ کیا ایسے ڈھلان بہت سے ہیں۔؟"

بکسبی صاحب نے کہا۔ ہاں۔ میرا خیال ہے کہ اس سفر میں ہم کو جتنے ڈھلان ملے ہیں اتنے پہلے کبھی نہیں ملے ہونگے۔ اگر دریا میں پھر سیلاب آتا ہے تو ہم بالو کے ٹیلوں کے پیچھے چلے جائیں گے۔ یہ ٹیلے دریا میں جگہ جگہ پر ملتے ہیں اور یہ اتنے اونچے اور خشک رہتے ہیں جیسے کسی مکان کی چھت۔ ہم ٹیلوں کے بیچ میں سے ہو کر ان نشیبی جگہوں سے جو تم نے کبھی نہیں دیکھی ہونگی گذر جائیں گے۔ یہ ٹیلے دریا میں تین سو ایکڑ رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہم ایسے شگافوں سے گذریں گے

جنھیں تم ہمیشہ ٹھوس زمین سمجھتے رہے ہو۔ ہم جنگلوں میں سے ہو کر گذریں گے اور دریا کے ۲۵ میل کے فاصلے کو ایک طرف چھوڑ جائیں گے۔ ہم کو نیو آرلینز اور ریکرو کے درمیان واقع ہونے والے ہر جزیرے کا پچھلا حصہ نظر آئے گا۔

" اس کا مطلب تو یہ ہے کہ جتنا علم مجھ کو دریا کے بارے میں حاصل ہو چکا ہے قریب قریب اتنا ہی علم اور حاصل کرنا پڑے گا اور اتنا ہی کام اور کرنا پڑے گا۔"

" نہیں! بلکہ اس سے دُگنا اور اتنی اچھی طرح جتنی تمہاری بساط میں ہو۔"

یعنی میری ساری زندگی اسی کام کے لئے وقف ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اس پیشے کو اپنا کر بڑی حماقت کی۔

" ہاں یہ سچ ہے۔ احمق تو تم اب بھی ہو۔ البتہ جب تم کو اس علم پر عبور حاصل ہو جائیگا اس وقت تمہاری حماقت رخصت ہو جائے گی۔"

" میرا خیال ہے کہ مجھے یہ علم کبھی حاصل نہیں ہو سکتا۔

" نہیں۔ ہو گا کیسے نہیں۔ ضرور ہو گا۔"

رفتہ رفتہ میں نے پھر جرأت کی اور کہا

" جس طرح مجھے دریا کے متعلق اور باتیں معلوم ہیں کیا اسی طرح یہ باتیں بھی سیکھنی پڑیں گی تاکہ میں رات کو بھی کشتی چلا سکوں۔"

" ہاں۔ اور تم کو دریا کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک کافی ایسے نشانات مقرر کرنے پڑیں گے جیسے وہ ٹھنٹھ جو تم نے دیکھا ہے۔ ان نشانات کے ذریعہ تمکو یہ پتہ چل سکے گا کہ ان بیشمار مقامات پر پانی کب زیادہ ہوتا ہے جیسا کہ اس ٹھنٹھ کے پاس۔ جب دریا میں سیلاب آئے تو تم ان میں سے نصف درجن مقامات میں جہاں پانی سب سے زیادہ گہرا ہے کشتی چلا سکو اگر پانی ایک فٹ اور چڑھ آئے تو پھر ایک درجن اور مقامات کا اضافہ کر سکتے ہو۔ اسی طرح اور آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ اسطرح تم کو یہ معلوم ہو گا کہ تم کو اپنے کناروں اور اس کی گہرائیوں کے متعلق یقینی معلومات حاصل کرنی ہونگی اور پھر تم ان سب باتوں کو آپس میں خلط ملط نہیں کرو گے کیونکہ جب تم ایک مرتبہ ان شگافوں سے شروعات کرو گے تو پھر واپس آنے کا

سوال ہی پیدا نہیں ہوگا یا پھر اگر تم دریا میں پھنس گئے اور پانی اترنے لگا تو تمہیں وہاں چھ مہینے تک رکنا پڑ سکتا ہے۔ تقریباً پچاس شگاف ایسے آئیں گے جن میں تم کشتی نہیں چلا سکو گے بجز ان حالتوں کے جبکہ دریا عروج پر ہو بلکہ جب پانی ساحل سے اوپر تک آگیا ہو۔"

"یہ نیا سبق تو بڑا خوشگوار ہے۔"

"ہاں کافی خوشگوار ہے اور یاد رکھو جیسا کہ میں نے ابھی تمکو بتایا ہے جب تم ان شگافوں میں سے کسی ایک میں داخل ہو جاؤ تو پھر تمکو انہیں عبور ہی کرنا ہوگا۔ یہ شگاف اتنے تنگ ہوتے ہیں کہ انہیں سے پیچھے ہٹنا محال ہوتا ہے یہ اتنے خمدار ہوتے ہیں کہ انمیں پیچھے کی طرف نہیں ہٹ سکتے اور انکے اگلے سرے پر پانی ہمیشہ اتنا اتھلا ہے کہ اور کہیں اتنا اتھلا نہیں ہوتا۔ مگر رفتہ رفتہ اسکے سرے بھی پانی سے بھر جاتے ہیں جسکی وجہ سے جتنی گہرائی اس موسم میں ہوتی ہے ضروری نہیں کہ اتنی ہی کسی دوسرے موسم میں بھی ہو اس لئے اس موسم کے مقرر کئے ہوئے نشانات جن سے گہرائی معلوم ہوتی ہے دوسرے موسم میں کام نہیں دیتے۔"

اسکا مطلب یہ ہوا کہ ہر سال نئے نشانات مقرر کر کے یاد رکھنا پڑیں گے۔

"یقیناً" کشتی کو ساحل تک لیجاؤ۔ دریا کے وسط میں تمہارے ٹھہرنے کا کیا مقصد ہے؟"

بعد کے کئی مہینوں کے اندر مجھے بڑی عجیب و غریب باتیں معلوم ہوئیں۔ جس روز مذکورہ بالا گفتگو ہوئی اسی روز دریا میں طغیانی آگئی۔ دریا کی ساری سطح ان بڑے بڑے لٹھوں شکستہ شاخوں اور بڑے بڑے درختوں سے جو ٹوٹ کر بہہ آئے تھے سیاہ معلوم پڑتی تھی۔ اب دن میں بھی ماہر ترین قسم کے ملاح کی ضرورت تھی جو ان تیزی سے بہتے ہوئے درختوں کے بیچ میں سے کشتی کو صحیح سلامت نکال کر لے جاوے کیونکہ جگہ بجگہ ندی کے پاٹ کو عبور بھی کرنا پڑتا تھا۔ رات کے وقت تو یہ مشکل اور زیادہ بڑھ گئی۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک بڑا شہتیر جو بہت گہرے پانی کے اندر چھپا ہوا ہوتا دفعتاً ہماری کشتی کے اگلے حصے کے نیچے آجاتا تھا۔ اس سے بچنے کی کوشش کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا اور ہمارے لئے اسکے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا تھا کہ ہم کشتی کے انجنوں کو روک دیں ایک پہیہ اس لٹھے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چڑھ جاتا اور اس سے ایک بڑی گرج سی پیدا ہوتی اور کشتی ایک طرف کو لوٹ جاتی جس سے مسافروں کو بڑی پریشانی ہوتی۔ اکثر ہماری کشتی کے نیچے یہ پانی میں چھپے ہوئے لٹھے آجاتے اور اس سے بڑی زور کی

کھڑکھڑاہٹ ہونے لگتی اور کشتی ایک دم رک دی جاتی گویا اس کا تصادم کسی برِ اعظم سے ہو گیا ہو۔
بعض مرتبہ کوئی شہتیر ایک ہی جگہ رک کر ہماری کشتی کے سامنے قیام پذیر ہو جاتا اور دریا کے پانی کو
پیچھے کی طرف دھکیل دیتا۔ ایسی حالت میں ہمیں اس رکاوٹ سے بچنے کے لئے ذرا دیکھنا پڑتا۔ بعض
مرتبہ اندھیرے میں کشتی کی ٹکر سفید رنگ کے شہتیروں سے ہو جاتی کیونکہ جب تک ہم ان کے پاس نہیں
پہونچ جاتے تھے تب تک یہ ہمیں دکھائی نہیں دیتے تھے۔ لیکن سیاہ رنگ کا لٹھا رات کے وقت بالکل
صاف نظر آتا تھا۔ روز روشن کے رخصت ہوتے ہی سفید چیز ایک بھدی ناخوشگوار سی چیز بن
جاتی تھی اور اس میں شک نہیں کہ جب یہ بڑی بھاری طغیانی آئی تو مسیسپی کے اوپر معاون دریاؤں
سے آنے والے لٹھوں کے بنے ہوئے بیڑوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا اوپر پٹس برگ سے کوئلہ لانے والی
کشتیاں اور ہر جگہ سے تجارتی ڈونگے اور " اِنڈیانا پوسے کا دنٹ " سے بڑی کشتیاں جن میں پھل، کرسی میز
وغیرہ لدے ہوتے تھے آآکر دریا میں اکٹھا ہوتے (یہاں سامان کی تفصیل کے لئے صرف پھل اور
فرنیچر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے ویسے اس سامان میں بانس اور لوکیاں زیادہ ہوتی تھیں)۔ ان کشتیوں
سے پائلٹوں کو سخت نفرت تھی اس لئے ان کشتیوں کو مع سودو واپس کر دیا جاتا تھا۔ قانون کی رو سے
ان بے سہارا سوداگروں کو اپنی کشتیوں پر روشنی جلتی رکھنے کا حکم تھا لیکن عام طور پر اس قانون پر
عمل نہیں ہوتا تھا۔ دفعتاً ایک تاریک رات کو ہماری کشتی کے اگلے حصّے کے سامنے ایک روشنی دکھائی
دی اور اس کے ساتھ ہی ایک درد بھری آواز جس کے ساتھ جنگل کی گونج بھی شامل تھی سنائی دی
وہ آواز یہ تھی " تم لوگ کہاں جا رہے ہو " نہیں کچھ دکھائی دیتا ہے یا نہیں۔ ؟ چور اُچکے کہیں
کے۔ مردود۔ ابندرکی اولادو۔!

پھر ایک لمحے کے لئے جب ہماری سیٹی بجی تو ہماری بھٹیوں کے سُرخ سرخ انگاروں کی
روشنی میں وہ تجارتی کشتی دکھائی دی اور اس آدمی کی جھلک دکھائی دی جو اتنی مرصّع زبان استعمال
کر رہا تھا۔ یہ جھلک ویسے ہی تھی جیسے بجلی کے کوندنے کی وجہ سے کوئی چیز دکھائی دی جائے اسی ایک
لمحے میں ہمارے فائرمینوں اور عرشے پر کام کرنے والے مزدوروں نے اُدھر کے لوگوں کے جواب میں
گالیوں کی بوچھار شروع کر دی۔ اس ہنگامے میں ہمارا ایک پہیہ پتوار کے ساتھ (جو ٹکڑے ٹکڑے
ہو کر گھما تھا) نکل کر جا پڑا۔ اسکے بعد پھر گہری تاریکی طاری ہو گئی۔ اس چھٹی کشتی کا ملاح یقیناً نیو آرلینز

کی جانب جا رہا ہوگا۔ وہ ہماری کشتی کا تعاقب کرنے لگا وہ زور زور سے قسم کھا کر کہہ رہا تھا کہ اسکی کشتی پر روشنی موجود تھی اور وہ وہاں پہنچ کر ہماری کشتی پر دعویٰ کر دے گا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اسکے جتھے نے لالٹین اس غرض سے نیچے کی طرف لٹکا رکھی تھی کہ وہ اندھیرے میں آزادی سے گا سکیں، لیٹ سکیں شراب پی سکیں اور جوا کھیل سکیں ۔ ان کے عرشے پر کوئی پہرے دار بھی نہیں تھا ایک مرتبہ رات کے وقت ہم ایک جزیرے کے پیچھے جنگل سے ڈھکی ہوئی چٹانوں کی گھاٹیوں میں سے گزر رہے تھے (جنکے بارے میں ملاح کہا کرتے تھے کہ وہ اتنی تاریک ہیں جتنی دوزخ کی کوٹھریاں) ہم نے پوسی کا ونٹی کے کھرلنے کی کشتی میں سے جو پھل اور فرنیچر وغیرہ لے جا رہی تھی سامان اڑانے کا منصوبہ بنالیا - وہ لوگ اتفاق سے اپنی کشتی کے نیچے کے حصے میں بیٹھے سارنگی بجا رہے تھے - خیریت ہوگئی کہ ہم کو عین وقت پر ان کی موسیقی کی آواز سنائی دے گئی اور ہم وہاں سے کھسک گئے۔ بدقسمتی سے ہم ان کا کوئی خاص نقصان نہیں کر سکے تاہم ہم ان کے اتنے قریب پہونچ گئے تھے کہ تھوڑی دیر کے لئے ہمیں اپنی کامیابی یقینی دکھائی دینے لگی تھی ۔ وہ لوگ اپنی لالٹین لے آئے اور جوں ہی ہم پیچھے ہٹے اور کشتی میں بیٹھ کر آگے چلے تو اس اعلیٰ خاندان کے چھوٹے بڑے مرد، عورت سب لوگ لالٹین کی روشنی میں کھڑے ہو کر ہمیں دیکھنے لگے ۔ وہ لوگ اس وقت تک ہمیں گالیاں دیتے رہے جبتک کہ ہر چیز دھندلا نہ گئی۔ ایک مرتبہ جب ہم نے ایک تنگ مقام پر کوئلہ لے جانے والی کشتی کے ایک ملاح کا چپو اڑانے کی کوشش کی تو اس نے گولی چلادی جو ہمارے پائلٹ ہاؤس سے گزرتی ہوئی نکل گئی۔

گیارھواں باب

دریا میں طغیانی آتی ہے

اس زبردست طغیانی کے دوران میں دریا میں چھوٹی چھوٹی کشتیوں کا آنا جانا بہت ناگوار گزرتا تھا۔ ہم ایک ڈھلان سے دوسری ڈھلان تک چلے جا رہے تھے میرے لئے یہ ایک بالکل نئی دنیا تھی۔ اگر کسی ڈھلان میں کوئی بہت تنگ مقام آجاتا تو ہمارا ضرور کسی بڑی کشتی سے سامنا ہو جاتا۔ اگر خوش قسمتی سے یہ حادثہ ٹل جاتا تو پھر اس سے بھی خطرناک مقام پر یہ مرحلہ پیش آتا اور پھر دونوں طرف سے گالیوں کا وہ سلسلہ شروع ہو جاتا کہ توبہ ہی بھلی۔

بسا اوقات جب ہم اس بڑے دریا میں بڑی احتیاط کے ساتھ کہرے میں ہو کر گزر رہے ہوتے ہیں تو اس وقت جو گہری خاموشی طاری ہوتی ہے وہ یکایک ٹیم کے تسلوں کی کھنکھناہٹ سے ٹوٹ جاتی ہے اور ایک ہی لمحہ میں کوئی نہ کوئی بیڑا مکڑی کے جال جیسے باریک کہرے سے نکل کر ہمارے پیچھے پیچھے آجاتا ہے۔ ایسے میں ہم ان لوگوں سے مقابلہ کرنے اور چاقو نکالنے کے لئے رکنے کی بجائے انجن کی گھنٹیوں کو بالکل نہ بجنے دیتے اور ساری بھاپ کے زور سے فوراً اپنی کشتی کو دور بھگا لے جاتے کیونکہ اگر بچ کر نکل جانے کا راستہ مل جائے تو کوئی بھی اپنی دخانی کشتی کو کسی چٹان یا شہتیر سے ٹکرانا پسند نہیں کرے گا۔

آپ کو غالباً مشکل سے ہی یقین آئے گا مگر یہ واقعہ ہے کہ دخانی کشتی میں کام کرنے والے بیشتر لوگ پرانے زمانے میں اپنے ساتھ بکثرت مذہبی کتابیں لے جایا کرتے تھے۔ دن میں بیس بیس دفعہ ہم لوگ کسی ریتیلے ساحل سے ٹکراتے تھے جبکہ ساحل کے موڑوں پر ہم سے دو میل آگے یا پیچھے، بہت سی چھوٹی چھوٹی کشتیاں ادھر ادھر بھٹکتی پھرتی۔۔۔ تھیں۔

ان میں سے کبھی کوئی کشتی تیزی سے جھپٹتی ہوئی آتی اور بڑی محنت سے دریا کے پاٹ کو پار کر جاتی اور پھر ہماری کشتی کے اگلے حصے کے سایہ میں کھڑی ہو جاتی۔ اس کے ہانپتے ہوئے ملاح خوشی سے چلا اٹھتے "ہم آگئے" اور پھر وہ کشتی ایک طرف کو ہو جاتی اور کلارک نیو آرلینز کے رسالوں کا ایک پیکٹ ان کی کشتی میں پھینک دیتے۔ اگر یہ رسائل یلا کسی رائے زنی کے اٹھائے جاتے تو پھر اور بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی کشتیاں آپ کی طرف آتی دکھائی دیں گی جو یہ دیکھ رہی تھیں کہ پہلے آنے والی کشتی کو کیا ملتا ہے۔ اگر پہلی کشتی والے پیکٹ لے کر چل دیتے اور کچھ نہ کہتے تو باقی کشتیوں والے بھی پتواروں کو جلدی جلدی چلاتے ہوئے تیزی سے آگے آ جاتے۔ جیسے ہی وہ قریب آتے تو کلارک مذہبی کتابوں کے چھوٹے چھوٹے صاف ستھرے بنڈل ان کی طرف پھینک دیتے اور وہ انھیں اٹھا لیتے تھے ان کتابوں کو لینے کے لئے کشتیوں کے ملاح گرمیوں کے دنوں میں دو دو میل سے بھاری کشتیوں کو کھینے ہوئے چلے آتے تھے۔ ان مذہبی کتابوں کو پڑھ کر نہ جانے کتنے عہد و پیمان ان کو اپنی زندگی میں کرنے پڑتے۔ اس بات کا اس وقت کسی کو یقین بھی نہیں ہوتا... تھا۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں دریا میں طغیانی کی وجہ سے مجھے ایک نئی دنیا کا نظارہ میسر ہوا۔ جب تک دریا کا پانی ساحل کے اوپر آتا ہم اپنا پرانا راستہ چھوڑ چکے ہوتے آنے والے ہر گھنٹے میں ہم ان ریتیلے پشتوں پر چڑھتے رہتے تھے جو پانی کی سطح سے کبھی دس فٹ باہر نکلے ہوئے تھے۔ ہم چھوٹے چھوٹے ساحلوں کو چھوتے ہوئے جا رہے تھے جیسا کہ ہم نے "میڈ بینڈ" پر کیا تھا۔ پہلے میں دیکھا کرتا تھا کہ اس موڑ سے لوگ بچ کر نکل جاتے تھے۔ ہم نمبر ۸۲ جیسے ڈھلوان سے جہاں پہلے ایک سیدھی لکڑی کی دیوار تھی کھڑ کھڑاہٹ کی آواز کرتے ہوئے گذرے اور اس کے آخر تک پہونچ گئے۔ ان میں سے بعض ڈھلانیں بالکل خاموش تھیں۔ ان ٹیڑھے اور دشوار گذار شگافوں کے دونوں طرف گھنے جنگل اُگے ہوئے تھے اور ان کو دیکھ یہ خیال ہوتا تھا کہ کبھی انسان نے کبھی ان جگہوں پر قدم نہیں رکھا ہوگا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے ہمیں انگور کی لہراتی ہوئی بیلوں اور جنگلوں سے گھرے ہوئے گھاس کے خطوں نیز لمبی لمبی درختوں کی قطاروں کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ سُرخ سرخ پھولوں وا

بیلیں خشک درختوں کے تنوں سے لٹک رہی تھیں اور جنگل کا یہ جابجا پھیلا ہوا حسن پانی میں
غرق ہو کر رائیگاں ہو رہا تھا۔ ڈھلانوں میں کشتی چلانے میں بڑا لطف آتا ہے کناروں کے
علاوہ ہر جگہ ڈھلان گہرے تھے یہاں دریا کا بہاؤ بھی سست ہوتا ہے۔ نشانات کے نیچے تو
پانی بالکل ساکن ہوتا تھا۔ چھپے ہوئے ساحل یکدم ڈھلان بن جاتے تھے۔ یہاں بید کی
نرم و ملائم جھاڑیاں دریا کے باہر نکلی ہوئی تھیں اور ان میں سے ہو کر نکلتے وقت کشتی کا چوڑا
حصہ ان سے اس طرح ڈھک جاتا تھا جس سے ایسا محسوس ہوتا تھا گویا آپ ان میں پھنس
گئے ہوں۔

دوسرے جزیروں کے عقب میں چھوٹے چھوٹے کھیت تھے جن کی حالت بہت خراب
تھی۔ ان میں لکڑی سے بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی خستہ حال کوٹھریاں تھیں جن کے بد سید ستون نکلے پانی
کی سطح سے ایک دو فٹ اوپر نکلے ہوئے تھے۔ یہاں دو ایک زرد رو قبیلہ نسب زمین کی پوشاک
پہنے بیٹھے تھے۔ وہ اپنی کہنیاں گھٹنوں پر ٹیکے اور اپنے جبڑوں کو ہاتھوں سے پکڑے تمباکو چبا رہے
تھے اور ٹوٹے ہوئے دانتوں کے شگافوں سے اس کی پیک کو تیرتے ہوئے لکڑی کے تختوں پر تھوکتے
جاتے تھے ان کے گھروں کے باقی ماندہ لوگ اور کھیتوں میں کام آنے والے چند مویشی ایک
لکڑی کی کوٹھڑی میں جو ان کے قریب ہی لنگر گاہ میں تھی بری طرح ٹھسے پڑے تھے۔ یہیں گھر والے
کھانا بناتے تھے، یہیں کھاتے تھے اور یہیں سوتے تھے۔ اس طرح ان کو پانی کے اوپر بنے ان
مکانوں میں ہفتوں رہنا پڑتا تھا جب دریا کا پانی دو تین فٹ اتر جاتا تو یہ لوگ اپنی
لکڑی کی کوٹھریوں سے باہر نکل کر زمین پر رہنے لگتے تھے یہاں سردی بہت ہوتی تھی مگر یہ
سردی بھی خداوند تعالیٰ کی جو دانائے مطلق ہے رحمت تھی تاکہ ان لوگوں کو کڑی محنت کے بعد
بھی کم تھکاوٹ ہو۔ اس طرح انہیں سال میں دو مرتبہ دریا میں سکونت اختیار کرنا پڑتی
تھی۔ ایک مرتبہ تو دسمبر میں جب دریائے اوہایو میں طغیانی آتی اور دوسری مرتبہ جون کے
مہینے میں جبکہ مسیسپی طغیانی پر ہوتا تھا اور اس میں رحمت ایزدی شامل تھی کیونکہ اس سے
یہ فائدہ ہوتا تھا کہ کبھی کبھی جب کوئی کشتی ادھر سے گذرتی تو ان کی سستی اور بزدلی کم
ہو جاتی اور ان میں زندگی کے آثار نمودار ہو جاتے۔ یہ لوگ بھی اس رحمت ایزدی کے بدلے

ملاح تھے وہ اس مصیبت کے دوران میں ہر ممکن طریقے سے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے تھے کیونکہ اس موسم میں جب دریا اتر جاتے ہیں ان بیابانوں میں رہنے والے لوگوں کو کیا کام مل سکتا تھا جس سے وہ گذر اوقات کر سکتے۔؟

ایک مرتبہ ہم نے دیکھا کہ جزیرے کی ان خوبصورت ڈھلانوں میں ہمارا راستہ ایک بڑے بھاری درخت کے گرنے سے بالکل رک گیا تھا۔ اس سے یہ جاننے میں مدد ملتی ہے کہ انہیں یہ کچھ ڈھلان کس قدر دشوار گذار تھے۔ مسافروں کو ایک ویرانے میں سستانا پڑا اور اس دوران میں کشتی کے ملاح اس درخت کو ہٹا کر راستہ صاف کرنے میں مشغول رہے کیونکہ جیسا کہ آپ سمجھ سکتے ہیں یہاں سے واپس لوٹ جانے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

کیروسے بیٹن روج تک جب دریا کا پانی کناروں کے اوپر پہونچ جاتا ہے تو رات کے وقت سفر کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی کیونکہ ایک ہزار میل تک دریا دونوں طرف گھنے جنگلوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہ سلسلہ صرف کہیں کہیں کھیت یا لکڑی کے انبار آ جانے سے منقطع ہوتا ہے ورنہ یہ دیوار کی طرح دریا کی کل لمبائی میں دونوں طرف پھیلا ہوا ہے۔ اس وجہ سے دریا سے باہر نکلنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے جیسا کہ اس گلی سے جس کے دونوں طرف جنگلے لگے ہوں لیکن بیٹن روج سے لے کر نیو آرلینز تک صورت حال مختلف ہے۔ یہاں دریا ایک میل سے زیادہ چوڑا اور بہت گہرا ہے۔ کہیں کہیں تو یہ گہرائی دو سو فٹ تک ہے۔ یہاں سے سو میل سے بھی زیادہ فاصلے تک ساحل کے دونوں طرف عمارتی لکڑی کے جنگل نہیں پائے جاتے بلکہ ان پر لگاتار گنے کے کھیت ہی ملتے ہیں۔ صرف کہیں کہیں خوبصورت چائنا بیری یا دوسرے قسم کے درختوں کی قطاریں نظر آ جاتی ہیں گنے کے کھیتوں کے پیچھے لکڑی کے جنگل کو دو سے لے کر چار میل کی دوری تک صاف کر دیا گیا ہے جب برفباری کا موسم ڈھکی دیتا ہے تو کاشتکار جلدی سے اپنی فصل کاٹ لیتے ہیں۔

جب گنا پیلنے کا کام ختم ہو جاتا ہے تو پھوک، کاٹے کھوئی کہتے ہیں ڈھیر لگا دیتے ہیں اور پھر اسے جلا ڈالتے حالانکہ دوسرے ملکوں میں یہ کھوئی شکر کے کارخانوں کی بھٹیوں میں ایندھن کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ گیلی کھوئی کے ڈھیر بہت آہستہ آہستہ جلتے ہیں اور ان میں

سے جو دھواں نکلتا ہے اس کو شیطان کے باورچی خانے کے دھوئیں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

کشتی کی نشیبی سمت کے تمام راستے میں اس کے دونوں طرف ساحل کی حفاظت کے لئے دس یا پندرہ فٹ اونچا پشتہ بنا دیا گیا ہے۔ یہ پشتہ حسب ضرورت ساحل سے دس سے سو فٹ تک پیچھے ہٹ کر بنایا جاتا ہے۔ عام طور پر یہ تیس یا چالیس فٹ پیچھے ہٹ کر ہی بنایا جاتا ہے جب دریا کا پانی ساحل کے اوپر تک آجاتا ہے تو گنے کے جلتے ہوئے پھوس کے انبار سے جو دھواں اٹھتا ہے اسکی راستہ روک تاریکی سارے خطے پر چھا جاتی ہے ایسے میں آدھی رات کے وقت کشتی کو ڈھیلا چھوڑ کر دیکھیے کہ اسے کن حالات سے دوچار ہونا پڑے گا اور یہ بھی دیکھیے کہ اس سے آپ پر کیا گزرتی ہے۔

ایسی حالت میں آپ ایک ایسے مبہم اور تاریک سمندر میں پہونچ جائیں گے جس کا کہیں کنارہ نظر نہیں آتا۔ یہ تاریک سمندر تاریکی میں نظر سے اوجھل ہو جاتا ہے کیونکہ اس وقت آپ پشتے کی تاریک لکیر دیکھ [illegible] نہیں کر سکیں گے۔ بلکہ آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ آپکے سامنے کوئی چلتا پھرتا پہاڑ ہے حالانکہ وہاں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ کھیتوں کی ہیئت بھی دھوئیں سے بدل جاتی ہے اور وہ بھی سمندر کا ایک جزو نظر آنے لگتے ہیں۔ آپ لاکھ پھرتے رہیئے لیکن آپ کو کچھ پتہ نہیں چلتا کہ اب کیا مصیبت پیش آنے والی ہے ایک عجیب بے یقینی کی سی حالت ہوتی ہے۔ آپ کو محسوس تو یہی ہوتا ہے کہ آپ دریا میں سفر کر رہے ہیں لیکن آپ کو اس کی اصلی حالت کا پتہ نہیں ہوتا۔ اس حالت کا خاص امکان ہے کہ آپ کو تو یقین ہو کہ آپ ساحل سے کم از کم دو میل دور ہیں لیکن درحقیقت آپ ساحل اور [illegible] سے صرف چھ فٹ دور ہوں۔ آپ کو یہ بھی یقین ہوتا ہے کہ اگر آپ کی کشتی پشتے سے ٹکرا گئی اور اس کی پتوار گر کر ٹوٹ گئیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی لیکن آپ کو کم از کم یہ اطمینان ہوتا ہے کہ جن باتوں کا آپ کو اندیشہ تھا وہ پیش آ رہی ہیں۔ کسی گاؤں کی ایک بڑی [illegible] ایک دفعہ رات کے وقت گنے کے کھیت سے جا ٹکرائی اور اسے ایک ہفتہ تک وہاں پڑا رہنا پڑا لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی ایسا پہلے بھی اکثر ہو چکا تھا۔

میرا خیال تھا کہ میرا باب [illegible] تمام ہو جانے [illegible] ختم کرنے سے پہلے میں ایک اور عجیب و غریب بات کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ چونکہ اس کا تعلق پائلٹنگ کے کام سے ہے اسلئے

اس کا ذکر یہاں برمحل معلوم ہوتا ہے۔ اس دریا پر ایک اعلیٰ درجے کے پائلٹ مسٹر ایکس ہوا کرتے تھے ان کو سوتے میں چلنے کا مرض لاحق تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اگر وہ دریا کے کسی خراب حصے کے باعث پریشانی میں مبتلا ہو جاتے تو یقینی طور پر سوتے میں اٹھ کر ٹہلنے لگتے اور عجیب و غریب حرکتیں کرتے۔ ایک بار وہ جارج ایلر کے ساتھ نیو آرلینز کے ایک بڑے مسافر بردار جہاز پر پائلٹ کا کام کر رہے تھے اس سے پہلے سفر میں بہت دیر تک مسٹر جارج گھبرائے ہوئے سے معلوم ہوتے رہے لیکن رفتہ رفتہ ان کے ہوش و حواس مجتمع ہونے لگے کیونکہ مسٹر ایکس ابھی تک اپنے بستر پر پڑے آرام سے سو رہے تھے۔ مگر ایک روز رات زیادہ گذر چکی اور کشتی ارکنسا کے علاقے میں ہیلینا کے قریب پہونچ رہی تھی۔ یہاں پانی کی سطح نیچی تھی اور قصبے کے قریب گھپ اندھیرا تھا اور کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ مسٹر ایکس اس موڑ کو حال ہی میں دیکھ چکے تھے جبکہ ایلر نے اسے بہت پہلے دیکھا تھا۔ رات بیحد تاریک تھی۔ پھوار بھی پڑ رہی تھی اور ہر طرف تاریکی کی حکومت تھی مسٹر ایلر کھڑے کھڑے یہ سوچ رہے تھے کہ مسٹر ایکس کو اپنی مدد کے لئے بلانا بہتر ہوگا یا نہیں کہ اس وقت دروازہ کھلا اور مسٹر ایکس خود بخود پائلٹ ہاؤس میں آگئے۔ شاید آپ کو یاد ہو کہ بہت تاریک راتوں میں کشتی کے اندر کسی طرح کی روشنی جہازرانی کے لئے ہلاکت خیز ثابت ہوتی ہے اگر آپ ایسی تاریک رات میں کسی ایسے کمرے کے اندر ہوں جس میں روشنی موجود ہو تو آپ کو باہر کی چیزیں نظر نہیں آئیں گے اور نہ آپ ان کو ٹھیک سے پہچان ہی سکیں گے، لیکن اگر آپ روشنی کو گل کر دیں اور تاریکی میں کھڑے ہو جائیں تو آپ باہر کی ہر چیز کو بخوبی پہچان سکیں گے۔ اسی لئے بہت تاریک رات میں پائلٹ سگریٹ تک نہیں پیتے۔ کشتی میں اگر کوئی دراز ہو جس سے آگ کی کرنیں نکل کر ذرا سا بھی باہر جا سکتی ہوں تو یہ لوگ پائلٹ ہاؤس میں آگ نہیں جلاتے۔ وہ بھٹیوں پر ترپال کے پردے ڈال دیتے ہیں اور روشندانوں کو بالکل بند کر دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں کشتی سے کسی قسم کی روشنی نہیں نکلتی۔ دفعتاً ایک مبہم اور ایک غیر واضح سا سایہ پائلٹ ہاؤس میں داخل ہوا جس کی آواز مسٹر ایکس کی آواز سے ملتی جلتی تھی۔ اس نے کہا "جارج کشتی میرے حوالے کر دو۔ آپکے دیکھنے کے بعد میں نے متعدد بار یہ جگہ دیکھی ہے۔ اور یہ جگہ اتنی بری [illegible] طرح تھی

ہے کہ میرا خیال ہے کہ میں بجائے اس کے کہ آپکو کشتی کو نکالنے کا طریقہ بتاؤں میں خود ہی اسے زیادہ آسانی سے نکال لے جاؤں گا۔"

"آپکی بڑی مہربانی ہے میں سچ کہتا ہوں کہ میری بھی یہی خواہش ہے۔ مجھ میں اب ذرا بھی طاقت باقی نہیں ہے۔ میں پہیے کو گھڑی کی طرح بار بار چکر دے رہا ہوں۔ اسوقت اتنا اندھیرا ہے کہ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ کشتی کہاں جارہی ہے کیونکہ یہ تو لٹو کی طرح گھوم رہی ہے۔ لہٰذا ایلبر ایک تپائی پر بیٹھ گیا۔ اس کا کلیجہ بری طرح دھڑک رہا تھا اور اسے سانس لینا بھی دشوار تھا۔ اس کالے سائے نے بغیر کچھ کہے سنے پہیہ تھام لیا اس نے دو ایک مرتبہ اُسے گھما کر اس ناچتی ہوئی کشتی کو سنبھال کر اطمینان سے کھڑا کر دیا وہ ایسے اطمینان سے کام کر رہا تھا گویا بجائے تاریک رات کے دوپہر میں کام کر رہا ہو۔

جب ایلبر نے کشتی چلانے کی یہ عجیب و غریب مہارت دیکھی تو خیال آیا کہ اسکو اپنی معذوری کا اظہار نہیں کرنا چاہیئے۔ وہ حیران ہو کر مسٹر ایکس کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا آخرکار وہ بول اٹھا۔ "میرا خیال تھا کہ میں کشتی چلا سکتا ہوں لیکن میں غلطی پر تھا۔"

مسٹر ایکس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سنجیدگی کے ساتھ اپنے کام میں محو رہا۔ اس نے پنسال برداروں کو آگاہ کرنے کے لئے گھنٹی بجائی اور حکم دیا کہ بھاپ کی تیزی کم کر دی جائے وہ بڑی احتیاط اور صفائی کے ساتھ کشتی کو ان نشانوں تک لے گیا جو دکھائی بھی نہیں دے رہے تھے۔ پھر وہ پہیے کے دُھرے کے پاس کھڑا ہو گیا اور یہ تصدیق کرنے کے لئے کہ اسوقت وہ کس مقام پر ہے اس نے اندھیرے میں بڑے غور سے آگے اور پیچھے دیکھا۔ جب پنسال برداروں سے یہ معلوم ہوا کہ پانی اتھلا ہے تو اس نے انجنوں کی حرکت بالکل بند کر دی اور جب کشتی سب سے زیادہ اتھلے پانی میں آگئی اور یہ تشویش پیدا ہو گئی کہ نہ جانے ہم کدھر بہہ جائیں اور بالکل خاموشی طاری ہو گئی تو اس نے بھاپ نکال دی۔ پھر کشتی کو قدرے احتیاط کے ساتھ آگے لے گیا اسکے بعد نہایت ہوشیاری کیساتھ وہ ان دوسرے مقامات میں سے ہو کر نکل گیا جہاں پانی کم گہرا تھا اس نے نہایت مستعدی اور احتیاط سے پنسال اور انجن کا استعمال کیا کشتی دریا کی تہہ کو چھوئے بغیر آگے کھسکی اور آخرکار اس موڑ میں داخل ہو گئی جو تیسرا اور آخری خطرناک مقام تھا۔ غیر محسوس طریقہ پر کشتی اندھیرے میں آہستہ آہستہ

آگے بڑھی اور ایک ایک انچ بڑھتے بڑھتے وہاں تک پہونچی۔ پھر مشکل سے ایک طرف کو ہٹی یہاں تک کہ وہ سب سے زیادہ پایاب پانی میں پہونچ گئی پھر بھاپ کے ایک زور کے دھکے سے وہ ہچکولے کھاتی ہوئی ایک چٹان پر چڑھ گئی جہاں سے گہرے پانی میں گر کر وہ محفوظ علاقے میں پہنچ گئی۔

ایلر صاحب نے جو بڑی دیر سے سانس روکے تشویش کے ساتھ یہ سب دیکھ رہے تھے ایک سکون آمیز آہ بھری اور کہا "مسیسپی میں آج تک ایسی مزیدار جہاز رانی کبھی نہیں ہوئی۔ اگر میں اسے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھتا تو غالباً اس کا یقین کبھی نہ کرتا"

اس کی بات کا کسی نے جواب نہ دیا مگر اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"پارٹنر، ذرا پانچ منٹ تک اور یہیں رہو۔ میں ذرا نیچے جا کر ایک پیالہ کافی پی آؤں"

ایک ہی منٹ میں ایلر صاحب نیچے اتر کر ہوٹل میں جا پہونچے جہاں انھوں نے کافی اور کھانے کے لئے کچھ منگوایا۔ عین اسی وقت رات کا چوکیدار وہاں آ پہنچا۔ وہ واپس جانے والا ہی تھا کہ اس کی نظر ایلر صاحب پر پڑی اور اس نے چلا کر کہا "پہیئے کے پاس کون ہے۔؟"

جواب ملا "مسٹر ایکس"

چوکیدار نے کہا "فوراً پائلٹ ہاؤس میں پہونچ جائیے۔ جلدی کیجئے بہت جلدی"

فوراً ہی دونوں آدمی ساتھ ساتھ پائلٹ ہاؤس کی طرف لپکے۔ وہ ایک قدم میں تین تین سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔ پہیئے پر واقعی کوئی نہ تھا۔ اور دریا کے وسط میں یہ عظیم اسٹیمر خود ہی سیٹی بجا رہا تھا جو کیچڑ کی پھرتی سے باہر نکل آیا۔ ایلر نے پہیہ ہاتھ میں تھاما۔ ایک انجن کو زور سے پیچھے کھینچا پھر وہ سانس روکے کھڑا رہا۔ اسی وقت کشتی دفعتاً ایک جھاڑی سے دور ہٹ گئی ورنہ میکسیکو کی کھاڑی میں وہ اسی جھاڑی سے ٹکرانے کو ہی تھی۔!

کچھ ہی دیر بعد چوکیدار پھر آیا اور بولا "کیا اس پاگل نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ جب وہ یہاں آیا تھا تو سو رہا تھا"

ایلر نے کہا "نہیں تو"

چوکیدار بولا "جناب وہ تو سو رہا تھا۔ میں نے اسے جنگلے کے سرے پر چلتے ہوئے دیکھا وہ ایسی بے فکری سے چل رہا تھا جیسے کوئی سڑک کے کنارے کنارے پٹری پر چل رہا ہو۔ پھر میں نے اُسے اُسکے بستر پر لٹا دیا۔ ایک منٹ بعد وہ پھر وہیں پہونچ گیا اور پہلے جیسی بے باکی سے یوں چلنے

لگا جیسے کوئی سرکس کا کھلاڑی پتلی رسّی پر چل رہا ہو۔

ایلر نے کہا: "اب کے جب دوبارہ اسے ایسا دورہ پڑے گا تو میں اس کے پاس رہوں گا اور میرا خیال ہے کہ اسے ایسے دورے اکثر پڑتے ہوں گے۔ کاش تم اس کو میلینا کے موڑ پر کشتی چلاتے ہوئے دیکھتے میں نے اتنی شاندار جہاز رانی پہلے کبھی نہیں دیکھی جب وہ گہری نیند میں سوتے ہوئے ایسی چابکدستی اور مہارت سے اتنی شاندار جہاز رانی کر سکتا ہے تو مرنے کے بعد وہ کیا کچھ نہ کر سکیگا!"

بارھواں باب

گہرائی ناپنا

جب دریا کی سطح بہت نیچی ہو اور دخانی کشتی ندی کا سب پانی کھینچ لے یا پرانے زمانے کی طرح کچھ زیادہ ہی پانی کھینچے تو جہاز رانی میں بہت احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسلئے جب کبھی دریا میں پانی بہت کم ہوتا تھا تو ہم قریب قریب ہر سفر میں بعض خاص مقامات پر دریا کی گہرائی ناپ لیا کرتے تھے۔

دریا کی گہرائی اس طرح ناپی جاتی ہے کہ نچلے پانی سے کچھ اوپر کی طرف کشتی کنارے سے بلند کی جاتی ہے۔ جو پائلٹ پہرے پر نہیں ہوتا وہ اپنے شاگرد یا پتوار چلانے والے دنیز کچھ منتخب ملاحوں کو (جن میں بعض مرتبہ کوئی حاکم بھی شامل ہوتا ہے) لیکر ایک کشتی میں چلتا ہے۔ اگر اس کے پاس ہر ضروری چیز اور آرام و آسائش کے سامان سے آراستہ کشتی جسے گہرائی ناپنے والی مخصوص کشتی کہتے ہیں نہیں ہوتی تو وہ جہاز کے ساتھ والی معمولی کشتی میں ہی چلتا ہے۔ اور وہ بہترین پانی کی تلاش میں چلتے ہیں۔ اسی دوران میں جو پائلٹ وہاں کام پر مامور ہوتا ہے

وہ دوربین سے اس کشتی کی حرکات و سکنات پر نظر رکھتا ہے اسے کشتی کے انجینیروں سے کچھ مدد ملتی ہے۔ پائلٹ یہ بتاتا رہتا ہے کہ بلندی کی طرف چلو اور اب نشیب کی طرف کیونکہ پانی کی سطح مد غنی رنگوں کی بنی ہوئی ایک ایسی تصویر جیسی ہوتی ہے جو چند گز کی دوری سے دیکھنے سے زیادہ واضح اور قابل فہم ہوتی ہے بمقابلہ اس کے کہ اس کا معائنہ نہایت ہی قریب سے کیا جائے اسلئے سیٹی کے اشاروں کی ضرورت کم ہی پڑتی ہے۔ جب ہوا سے پانی کی سطح پر بڑی بڑی موجوں میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے تب تو ان اشاروں کی بالکل اہمیت نہیں رہتی۔

جب یہ چھوٹی کشتی کہیں پایاب پانی میں پہونچ جاتی ہے تو اس کی رفتار کم ہو جاتی ہے اور پائلٹ ایک دس یا بارہ فٹ لمبے بانس سے پانی کی گہرائی ناپنے لگتا ہے اور سکان پر بیٹھا ہوا ملاح پھر اسطرح کے احکام کی تعمیل کرتا رہتا ہے۔ "کشتی کو دائیں طرف مڑ کے رکھو" یا اس کو بائیں طرف جھکا دو یا اسے ایسے ہی رکھو اور اسی سمت میں چلنے دو" وغیرہ وغیرہ۔

جب پیمائش سے معلوم ہو جاتا ہے کہ بہتر ہے ساحل کے پایاب ترین پانی میں ناؤ داخل ہو گئی ہے تو حکم دیا جاتا ہے کہ کشتی بالکل روک دو اور ملاح کشتی چلانا بند کر دیتا ہے اور ناؤ دھارا کے ساتھ بہنے لگتی ہے۔ پھر دوسرا حکم یہ ملتا ہے کہ بیراک پہیے کے پاس کھڑے رہو۔ جونہی کشتی سب سے زیادہ پایاب پانی میں پہونچتی ہے تو پائلٹ حکم دیتا ہے" بیراک پہیے کو چھوڑ دو" اور کشتی پھر چلنے لگتی ہے' اور اگر اس سے بھی پائلٹ کی تشفی نہیں ہوتی تو وہ اس کی گہرائی پھر ناپتا ہے۔ اگر اس کو بلندی یا نشیب میں اچھا پانی نظر آتا ہے تو وہ بیراک پہیے ہٹا کر اسی جگہ لے آتا ہے۔ جب اسکی پوری طرح تشفی ہو جاتی ہے تو پھر وہ حکم دیتا ہے جسکے مطابق لوگ اپنے اپنے پتواروں کو ہوا میں بلند کر کے ایک قطار میں کھڑا کر لیتے ہیں۔ پھر جب کشتی سے سیٹی کی آواز دور سے آتی ہے تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ سگنل دیکھ لیا گیا ہے۔ تب سب لوگ پتواروں کو چھوڑ دیتے ہیں اور ڈونگی کو اچھا کر بیراک پہیے کے ساتھ لگا دیتے ہیں۔ پھر اسٹیمر آہستہ آہستہ نہایت احتیاط کے ساتھ پیچھے کی طرف بڑھتا ہے اور اس کا رخ پہیے کی طرف کر دیا جاتا ہے۔ پھر کشتی اگلی جد و جہد کے لئے بھاپ کی طاقت پیدا کرتی ہے اور کسی نازک موقع پر اپنی تمام بھاپ کی طاقت سے بیراک پہیے اور ریت کے

پشتے کی طرف بڑی مشکل سے لوٹتی ہے اور اس کو پار کر کے گہرے پانی میں آجاتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ گہرے پانی میں نہ پہونچ پائے۔ تب وہ ریت کے ساحل سے ہی ٹکرا کر جھکولے کھانے لگتی ہے۔ ایسی حالت میں اُسے کئی کئی گھنٹے یا کئی کئی دن تک وہیں گذارنے پڑتے ہیں اور اُسے بلیوں سے باندھ دیا جاتا ہے۔ بعض مرتبہ دریا میں پیراک پیپا نہیں ڈالا جاتا بلکہ ایک چھوٹی کشتی بہترین پانی کی تلاش میں آگے بڑھ جاتی ہے اور اسٹیمر اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ بعض مرتبہ دریا کی پیمائش میں بڑا مزہ آتا ہے اور لوگوں کو اس میں خاصی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر گرمی کے موسم میں جبکہ دن شاندار ہوتا ہے یا رات طوفانی۔ لیکن جاڑے میں جب بہت سردی پڑتی ہے اور صورت حال خطرناک ہوتی ہے تو اس کام کا سارا لطف جاتا رہتا ہے۔

پیراک پیپا ایک چار یا پانچ فٹ چوڑا تختہ ہوتا ہے جس کا ایک سرا اوپر کی طرف مڑا ہوتا ہے گویا وہ ایک اسکول کی بینچ ہو جو الٹ دی گئی ہو جس میں ایک پایہ لگا رہنے دیا ہو اور باقی نکال دیئے گئے ہوں۔ ایک رسّی کے ذریعہ پتھریلے ساحل کے اوپر جہاں سب سے کم پانی ہوتا ہے اس کو رکھ دیا جاتا ہے اور اسکے اٹھے ہوئے سرے سے ایک بھاری پتھر باندھ دیا جاتا ہے۔ اس کا مڑا ہوا سرا اس کو دھارے میں رُوکے رہتا ہے۔ ورنہ اسے پانی بہالے جائے۔ رات کے وقت کاغذ کی ایک قندیل میں موم بتی جلا کر پیراک پیپے کے اوپر لٹکا دی جاتی ہے تاریکی کے عالم میں ایک یا ایک سے زیادہ میل کے فاصلے تک اس کی روشنی ٹمٹماتی ہوئی نظر آتی ہے۔ نوسکھیئے پائلٹ کو اگر پیمائش کے کام پر جانے کا اتفاق ہو جائے تو اس کے لئے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کوئی نہیں ہوتی یہ بڑی دلچسپ مہم ہوتی ہے لیکن بسا اوقات صورت حالات خطرناک بھی ہو جاتی ہے۔ پیمائشی کشتی کے پچھلے حصے میں بیٹھ کر اسے تیز چلانے میں ان کو جنگی جہازوں کے ملاحوں کی شان و شوکت کا سا احساس ہوتا ہے۔ جب تجربہ کار اور کہن سال ملاح پتوار چلانے میں دل و جان سے جٹ جاتے ہیں تو اسوقت کشتی کے مسرت آمیز جھٹکوں اور ہچکولوں میں بڑا لطف آتا ہے کشتی کے اگلے حصے کے نیچے سے سفید جھاگ کے اٹھنے کا نظارہ نہایت دلفریب ہوتا ہے اسوقت پانی کے تھپیڑوں سے ایک عجیب و غریب سی موسیقی پیدا ہوتی ہے۔ گرمی کے موسم میں جب دریا کی سطح پر ٹھنڈی ہوا چل رہی ہو اور دھوپ

میں لہریں رقص کر رہی ہوں تو تیز رفتاری سے کشتی چلانا نہایت ہی پر لطف اور جاں بخش معلوم ہوتا ہے مبتدی پائلٹ کے لئے یہ بڑی شان کی بات ہے۔ کیونکہ ملاحوں کو حکم دینے کا موقع ملتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ پائلٹ تو کشتی کو چلنے کا حکم دیکر باقی کام مبتدی پائلٹ پر ہی چھوڑ دیتا ہے۔ پھر مبتدی پائلٹ بڑے رعب سے حکم صادر کرتا ہے اور نہایت تحکمانہ لہجے میں چلاتا ہے "دائیں طرف آہستہ سے موڑو' بائیں طرف زیادہ دباؤ ڈالو' اب دائیں طرف ڈھیل چھوڑدو خوب دل لگاکر کام کرو۔ جٹ جاؤ ہاں جٹ جاؤ۔" مبتدی کپتان کو دریا کی پیمائش میں اسوجہ سے اور بھی لطف آتا ہے کہ دن کے وقت مسافر کشتی کی روانی کو بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھتے ہیں اور اگر رات کا وقت ہو تو مبتدی پائلٹ جانتا ہے کہ مسافروں کی حیرت زدہ نگاہیں دور جاتی ہوئی کشتی کی لالٹین کی روشنی پر جمی ہوئی ہیں جو تاریکی میں جھلملاتی رہتی ہے۔

ایک مرتبہ ایک سفر کے دوران میں ایک سولہ سالہ حسین وجمیل دوشیزہ نے قریب قریب ہر روز سارا دن اپنے چچا اور چچی کے ساتھ پائلٹ ہاؤس میں گذرا۔ مجھے اس سے محبت ہوگئی۔ مسٹر تھامسن برگ کا شاگرد پائلٹ ٹام 'جی' بھی اس لڑکی پر فریفتہ ہوگیا۔ ابھی تک ٹام اور میں جگری دوست تھے لیکن اب اس لڑکی کے باعث ہم دونوں کے درمیان کچھ سرد مہری سی پیدا ہوگئی۔ میں نے لڑکی سے اپنی دریائی تجربات کا ذکر کیا اور اس کے دل میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی کہ میں نے بجانے کتنے عظیم کارنامے سرانجام دیئے ہیں۔ اس کے خلاف ٹام نے بھی اس لڑکی کے سامنے اپنی اہمیت جتائی اور اپنے کارنامے بیان کر کے خود کو سورما ثابت کرنے کی کوشش کی اور اس میں شک نہیں کہ وہ اپنی کوشش میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوا کیونکہ اس کو اپنے بیان میں حاشیہ آرائی کرنا خوب آتا تھا۔ بہر حال نیکی بجائے خود معاوضہ ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ میں اپنے رقیب کے لئے ایک رکاوٹ تھا۔ پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس سے میری امید بندھی۔ پائلٹوں نے نشان نمبر ۲۱ کے موڑ پر پیمائش کرنے کا ارادہ کیا تھا اور پیمائش کے لئے رات کے نو یا دس بجے کا وقت مقرر ہوا تھا۔ مسافروں کو اس وقت تک جاگتے رہنا تھا اور نگرانی کی باری مسٹر تھامسن برگ کی تھی۔ اس لئے میرے افسر کو پیمائش کا کام سرانجام دینا تھا۔ پیمائش کے کام میں استعمال کی جانیوالی یہ کشتی

ہمیں بڑی اچھی لگتی تھی۔ یہ کشتی لمبی۔ سجی ہوئی۔ خوبصورت اور شکاری کتے ایسی تیز رفتار تھی۔ کشتی کی نشستوں پر گدے بچھے ہوئے تھے۔ اس کشتی میں بارہ چپو چلانے والے تھے ایک افسر کپتان کے حکم کو ملاحوں تک پہنچانے کے لئے ہر وقت تیار رہتا تھا، کیونکہ ہمارے جہاز کے چلنے کا انداز ہمیشہ بدلتا رہتا تھا۔

ہم نے کشتی نشان نمبر ۱۲ کے کنارے لے جاکر باندھ دی اور ہم کام کے لئے کمر بستہ ہو گئے۔ یہ بڑی بھیانک رات تھی اور دریا کا پاٹ اتنا چوڑا تھا کہ اگر کسی کو بحری سفر کا تجربہ نہ ہو تو اسے اس تاریکی کے عالم میں دریا کے دوسری جانب کا کنارہ دکھائی نہیں دے گا سب مسافر چاق و چوبند تھے اور اس مہم میں خاصی دلچسپی لے رہے تھے۔ صورت حال ہر طرح اطمینان بخش تھی۔ جس وقت میں جلد جلد انجن والے کمرے سے گذرا میں نے طوفان میں پہننے والی باد تلد وردی زیب تن کر رکھی تھی۔ جب میں ٹام سے ملا تو میں خود کو اس قسم کی کم ظرف بات کہنے سے نہ روک سکا "کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ تم کو پیمائش کے کام پر جانا نہیں پڑ رہا ہے۔"

ٹام ادھر سے گذر رہا تھا۔ میری بات سن کر وہ جلدی سے مڑا اور بولا۔

"تم ہی جاؤ اور وہاں پیمائشی ڈنڈا بھی لے آؤ۔ میں اسے لینے کے لئے جانے ہی والا تھا لیکن اب تم ہی لے آؤ۔ میری اور تمہاری ملاقات اب ہیلی فیکس میں ہو گی۔"

میں نے کہا "کون چاہتا ہے کہ تم پیمائش کا بانس لاؤ۔ کم از کم میں تو نہیں چاہتا۔ بانس تو پیمائش کرنے والی کشتی میں ہی پڑا ہے۔"

" ٹام نے جواب دیا "نہیں یہ وہاں نہیں ہے۔ اس پر نئی پالش ہوئی ہے اور یہ دو دن سے عورتوں کے محافظ خانہ میں سوکھنے کے لئے رکھی ہوئی ہے۔

میں جلدی سے لوٹا اور آنِ واحد میں عورتوں کے جھنڈ کی طرف جا پہنچا جہاں عورتیں کشتی دیکھنے میں معروف اور حیرت زدہ ہو کر حکم سننے کی منتظر تھیں۔ میں نے کہا۔

"ماسٹر دیکھئے صاحبان۔"

میں نے پھر غور سے دیکھا ہم پہ جانے والی پیمائشی کشتی روانہ ہو چکی تھی اور بے ایمان ٹام پتوار کے پیچھے پر تعینات تھا اور میرا افسر ہاتھ میں پیمائشی ڈنڈا لئے اس کے قریب ہی

بیٹھا تھا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ مجھے یہ کہہ کر بیوقوف بنایا گیا تھا کہ میں بھٹکتی ڈانڈا لے آؤں۔!

اس وقت اس نوجوان حسینہ نے مجھ سے کہا "اُف! اس تاریک رات میں اس چھوٹی سی کشتی پر سفر کرنا کتنا بھیانک ہے۔ کیا تمہارے خیال میں اس کام میں کوئی خطرہ ہے۔؟ مجھے ایسا لگا جیسے کسی نے میرے چھرا گھونپ دیا ہو۔ میں خون کا گھونٹ پی کر لوٹ آیا میں پائلٹ کی مدد کرنے کے لئے پائلٹ ہاؤس میں چلا گیا۔

رفتہ رفتہ کشتی کی لالٹین نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ پھر تھوڑے ہی وقفے کے بعد یہ اس جگہ سے ایک میل دور پانی کی سطح پر ایک ننھی سی چنگاری کی طرح نظر آنے لگی۔ مسٹر تھارن برگ نے سیٹی بجائی اسٹیمر کو پیچھے ہٹایا اور چنگاری کی سمت میں جہاز کو موڑ دیا ہم لوگ تھوڑی دیر تک تو تیزی سے چلتے رہے۔ پھر ہم نے بھاپ کو دھیما کر دیا اور بڑی احتیاط کے ساتھ اس روشنی کی طرف رینگنا شروع کر دیا اتنے میں مسٹر تھارن برگ نے چلا کر کہا۔

" ارے پیراک پیپے کی لالٹین بجھ گئی۔؟"

انھوں نے انجن روک دیے اور ایک یا دو لمحے کے بعد پھر کہا "لو لالٹین پھر روشن ہو گئی" وہ ایک مرتبہ پھر انجن پر آئے اور گھنٹی بجا کر پلسال برداروں کو خبردار کیا۔ پہلے تو پانی آہستہ آہستہ پایاب ہوتا گیا اس کے بعد وہ پھر گہرا ہو گیا۔ یہ دیکھ مسٹر تھارن برگ بڑبڑائے۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پیراک پیپا پتھریلے ساحل سے ہٹ کر دور چلا گیا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ بائیں جانب کچھ زیادہ دور ہی چلا گیا ہے۔ بہرحال اب سلامتی اسی میں معلوم ہوتی ہے کہ ہم کسی نہ کسی طرح اسے عبور کر جائیں۔" اس طرح اس انتہائی تاریکی کے عالم میں ہم روشنی کی طرف دھیرے دھیرے رینگتے ہوئے روانہ ہوئے۔ جیسے ہی ہماری کشتی کا اگلا حصہ پیپے کے اوپر چڑھنے لگا مسٹر تھارن برگ نے گھنٹی والے رستے پکڑ لئے۔ فوراً ہی گھنٹیوں سے چونکا دینے والی ہیبت ناک آواز ہوئی وہ خود بھی چلا اٹھے "میرے خدا! ارے یہ تو بھیانک کشتی ہے۔"

عرشے کے نیچے سے بہت سے لوگوں کی وحشت انگیز صدائیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

تھوڑے وقفے کے بعد کسی چیز کے چرچرانے اور لوٹنے کی آواز آئی۔ مسٹر تھارن برگ نے جب یہ حالت دیکھی تو چلا کر کہا "دیکھو پیڈل ربل نے پیمائشی کشتی کو کچل دیا ہے۔ اُف یہ کیا ہوگیا۔ اِدھر دیکھو۔۔۔ بھاگو۔۔۔ دیکھو تو کون ہلاک ہوا ہے۔؟"

میں چشم زدن میں عرشے پر پہونچ گیا۔ میرا سردار۔ تیسرا نائب کپتان اور قریب قریب باقی تمام آدمی صحیح سلامت تھے۔ ان کو خطرے کا علم اسوقت ہوا جب ان کے لئے اس سے بچنا بالکل محال ہوگیا تھا۔ ایک لمحے کے بعد جب پہرہ داروں نے انھیں آکے گھیر لیا تب وہ چونکے۔ میرے افسر کے حکم پر انھوں نے پہرے داروں کا سہارا لیا اس طرح انھیں جہاز پر چڑھایا گیا۔ دوسرے ہی لمحہ پیمائشی کشتی پیڈل وھیل سے ٹکرا گئی اور ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہوگئی۔ دو آدمیوں اور اُمیدوار پائلٹ ٹام کا کہیں پتہ نہ چلا۔ اس واقعہ کی خبر سارے اسٹیمر میں آناً فاناً پھیل گئی۔ جہاز کے سب مسافر جن میں عورتیں بھی شامل تھیں اور جنکے چہرے مارے فکر کے سفید پڑ رہے تھے آکر جہاز کے صدر راستے میں اکٹھے ہوگئے اور سہمی ہوئی آوازمیں اس سانحہ کے متعلق بات چیت کرنے لگے۔ بار بار وہ یہی کہہ رہے تھے "ارے غریب لوگ غریب لڑکا۔! بدنصیب لڑکا۔!

اِسی اثنا میں جہاز میں رکھی ہوئی کشتی کو دریا میں اُتار کر اور ملّاح بھیج کر اسے چالو کردیا گیا تھا تاکہ گمشدہ اشخاص کو تلاش کیا جا سکے۔ اتنے میں بائیں جانب سے ایک [illegible] سنائی دی۔ یہ کشتی کسی دوسری جانب جاکر نظر سے اوجھل ہوچکی تھی دفعتاً آدھے لوگ ایک طرف کو دوڑ پڑے اور چلا چلا کر تیرنے والے شخص کی ہمت کو بڑھانے لگے، باقی لوگ دوسری جانب بھاگے اور چیخ چیخ کشتی کو پیچھے مڑنے کے لئے آواز دینے لگے۔ ان لوگوں کی آوازوں پر تیرنے والا بڑھا چلا آرہا تھا کیونکہ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس کے تیرنے کی [illegible] سے بظاہر ہوتا تھا کہ اس کی قوت جواب دے چکی تھی۔ اب ہجوم بولڈر کے پاس آ کھڑا ہوا [illegible] لوگ ٹکٹکی باندھ کر تاریکی کے عالم میں اُدھر ہی دیکھ رہے تھے اور تیرنے والے کی کیفیت [illegible] ہجوم کی زبان سے جو بات نکلی تھی وہ یہ تھی "ہائے غریب آدمی! مصیبت کا مارا۔ بدنصیب۔ [illegible] اسکی جان بچانے کا کوئی نہیں ہے۔" یہ آوازیں برابر آرہی تھیں اور اب قریب [illegible]

رہی تھیں ۔ انمیں سے ایک نے ہمت کر کے یہ کہا "میں اس کی جان بچانے کی کوشش کروں گا۔ ذرا
ایک رسّی ہاتھ میں لے کر یہاں کھڑے ہو جاؤ۔"

اسکی آواز سنکر لوگوں نے خوشی کے مارے بڑے نعرے سے تالیاں بجائیں۔ برائن تب کپتان
ٹارچ کی روشنی میں کھڑا ہو گیا۔ اسکے ہاتھ میں ایک رسّا تھا۔ اسکے تمام آدمی اسکے اردگرد جمع ہو گئے
تھے۔ دوسرے ہی لمحے میں پیراک کا چہرہ روشنی کے ایک حلقے میں نمودار ہوا اور فوراً اس کو اوپر
کشتی میں کھینچ لیا گیا۔ اسکے پیر لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ پانی میں شرابور تھا اور جونہی اس کو کشتی میں
سوار کیا گیا لوگوں نے مسرت کے نعرے بلند کئے۔ یہ وہی شیطان ٹام تھا۔!

تلاش کرنے والی کشتی کے ملاحوں نے ہر طرف تلاش کیا لیکن باقی دو آدمیوں کا کوئی پتہ نہیں
چلا۔ شاید یہ لوگ محافظوں تک پہنچنے میں ناکام رہے۔ غالباً بھیڑیوں نے انھیں پیچھے دھکیل دیا
ہو اور وہ ہلاک ہو گئے ہوں ٹام محافظوں کی طرف بالکل نہیں لپکا۔ اس نے دریا میں سر
کے بل غوطہ لگایا مگر یہ کوئی خطرے کی بات نہیں تھی۔ میں نے بھی بڑی آسانی کے ساتھ
یہی کیا ہوتا اور میں نے اپنا یہ خیال ظاہر بھی کر دیا لیکن دوسرے حضرات بیک زبان اس
گدھے کے کارنامے کو حیرت انگیز قرار دے رہے تھے گویا اس نے کوئی بڑی مہم سر کی ہو۔ یہ لڑکی
بھی بقیہ سفر کے دوران میں اس قابل رحم ہیرو کی باتیں بڑے شوق سے سنتی رہی۔ لیکن میں نے
اسکی طرف ذرا بھی توجہ نہیں دی۔ میں اس سے نفرت کرنے لگا تھا۔

بہر صورت میں نے اس سے کوئی سروکار نہیں رکھا۔ پیمائشی کشتی کی لالٹینوں سے جو روشنی
آ رہی تھی ہم غلطی سے اسے پیراکی پیپے کی روشنی سمجھ بیٹھے تھے اور جیسا کہ میرے افسر نے مجھے بتایا اسکی
وجہ یہ تھی کہ دریا میں پیراکی پیپے کو ڈال کر اس نے اسے کچھ نیچے چھوڑ دیا تھا جب تک وہ پیپا صحیح
سلامت نظر نہ آ گیا وہ اس کی طرف دیکھتا رہا لیکن اسکے بعد وہ ایسی جگہ چلا گیا جہاں سے پیپا سو گز
کے فاصلے پر تھا اور جہاز کے راستے سے ایک طرف کو ہٹا ہوا تھا۔ تب وہ پیمائشی کشتی کو دریا کی بالائی
سمت کی طرف لے گیا اور کچھ دیر انتظار کرتا رہا۔ اس اثنا میں وہ دوسرے افسر سے بات چیت کرنے
لگا۔ پھر جب اسکو یہ اندازہ ہو گیا کہ کشتی قریب قریب ٹھیک ساحل پر پہنچ گئی ہے تو اس نے نظر اٹھا
کر اوپر کی طرف دیکھا۔ اسے معلوم ہوا کہ پیراکی پیپا کہیں بہہ گیا ہے۔ اس نے تصور کر لیا کہ

اسٹیمر اس کو عبور کر چکا تھا۔ وہ بدستور ہاتھوں مصروف رہا۔ اب اسکو معلوم ہوا کہ اسٹیمر اسکے بہت قریب آ گیا ہے اور جو کچھ اس نے دیکھا وہ درست ہی تھا۔ اسٹیمر کو اس کے قریب آنا ہی تھا تاکہ کشتی کو اوپر اٹھانے میں سہولت ہو۔ آخری لمحے تک وہ اس انتظار میں رہا کہ جہاز ان کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ پھر اس کو یک بیک خیال آیا کہ جہاز انھیں کچلنے ہی والا ہے کیونکہ کشتی کی لالٹین کو جہاز نے پیچھے کی روشنی سمجھ لیا تھا۔ اسلئے کپتان نے لوگوں کو پکارتے ہوئے کہا سب کھڑے ہو جاؤ اور موقع دیکھ کر چھلانگ لگا کر می فنطوں تک تیر کر جا پہنچوں۔ آ اور دوسرے ہی لمحہ لوگوں نے چھلانگ لگا دی۔

تیرھواں باب

پائلٹ کی ضرورتیں

لیکن شاید میں اپنے مقصد سے بھٹک رہا ہوں۔ پچھلے بابوں میں میں نے جہاز رانی کی جو مخصوص ضرورتوں کو بیان کیا تھا انکو زیادہ واضح کرنا میرا مقصد تھا۔ سب سے پہلے پائلٹ کو اپنے اندر ایک صلاحیت پیدا کرنی ہوتی ہے جو مثالی اور مکمل ہونی چاہیئے۔ اور وہ صلاحیت قوتِ یادداشت ہے صرف یہ خیال کرنا ہی کافی نہیں ہے کہ فلاں چیز کیسی ہے۔ اس کیلئے اس شے کو جاننا بھی ضروری ہے کیونکہ جہاز رانی ایک باقاعدہ سائنس ہے۔ پرانے زمانے میں بجائے ایسے الفاظ کے "میں جانتا ہوں" اگر کوئی پائلٹ اس قسم کے فقرے استعمال کرتا تھا "میرا خیال ہے یا" "میرے خیال میں" تو اسے بڑی نفرت سے دیکھا جاتا تھا۔

غالباً آپ کی سمجھ میں یہ بات آسانی سے نہیں آئے گی کہ اس دریا کے بارہ سو میل لمبے

فاصلہ کی ہر چھوٹی چھوٹی چیز کو بالتفصیل جاننا کتنا ضروری ہوتا ہے اور یہ کتنا بڑا کام ہے۔ اگر آپ نیو یارک شہر کی سب سے لمبی سڑک پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک مسلسل گھومتے رہیں اور اسکے دونوں طرف شہر کی سب عمارتوں کو پورے اطمینان کے ساتھ ذہن میں نقش کرنا شروع کریں یہانتک کہ آپ کو ہر مکان ہر کھڑکی، ہر دروازہ اور روشنی کا کھمبا اور چھوٹی یا بڑی نشانی ازبر ہو جائے اور ان سب چیزوں کو آپ اتنا صحیح صحیح جان لیں کہ اگر بالکل تاریک رات میں آپ کو یکایک اس سڑک پر کہیں چھوڑ دیا جائے تو آپ ہر چیز کو فوراً پہچان لیں، تو پھر آپکو کسی رونا اندازہ ہو سکے گا کہ ایک پائلٹ کو جو دریائے مسیسپی کے متعلق کئی معلومات اپنے دماغ میں محفوظ رکھ کر چلتا ہے کسقدر صحیح اور تفصیلی معلومات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اگر آپ نیو یارک کی سڑک کے متعلق یہ یاد رکھ سکیں کہ کہاں کہاں اس پر چوراہے ہیں اور پہلو داری پر جو پتھر لگے ہیں وہ کیسے ہیں، ان کا سائز کیا ہے اور کس طرح لگائے گئے ہیں ساتھ ساتھ اگر یہ بھی یاد رکھ سکیں کہ ان لاتعداد جگہوں میں سے ہر جگہ پر جہاں سے آپ گذر رہے ہیں، زمین کتنی گہری ہو گی تب آپکو یہ اندازہ ہو سکے گا کہ پائلٹ کو دریائے مسیسپی میں جہاز کو سلامتی سے چلانے کے لئے کتنی معلومات کی ضرورت ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں اگر نیو یارک کی کسی سڑک پر گشت کرتے ہوئے آپ نصف درجن نشانیوں کو منتخب کر کے انکی جگہ مہینے میں ایکبار بدل دیں اور پھر بھی اندھیری رات میں ان نئی جگہوں کو پہچاننے میں غلطی نہ کریں اور اسطرح برابر تبدیلیاں کرتے ہوئے بھی آپ کہیں نہ چوکیں تو آپکو اندازہ ہو جائیگا کہ پائلٹ کو دریائے مسیسپی میں، جو آئے دن بدلتا رہتا ہے، جہازرانی کرنے میں کیسی یادداشت کی ضرورت ہوتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ ایک پائلٹ کی یادداشت بھی دنیا میں ایک سب سے زیادہ تعجب خیز چیز ہے پرانے اور نئے عہد نامے کو حفظ کر لینا اور انکو شروع سے آخر۔ ۔ تک یا کہیں سے بھی بآسانی پڑھ دینا یا پھر کتاب کو کہیں سے شروع کر کے اس کے آگے یا پیچھے کسی طرف کو بھی پڑھ لینا اور نہ کہیں لڑکھڑانا اور نہ غلطی کرنا یہ سب اتنی غیر معمولی قابلیت کی نشانی نہیں ہے جتنا غیر معمولی ایک پائلٹ کا دریائے مسیسپی کے متعلق ذخیرۂ علم ہوتا ہے یا اس کی جہازرانی کی قابلیت ہوتی ہے۔ میں نے یہ مثال دیدہ دانستہ دی ہے اور یقین ہے کہ میں نے اس سچائی میں کوئی مبالغہ نہیں کیا۔

بہت سے لوگ میرے اس طرح کے مقابلہ کو مبالغہ آمیز سمجھیں گے لیکن پائلٹ لوگ یقیناً مجھ سے متفق ہوں گے۔

پائلٹ کی یادداشت کتنی آسانی اور کیسے اطمینان کے ساتھ کام کرتی ہے یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے اپنے دماغ پر کوئی زور ڈالنا ہی نہیں پڑتا۔ غیر شعوری طور پر وہ ہر روز اور ہر گھنٹے معلومات کا ذخیرہ اکٹھا کرتا رہتا ہے اور کہیں بھی ان اہم معلومات کا غلط استعمال نہیں کرتا۔ مثلاً اگر کوئی بنسال بردار چلا کر آواز دیتا رہتا ہے "ڈھائی فیدم" "ڈھائی فیدم" حتیٰ کہ اسکی آواز گھڑی کی ٹِک ٹِک کی طرح اکتانے والی ہو جاتی ہے اور اس اثنا میں لوگ برابر بات چیت بھی کرتے رہتے ہیں اور ان کا کوئی خاص دھیان آواز وں کی طرف نہیں جاتا اور ڈھائی فیدم کی مسلسل آوازوں کے درمیان اگر کہیں بنسال بردار ایکبار "سوا دو فیدم" کہدیتا ہے اور پھر پہلے کی طرح ڈھائی فیدم کی آواز لگانے لگتا ہے، تو دو یا تین ہفتے بعد بھی پائلٹ یہ بتا دیتا ہے کہ جب سوا دو فیدم کی آواز لگائی گئی تھی تو اسوقت کشتی کی دریا میں بالکل صحیح حالت کیا تھی نیز وہ کشتی کے آگے، پیچھے اور دونوں اطراف میں ایسی بیشمار نشانیاں بتا سکے گا جنکی مدد سے آپ خود وہاں کشتی لے جا کر ٹھیک اسی مقام پر روک سکیں گے۔ سوا دو فیدم کی آواز اس کے خیالات کو منتشر نہیں کر پاتی اور وہ برابر بات چیت کرتا رہتا ہے لیکن اسکے ساتھ ہی وہ اپنے دماغ میں ہر صورت حال کا نقشہ بھی بنا لیتا ہے۔ اس نے نہ صرف گہرائی کی لگاتار تبدیلی یاد رکھا بلکہ آئندہ کے حوالے کے لئے ضروری تفصیلات بھی اکٹھی کر لیں اور اس معاملہ میں اس نے بنسال بردار سے بھی کوئی مدد نہ لی۔ اگر آپ کسی دوست کے ساتھ ٹہل رہے ہوں اور بات چیت بھی جاری ہو اور کوئی تیسرا دوست آپکے پہلو ہی میں بیٹھا ہو اور حرف الف کو اس انداز سے دہرا رہا ہو کہ چار بار الف کہکر ایکبار بیچ میں حرف ی کہدے اور ی پر کوئی زور نہ دے تو دو یا تین ہفتے بعد آپ یہ نہیں بتا سکیں گے کہ الف حرف کی آوازوں کے بیچ ی بھی بولا گیا تھا اور نہ آپ یہ بتا سکیں گے کہ جب حرف ی بولا گیا تھا تو آپ کس جگہ سے یا کن چیزوں کے پاس سے گذر رہے تھے۔ لیکن اگر آپ کی قوت یادداشت کو تربیت دی جائے تو آپ از خود بڑی آسانی سے یہ سب بتلا سکیں گے۔ اگر کسی آدمی کی یادداشت شروع سے اچھی ہو تو جہاز رانی کی مشق اسکی اس قوت میں بے انتہا اضافہ کر سکتی ہے۔ لیکن صرف ان ہی معاملات میں

جسمیں اسکو روزانہ تربیت ملتی ہے اور ایک وقت ایسا آئیگا جبکہ اسکی قوتیں اتنی طاقتور ہو جائیں گی کہ وہ ساحلی نشانات اور پانی کی گہرائیاں بھی بغور دیکھ لے گا اور یہ چیزیں اپنی تمام تر تفصیلات کے ساتھ اُ ذہن میں محفوظ رہیں گی۔ لیکن اگر دوپہر کے وقت اسی آدمی سے آپ یہ پوچھیں کہ صبح تم نے کیا ناشتہ کیا تھا تو بہت اغلب ہے کہ وہ نہ بتا سکے۔ اگر انسانی قوتِ یادداشت کو کسی خاص کام پر مرکوز کر دیا جائے تو اس سے حیرت انگیز کارنامے وجود میں آسکتے ہیں۔

اسوقت جبکہ دریائے مسیسپی پر ملاحوں کے مشاہرے یا اجرتیں بہت بڑھ گئی تھیں، میرے افسر مسٹر بکسبی نے دریا کی بالائی جانب سفر کیا اور ایک ہزار میل سے زیادہ فاصلے کی سب معلومات اتنی آسانی اور عجلت کیساتھ حاصل کر لیں کہ اسکی قابلیت دیکھکر تعجب ہوتا تھا۔ جب وہ دریا کے ہر حصے کو ایکبار دن میں اور ایکبار رات میں دیکھ چکا تو اسکی معلومات اسقدر مکمل ہو چکی تھیں کہ اس نے دن کا جہازرانی کا لائیسنس بنوالیا اور چند سفر کرنے کے بعد اس نے مکمل لائیسنس بنوالیا اور دن رات جہازرانی کا کام شروع کر دیا اور صفِ اوّل کے پائلٹ کا درجہ حاصل کیا۔

مسٹر بکسبی نے میرا تقرر ایک ملاح کی حیثیت سے ایک ایسے پائلٹ کے ماتحت کرا دیا جسکی قوتِ یادداشت کے کارنامے میرے لئے ایک معجزہ تھے میرے خیال میں اسکی یادداشت پیدائش سے ہی اچھی تھی۔ محض اتنی تربیت سے اس میں اتنی صلاحیت نہیں آسکتی تھی مثلاً جب کبھی کوئی شخص کوئی نام لیتا تو یہ پائلٹ جس کا نام مسٹر براؤن تھا فوراً بول اٹھتے "ہاں میں اسے جانتا ہوں، ان کا چہرہ زرد، سر سرخ، گلے میں ایک طرف چوٹ کا نشان ہے جیسے گوشت کے نیچے کسی چیز کا کوئی فالتو ٹکڑا لگا ہو۔ وہ جنوبی امریکہ میں چھ مہینے سے محکمہ تجارت میں کام کر رہے تھے۔ یہ بات قریب تیرہ سال پہلے کی ہے۔ میں نے انکے ساتھ ایک بار سفر کیا ہے۔ دریا کی بالائی جانب، اسوقت پانی پانچ فٹ تھا۔ اسوقت تک "ہنری بلیک جہاز" "ٹاور آئی لینڈ" کے ساحل سے ٹکرا چکا تھا۔ وہاں پانی صرف ساڑھے چار فٹ تھا۔ اور "سن فلاور" جہاز کے غرق ہونے پر حاجی البنٹ نے اپنا پتوار اتار کر رکھ دیا تھا۔ کسی نے کہیں یہ کہہ دیا کہ "سن فلاور" تو اسوقت غرق نہیں ہوا تھا جب تک کہ۔۔۔" اس پر مسٹر براؤن نے جواب دیا:۔

"مجھے معلوم ہے کہ یہ جہاز کب ڈوبا تھا۔ یہ واقعہ اس سے تین سال پہلے کا ہے اسوقت

آسا ہارڈی اس جہاز کا کپتان تھا اور اس کا بھائی جان اس جہاز کا پہلا کلرک تھا اور اس جہاز کا یہ سفر تھا۔ ٹام جونز نے مجھے یہ باتیں ایک ہفتہ بعد نیو آرلینز میں بتلائیں۔ وہ سن فلاور کا پہلا نائب کپتان تھا۔ اگلے سال کی چھ جولائی کو کپتان ہارڈی کے ہاتھ میں ایک کیل گھس گئی اور وہ لاک جا کی بیماری سے ۱۵ جولائی کو مر گیا۔ اسکے دو سال بعد ۳۔ مارچ کو اسکا بھائی جون سرخ بادہ کے مرض میں مبتلا ہو کر راہی ملکِ عدم ہوا میں نے دونوں ہارڈی بھائیوں میں سے کسی کو نہیں دیکھا وہ لوگ دریائے الیگنی میں سفر کیا کرتے تھے۔ لیکن جو لوگ ان سے واقف تھے اور جنھوں نے مجھے انکے بارے میں بتلایا تھا ان ہی لوگوں نے مجھے یہ بھی بتلایا تھا کہ کپتان ہارڈی جاڑے ہوں کہ گرمی ہر موسم میں سوتی موزے پہنتے تھے۔ انکی پہلی بیوی کا نام جین شک تھا اور وہ نیو انگلینڈ کی رہنے والی تھی۔ انکی دوسری بیوی پاگل خانے میں مرگئی تھی یہ اس کا خاندانی مرض تھا۔ وہ کنٹکی کے شہر لیکزنگٹن کی رہنے والی تھی۔ شادی سے پہلے اس کا نام ہارش تھا۔"

اور اسطرح کی بہت سی باتیں مسٹر براؤن نے بتلائیں۔ ایک گھنٹہ متواتر مسٹر براؤن کی زبان چلتی رہی۔ وہ کوئی بات فراموش نہیں کر سکتے تھے۔ یہ انکے لئے ناممکن تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتیں جنکو ہوئے کئی برس گذر چکے تھے۔ انکے دماغ میں اتنی واضح اور صاف طور پر محفوظ تھیں جیسے وہ واقعی قابلِ یادداشت اور مشہور واقعات ہوں۔ دراصل ان کی یادداشت محض ایک پائلٹ کی یادداشت نہ تھی بلکہ اسمیں دنیا بھر کی باتیں سمائی ہوئی تھیں۔ اگر ان کو ایک معمولی خط کا جو انھیں سات ۔ ۔ ۔ سال پہلے ملا ہوتا، ذکر کرنا ہوتا تو یقین جانئے کہ وہ محض اپنی یادداشت سے اس خط کا کل مضمون بیان کر ڈالتے۔ اس بات کا خیال کئے بغیر کہ وہ اپنے اصلی موضوع سے ہٹ رہے ہیں وہ بیچ بیچ میں اس خط کے مصنف کی سوانح حیات بیان کرنے لگتے اگر وہ اسکے اور اسکے متعلقین کی سوانح حیات کا یکے بعد دیگرے ذکر نہ کرتے تو سمجھئے کہ سننے والے کی خوش قسمتی تھی کہ وہ بور ہونے سے بچ گیا۔

سچ پوچھئے تو ایسی یادداشت ایک بڑی بدنصیبی ہے کیونکہ ایسے آدمی کے لئے سب واقعات خواہ وہ ضروری ہوں خواہ غیر ضروری یکساں اہمیت رکھتے ہیں اور وہ انکو یکساں طوالت سے بیان کرتا ہے۔ بیان کنندہ ان واقعات میں سے دلچسپ اور غیر دلچسپ کا امتیاز نہیں کر سکتا۔ یہ تو لی

ہونے کی وجہ سے وہ اپنے بیان کو بے لطف تفصیلات سے بھرتا چلا جاتا ہے اور اپنے آپکو ایک ناقابلِ برداشت مغز چٹ بنا لیتا ہے۔ اسکے علاوہ وہ ایک موضوع پر جم نہیں پاتا بیچ بیچ میں جو بھی متفرق واقعات اس کو یاد آجاتے ہیں وہ انکو بیان کرنے لگتا ہے اور اصل موضوع سے دور ہٹ جاتا ہے مثلاً مسٹر براؤن نہایت پُر خلوص ارادے کے ساتھ آپکو ایک کتّے کے متعلق ایک پُرمذاق واقعہ سُنانا شروع کرتے ہیں مگر دفعتاً انھیں اتنی ہنسی آتی ہے کہ ان کے لئے قصّہ شروع کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ تب وہ اپنی یادداشت سے اس کتّے کی نسل اور شکل وشباہت بیان کرنا شروع کرتے ہیں۔

پھر کتّے کے مالک کی کہانی بیان کرنے لگتے ہیں، پھر مالک کے خاندان کی حتیٰ کہ اس خاندان میں جو شادیاں اور موتیں ہوئی تھیں ان کا ذکر کرنے لگتے بلکہ شادی کے موقعوں پر جو تہنیت نامے یا موت کے موقعوں پر جو تعزیت نامے اس خاندان والوں کو بھیجے گئے تھے ان میں لکھے ہوئے مصرعوں کو گانے لگتے۔ تب وہ یہ بتلاتے کہ انمیں سے ایک تقریب ایک سال جاڑوں میں ہوئی تھی اور پھر اس جاڑے کے موسم کا تفصیل کے ساتھ ذکر شروع ہو جاتا اور یہانتک کہ اس سال جاڑے میں جو لوگ سردی سے برف میں جم کر مر گئے تھے انکے نام بھی گناتے اور پھر اعداد وشمار کی مدد سے بتلاتے کہ اس سال سور کا گوشت اور سوکھی گھاس کتنی مہنگی ہو گئی تھی۔ پھر ان دونوں چیزوں کے ذکر سے غلّے اور چارے کی یادداشت تازہ ہو جاتی اور ان بعد کی دونوں چیزوں سے گایوں اور گھوڑوں کا ذکر چھڑ جاتا اور گایوں اور گھوڑوں کے توسط سے انھیں سرکس کی یاد آجاتی اور اس تذکرہ میں وہ کچھ مشہور گھوڑ سواروں کا ذکر کرنے لگتے۔ سرکس کے ذکر سے لامحالہ مویشی خانے کا ذکر چھڑ جاتا اور پھر وہ ہاتھی سے لیکر خطِ استوائی افریقہ کے جانوروں تک کا ذکر کرنے لگتے۔ افریقہ کے غیر عیسائی اور وحشی لوگوں کے تذکرے سے مذہب کا ذکر آجاتا اور اس طرح تین یا چار گھنٹے کی مغز چاٹ باتوں کے بعد پہرہ بدل جاتا اور مسٹر براؤن پائلٹ ہاؤس سے باہر نکلتے اور چلتے چلتے بائبل کے وعظوں کی تلاوت کرنے لگتے۔ یہ وہ وعظ تھے جو انھوں نے برسوں پہلے سنے تھے اور جن میں مناجات کے ذریعہ خدا کی رحمت حاصل کرنے کی تلقین کی گئی تھی۔ اور یوں اصل موضوع، جو کتّے کے واقع کے بارے میں تھا وہیں ختم ہو جاتا اور سننے والا جو اتنی دیر انتظار کرتا رہا تھا مایوس ہو جاتا۔

پائلٹ کی یادداشت ضرور اچھی ہونی چاہئے مگر اس سے بھی زیادہ اہم دو اور خوبیاں ہیں جو

پائلٹ میں ہونی چاہیئں، اوّل یہ کہ اسمیں جلد اور صحیح سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی قوت ہو اور دوسرے اس میں ایسی مستقل مزاجی اور ثابت قدمی ہو جسے کوئی بھی خطرہ ڈگمگا نہ سکے۔ اگر کسی آدمی میں شروع سے ہی تھوڑی بہت ہمت ہو تو وہ پائلٹ بننے پر کسی بھی خطرے کے وقت پریشان نہ ہوگا۔ لیکن قوتِ فیصلہ کسی اور ہی بات پر منحصر ہوتی ہے۔ قوتِ فیصلہ کا تعلق ذہانت سے ہے اگر آدمی ذہین ہو تبھی اسے جہازرانی کے کام میں آنا چاہیئے ورنہ وہ کبھی کامیاب پائلٹ نہ بن سکے گا۔

پائلٹ ہاؤس میں رہ کر انسان کی ہمت لگاتار بڑھتی رہتی ہے لیکن جبتک مبتدی پائلٹ اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہونا نہ سیکھ لے اور کچھ سال اکیلے اپنے فرائض کو انجام نہ دے لے اور ہر طرح کی مشکلات کو برداشت کرتے ہوئے اپنے عہدے کی ذمہ داریوں سے سرخرو نہ ہو تب تک اس کی جرأت کی تکمیل نہیں ہوتی۔ جب ایک مبتدی پائلٹ دریا سے اچھی طرح واقف ہو جاتا ہے تو وہ دن ہو یا رات بے باک ہو کر جہاز کو ہوشیاری سے چلانے لگتا ہے اُسے یقین ہونے لگتا ہے کہ اسکی کامیابی اسکی اپنی ہمت سے ہو رہی ہے۔ لیکن جب سب سے پہلی بار پائلٹ اپنی جگہ چھوڑ کر مُبتدی کو موقع دیتا ہے اور اس کو اپنی لیاقت سے کام کرنے کو کہتا ہے تو مبتدی کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کو اپنے کام میں کامیابی محض اپنے افسر کی نگرانی کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔ اسے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسکی ذاتی صلاحیت میں کوئی کمی ہے اور اگر لمحے بھر میں ہی دریا کے سفر میں کوئی ناگہانی مصیبت آگئی تو وہ اسکا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ جو کچھ واقفیت اس نے ابتک حاصل کی ہوتی ہے، اسکا ساتھ چھوڑ جاتی ہے اور پندرہ منٹ کے اندر ہی اس کا چہرہ ڈر اور فکر سے سفید پڑ جاتا ہے اُسے موت نظر آنے لگتی ہے۔ اسلئے پائلٹ لوگ اپنے شاگردوں کو بڑی عقلمندی سے تربیت دیتے ہیں اور انھیں ایسی ضروری باتیں بتا دیتے ہیں جن سے وہ خطرے کا سامنا بہادری سے کر سکیں اور اپنے حواس کو قائم رکھ سکیں ان کا پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ وہ امیدواروں کو دوستانہ قسم کے دھوکے دیتے رہتے ہیں۔

مسٹر بکسبی نے بھی ایک مرتبہ مجھے اسی طرح تربیت دی تھی۔ بعد از اں اگر سوتے میں بھی مجھے ان کا دوستانہ فریب یاد آجاتا تھا تو مجھے شرم آنے لگتی تھی۔ میں ایک ... بن گیا تھا واقعی اتنا اچھا کہ اپنے پہرے کے دوران میں خواہ دن ہو یا رات مجھے سب کام خود کرنا پڑتا تھا۔

مسٹر بکسبی شاذو نادر ہی مجھے کوئی رائے دیتے تھے وہ صرف اتنا کرتے تھے کہ جب کبھی رات کو موسم
بہت خراب ہوتا تو وہ پہیے پر خود آجاتے تھے تاکہ جہاز کو کسی بہت خطرناک چوراہے سے نکال لے جائیں
اور جب ضرورت ہو تو اسے ساحل پر لے جائیں۔ باقی پہرے کے وقت دس گھنٹے میں سے نو گھنٹے وہ
آرام کرتے تھے اور اپنی تنخواہ باقاعدہ وصول کرتے رہتے تھے۔ نشیب کی طرف دریا تقریباً کناروں
تک بھرا ہوتا تھا اور اگر کسی شخص کو میری اس صلاحیت پر شبہ ہوتا کہ میں کیرو سے نیو آرلینز کے
درمیان بلا کسی مدد یا ہدایت کے کسی موڑ کو پار کر سکتا ہوں تو مجھے بہت دکھ ہوتا تھا۔ مجھے تو یہ خیال
بہت بیہودہ لگتا تھا کہ میں دن کے وقت کسی موڑ پر جہاز رانی کرتے ہوئے ڈروں۔ موسم گرما میں ایک
دن جبکہ گرمی بہت زیادہ تھی میں آئی لینڈ نمبر ۶۰ کے موڑ سے گذر رہا تھا اور بڑے غرور کے ساتھ
سر اٹھا اٹھا کر دور تک دیکھ رہا تھا۔ اسی وقت مسٹر بکسبی نے کہا۔

"میں ذرا دیر کے لئے نیچے جا رہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تم اگلے موڑ سے واقف ہو گے"
مسٹر بکسبی کا یہ سوال میرے لئے باعث توہین تھا کیونکہ یہ موڑ جہاز رانی کے اعتبار سے سب سے زیادہ
صاف اور آسان تھا۔ اسمیں کیسے ہی جہاز رانی کرو کوئی خطرہ نہ تھا اور گہرائی کا عالم یہ تھا کہ یہاں دریا
کی تہ معلوم کرنا بھی دشوار تھا۔ مجھے یہ سب باتیں اچھی طرح معلوم تھیں "تم اگلے موڑ سے واقف ہو گے!
ہونہہ۔ یہ کام تو میں آنکھیں بند کر کے کر سکتا ہوں۔"

"اس میں کتنا پانی ہے؟"

"یہ تو عجیب سوال ہے۔ اگر مجھے گرجا کے مینار جتنا اونچا پیمانہ بھی مل جائے تو بھی اسکی گہرائی
نہیں ناپ سکوں گا۔"

"کیا واقعی تمہارا یہ خیال ہے؟" مسٹر بکسبی نے یہ سوال کچھ ایسے ڈھنگ سے کیا جس سے میری
خود اعتمادی کو دھکا لگا اور یہی مسٹر بکسبی کو توقع تھی۔ خیر وہ بلا کچھ کہے چلے گئے۔ مجھے طرح طرح کے
خیال آنے لگے۔ مجھ سے چھپا کر مسٹر بکسبی نے ایک شخص کو بلند عرشے پر اسلئے بھیجا کہ وہ پنسال بردار
کو کچھ ضروری ہدایتیں کر دے اور دوسرے قاصد کو اسلئے بھیجا کہ وہ افسران کے کان میں کچھ کہدے۔
اور پھر مسٹر بکسبی دھوئیں کی چمنیوں کے پیچھے جہاں سے وہ یہ دیکھ سکیں کہ کام کیسے ہو رہا ہے چھپ گئے۔
اس کے بعد بڑے نائب کپتان صاحب آئے اور پھر نیک کلرک آیا۔ ہر ایک یاد دلانے کے بعد مجھے گھورنے

والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ اور پیشتر اس کے کہ میں جزیرے کے سرے میں پہنچوں میرے سامنے پندرہ بیس آدمی جمع ہو گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر کون سی مصیبت آگئی ہے۔ جب میں جہاز کو لیکر موڑ کے پاس پہونچنے ہی والا تھا کہ کپتان صاحب نے میری طرف دیکھا اور ایک بناوٹی جھینپی سے پُر آواز میں کہا۔

"مسٹر بکسی کہاں ہیں۔؟"

"جناب وہ نیچے گئے ہیں۔"

لیکن اسکے بعد میرے دماغ میں ایک پریشانی پیدا ہو گئی۔ مجھے طرح طرح کے خطرات کا وہم ہونے لگا اور جتنا میں انکو دماغ سے نکالنے کی کوشش کرتا اتنے ہی زیادہ وہ اور بڑھنے لگتے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ سامنے میں نے پایاب پانی دیکھا تھا اور فوراً ہی بزدلی سے میرا دل ایسا بیٹھنے لگا کہ میرا ہر عضو بیکار سا ہو گیا اور موڑ کو پار کرنے کے سلسلے میں جو خود اعتمادی مجھے حاصل تھی وہ ختم ہو گئی۔ میں نے گھنٹے کی رسّی پکڑ لی جو میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی تھی۔ مجھے بیحد شرمندگی ہوتی۔ میں نے اسے پھر پکڑا اگر وہ پھر گر گئی۔ میں نے پھر اسے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے پکڑا اور اتنے دھیرے سے کھینچا کہ اسکی آواز مجھے بھی مشکل سے سنائی دی۔ کپتان صاحب اور نائب کپتان صاحب فوراً شاعرانہ انداز میں گنگنانے لگے "دائیں طرف کو چلو اور جلدی چلو۔"

یہ میرے لئے دوسرا صدمہ تھا۔ میں نے پہیئے پر گلہری کی طرح چڑھنے کی کوشش کی اور جیسے ہی میں ایک طرف ساحل پر کشتی لیجانے کی سوچتا مجھے اس طرف نئے خطرات نظر آنے لگتے اور تبھی میں دوسری طرف چل دیتا اور پھر دوسری طرف بھی مجھے اس سے کہیں بڑے خطرات نظر آنے لگتے اور پھر میں ساحل پر پہونچنے کے لئے پاگل ہوا تھا۔ اس وقت بنسال بردار نے افسردہ آواز میں کہا "پانی کی گہرائی صرف چار فیدم۔" اس جگہ جہاں دریا کی تہ معلوم کرنا دشوار تھا۔؟ اس آواز نے میرے اوسان خطا کر دئے۔

پھر آواز آئی "تین فیدم۔ تین فیدم۔ پونے تین، ڈھائی۔۔" یہ بڑی بھیانک علامتیں تھیں۔ میں نے گھنٹے والی رسّی پکڑ لی اور انجنوں کو روک دیا پھر آواز آئی "سوا دو فیدم۔ سوا دو فیدم۔ دو فیدم۔"

اب میں مجبور تھا۔ مجھ بالکل نہیں سوجھ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیئے۔ میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا اور ڈر کے مارے میری آنکھیں اتنی باہر نکل آئی تھیں کہ مجھے انھیں ٹوپی سے ڈھانکنا پڑا۔
پھر آواز آئی "پونے دو فیدم! ساڑھے نو فٹ"

اب ہم نو فٹ پانی کے قریب پہونچ چکے تھے۔ گھبراہٹ سے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ان کانپتے ہوئے ہاتھوں سے میں ٹھیک طور سے گھنٹی بھی نہ بجا سکا میں بولنے والی نلی کے پاس دوڑ کر گیا اور میں نے چلا کر انجینیر سے کہا۔

"ارے بین صاحب۔ اگر آپ کو مجھ سے کوئی اُنسیت ہے تو کشتی کو پیچھے ہٹائیے جلدی کیجئے۔ بین صاحب۔ کشتی کو پیچھے ہٹا لیجئے۔ اسے بربادی سے بچا لیجئے۔" تبھی میں نے آہستہ سے دروازہ بند ہونے کی آواز سُنی۔ میں نے چاروں طرف دیکھا تو وہاں مسٹر بکسبی کو کھڑے پایا جو نرمی اور آہستگی سے مسکرا رہے تھے۔ اسوقت جو صاحبان عرشے پر بیٹھے تھے مذاق اُڑانے کے لئے بڑی زور سے ہنس پڑے۔ میں نے یہ سب دیکھا اور محسوس کیا کہ میں سب سے ذلیل انسان ہوں۔ میں نے لنگر پانی میں ڈال دیا اور کشتی کو جہاں کا تہاں کھڑا کر دیا، اور انجنوں کے پاس آکر کہا "ایک یتیم کیساتھ آپ لوگوں نے اچھا مذاق کیا۔ اب میں کبھی نشان ۶۶ تک جاکر وہاں دریا کی گہرائی نہیں ناپوں گا۔ میں خود کو اب اور زیادہ بیوقوف بنانا نہیں چاہتا۔"

مسٹر بکسبی نے کہا "نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ تم بیوقوف نہیں بنوگے۔ مجھے اُمید ہے کہ تم بیوقوف نہیں کہلاؤگے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ تم اس طرح کے تجربوں سے کچھ سیکھ لو۔ کیا تم کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس موڑ پر پانی اتھاہ ہے۔؟"

میں نے کہا "جی ہاں۔ مجھے معلوم تھا"

مسٹر بکسبی بولے "ٹھیک ہے۔ تب تمہیں میری یا کسی اور کی باتوں سے اپنی خود اعتمادی کو نہیں کھونا چاہیئے تھا اور اپنے علم پر پکا بھروسہ رکھنا چاہیئے تھا اس بات کو ہمیشہ یاد رکھنا۔ ایک اور بات اور وہ یہ کہ جب تم کسی خطرناک جگہ میں گھر جاؤ تو بزدل مت بنو۔ اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا"

یہ سبق میرے لئے بہت کافی تھا۔ لیکن یہ مجھے بہت مہنگا پڑا، بلکہ اس سے بھی زیادہ تلخ

بات یہ تھی کہ اس واقع کے مہینوں بعد تک مجھے یہ فقرہ سُننا پڑا " بین صاحب، اگر آپ کو مجھ سے اُنسیت ہے تو کشتی کو فوراً پیچھے کھینچ لیجئے"۔ جب بھی مجھے اسکا خیال آتا میری طبیعت پژمردہ ہو جاتی۔ اس فقرے سے مجھے ایک قسم کی چڑ سی ہو گئی تھی۔

چودھواں باب

پائلٹ کا عہدہ اور اسکی شان و شوکت

پچھلے ابواب میں جہاز رانی کی تفصیلات کا ذکر کرکے میں نے قارئین کو بتدریج یہ بتلانے کی کوشش کی تھی کہ علم جہاز رانی کن کن چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے اور ساتھ ساتھ میں نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہ علم بہت ہی عجیب و غریب ہے اور قابل توجہ بھی اگر مجھے اس علم سے اتنی دلچسپی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں کیونکہ مجھے جہاز رانی کے پیشے سے بھی بے انتہا اُنس ہے۔ اتنی دلچسپی مجھے کبھی کسی پیشے سے نہیں ہوئی۔ مجھے اپنے اس پیشے پر بہت فخر بھی ہے۔ اسکی وجہ قابل فہم ہے۔ اس زمانے میں پائلٹ ہی ایک ایسا انسان روئے زمین پر ہوتا تھا جو بالکل آزاد و مختار کہلاتا تھا۔ بادشاہ لوگ پارلیمنٹ اور عوام کے ملازم مانے جاتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے ممبران پر انتخاب کنندگان کی شرائط کی پابندی ہوتی ہے۔ اخبار کا اڈیٹر بھی خود مختار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ اپنے مربیوں اور پارٹی والوں کے زیر اثر رہتا ہے اور انکے مفاد کو مد نظر رکھ کر ہی کام کر سکتا ہے اور اسی وجہ سے اُسے حقائق میں کچھ رد و بدل کرنی پڑتی ہے اور وہ دل کی بات کو صاف صاف نہیں کہہ سکتا۔ پادری بھی آزاد نہیں ہوتا اور نہ وہ ہمیشہ سچ بول سکتا ہے کیونکہ وہ اپنے حلقے کے لوگوں کی رائے کو خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو نظر انداز نہیں کر سکتا اس طرح جتنے مصنف ہیں وہ سب عوام کے ملازم ہیں اور وہ انکی رائے کے خلاف نہیں

جانا چاہتے۔ پہلے تو ہم آزادی سے صحیح صحیح بات لکھتے ہیں مگر بعد میں اچھا پنے سے پہلے آمیں کچھ ترامیم کر لیتے ہیں۔ در اصل ہر شخص کا خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو یا بچہ کوئی نہ کوئی مالک ہوتا ہے جسکی غلامی اُسے کرنی پڑتی ہے۔ لیکن جن دنوں کا میں ذکر کر رہا ہوں ان دنوں مسسپی کے پائلٹ کا کوئی مالک نہیں ہوتا تھا۔ کپتان ہر بکین ڈیک (بالائی عرشے) پر کھڑے ہو کر تھوڑی دیر کے لئے نہایت شان و شوکت کیساتھ اپنے ملاحوں کو پانچ سات حکم صادر کر دیا کرتا تھا۔ لیکن جب کشتی ساحل سے دھارا کے بیچ میں آجاتی تھی تو کپتان کی بھی حکومت ختم ہو جاتی تھی۔ جیسے ہی کشتی دریا میں پہنچتی تھی وہ مکمل طور پر پائلٹ کے اختیار میں ہو جاتی تھی اور کوئی شخص اسکے کام میں دخل نہیں دے سکتا تھا۔ وہ جو چاہتا کرتا اسے جدھر چاہتا لیجاتا اور اگر وہ مناسب سمجھتا تو اُسے کنارے پر لیجا کر باندھ دیتا۔ وہ اپنے کام میں بالکل خود مختار تھا۔ وہ کسی سے مشورہ کرنا نہیں جانتا تھا اور نہ اسے کسی سے حکم لینے کی ضرورت تھی۔ بلکہ اسے کسی کی کوئی تجویز بھی پسند نہ آتی تھی۔ در اصل ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے قانون کے مطابق پائلٹ کو کسی کے حکم یا کسی کی تجویز ماننے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ یہ خیال کیا جاتا تھا کہ کشتی کو چلانے کا کام پائلٹ ہی ٹھیک جان سکتا تھا اور کوئی نہیں۔ اور یہ خیال ٹھیک ہی تھا اسلئے پائلٹ کو بلا کسی محافظ الاحکام سمجھا جاتا تھا جو محض الفاظ ہی میں نہیں بلکہ حقیقت میں ایک مطلق العنان شاہنشاہ تھا۔ میں نے ایک اٹھارہ سالہ لڑکے کو دیکھا ہے جو پائلٹ کے کام پر مامور تھا۔ وہ ایک بڑے جہاز کو بڑے اطمینان سے ایک ایسے مقام پر لے گیا جہاں کشتی کی بربادی یقینی تھی لیکن اس کا بڈھا کپتان جو اس کے پاس ہی کھڑا تھا خاموش رہا اور خوف زدہ ہو کر دیکھتا ہی رہا اور اسکے کام میں کوئی دخل نہیں دے سکا حالانکہ اس مخصوص حالت میں کپتان کا دخل دینا بہت مناسب ہوتا مگر اس سے آئندہ کے لئے ایک تباہ کن مثال بن جاتی۔ پائلٹ کے لامحدود اختیارات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دخانی کشتیوں کے عہد قدیم میں پائلٹ ایک بڑی شخصیت کا مالک ہوتا تھا۔ کپتان اسکے ساتھ بڑی تواضع سے پیش آتا تھا اور سب افسران اور ملازمین اس کا خاص طور سے ادب کرتے تھے اور اسی وجہ سے مسافر بھی اس کی بڑی عزت کرتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ پائلٹ کے علاوہ اور کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو غیر ملکی بادشاہوں اور شہزادوں کے ساتھ سفر کرتے ہوئے

جھجھکنا نہ ہو۔ تاہم اپنے ہی رتبہ کے لوگوں کے درمیان کسی کو کوئی جھجھک نہیں ہوتی۔

پائلٹوں کو یہ عادت پڑ گئی تھی کہ اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے وہ ہمیشہ دوسروں کو حکم دیا کرتے تھے مگر مجھے آجکل یہ حیرت ہوتی ہے کہ میں اپنی خواہشات کے لئے دوسروں سے عاجزانہ درخواست کیوں کرتا تھا۔ ان کو تمکنت آمیز لہجے میں حکم کیوں نہیں دیتا تھا۔

اس پرانے زمانے میں دخانی کشتی کو سینٹ لوئی سے نیو آرلینز تک لیجا کر پھر سینٹ لوئی واپس لانے میں اور سامان بھرنے اور اتارنے میں عام طور پر قریب قریب پچیس دن لگتے تھے۔ انمیں سے سات دن سینٹ لوئی اور نیو آرلینز کے گھاٹوں پر لگ جاتے تھے اور سوا دو پائلٹوں کے جہاز کے باقی افراد سخت محنت سے کام کرتے تھے۔ پائلٹ لوگ کچھ کام نہیں کرتے تھے۔ وہ شرفاء کی طرح شہر میں گھومتے چلے جاتے تھے اور چھٹی میں بھی ان کو اتنی ہی اجرت ملتی تھی جتنی کام کے دنوں میں۔ جیسے ہی کشتی ان دو شہروں کے کسی گھاٹ پر پہونچتی، وہ کنارے پر اتر پڑتے اور جب تک آخری گھنٹی نہ بج جاتی اور کشتی اگلے سفر کے لئے پوری طور پر تیار نہ ہو جاتی تب تک وہ کشتی پر واپس نہ آتے تھے۔

جب کسی کپتان کو ایک بہت مشہور و معروف پائلٹ ہاتھ لگ جاتا تھا تو وہ بڑی کوشش سے اس کو اپنے جہاز پر رکھنے کے لئے اس سے بنائے رکھتا۔ جس زمانے میں مسیسپی کی بالائی جانب ایک پائلٹ کی تنخواہ چار سو ڈالر ماہانہ ہوتی تھی اسوقت میری یادداشت کے مطابق ایک کپتان نے ایک ایسے ہی ہوشیار پائلٹ کو تین مہینے تک پوری تنخواہ محض خالی بیٹھے رہنے کے لئے دی کیونکہ دریا کا پانی اسوقت منجمد تھا اور جہاز رانی کا کام معطل تھا۔ آپکو یاد ہوگا کہ اس سستے زمانے میں چار سو ڈالر کی تنخواہ اتنی شاندار سمجھی جاتی تھی کہ جسکا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ دنیا میں بہت تھوڑے لوگوں کو اتنی اونچی تنخواہ ملتی تھی۔ ایسے لوگوں کو بہت بڑا آدمی سمجھا جاتا تھا۔

جب دریا کے کسی طرف سے پائلٹ ہمارے چھوٹے سے گاؤں مسوری میں آتے تو گاؤں کی سب سے بڑی ہستیاں اور حسین و جمیل عورتیں ان سے ملاقات کرنے آتی تھیں۔ پائلٹوں کا بڑی عزت سے استقبال کیا جاتا تھا۔ پوری تنخواہ پاتے ہوئے یہ لوگ ساحل پر کئی کئی روز تک بڑی عیش کرتے تھے۔ خاص کر ان دنوں میں جبکہ دریائے مسوری میں تجارت بڑے زوروں پر تھی (یہ عہد کنساس کہلاتا تھا) اس زمانے میں ایک پائلٹ کو نو سو ڈالر ایک سفر کے ملتے تھے جسکے معنی

اٹھارہ سو ڈالر ماہانہ ہوتے ہیں۔ اس زمانے کے دو آدمیوں کے درمیان ہوئی ایک گفتگو کا ذکر میں یہاں کروں گا۔ دریائے الی نوریے پر کام کرنے والا ایک آدمی جو ایک پہیے کے پاس ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھا ہے دریائے مسوری کے دو پائلٹوں کو جو مرصع اور مسجع پوشاک پہنے ہیں سلام کرتا ہے اور کہتا ہے۔

"صاحبان، مجھے اوپر کی جانب ندی میں جانا ہے میں آپ کو ایک مہینے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں آپ کیا تنخواہ لیں گے۔"

"یک مشت اٹھارہ سو ڈالر"

"کمال ہے۔ خدا کی پناہ۔ اچھا تو تم میری کشتی لیجاؤ اور مجھے اپنی تنخواہ دیدو میں اسے اپنے لوگوں میں بانٹ لوں گا۔"

میرا مطلب اس گفتگو سے یہ ہے کہ مسیسپی کے پائلٹ خشکی پر رہنے والے انسانوں کی نگاہ میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ (نیز میری اپنی نگاہ میں بھی) انکی اہمیت انکی کشتی کے وقار کے مطابق ہوتی تھی مثلاً جو کشتیاں بہت شاندار گنی جاتی تھیں جیسے ایک اسکاٹ یا گرانڈ ٹرک ان پر ملاحی کرنا قابل فخریات تھی۔ حبشی فائرمین عرشے پر کام کرنے والے اور نائی جو ان کشتیوں میں کام کرتے تھے وہ بھی اپنے اپنے فرقوں میں بہت معزز آدمی سمجھے جاتے تھے اور وہ خود بھی اس بات سے بخوبی آگاہ تھے۔ ایک مرتبہ ایک لمبے چوڑے حبشی نے نیو آرلینز میں ایک ناچ کے کمرے میں بہت غرور کیساتھ کچھ بدتمیزی کی۔ آخر کار وہاں کا ایک منیجر دوڑ کر اسکے پاس آیا اور کہا "آپ کون ہیں۔ آپ کون ہیں۔ جاننا چاہتا ہوں۔"

بدتمیزی کرنیوالا حبشی ذرا بھی نہ گھبرایا بلکہ اور سینہ پھلا کر ایسی آواز میں بولا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ غرور و تمکنت دکھلانے میں حق بجانب ہے کیونکہ اس نے کم پیسہ خرچ نہیں کیا تھا۔ وہ بولا "میں کون ہوں۔ میں کون ہوں۔ میں تم کو یہ جلد بتلاؤں گا۔ میں تم حبشیوں کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں ایک اسکاٹ کا فائرمین ہوں۔" اور اتنا بتانا ہی کافی تھا۔

"گرانڈ ٹرک" نامی جہاز کا ایک نائی ایک صاف ستھرا حبشی تھا جو بڑی آسودہ خاطری اور اطمینان سے اپنی شان بگھارا کرتا تھا اور اسکے ہم مذاق لوگ اسے بہت پسند کرتے تھے۔ نیو آرلینز

کی سیاہ فام لڑکیاں شام کے وقت گلیوں میں دیواروں کی آڑ میں مردوں سے رنگ رلیاں کرتی پھرتی تھیں۔ ایک روز شام کو وہاں ایک جگہ کسی نے مندرجہ ذیل بات چیت سُنی۔ ایک ادھیڑ عمر کی حبشی عورت نے کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے سے اپنا سر باہر نکالا اور چلائی (کیونکہ وہ چاہتی تھی کہ اسکے پڑوسی سنیں اور حسد کریں)

"میری این۔ تم اِسی وقت گھر میں چلی آؤ۔ 'گرانڈ ترک' کا نائی کھڑا ہے اور وہ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

میں ابھی یہ کہہ رہا تھا کہ ایک پائلٹ کا عجیب وغریب مرتبہ بقدر اونچا تھا کہ نہ کسی کو اس پر انگشت نمائی کی ہمت پڑتی تھی اور نہ اس پر کوئی حکم چلا سکتا تھا۔ اس سلسلے میں مسٹر اسٹیفن ڈبلو کا نام میری زبان پر آتا ہے۔ وہ ایک خداداد قابلیت کا شخص تھا، نیک خصلت، کبھی نہ اُکتانیوالا، نکتہ سنج اور ظریف بھی تھا۔ وہ بڑا آزاد منش آدمی تھا جو کسی کی پروانہ کرتا تھا۔ عہدے کی شان و شوکت، ایام جوانی اور دولت کی فراوانی کی وجہ سے آرام طلبی اور مزے کی زندگی گذارنے کا عادی تھا۔ اسکے پاس ہمیشہ کام رہتا تھا مگر اس نے کبھی ایک پیسہ بھی بچا کر نہ رکھا تھا وہ چکنی چپڑی باتیں بنا کر لوگوں سے روپیہ اُدھار لینا خوب جانتا تھا۔ دریا کے ہر پائلٹ کا اس پر قرض تھا اور بہت سے کپتانوں کا بھی۔ اپنی اس لاابالی طبیعت میں اس نے ایک شان پیدا کر لی تھی۔ خداارکھے پائلٹ کے پیشے کو جس نے اس شخصیت میں اتنی دلربائی اور کشش پیدا کر دی تھی، لیکن یہ کشش ہر شخص کو مرعوب نہیں کر سکتی تھی۔ ایک مرتبہ اس نے کپتان وائی (۲) کے ساتھ جو ایک سخت رسیدہ اور نیک انسان تھے ایک بحری سفر کیا۔ لیکن جونہی کشتی نیو آرلینز پہونچی اس نے مسٹر سٹیفن کو پائلٹ کے عہدے سے برطرف کر دیا۔ لوگوں کو اس کے برطرف کئے جانے پر تعجب ہوا۔ مگر اس کا ذکر آتے ہی کپتان وائی (۲) کو جھرجھری آگئی اور پھر وہ اپنی کمزور، پتلی اور سن رسیدہ آواز میں بولے۔

"خدا جھوٹ۔ مجھے بخشو۔ میں ایسے جنگلی انسان کو اپنی کشتی پر رکھ کر دنیا کا سفر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ قسمیں کھاتا ہے، گانا گاتا ہے، سیٹی بجاتا ہے، اور چیختا ہے۔ میں نے کسی قبائلی کو بھی اسطرح چیختے نہیں سنا۔ رات کا کوئی وقت ہو اسکے وحشیانہ پن میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

وہ کسی وجہ سے نہیں چیختا بلکہ اسلئے چیختا رہتا ہے کہ چیخنے میں اُسے ایک شیطانی قسم کا مزہ ملتا ہے۔ اس کے اس طرح چیخنے سے میری نیند خراب ہو جاتی۔ اس کی اسطرح کی جنگجویانہ چیخوں کو سنکر مجھے سوتے سوتے ایکدم اٹھکر بغیر پسینہ پونچھے آنا پڑتا ہے کہ دیکھوں کیا ماجرا ہے یہ عجیب و غریب شخص ہے بہت ہی عجیب و غریب۔ اسکی نگاہ میں کسی کے لئے کوئی عزت نہیں ہے وہ کبھی مجھے بوتی کہتا اور کبھی کچھ۔ اس کے پاس ایک سارنگی ہے اور ایک بلی۔ وہ قابلِ نفرت کھیل کھیلتا ہے۔ وہ بلی کو تنگ کرتا ہے اسلئے بلی غرایا کرتی ہے اور جب وہ اور بلی دونوں موجود ہوں تو کسی کی کیا مجال جو سو سکے۔ وہ بڑا ہی بے پروا ہے۔ شاید ہی کوئی شخص اتنا بے پروا ہو اب آپکو یقین آئے یا نہ آئے میں بالکل سچ سچ کہتا ہوں کہ یہ شخص چکوٹ کے پاس میری کشتی ایک طرح جھکا کر ان خطرناک بہتے ہوئے پیڑوں کے اندر لے گیا جبکہ اسٹیم زوروں پر کام کر رہی تھی اور ہوا بھی پورے زور و شور سے چل رہی تھی۔ بتائیے کشتی کا کیا انجام ہوتا۔ میرے افسران آپکو اسکے متعلق بتائیں گے کیونکہ انھوں نے یہ سب دیکھا ہے' اور جناب جب وہ ان پیڑوں کے بیچ میں ہو کر کشتی کو لا رہا تھا تو اسوقت ڈر کے مارے میں کانپ رہا تھا اور خدا سے دعا مانگ رہا تھا کہ کشتی صحیح سلامت نکل جائے۔ اگر وہ چیں بہ جبیں ہو کر سیٹی نہ بجاتا۔ میں تو اس سے کبھی بولنا نہیں چاہتا تھا۔ البتہ جناب اس نے سیٹی بجائی اور مجھ سے کہا " کیا آجکی رات آپ باہر نہ آئیں گے۔ نہ آئیں گے۔ نہ آئیں گے وغیرہ وغیرہ" اور یہ سب باتیں وہ ایسے سکون کے ساتھ کہتا تھا جیسے کہ ہم کسی ماتم پرسی کی رسم میں چُپ چاپ بیٹھے اسکی باتیں سُن رہے ہوں خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ ہم خود مرحوم کے رشتہ دار نہ ہوں بلکہ محض مرحوم کے عزیز و اقارب کو ماتم کرتے دیکھ رہے ہوں۔ جب میں نے اُسے بُرا بھلا کہا تو وہ مجھ پر ہنس دیا جیسے کہ میں کوئی بچہ ہوں اور مجھ سے کہا کہ گھر لوٹ جاؤ اور نیک انسان بننے کی کوشش کرو اور اپنے بڑوں[1] کے کام میں دخل نہ دو"

ایکمرتبہ ایک ذلیل قسم کے کپتان نے اسٹیفن صاحب کو نیو آرلینز میں پکڑ لیا اسوقت وہ کام پر نہ تھے اور نہ ان کے پاس پیسہ تھا اسلئے اسٹیفن صاحب کو ایک تنگ جگہ میں گھیر لیا اور انھیں اس بات

[1] یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ اسوقت کپتان کی جہازرانی کی لیاقت نمائشی اور خام ہوتی تھی جبکہ پائلٹ کی لیاقت اور اسکا اقتدار مطلق مانا جاتا تھا لہٰذا مذکورہ بالا الفاظ کچھ ایسے ناموزوں نہیں تھے۔

۱۲۵

پر راضی کرلیا کہ وہ ایکسو چھبیس ڈالر ماہانہ پر اسکی کشتی میں ملازمت کرلیں۔ یہ رقم اسوقت صرف آدھی تنخواہ کے برابر تھی۔ اسلئے کپتان نے یہ وعدہ کیا کہ وہ کسی پر یہ راز افشاں نہ کریگا اور اسطرح اسٹیفن صاحب کے ہم پیشہ لوگ انھیں حقارت سے نہ دیکھیں گے۔ لیکن کشتی کو نیو آرلینز سے چلے ابھی دو دن کا وقفہ بھی نہ ہوا تھا کہ اسٹیفن کو معلوم ہو گیا کہ کپتان اپنی چالاکی کی شیخی مار رہا ہے۔ اس نے سب افسروں سے یہ بات کہہ دی تھی۔

اسٹیفن صاحب کو یہ سنکر ایک جھرجھری سی آئی مگر انھوں نے کہا کچھ نہیں۔ سہ پہر کے قریب کپتان بالائی عرشہ پر آیا۔ چاروں طرف دیکھا اور بہت متعجب ہوا۔ اس نے اسٹیفن کی طرف مستفسرانہ انداز میں دیکھا لیکن اسٹیفن صاحب بڑے اطمینان سے اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ کپتان تھوڑی دیر تک پریشان سا کھڑا رہا اور دو ایک بار اس نے کچھ تجویز پیش کی لیکن بحری قانون کے مطابق اس نے جلد بازی سے کام نہیں لیا اور غصہ میں خاموش کھڑا رہا۔ وہ کئی منٹ تک پیچ و تاب کھاتا رہا اور پریشان بھی رہا تب اپنے کمرہ میں واپس لوٹ گیا لیکن جلد ہی وہ پھر باہر آ گیا۔ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ پریشان تھا۔ فوراً ہی اس نے ہمت کر کے اسٹیفن صاحب سے بڑے ادب سے پوچھا جناب اب تو دریا اچھی حالت میں ہے۔ کیا ایسا نہیں ہے۔؟

”ہاں یقیناً ایسا ہی ہے۔ جب کنارے تک پانی بھرا ہو تو دریا کی حالت اچھی ہی کہی جاتی ہے۔“

یہاں پانی کافی گہرا معلوم ہوتا ہے۔

ارے ہو نہہ! یہاں تو ایک میل کی دوڑ کے قابل بھی پانی نہیں ہے۔“

غالباً کنارے کی طرف چلنا آسان ہے بہ نسبت وسط دریا کے۔“

ہاں میرا بھی یہی خیال ہے لیکن وہاں کشتی کی حفاظت یقینی نہ ہو گی یہاں کشتی بالکل محفوظ ہے یہاں کشتی تلے سے نہیں ٹکرائے گی اسکا آپ اطمینان رکھیں کپتان لوٹ گیا وہ بہت غمگین تھا کیونکہ اگر کشتی اسیطرح چلتی رہی تو شاید سینٹ لوئی تک پہنچنے سے پہلے وہ بڈھا ہو کر بھی مر جائے۔ دوسرے روز وہ پھر عرشے پر آیا اور پھر اسٹیفن صاحب کو بڑی وفاداری کیساتھ دریا کے وسط میں کشتی کھینچتے ہوئے پایا وہ مسیسپی کے تیز دھارا کا مقابلہ کر رہے تھے اور بڑے اطمینان سے سیٹی بجا رہے تھے۔ اب صورتِ حال نازک ہو چلی تھی۔ کنارے کے

پاس ایک سست رفتار کشتی پانی کو کاٹتے ہوئے بڑے مزے سے چلی جارہی تھی۔ وہ ایک جزیرے کے ڈھلان کی طرف جارہی تھی۔ مگر اسٹیفن صاحب دریا کے بیچ میں ہی اپنی کشتی اٹکائے ہوئے تھے۔ کپتان نے مجبوراً کہا۔

"مسٹر ڈبلو۔ کیا اس ڈھلان سے ہوکر جانے سے کافی فاصلہ کم نہیں ہو جائے گا؟"

"شاید ہو جائے۔ مگر مجھے معلوم نہیں۔"

"کیا کہا۔؟ نہیں معلوم کیا انہیں اتنا پانی نہیں ہوگا کہ ہم اس سے ہوکر جا سکیں۔"

"مجھے امید ہے کہ ہوگا لیکن مجھے یقین نہیں ہے۔"

"میں پوری ذمہ داری کیساتھ کہہ رہا ہوں کہ آپکا یہ طریقہ بیحد انوکھا ہے اور ٹھیک نہیں ہے۔ دیکھیے اس کشتی کے پائلٹ اس ڈھلان پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کی واقفیت انکے برابر بھی نہیں ہے۔؟"

اسٹیفن۔" وہ ڈھائی سوڈالر پانے والے پائلٹ ہیں۔ لیکن آپ بے چین نہ ہوں میں کم از کم اتنا ضرور جانتا ہوں جتنا سوا سوڈالر پانیوالا پائلٹ۔" اور کپتان اسٹیفن صاحب کو ڈھائی سوڈالر دینے کے لیے رضامند ہو گیا۔

اور پانچ منٹ بعد ہی اسٹیفن صاحب ڈھلان سے ہوکر دنادن کشتی کو چلائے جارہے تھے۔ اور اپنے مقابلے والی کشتیوں کو ڈھائی سوڈالر تنخواہ کے ہاتھ دکھا کر پیچھے چھوڑ چکے تھے۔

پندرھواں باب

پائلٹوں کی اجارہ داری

ایک دن ایک اسکاٹ جہاز پر میرے افسر مسٹر بکسی کٹ آئی لینڈ کے جزیرہ کے پاس ایک بہت تنگ مقام سے بڑی احتیاط کیساتھ آہستہ آہستہ کشتی نکال رہے تھے کشتی محض رینگ رہی تھی۔ دونوں پنسالیں[1] کام کر رہی تھیں اور ہر آدمی خوف سے سانس روکے دیکھ رہا تھا۔ کپتان، جو انتہائی زود حس اور بدھو قسم کا آدمی تھا، پہلے تو خاموش کھڑا رہا پھر جب اس سے نہ رہا گیا۔ تو وہ گھبرا گیا اور غصہ سے چلا کر بولا۔

"مسٹر بکسی مہربانی کر کے جہاز کو اسٹیم دیجئے۔ اسٹیم دیجئے۔ نہیں تو وہ اس رفتار سے چٹان پار نہ کر سکے گا" اس بات کا مسٹر بکسی پر کیا اثر ہوا۔ اسکا اندازہ انکی خاموشی ہی سے لگایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن پانچ منٹ بعد جب خطرہ کا مقام نکل گیا اور پنسال ڈالی گئی تو بکسی غصہ سے آگ بگولہ ہو گئے۔ اور کپتان صاحب کو اتنی کھری کھری سنائیں جتنی پہلے میں نے کبھی نہ سنی ہونگی۔ یہ اچھا ہوا کہ کوئی کشت و خون نہیں ہوا کیونکہ کپتان صاحب کا پہلو کمزور تھا ورنہ وہ ایسا انسان نہ تھا جو ایسی ملامت کی باتیں چپ چاپ سن لیتا۔

علم جہاز رانی کی نوعیت اور اسکی جزئیات کیساتھ ساتھ یہ بتانے کے بعد کہ ایک پائلٹ دخانی کشتی کے ملازمین میں کیا درجہ رکھتا ہے۔ میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ چند الفاظ اس جماعت کے بارے میں بھی کہوں جو پائلٹوں نے اپنے ہم پیشہ لوگوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے بنائی

---

[1] پنسال۔ پانی ناپنے کا آلہ۔

تھی۔ اس میں ایک خاص بات یہ تھی کہ ان لوگوں کی یہ جماعت سب سے زیادہ منظم، مکمل اور مستحکم تجارتی جماعت تھی۔ اتنی عمدہ جماعت انسانوں نے پہلے کبھی نہیں بنائی تھی۔

بہت عرصہ تک ایک پائلٹ کی تنخواہ ڈھائی سو ڈالر ماہانہ رہی۔ لیکن بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ جیسے جیسے دخانی کشتیاں تعداد میں بڑھنے لگیں اور تجارتی کاروبار پھیلا تو پائلٹ کی اجرت رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔ وجہ بہت صاف تھی۔ پائلٹ بہت زیادہ تعداد میں ہو گئے تھے۔ ہر پائلٹ کو ایک اپرینٹس یا بندی جو کب (Cub) کہلاتا تھا اور ایک اسٹرس مین۔ باجہازران یہ دو ملازم ملتے تھے جو دو سال تک محنت و مشقت کرتے تھے جبکہ پائلٹ حضرت ایک اونچی بینچ پر بیٹھ کر سگریٹ پیا کرتے تھے۔ کپتانوں اور پائلٹوں کے لڑکے اور بھتیجے بھی پائلٹ ہی بننا چاہتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ رواج ہو گیا کہ قریب قریب ہر پائلٹ کے پاس ایک اسٹرس مین رہنے لگا۔ جب اسٹرس مین اتنی ترقی کر لیتا تھا کہ وہ پائلٹ اسکے کام سے مطمئن ہو سکے، تو اسے پائلٹ کا لائسنس مل جاتا تھا۔ ایک عرضی یونائیٹڈ اسٹیٹس انسپکٹر کے یہاں دینی پڑتی تھی۔ اسکے علاوہ کسی اور کاروائی کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ عام طور پر کسی قسم کی کوئی تحقیقات بھی نہیں ہوا کرتی تھی۔ اور نہ ہی امیدوار کی قابلیت کا کوئی ثبوت ہی مانگا جاتا تھا۔

نتیجۃً نئے پائلٹوں کی دن دونی بڑھتی تعداد کا خراب اثر ان کی تنخواہوں کی شرحوں پر پڑا۔ تجربہ کار پائلٹوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ ظاہر ہے نہیں اسکی روک تھام کرنی تھی اور عمل بھی کرنا تھی۔ لیکن کون سے اقدام ضروری تھے۔؟ ایک ضروری قدم تو یہ تھا کہ وہ ایک بہت ہی منظم جماعت بنائیں۔ اسکے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔ لیکن اس کام کو تکمیل تک پہونچانا آسان نہ تھا۔ اس لئے محض بات چیت ہی ہو کر رہ گئی اس معاملہ میں جو بھی پہل کرتا اسی کے برباد ہونے کا اندیشہ تھا۔ بالآخر بارہ دلیر پائلٹ جنمیں چند بہت جوانمرد بھی تھے اس کام میں جٹ گئے۔ انھوں نے جو بھی ذاتی میں آئے ان سے فائدہ اٹھایا۔ حکومت سے انھیں ایک خاص فرمان عطا کیا گیا جسکی رو سے انھیں بڑی بڑی رعائتیں حاصل ہو گئیں۔ اس چارٹر کا نام پائلٹس بینیوولینٹ ایسوسی ایشن رکھا گیا۔ اس کی رو سے انھوں نے اپنے افسران کا کثرت رائے سے انتخاب کیا اور اپنی جماعت کو مکمل بنایا۔ چندہ اکٹھا کیا اور ایسوسی ایشن کی طرف سے پائلٹ کی تنخواہ فوراً ڈھائی سو ڈالر

ماہانہ کر دی گئی۔ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ان بارہ کے بارہ پائلٹوں کو ملازمت سے فوراً برطرف کر دیا گیا۔ اور یہ لوگ اپنے وطن واپس چلے گئے۔ لیکن انکے چارٹر کے دو تین ذیلی قوانین میں ایسے مبہم نکات رہ گئے تھے جنکو کسی طرح بھی توڑا مروڑا جا سکتا تھا۔ مثلاً ایسوسی ایشن کے تمام ممبران جو پرانے تجربہ کار تھے مگر ملازمت میں نہیں تھے پچیس ڈالر ماہانہ پینشن کے مستحق تھے۔ اس قانون کا غلط استعمال یہ ہوا کہ نئے کام پر لگے ہوئے پائلٹ بھی بے کاری کے دنوں میں پینشن لینے والوں کی جماعت میں شامل ہونے لگے۔ بھوکوں مرنے سے پچیس ڈالر ہی غنیمت تھا۔ دوسرے اس جماعت میں ممبر بننے کی فیس بیس ڈالر تھی لیکن بیکار پائلٹوں سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔

اسکے علاوہ پرانے پائلٹوں کے مرنے کے بعد انکی بیواؤں کو پچیس ڈالر ماہانہ پینشن ملتی تھی اور انکے ہر بچے کیلئے کچھ روپیہ بھی۔ مزید براں پائلٹ کے مر جانے پر تدفین و تکفین کا خرچ بھی ایسوسی ایشن دیتی تھی۔ ان مراعات کو سن کر مسی سپی کی وادی کے سب پائلٹ جو ریٹائر کر دیئے گئے تھے ایسوسی ایشن کے ممبر بننے لگے۔ ٹانگوں سے معذور لوگ بیساکھیوں کے سہارے آئے۔ کچھ ٹھیلوں پر اور کچھ بیماروں کی ڈولی یا زخمیوں کی گاڑیوں میں آئے۔ غرض یہ کہ کسی نہ کسی طرح سب پائلٹ وہاں پہنچ گئے۔ وہ دس ڈالر فیس داخل کر دیتے تھے۔ اور فوراً پچیس ڈالر پینشن پانے لگتے تھے۔ اور اپنے دفنانے کے خرچ کی بھی ایسوسی ایشن سے امید رکھتے تھے۔

رفتہ رفتہ تمام بیکار و معذور پائلٹ جنکے ساتھ ایک درجن اچھے پائلٹ بھی تھے ایسوسی ایشن میں داخل ہو گئے۔ نوے فیصدی پائلٹ جو ایسوسی ایشن میں شامل نہ تھے ان لوگوں پر حقیر آ ہنسا کرتے تھے۔ بلکہ دریا کے سبھی ملازمین ان اپاہج ممبران پر حقارت سے ہنسا کرتے تھے۔ لوگ اس قانون پر بھی ہنسا کرتے جسکی رو سے ہر پائلٹ کو جو ایسوسی ایشن کا ممبر بنتا تھا اپنی تنخواہ کا دسواں حصہ ہر ماہ بطور امداد ایسوسی ایشن کے خزانہ میں داخل کرنا پڑتا تھا۔ لیکن جو اسکے ممبر تھے وہ سب یا تو ملازمت سے چھٹی پائے ہوئے تھے یا وہ ہوتے تھے جنکو ملازمت میں رکھنے کی اجازت نہیں تھی اور کوئی انھیں ملازم نہیں رکھ سکتا تھا۔ دوسری طرف ہر وہ شخص جو ایسوسی ایشن کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا کم از کم اس بات سے مسرور و خوش تھا کہ اسطرح

سب نکمے پائلٹ ایسوسی ایشن سے پینشن پانے لگے اور مستحق و قابل پائلٹوں کے لئے ملازمت کا میدان خالی ہو گیا۔ لیکن یہ صرف مذاق ہی نہیں تھا۔ دراصل ایسوسی ایشن بننے کی وجہ سے رفتہ رفتہ پائلٹوں کی تنخواہیں بڑھنے لگیں اور خاص طور سے اسلئے بھی کہ تجارت کا موسم بھی آ گیا تھا۔ سو ڈالر ماہانہ حساب تنخواہ ایکسو پچیس ڈالر اور کہیں کہیں ایکسو پچاس ڈالر ہو گئی تھی۔ ایک مضحکہ خیز بات یہ تھی کہ جن بارہ آدمیوں نے ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی تھی انکو رتی بھر بھی فائدہ نہیں ہوا۔ کچھ مذاق کرنیوالے ایسوسی ایشن ہال میں محض اسلئے جاتے تھے کہ وہاں ممبران سے گپ شپ کریں تاکہ وہ انکو ملاح بنا کر دریا کا سفر بھی کرائیں بہ طرح وہ دیکھ لیں کہ انکا پرانا دریا اب کیسا لگتا ہے۔ تاہم ایسوسی کو اطمینان تھا کہ اس نے اپنا کام انجام دیدیا ہے۔ یا کم از کم کوئی بات غیر متوقع نہیں ہوئی۔ گاہے ماہے جب کوئی بدنصیب پائلٹ وہاں پہونچتا، تو اُسے ایسوسی ایشن کا ممبر بنا لیا جاتا۔ مگر بعد میں جو پائلٹ ممبر بنے وہ اچھے پائلٹوں میں سے تھے کیونکہ نااہل لوگ تو پہلے ہی ایسوسی ایشن میں کھپ چکے تھے۔ جیسے جیسے تجارتی موسم آتا گیا پائلٹوں کی تنخواہیں بڑھتی چلی گئیں۔ اور دو سو پچاس ڈالر تک پہونچ گئیں یعنی اسی رقم تک ایسوسی ایشن نے مقرر کی تھی۔ اب یہ تنخواہ مستقل ہو گئی تھی۔ لیکن ایسوسی ایشن کے کسی ممبر کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ کیونکہ کسی ممبر کو ملازمت کیلئے نہیں بلایا گیا۔ اب ایسوسی ایشن کے ممبر الکاہل سے زیادہ مذاق اڑایا جانے لگا۔ اور بچارے ممبروں کو سب کچھ سننا دسہنا پڑا۔

مگر ایسوسی ایشن شروع ہو کر بند مشکل ہی سے ہوتی ہے۔ حالات بدلے۔ موسم سرما آیا۔ تجارت کا کام دگنا اور تگنا ہو گیا۔ اب مسوری۔ الی نوائے اور مسی سپی کے بالائی حصہ سے کشتیوں کا ایک ہجوم تجارت میں حصہ لینے کے لئے نیو آرلینز کی طرف چل پڑا۔ اور یکایک پائلٹوں کی مانگ بڑھ گئی۔ انکا ملنا بہت کم ہو گیا۔ پائلٹوں کیلئے اب بدلہ لینے کا موقع تھا۔ ایسوسی ایشن کے پائلٹوں کو ملازمت میں رکھنا لوگوں کو بہت تلخ معلوم ہوتا تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ بالآخر کشتیوں کے کپتان اور مالکان اس بات پر رضامند ہو گئے کہ ایسوسی ایشن کے پائلٹوں کو ملازم رکھ لیں گے۔ ان کے سامنے اب اور کوئی راستہ نہیں تھا لیکن ان نکالے ہوئے پائلٹوں میں سے کوئی بھی ملازمت کیلئے نہیں آیا۔ اب تو مالکان کو اور بھی ندامت کا سامنا کرنا پڑا۔ طے یہ پایا کہ برطرف کئے گئے پائلٹوں کو تلاش کر کے ملازمت کی ......

پیشکش کی جائے۔ ایک کپتان صاحب نے ندامت برداشت کرتے ہوئے پہل کی حالانکہ وہی

ایسوسی ایشن کو سب سے زیادہ حقارت سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے ایسوسی ایشن کے ایک پائلٹ کو تلاش کرلیا۔ اور اس سے کہا "آپ جیسے ہوائیوں کو ہم سے اچھا کوئی اور مالک نہیں ملے گا۔ میں آپ کی حتی الامکان توقیر کروں گا۔ میں آپ کو ملازمت دینے کے لئے آیا ہوں۔ آپ فوراً اپنا سامان تیار کرکے چل دیجئے میں بارہ بجے یہاں سے روانہ ہونا چاہتا ہوں۔"

"میں اسکے بارے میں کچھ نہیں جانتا آپکا دوسرا پائلٹ کون ہے۔"

"میرے پاس مسٹر آئی۔ ایس ہیں۔ آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔"

"میں اسکے ساتھ نہیں جا سکتا۔ وہ ایسوسی ایشن کا ممبر نہیں ہے۔"

"کیا کہا۔"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔"

"تو کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ تم دریا کے سب سے پرانے اور ہوشیار پائلٹ کیساتھ بیٹھ نہیں چلاؤ گے۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ پائلٹ تمہاری ایسوسی ایشن کا ممبر نہیں ہے۔"

"ہاں میرا یہی مطلب ہے۔"

"کیا یہ بے جا غرور نہیں ہے۔ میں نے تو خیال کیا تھا کہ میں تمہارے ساتھ نیکی کر رہا ہوں۔ لیکن اب مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ آپ مجھ پر مہربانی فرما رہے ہیں۔ کیا تم ایسوسی ایشن کے کسی قانون کے تحت ایسا کہہ رہے ہو۔"

پائلٹ۔ "بیشک"

کپتان۔ "ذرا وہ قانون مجھے بھی دکھاؤ۔"

دونوں صاحبان ایسوسی ایشن کے دفتر میں چلے گئے جہاں سیکریٹری نے کپتان کو مطمئن کر دیا۔ کہ پائلٹ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔

"اچھا اب یہ بتائیے کہ میں اب کیا کروں۔ میں نے مسٹر آئی۔ ایس کو تمام سیزن کے لئے رکھا ہے۔"

"میں آپکو ایک پائلٹ اور دوں گا اور وہ بارہ بجے کشتی پر پہنچ جائے گا۔"

"لیکن اگر میں مسٹر آئی۔ ایس کو الگ کر دوں گا تو وہ پورے سیزن کی اجرت مانگے گا۔"

سیکرٹری: "یہ آپکا اپنا معاملہ ہے۔ آپ جانیں اور مسٹر آئیس۔ ہم آپکے ذاتی معاملات میں دخل دینا نہیں چاہتے۔"

کپتان صاحب بہت بوکھلائے۔ لیکن سب بیکار۔ بالآخر انھیں مسٹر آئیس کو ملازمت سے نکالنا پڑا۔ اور اسکو ایک ہزار ڈالر دینا پڑا اور اسکی جگہ ایسوسی ایشن کے ایک پائلٹ کو ملازم رکھنا پڑا۔ اب لوگ اُن لوگوں کا مذاق اُڑانے لگے جو ایسوسی ایشن سے باہر تھے۔ ہر روز کسی نہ کسی ایسے پائلٹ پر نزلہ گرتا تھا۔ اور کپتان لوگ ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کسی نہ کسی غیر ایسوسی ایشن والے پائلٹ کو ملازمت سے نکال دیتے۔ وہ پائلٹ بیچارہ بیعزتی کیساتھ روتا ہوا چلا جاتا۔ اور اسکی جگہ اس ایسوسی ایشن کا کوئی پائلٹ جس سے لوگ ابتک نفرت کرتے تھے رکھ لیا جاتا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ایسے بیکار لوگوں کی تعداد جو ایسوسی ایشن سے باہر تھے کافی زیادہ ہوگئی۔ حالانکہ تجارت زوروں پر تھی اور انکی ضرورت بھی تھی۔ اب لوگوں کے ہنسنے کا انداز بدلنے لگا۔ کپتان اور مالکان نے اِن پر ہنسنا بالکل بند کر دیا اور غصہ میں آکر بدلہ لینے کا موقع تلاش کرنے لگے کہ جیسے ہی تجارت کا بڑھا ہوا کام ختم ہوگا۔ اُن سے نبٹا جائے گا۔

جلد ہی وہ وقت آگیا۔ جب غیر ممبروں کو موقع ملا اور وہ کشتیوں کے مالک بن گئے اور انھوں نے ہر کشتی پر ایسوسی ایشن کے باہر کے پائلٹ اور کپتان رکھ لئے۔ لیکن انکی یہ فتح زیادہ عرصہ تک نہ رہی۔ اسکا ایک سبب یہ تھا کہ ایسوسی ایشن نے ایک سخت اصول بنا لیا تھا کہ ایسوسی ایشن کے ممبر کسی حالت میں بھی دریا کا کوئی حال کسی باہر والے کو نہیں بتائیں گے۔ اسوقت تک قریب قریب آدھی کشتیوں پر صرف ایسوسی ایشن کے ممبر پائلٹ ہی ملازم تھے۔ اور باقی نصف پر باہر والے پائلٹ تھے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ طرفین ایک دوسرے کو دریا کے متعلق معلومات نہ ہونے دینے کی یکساں کوشش کرینگے۔ لیکن دراصل ایسا نہیں ہوا۔ سارے دریا پر ہر بڑے بڑے قصبے میں جہاز سے سامان اُتارنے کیلئے بجائے لکڑی کے چبوترے یا پشتے کی جگہ ایک کشتی کھڑی ہوتی تھی اور لانے لیجانے کیلئے سامان بھی اسی کشتی پر جمع رہتا تھا۔ جہاز کا انتظار کرنیوالے بھی اسی کشتی پر سوار رہتے تھے۔ ایسوسی ایشن کے افسر ہر کشتی میں ایک صندوق رکھ دیتے تھے۔ جسمیں عجیب سا تالا پڑا رہتا تھا۔ اس قسم کے تالے صرف امریکہ کی ڈاک سروس میں ہی استعمال ہوتے تھے۔ یہ تالے امریکہ کے ڈاک کے تھیلوں میں لگا کرتے

تھے اور یہ گورنمنٹ کا مال سمجھا جاتا تھا۔ بہت کاوشوں اور خوشامد سے گورنمنٹ اس بات پر رضامند ہوئی تھی کہ ایسوسی ایشن کو یہ تالے استعمال کرنے دے۔ ایسوسی ایشن کے ہر آدمی کو اس تالے کی ایک چابی دیدی جاتی تھی یہ چابی اور اسکے استعمال کا طریقہ کہ کیسے اس کو ہاتھ میں پکڑا جائے ایسوسی ایشن کے ممبروں کو ہی معلوم رہتا تھا۔ اسلئے جب کوئی اجنبی آدمی کسی تالی رکھنے والے سے دریا کے متعلق کوئی معلومات حاصل کرنا چاہتا تو پہلے یہ معلوم کیا جاتا تھا کہ یہ اجنبی ایسوسی ایشن کا ممبر ہے بھی یا نہیں۔ اینٹک سینٹ لوئی اور نیو آرلینز ایسوسی ایشن دخانی جہاز کے متعلق ایک درجن صنعتوں میں اپنی شاخیں کامیابی سے چلا چکی تھی۔ (اور اسکے ممبروں کی تعداد بہت بڑھ چکی تھی) اگر کوئی ایسا اجنبی جو ایسوسی ایشن کا ممبر نہیں ہوتا تھا اور ویسی ہی چابی نہیں رکھتا تھا یا چابی استعمال کرنے کا ویسا ہی طریقہ نہیں جانتا تھا تو چابی رکھنے والا کارکن دریا کے متعلق اجنبی کو کچھ بھی بتلانے سے شائستگی کیساتھ گریز کر جاتا تھا۔ ایسوسی ایشن کا سیکریٹری ہر ممبر کو چند خوبصورت فارموں کا ایک بنڈل دیتا تھا۔ ان خوبصورت لائن دار کاغذوں پر کچھ سرخیوں کے تحت مندرجہ ذیل عبارت چھپی ہوتی تھی۔

اسٹیمر گرینٹ ری پبلک

جون اسمتھ ماسٹر۔

پائلٹ۔ جون جونز اور تھامس براؤن۔

کراسنگ (موڑ)	ساؤنڈنگ (گہرائی ناپنا)۔	نشانات۔	رائے

سفر کے دوران میں ہر روز ان فارموں کی خانہ پری کی جاتی تھی۔ اور ان کو گھاٹ پر رکھے ہوئے صندوق میں ڈال دیا جاتا تھا۔ مثلاً سینٹ لوئی سے چلکر جب بھی پہلا کراسنگ مکمل ہوجاتا تھا تو سب معلومات ان کورے فارموں میں مناسب عنوان کے تحت اس طرح بھر دی جاتی۔

سینٹ لوئیس۔ ۹½ فٹ۔ دنبالہ جہاز کورٹ ہاؤس پر انگلا اسپر الکڑی کے احاطہ سے آگے جھاڑیوں پر رہے گا' جب تک تم پہلی چٹان سے اوپر نہ اٹھو۔ پھر سیدھے چلو۔ تب "کیفیت" کے خانے میں "ٹوٹے ہوئے جہاز سے ہٹ کر چلو یہ بہت ضروری ہے۔ جیسے ہی تم سیدھے چلوگے تمہارے راستے میں ایک ٹھنٹھ آجائیگا اسکے اوپر سے نکل جاؤ۔ جس پائلٹ نے

یہ معلومات سے پُر فارم کیرو کے صندوق میں ڈالا۔ اس نے اس فارم میں سینٹ لوئی کے آگے بہاؤ کی طرف آنیوالے ہر کراسنگ کی تفصیلی رپورٹ بھی شامل کردی۔ اس نے دریا کے چڑھاؤ پر جانے والے قریب نصف درجن رپورٹیں ان پائلٹوں کی پڑھیں جو کیرو اور میمفس کے درمیان کے راستے سے آئے تھے۔ اس نے ان رپورٹوں کو اپنی یادداشت کیلئے نوٹ کرلیا۔ اور دوبارہ ان کو صندوق میں رکھ دیا۔ اور یوں اپنی کشتی پوری واقفیت لیکر لوٹا۔ تاکہ کسی بھی حادثہ کا مقابلہ کرسکے۔ اور اسکی کشتی کسی مصیبت کا شکار نہ ہوسکے۔ تاوقتیکہ وہ بالکل بے پروائی ہی سے کام نہ لے۔

ایک بارہ اٹھارہ سو میل لمبے دریا میں جسکی دھارا ہر روز بدلتی رہتی ہو اس قابلِ تعریف طریقے سے کتنا فائدہ ہوتا ہوگا۔ پہلے کسی پائلٹ کو ایک پایاب جگہ کو مہینے میں ایک یا دوبار دیکھنے کا اتفاق ہوا کرتا تھا اور اسے اسی واقفیت پر اکتفا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اب وہ سینکڑوں تیز نگاہوں کے جائزے سے مستفید ہوتا تھا۔ اور سینکڑوں ذہین دماغ اُسے یہ بتاتے تھے کہ اسے کیسے عبور کیا جائے۔ اب پائلٹ کی معلومات جو بیس گھنٹے سے زیادہ پرانی نہیں ہوتی تھیں۔ اگر پچھلے صندوق میں رکھی ہوئی اطلاعات سے اسکے ذہن میں کسی خطرناک کراسنگ کے بارے میں کچھ شک وشبہہ پیدا ہوجاتا تو اسکا علاج بھی تھا۔ اور وہ یہ کہ پائلٹ جیسے ہی کسی کشتی کو آتے ہوئے دیکھتا تو وہ ایک عجیب انداز سے بھاپ کی سیٹی بجاتا اور اگر دوسری کشتی کے پائلٹ ایسوسی ایشن کے ممبر ہوتے تو اس سگنل کا جواب ایک خاص طریقے سے دیتے۔ تب دونوں کشتیاں ایک دوسرے کے پاس سے گذرتیں اور تازہ ترین اطلاعات ملنے پر سب غلط فہمیاں دور ہوجاتیں۔ یہ اطلاعات پوچھنے والے کو زبانی بالتفصیل بتادی جاتیں۔

سب سے پہلا کام جو ایک پائلٹ نیو آرلینز یا سینٹ لوئیس پہونچ کر کرتا وہ یہ تھا کہ وہ اپنی آخری اور مفصّل رپورٹ کو ایسوسی ایشن کے دفتر لیجاتا اور وہاں اسے لٹکا دیتا۔ اسکے بعد ہی اسے گھر جانے کی اجازت ملتی تھی۔ دفتر کے کمروں میں ہمیشہ بھیڑ لگی رہتی تھی اور لوگ ندی میں ہونیوالی تبدیلیوں کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ اور تبھی یہ نووارد پائلٹ جاکر انھیں تازہ ترین اطلاعات دیتا اور انکے شک وشبہات کو دور کرتا۔ دوسرے دستکار لوگ اپنے پیشے کی باتوں کو فراموش کرکے دوسرے معاملات میں بھی دلچسپی لے لیتے ہیں، لیکن پائلٹ پر یہ بات صادق نہیں آتی اسے تو اپنی ساری توجہ

اپنے پیشے پر ہی لگانی پڑتی ہے اور کسی بات کا ذکر کرنے کی اُسے فرصت ہی نہیں ہوتی۔ کیونکہ اس سے کوئی فائدہ نہیں کہ ایکدن تو اسکی معلومات مکمل ہوں اور دوسرے دن ناکافی۔ اگر اسے ہمیشہ مستعد رہنا ہے تو اسے اپنا وقت بالکل ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔

لیکن جو لوگ ایسوسی ایشن کے ممبر نہیں تھے۔ ان کے لئے بہت دشواری تھی۔ انکے آپس میں ملنے کے لئے کوئی مخصوص جگہ نہیں تھی۔ جہاں وہ تبادلہ خیالات کرتے اور ایک دوسرے کو اطلاعات بہم پہونچاتے اور نہ ہی انھیں گھاٹ کی کشتی کے صندوق والی اطلاعات ہی مل سکتی تھیں۔ انھیں تو فقط اتفاقیہ غلط سلط خبریں مل جاتیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا کہ کبھی کبھی ایک پائلٹ کو ان اطلاعات کے سہارے جو سات آٹھ روز پرانی ہوتی تھیں، پانچ پانچ سو میل کا سفر طے کرنا پڑتا تھا۔ اگر دریا کی کیفیت اچھی ہوتی تو یہ اطلاعات کام آجاتیں لیکن اگر دریا کہیں بہت پایاب ہوتا تو یہ سفر اکثر مہلک ثابت ہوتا تھا۔

اب اسکا ایک لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ باہر والے پائلٹوں سے حادثے ہونے لگے۔ کبھی انکی کشتی پایاب پانی کی سنہ پر بیٹھ جاتی یا کبھی ڈوب جاتی اسطرح کی اور مصیبتیں ان پر نازل ہوتی رہتیں۔ جبکہ ایسوسی ایشن پائلٹ حادثات سے بالکل بچے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جن کشتیوں پر ایسوسی ایشن سے باہر والے پائلٹ کام کرتے تھے۔ انکے مالکان اور کپتان جو ابتک ایسوسی ایشن کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور اپنے کاروبار کی شیخی بگھارا کرتے تھے۔ اب بدلے ہوئے حالات میں کافی پریشان رہنے لگے۔ پھر بھی ظاہرا وہ شیخی ضرور بگھارتے تھے۔ لیکن ایک بدقسمت دن ایسا آہی گیا جب ہر کپتان کو ایک حکم جاری کیا گیا کہ وہ باہر والے پائلٹوں کو فی الفور نکال دے۔ اور ایسوسی ایشن کے پائلٹوں کو ملازم رکھے اور ایسا حکم دینے کی زبردست غلطی کون کرسکتا تھا؟ افسوس کہ یہ حکم ایسی ذی اثر ہستی کا تھا جسکو حکومت کی حمایت حاصل تھی۔ اور اسکی طاقت حکومت کی طاقت سے بھی زیادہ تھی۔ یہ بااثر ہستی بحری بیمہ کرنے والوں کی تھی۔

اب لڑنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا ہر باہری پائلٹ کو اپنا بوریا بستر باندھ کر جہاز سے اترنا پڑا۔ البتہ یہ شبہ کیا جا رہا تھا کہ ایسوسی ایشن اور بیمہ کمپنی والوں کے درمیان کوئی خفیہ سازش ضرور تھی۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا۔ دراصل بیمہ کرنے والوں نے ایسوسی ایشن کے چلائے ہوئے نظام کی خوبیوں کو سمجھا اور یہ یقین کر لیا کہ اس طریقے سے کشتی اور اسکے افراد کی سلامتی یقینی ہے۔

اسلئے صاف اور سچے تجارتی اصولوں کی بنا پر انھوں نے یہ فیصلہ کیا تھا۔

اب باہری پائلٹوں کی جماعت میں آہ و بکا اور غم و غصہ کا اظہار ہونے لگا لیکن ابھی انکے لئے ایک راستہ کھلا تھا۔ اور اسی پر وہ گامزن ہوئے۔ اب وہ دو۲ دو۲ یا زیادہ تعداد میں بارہ بارہ ڈالر دیکر ایسوسی ایشن کے ممبر بننے کے لئے آنے لگے۔ لیکن یہ جان کر انھیں تعجب ہوا کہ ایسوسی ایشن کے آئین میں کئی نئے قوانین کا اضافہ ہو چکا تھا مثلاً ممبر بننے کی فیس اب بڑھا کر پچاس ڈالر کر دی گئی تھی۔ یہ رقم تو دینی ہی تھی اسکے علاوہ جب سے ایسوسی بنا تھا اسوقت سے ابتک پائلٹ سے ہر ماہ جو رقم پیدا کی تھی اسکا دسواں حصہ بھی ان پر واجب تھا۔ بہت سے پائلٹوں پر تین تین اور چار چار سو ڈالر واجب الادا تھے اور جبتک وہ کل پیسہ ادا نہ کرتے انکی ممبر بننے کی درخواست پر غور نہیں ہو سکتا تھا۔ اسکے علاوہ اگر کسی ایک ممبر نے امیدوار کے خلاف اپنا ووٹ دیدیا تو پھر اسکی درخواست ہی خارج کر دی جاتی تھی۔ ہر ممبر کو کسی گواہ کے سامنے خود ہاں یا نہیں میں ووٹ دینے کا اختیار تھا۔ اسلئے ایک امیدوار کی درخواست کو منظور ہوتے ہوتے کئی ہفتے لگ جاتے تھے کیونکہ بہت سے پائلٹ سفر پر باہر ہوتے تھے اور انکی آمد کا انتظار کیا جاتا تھا۔ پھر بھی منفعل قصوروار پائلٹ اپنی بچت کی رقم اکٹھی کر کے اور وہ تنگ کرنے ناخوشگوار طریقۂ عمل سے گذر کر ایسوسی ایشن میں داخل ہونے لگے۔ ایک ایسا وقت آ گیا کہ قریب بدس پائلٹ ہی ایسوسی ایشن سے باہر رہ گئے۔ انھوں نے یہ طے کیا کہ وہ عرضی دینے کے بدلے بھوکوں مرنا پسند کرینگے۔ وہ بہت عرصے تک بیکار رہے کیونکہ کوئی کپتان انھیں ملازمت دینے کی جرأت نہ کر سکا۔

رفتہ رفتہ ایسوسی ایشن نے یہ مشتہر کیا کہ ایک معینہ تاریخ سے پائلٹ کی تنخواہ پانچسو ڈالر ماہانہ کر دی جائے گی۔ ایسوسی ایشن کی جتنی شاخیں تھیں وہ بھی با اقتدار ہو چکی تھیں۔ بلکہ ریڈ ریور (Red River) والوں نے تو اس رقم سے بھی تجاوز کر کے پائلٹوں کی تنخواہ سات سو ڈالر ماہانہ مقرر کر دی تھی۔ با دل نا خواستہ باہر والے دس پائلٹ بھی یہ حالت دیکھکر ممبر بننے کو راضی ہو گئے اور انھوں نے اپنی عرضیاں بھی دیدیں۔ مگر اس اثناء میں ایک اور ضمنی قانون بن چکا تھا۔ وہ یہ کہ امیدوار کو دسواں حصہ نہ صرف اس رقم کا جو اس نے ایسوسی ایشن کے وجود میں آنے سے ابتک پیدا کی تھی بلکہ اس متصورہ رقم کا بھی جو وہ خالی وقت میں پیدا کرتا بالشرطیکہ وہ ناراض

ہو کر گھر نہ بیٹھ رہتا' دینا تھا۔ انکو ایسوسی ایشن میں لینا ایک بڑا مرحلہ تھا لیکن بالآخر یہ قضیہ کسی نہ کسی طرح طے ہو گیا اور انکو داخلہ مل گیا۔ انمیں سے جو سب سے زیادہ ضدی قسم کا قصوروار تھا وہ اسمیں اسوقت تک شامل نہ ہوا جبتک کہ اس پر چھ سو پچیس ڈالر واجب الادا نہ ہو گئے۔ اسکو یہ کل رقم اپنی مرضی کیساتھ بھیجنا پڑی۔ ایسوسی ایشن کا اب کافی پیسہ بینک میں اکٹھا ہو گیا تھا اور اب یہ ایک بڑی بااقتدار جماعت بن گئی تھی۔ اب ایک اور ضمنی قانون بنا دیا گیا۔ اور وہ یہ کہ پانچ سال تک کوئی اُمیدوار یا نائب پائلٹ نہیں رکھے جائیں گے نیز اس مدت کے بعد بھی ایک محدود تعداد ان ملازمین کی رکھی جائے گی جنکا تقرر کشتی کے مالکان نہیں بلکہ ایسوسی ایشن ہی کیا کرتی ہے اور وہ بھی ان شرائط پر کہ امیدوار اٹھارہ سال سے کم کا نہ ہو' معزز خاندان کا ہو اور اچھے چال چلن کا ہو' تعلیمی قابلیت کے اعتبار سے ایک مخصوص امتحان پاس ہو' امیدوار بننے کی مراعات حاصل کرنے کے لئے ایک ہزار ڈالر پیشگی فیس ادا کرے اور ایسوسی ایشن کے احکام پر عمل کرتا ہے جبتک کہ ممبروں کی نصف سے زیادہ اکثریت اسکی عرضی پر دستخط کر کے اسکے لئے پائلٹ کا لائسنس نہ دلوا دیں۔

پہلے سے جتنے اپرینٹس (امیدوار) جہازوں پر کام کرتے تھے انکو انکے مالکان کی ملازمت میں داخل کر لیا گیا اسکے پریذیڈینٹ (صدر) اور سکریٹری انکو حسب منشار کے کسی نہ کسی کشتی پر ملازمت کیلئے بھیجتے رہتے تھے۔ ہر چند اصولوں کے تحت انکو ایک کشتی سے دوسری کشتی میں تبدیل کرتے رہتے تھے۔ اگر کوئی پائلٹ یہ ثابت کر دیتا کہ اسکی صحت خراب ہے اور اسے مدد کی ضرورت ہے تو منہ کسی نہ کسی معاون کو اسکی مدد کیلئے بھیج دیا جاتا تھا۔

بیواؤں اور یتیموں کی تعداد بڑھنے لگی تھی کہیں ایسوسی ایشن کے ذرائع آمدنی بھی تو بڑھنے لگے تھے۔ ایسوسی ایشن مرحوم پائلٹوں کے دفن کے لئے پیسہ دیتی اور اسکے دفنانے کا کام بڑی شان وشوکت سے کیا جاتا۔ اگر ضرورت ہوتی تو یہ اپنے ممبروں کو دریا کے بہاؤ کی طرف ان پائلٹ بھائیوں کی لاشوں کو کھوجنے کے لئے بھی بھیجتی جو کشتی کے کسی حادثے میں کام آچکے تھے۔ اسطرح کی کھوج میں کبھی کبھی ایک ایک ہزار ڈالر تک خرچ ہو جایا کرتے تھے۔

ایسوسی ایشن نے ایک فرمان بھی حاصل کر لیا تھا' جسکی رو سے اب اس نے بیمہ کرانے کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ اس نے صرف ممبروں کی زندگیوں کا ہی بیمہ نہیں کیا بلکہ دخانی

کشتیوں کو نقصان سے محفوظ رکھنے کے لئے انکا بھی بیمہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ ادارہ اب لاثانی سمجھا جانے لگا۔

یہ دنیا میں سب سے زیادہ طاقتور قسم کا ادارہ تھا۔ جسے حق تجارت بلا شرکت غیرے حاصل تھا۔ امریکہ کے قانون کے مطابق جبتک دو سند یافتہ پائلٹ کسی امیدوار کی لیاقت کی تصدیق نہ کر دیتے تھے اسوقت تک وہ پائلٹ نہیں بن سکتا تھا اور اب ایسوسی ایشن کے باہر کوئی ایسا قابل پائلٹ نہ رہ گیا تھا جو اس تصدیق کے کام کو کر سکے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پائلٹ بنانے کا کام ختم ہو گیا۔ ہر سال کچھ پائلٹ مر جاتے اور کچھ سن رسیدگی اور ضعیفی کے باعث بیکار ہو جاتے اور انکی جگہ لینے کے لئے نئے پائلٹ نہ ملتے۔ ایسی حالت میں جبکہ ایسوسی ایشن کو یہ اختیار تھا کہ پائلٹ کی تنخواہ جتنی چاہے کر دے۔ جبتک وہ اس حد تک اجرتیں نہ بڑھا دیتی کہ قومی حکومت ناراض ہو کر لائیسنس دینے کا طریقہ ہی بدل دے، کشتیوں کے مالکان کیلئے اسکے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ایسوسی ایشن کے آگے سر خم کر دیں۔

ایسوسی ایشن کے مطلق العنان ہونیکے راستے میں اگر کوئی رکاوٹ تھی تو وہ صرف مالکان کشتی اور کپتان لوگ تھے اور بالآخر یہ رکاوٹ بھی ہٹ گئی۔ غالباً آپ کو یقین نہ آئے گا کہ مالکان اور کپتانوں نے دیدہ و دانستہ خود اپنے کو ہٹا لیا۔ جب پائلٹوں کی ایسوسی ایشن نے مہینوں پہلے یہ اعلان کیا کہ یکم ستمبر ۱۸۶۱ء کو پائلٹوں کی تنخواہ پانچسو ڈالر ماہانہ ہو جائیگی تو مالکان اور کپتانوں نے مال کے کرایہ پر چند سینٹ بڑھا لئے اور دریا کے رہنے والے کسانوں کو کرایہ بڑھانے کی وجہ بتاتے ہوئے انکی توجہ پائلٹوں کی بڑھی ہوئی تنخواہوں کی طرف مبذول کی اگرچہ انکی بتائی ہوئی وجہ ناکافی تھی، پھر بھی کسانوں نے اس پر کوئی غور نہ کیا اور وہ مان گئے کہ ان حالات میں ایک بشل غلہ پر صرف پانچ سینٹ کرایہ بڑھانا نامناسب نہیں ہے۔ انکی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ چالیس ہزار بوروں پر جو کرایہ بڑھایا گیا تھا وہ پائلٹوں کی نئی تنخواہوں کے بوجھ کو پورا کرنے سے بھی کہیں زیادہ اور غیر ضروری تھا۔

اسلئے اب فوراً ہی کپتانوں اور مالکوں نے اپنی ایسوسی ایشن بنالی اور کپتان کی تنخواہ بھی پانچسو ڈالر کر دی گئی۔ علاوہ ازیں سامان کے محصول میں اور اضافہ کرنے کی کوشش کی۔ یہ

ایک انوکھا خیال تھا لیکن جو اثر ایک مرتبہ پیدا کیا جا چکا تھا وہ دوبارہ بھی ہو سکتا تھا۔ سب پائلٹوں کے ایسوسی ایشن میں شامل ہونے سے پہلے اس نے یہ اعلان کیا تھا کہ اگر کوئی کپتان کسی باہر والے پائلٹ کو ملازم رکھے گا تو اسے مجبور کیا جائے گا کہ وہ اس پائلٹ کو نکال دے اور پانچسو ڈالر جرمانہ ادا کرے۔ جبتک کپتانوں کی ایسوسی ایشن اتنی طاقتور نہ ہوگی کہ وہ اپنے ممبروں پر قابو پا سکے تب تک پائلٹوں کی ایسوسی ایشن بڑے بڑے جرمانے وصول کرتی رہی۔ کپتانوں کی جماعت کو بعد میں بھی کوئی خاص کامیابی نہ ہو سکی۔ انھوں نے پائلٹوں سے یہ بات منوانے کی کوشش کی کہ ایسوسی ایشن کا کوئی بھی پائلٹ کسی ایسے کپتان کے ماتحت ملازمت نہ کرے جو کپتانوں کی ایسوسی ایشن کا ممبر نہ ہو لیکن پائلٹ اس پر راضی نہ ہوئے۔ وہ سمجھ گئے کہ اس سے کپتان اور بیمہ کمپنی والے انکے معاملات میں دخل دیا کرینگے اسلئے انھوں نے عقلمندی...... سے کام لیتے ہوئے بلاوجہ اپنے آپ کو دوسری جماعتوں کے چنگل میں نہیں پھنسلیا۔

جیسا کہ میں آپ کو یاد دلا چکا ہوں، پائلٹوں کی ایسوسی ایشن دنیا میں سب سے زیادہ مستحکم ادارہ تھا جو لافانی معلوم ہوتا تھا۔ لیکن آخر اسکی شان و شوکت کے دن بھی ختم ہو گئے۔ اسکی کئی وجوہات تھیں۔ پہلی وجہ تو یہ تھی ایک ریل کی سڑک مسیسپی، ٹینیسی اور کینٹکی سے شمالی ریلوے جنکشنوں تک نکال دی گئی اور اسکی وجہ سے مسافر دخانی کشتیاں چھوڑ کر ادھر آنکلے۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ جنگِ عظیم چھڑ گئی اور جنگ کے دوران میں دخانی کشتیوں کا روزگار ختم ہو گیا۔ بہت سے پائلٹ بیکار ہو گئے۔ ادھر ضروریاتِ زندگی مہنگی ہوتی جا رہی تھیں، اسی زمانے میں سینٹ لوئی ایسوسی ایشن کا خزانچی خزانے سے کل رقم لیکر فرار ہو گیا۔ پھر جب ہر جگہ ریلوں کی سڑکیں تیار ہونے لگیں، تو اسٹیمروں کی ضرورت ہی نہ رہی۔ جب جنگ ختم ہوئی اور صرف سامان ڈھونے کا کام رہ گیا تو اٹلانٹک ساحل کے کچھ عقلمند... لوگوں نے ایک تجویز رکھی اور وہ یہ کہ ایک درجن اسٹیمروں کا سامان نیو آرلینز تک ایک چھوٹی سی کشتی جسے ٹگ بوٹ کہتے تھے کے ذریعہ کیوں نہ ڈھویا جائے۔ پھر زمانے نے ایسا پلٹا کھایا کہ پائلٹ ایسوسی ایشن اور علمِ جہاز رانی زمانۂ قدیم کی حسرت انگیز باتیں بن کر رہ گئیں۔

سولہواں باب

کشتیوں کی دوڑ کا زمانہ

یہ عام رواج سا ہو گیا تھا کہ نیو آرلینز سے کشتیاں ہمیشہ چار اور پانچ بجے کے درمیان سہ پہر کو روانہ ہوتی تھیں تین بجے کے بعد ملاح رال اور بیروزہ جلانے لگتے جو سفر کی تیاری کی علامت تھی۔ دھوئیں کے دو تین میل لمبے سیاہ بادل بڑا دلکش منظر پیدا کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دھوئیں کے کھمبے اور دھوئیں کی چھت ایک ہو کر سارے شہر پر چھا گئے ہیں۔ ہر باہر جانے والی کشتی کے جیک اسٹاف (جھنڈے کا بانس) پر اسکا جھنڈا لہرایا کرتا تھا کشتی کے پچھلے حصے پر ایک دوسرا جھنڈا بھی لہرایا کرتا تھا۔ دو تین میل نائب کپتانوں کو حکم کی بڑی پابندی کرنی پڑتی تھی اور انھیں حلف وفاداری بھی بڑے شد و مد سے اٹھانا پڑتا تھا۔ سامان سے بھرے ہوئے لاتعداد پیپے اور صندوق ڈھیرے ڈھیرے پشتوں کے قریب چکر لگاتے رہتے تھے اور کشتی کے تختوں کی طرف آجاتے تھے۔ اندھیرے سے گھبرے ہوئے مسافران چیزوں کی ضرب سے بچنے کی کوشش کرتے اور اچھل کر ایک طرف ہٹ جاتے اور پائلٹوں کے کمروں کی طرف دوڑتے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ پائلٹوں اور دوسرے افسران کے رہنے کی جگہ محفوظ ہوتی ہے گو کہ اس بارے میں بھی انھیں کبھی کبھی شبہ ہونے لگتا تھا چابی دار بٹوے اور کاغذ کے ڈبے لئے ہوئے عورتیں سامان ڈھونے کے کام میں اپنے خاوندوں کا جو قالینوں کے پلندے اور روتے ہوئے بچوں کو اٹھائے ہوتے تھے ہاتھ بٹاتی تھیں لیکن آندھی اور طوفان کی سی گرج اور ہر طرف افراتفری سے لوگوں کو پریشان دیکھ کر وہ گھبرا جاتی تھیں۔ اسباب کے ٹھیلے اور گاڑیاں جلدی میں ادھر سے ادھر دوڑتی نظر آتی تھیں اور انکی کھڑکھڑاہٹ جہاں تہاں سنائی دیتی تھی۔ کبھی کبھی یہ گاڑیاں ایک جگہ اکٹھی ہو کر رک بھی جاتی تھیں۔ اس گڑبڑ کی وجہ سے دس سیکنڈ تک یا تو وہ دکھائی

ہی نہیں دیتی تھیں یا بہت مبہم سی نظر آتی تھیں ۔ دخانی کشتیوں کی بھی ایک لمبی سی قطار بنجاتی تھی ۔ ہر کشتی کے اگلے عرشے پر بوجھ اٹھانے والی مشین لگی ہوتی تھی ۔ جب یہ مشینیں وزن اٹھا اٹھا کر نیچے عرشے پر رکھتی تھیں تو اتنا شور ہوتا تھا کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگتے تھے ۔ پسینے سے نہاتے ہوئے نیم برہنہ حبشی ملاح جو ان مشینوں کو چلاتے تھے دہاڑ دہاڑ کر یہ گانا گاتے رہتے "ڈی لاس سیک، ڈی لاس سیک" اس شور و غوغہ سے انھیں جو خوشی ہوتی تھی وہ بعید از قیاس ہے ۔ وہ جوش میں بھرے ہوتے اور کام کرتے رہتے جبکہ اور ہر شخص اس سے پاگل ہو رہا ہوتا پھر ہر کین اور ہوائے طرز دونوں عرشوں پر حبشی مسافروں کی بھیڑ جمع ہو جاتی اور تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی ۔ پھر آخری گھنٹی بجتی اور سب اپنی اپنی جگہ چلے جاتے ۔ مجمع اب پہلے سے دُگنا ہو جاتا ۔ ایک یا دو لمحوں میں آخری مرتبہ سب مسافروں کو آگاہ کیا جاتا کہ اسٹیمر چھوٹ رہا ہے اور تبھی بڑے بڑے چینی گھنٹوں کی آوازیں آتیں اور کوئی چلا کر کہتا "جو لوگ نہیں جا رہے وہ کنارے کی طرف ہٹ جائیں" ۔ مجمع اب چوگنا ہو جاتا ۔ باقی لوگ ساحل پر جمع ہونے لگتے ۔ ان لوگوں میں سے جو جہاز پر چڑھنے کی کوشش کرتے ہوتے بہت سے گر جانے لگے جاتے ۔ فوراً ہی اسٹیج کے تختوں کی بھی ایک لمبی قطار کشتی میں چڑھائی جاتی ۔ پرانے دستور کے مطابق ہر تختے کے سرے پر ایک مسافر بیٹھتا دیر میں آنیوالے مسافر گھبراہٹ میں اپنے دانتوں، ناخنوں اور ہر چیز کا سہارا لے کر تختوں پر چڑھ بیٹھتے ۔ پس و پیش کرنیوالے مسافر گھبرا کر کنارے کی طرف چھلانگ لگاتے اور سر کے بل گرتے ۔

اب کشتیاں پیچھے کی طرف دھارا میں پھسلنے لگتی ہیں اور ان کا اور دوسری دخانی کشتیوں کا درمیانی فاصلہ بڑھنے لگتا ہے ۔ لوگ نہ جانے والی کشتیوں کے اوپر چڑھ جاتے ہیں تاکہ جاتی ہوئی کشتیوں کا نظارہ کر سکیں ۔ یکے بعد دیگرے دخانی کشتیاں سیدھی پانی میں پھسلنے لگتی ہیں ۔ ہر کشتی جھولتی ہوئی آتی ہے کیونکہ شروع شروع میں بھاپ کا زور بہت ہوتا ہے ۔ ہر کشتی میں اسکا جھنڈا لہراتا ہے کالا کالا دھواں اوپر اٹھ رہا ہے اور کشتی کے اگلے حصے میں فائرمین اور ڈیک پر کام کرنیوالے کارکن (جو عموماً حبشی ہوتے ہیں) اکٹھے ہو جاتے ہیں ۔ سب سے اچھی آواز تیج میں کھڑے ہوئے ایک شخص کی معلوم ہوتی ہے جو لنگر کی چرخی پر کھڑا اپنا ٹوپ یا جھنڈا ہلا رہا ہے ۔ سب لوگ مل کر اونچی آواز میں کچھ گا رہے ہیں ۔ ساحل پر کھڑے لوگ جانے والوں کو الوداع

کہنے کیلئے بندوقیں داغ رہے ہیں۔ ہزاروں تماش بین اپنے ٹوپ ہلا رہے ہیں اور مرحبا کے نعرے لگا رہے ہیں۔ یکے بعد دیگرے جہاز قطار میں آجاتے ہیں اور یہ شاندار جلوس دریا کے چڑھاؤ کی طرف پانی میں پھسلتا ہوا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پرندوں کے غول اڑ رہے ہوں۔

پرانے زمانے میں جب دو تیز رفتار کشتیاں مقابلے کی دوڑ کیلئے روانہ ہوتی تھیں اور لوگوں کا ہجوم انھیں دیکھتا ہوتا تھا تو ملاحوں کو دیکھکر لوگوں کے دلوں میں بڑا جوش آتا تھا۔ یہ نظارہ شام کے وقت خصوصاً اچھا لگتا تھا جبکہ ملاحوں کے کمروں میں ٹارچوں کی لال روشنی ہوتی تھی۔

حاکموں کو کشتیوں کی دوڑ دیکھنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ پبلک کا تو خیال تھا کہ کشتیوں کی دوڑ خطرناک ہوتی ہے، مگر جب یہ قانون بن گیا کہ فی مربع انچ کتنے مکعب انچ بھاپ بھری جائے تو خطرے کا کوئی اندیشہ نہ رہا جب کسی انجینیر کا دل ریس میں لگا ہوتو اُسے نیند نہیں آسکتی اور وہ ہمیشہ چوکنا رہتا ہے اور ہمیشہ گیج کاک یا دوسری چیزوں کو دیکھتا رہتا ہے کہ آیا وہ ٹھیک کام کر رہی ہیں یا نہیں۔ اس کے برعکس خطرہ تو ان کشتیوں کو ہوتا تھا جو آہستہ آہستہ اور مشکل سے چلتی تھیں اور جہاں انجینیر بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگتے تھے یا بوائلر سے پانی کا نکاس بند کر دیتے تھے۔

دخانی کشتیوں کے عروج کے زمانے میں دو مشہور تیز رفتار کشتیوں کی دوڑ کا واقعہ بڑا دلچسپ اور اہم سمجھا جاتا تھا۔ کئی ہفتوں پہلے اس دوڑ کی تاریخ مقرر کر دی جاتی تھی اور اسی وقت سے مسیسپی کی ساری وادی میں چہل پہل اور رونق ہو جاتی تھی۔ سیاسی معاملات اور موسم کے چرچے بند ہو جاتے تھے اور لوگ صرف آنے والی دھند کا ذکر کیا کرتے تھے۔ جیسے جیسے وقت نزدیک آتا دوڑ میں شریک ہونیوالی دونوں کشتیاں خالی کرا کے دوڑ کیلئے تیار کی جاتیں ہر اُس چیز کو جس سے کشتی کے وزن میں اضافہ ہو سکتا تھا یا جس کی وجہ سے کشتی پر پانی یا ہوا کا دباؤ بڑھنے کا اندیشہ ہوتا ہٹا دیا جاتا تھا بشرطیکہ کشتی کو اس چیز کی ضرورت نہ ہو۔ مستول اور اُسے سہارا دینے والی مشینیں بھی ساحل پر پھینک دی جاتیں۔ اگر اتفاق سے کشتی دریا کی تہ میں پھنس جاتی تو اسے اٹھانے کیلئے بھی کوئی چیز کشتی میں نہیں ہوتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ بہت سال پہلے جب مشہور و معروف جہاز ایکلپس اور اے۔ ایل شاٹ ویل لمبی دوڑ پر گئے تو اور وزن کم کرنے کیلئے ایکلپس کی چمنیوں کے درمیان جو خوبصورت مرصع کاری ہوئی تھی۔ اُسے کھرچ دیا گیا۔ کپتان نے اپنے بکری کی کھال کے دستانے اتار دیئے اور سر کے بال منڈوا دیئے۔ لیکن

رفتار تھی کہ جب یہ میڈ بوٹ کے موڑ پر دھنس گئی تو اس وقت تک مالکوں کو اسکی کوئی اطلاع ملے ہوئے پانچ برس گزر چکے تھے۔ اس واقعہ پر مجھے حیرت ہوئی مگر کچھ بھی ہو تحریر مطابق ایسا ہی ہے۔ یہ جہاز بہت ہی سست رفتار تھا پھر بھی کبھی کبھی جب دوڑیں ہوتیں تو بڑا مزہ آتا۔ جنگلوں بہتے ہوئے پیڑوں کے تنوں اور دوسری چیزوں کا نظارہ بڑا پر لطف لگتا۔ ہمارا ایک سفر تو بہت ہی دلچسپ رہا۔ ہم سینٹ لوئی سولہ دن میں پہنچ گئے۔ لیکن اس بے تحاشہ دوڑ کے باوجود بھی میرا خیال ہے کہ ہم نے فورٹ ایڈمس تک پہونچنے میں جو صرف پانچ میل کا فاصلہ ہے تین مرتبہ پہرے بدلے۔ یہ فاصلہ ایک پیچ کی شکل میں ہے دریا کا ایک سیدھا حصہ یا ٹکڑا ہوتا ہے۔ اس جگہ دریا کا بہاؤ بڑا خوبصورت لگتا ہے۔

نیو آرلینز سے گرانڈ گلف تک کا سفر ہم نے چار دن میں طے کیا۔ کل فاصلہ ۵۴۴۳ میل کا تھا ایکلپس اور شاٹ ویل نے یہ سفر صرف ایک دن میں طے کر لیا تھا۔ ۳۴ چیوٹے بس (۷۰۰ میل کا فاصلہ) ہمیں نو دن لگے جبکہ ایکلپس اور شاٹ ویل دو دن میں پہنچ گئے۔ قریب ایک صدی پہلے ایک کشتی جس کا نام جے۔ ایم۔ وہائٹ تھا نیو آرلینز سے کیرو تک تین دن ۶ گھنٹے اور ۴۴ منٹ میں پہونچی۔ سنہ ۱۸۵۲ء میں ایکلپس نے یہی سفر تین دن ۳ گھنٹے اور ۲۰ منٹ میں طے کیا تھا۔ سنہ ۱۸۷۰ء میں آر۔ ای۔ لی نے یہ سفر ۳ دن اور ایک گھنٹہ میں کیا۔ ریکارڈ کے حساب سے سفر سب سے تیز رفتار سمجھا جاتا ہے۔ مگر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کہ ایسا نہیں تھا۔ کیونکہ نیو آرلینز اور کیرو کے بیچ کا فاصلہ جب جے۔ ایم۔ وہائٹ نے سفر کیا تھا گیارہ سو چھ میل کا تھا۔ اسلئے جہاز کی رفتار اوسطاً چودہ میل سے کچھ زیادہ تھی اور جس زمانے میں ایکلپس نے سفر کیا تھا اسوقت ان دونوں بندرگاہوں کے بیچ کا فاصلہ کم ہو کر ایک ہزار اسی میل رہ گیا تھا لہٰذا جہاز کی اوسط رفتار قریب ۱۴ ۳/۸ میل فی گھنٹہ ہوگی اور آر۔ ای۔ لی - - - - - - - کے سفر کے دوران یہ فاصلہ اور بھی کم ہو کر ایک ہزار تیس میل رہ گیا تھا۔ اسلئے اسکی اوسط چال ۱۴ ۱/۸ میل فی گھنٹہ ہوگی۔ اسلئے سب سے زیادہ تیز رفتار جہاز ایکلپس کو سمجھا جانا چاہئے

کچھ مشہور سفروں کے اعداد و شمار

(کموڈور رالنگ پی کی جنتری سے)

نیو آرلینز سے قاہرہ تک۔ ۱۰۲۴ میل

		دن	گھنٹے	منٹ
۱۸۴۴ء	جے۔ایم۔ وہائٹ نے سفر طے کیا	۳	۶	۴۴
۱۸۵۲ء	رین ڈیر 〃 〃	۳	۱۲	۲۰
۱۸۵۳ء	ایکلپس 〃 〃	۳	۴	۴
۱۸۵۳ء	اے۔ایل۔شاٹ ویل 〃 〃	۳	۳	۴۰
۱۸۶۹ء	ڈیکسٹر 〃 〃	۳	۶	۲۰
۱۸۷۰ء	نیچیز 〃 〃	۳	۴	۳۴
۱۸۸۰ء	آر۔ای۔لی 〃	۳	۱	۰

نیو آرلینز سے لوئس ویلے تک۔ ۱۴۴۴ میل

		دن	گھنٹے	منٹ
۱۸۱۵	ایٹرپرائز نے فاصلہ طے کیا	۲۵	۲	۴۰
۱۸۱۷ء	واشنگٹن 〃	۲۵	۰	۰
۱۸۱۷ء	شیلبی 〃	۲۰	۴	۱۰
۱۸۱۹ء	پیراگن 〃	۱۸	۱۰	۰
۱۸۲۸	ٹیکومیش 〃	۸	۴	۰
۱۸۳۴ء	ٹسکیرورا 〃	۷	۱۶	۰
۱۸۳۷ء	جنرل براؤن 〃	۶	۲۳	۰
۱۸۳۷ء	رین ڈوار 〃	۶	۲۲	۰
۱۸۳۷ء	ایمپریس 〃	۶	۱۷	۰
۱۸۳۷ء	سلطانہ 〃	۶	۱۵	۰
۱۸۴۰ء	ایڈ شیپن 〃	۵	۱۴	۰

۱۸۱۲۔ بیلے آف دی ویسٹ	۰	۶	۱۴۔	۰
۱۸۴۳۔ ڈیوک آف آرلینز	۰۰	۵	۲۳۔	۰
۱۸۴۴۔ سلطانہ	۰	۵	۱۲۔	۰
۱۸۵۱۔ بوستانہ	۰	۵	۸	۰
۱۸۵۳۔ بیلے کی	۰	۴	۲۳۔	۰
۱۸۵۲۔ رین ڈیر	۰	۴	۲۰۔	۴۵
۱۸۵۲۔ ایکلپس		۴	۱۹۔	۰
۱۸۵۳۔ اے۔ ای۔ شاٹ ویل	،	۴	۱۰۔	۲۰
۱۸۵۳۔ ایکلپس	۰	۴	۹۔	۳۰

نیو آرلینز سے ڈونالڈسن ولے۔ ۷۸ میل

	گھنٹہ۔	منٹ۔	سیکنڈ
۱۸۱۲۔ اے۔ ای۔ شاٹ ویل نے سفر طے کیا		۵۔	۴۲۔
۱۸۵۲۔ ایکلپس ،،	،،	۵۔	۴۲۔
۱۸۵۴۔ سلطانہ ،،	،،	۵۔	۱۲۔
۱۸۵۶۔ پرنسس ،،	،،	۴۔	۵۱
۱۸۶۰۔ اطلانٹک ،،	،،	۵۔	۱۱
۱۸۶۰۔ جنرل کوئٹ مین ،،	،،	۵۔	۶
۱۸۶۵۔ روبحد ،،	،،	۴۔	۴۳
۱۸۷۰۔ آر۔ ای۔ لی ،،	،،	۴۔	۵۹

نیو آرلینز سے سینٹ لوئی تک۔ ۱۲۱۸ میل

	دن	گھنٹہ	منٹ
۱۸۴۴۔ جے۔ ایم وہائٹ نے سفر طے کیا	۳۔	۲۲ -	۹
۱۸۴۹۔ مسوری	۳۔	۱۹۔	
۱۸۶۹۔ ڈیکسٹر	۴۔	۹۔	

سال		دن	گھنٹہ	منٹ
۱۸۷۰	نیچز	۳	۲۱	۵۷
۱۸۷۰	آر۔ ای۔ لی ۔	۳	۱۸	۱۴

لوئس ویلے سے سنسناٹی تک ۔ ۱۴۱ میل

سال		دن	گھنٹہ	منٹ
۱۸۱۹	جنرل پائک نے سفر طے کیا	۱	۱۶	۰
۱۸۱۹	پیراگن ″	۱	۱۴	۲۰
۱۸۲۲	وھیلنگ پیکٹ ″	۱	۱۰	۰
۱۸۳۷	موسیلے ″	۰	۱۲	۰

سال			دن	گھنٹہ	منٹ
۱۸۴۳	ڈیوک آف آرلینز نے سفر طے کیا			۱۲	
۱۸۴۴	کانگریس	″	۔	۱۲	۲۰
۱۸۴۶	بین فرینکلن نمبر ۶	″	۔	۱۱	۴۵
۱۸۵۲	ایلیگینی	″	۰	۱۰	۳۸
۱۸۵۲	پٹس برگ	″	۔	۱۰	۲۳
۱۸۵۳	ٹیلی گراف نمبر ۳	″	۔	۹	۵۲

لوئی ویلے سے سینٹ لوئی تک ۷۵۰ میل

سال		دن	گھنٹہ	منٹ
۱۸۴۴	کانگریس نے فاصلہ طے کیا	۲	۱	۰
۱۸۵۴	پائک ″ ″ ″	۱	۲۲	۰
۱۸۵۴	ناردرنر ″ ″ ″	۱	۲۲	۲۰
۱۸۵۵	سدرنر ″ ″ ″	۱	۱۹	۰

سنسناٹی سے پٹس برگ تک ۴۹۰ میل

سال		دن	گھنٹہ	منٹ
۱۸۵۰	ٹیلی گراف نمبر ۲ نے فاصلہ طے کیا	۱	۱۷	

		دن	گھنٹہ	منٹ
۱۸۵۱	بیکیج اسپیٹ	۱	۱۶	۰
۱۸۵۲	... ینگ ,, ,,	۱	۱۵	۰

سینٹ لوئی سے انٹن تک ۔ ۳۰ میل

		دن	گھنٹہ	منٹ
۱۸۵۳	لٹونا نے فاصلہ طے کیا	۱	۳۵	۰
۱۸۶۹	ٹولڈن ایگل	۱	۳۷	۰
۱۸۶۹	ور ایگل	۱	۳۷	۰

متفرق اعداد و شمار

جون ۱۸۵۹ میں سینٹ لوئی کیوکک پیکٹ سٹی آف لوئیانہ نے لوئی سے کیوکک تک کا سفر (جو ۲۱۴ میل کا فاصلہ ہے) ۱۶ گھنٹے اور ۲۰ منٹ میں طے کیا۔ ریکارڈ کے اعتبار سے یہ بہترین رفتار ہے۔

۱۸۶۸ اسٹیمر مسمی ہاکیٹی نے سٹیٹ نے جو نار تھ لائن کمپنی سے متعلق ہے سینٹ لوئی سے سینٹ پال تک کا فاصلہ جو ۸۰۰ میل ہے دو دن اور بیس ۲/۱ گھنٹوں میں طے کیا۔ یہ جہاز رفتار میں ابتک کسی جہاز سے نہیں ہارا۔

۱۸۵۳ میں سٹیمر پولر اسٹار نے سینٹ لوئی سے سینٹ جوزف تک مسوری دریا میں ۶۴ گھنٹے سفر کیا۔

جولائی ۱۸۵۶ میں سٹیمر جیمس۔ ایچ لوکس اینڈی واٹن لینڈ اسی فاصلے کو ۶۰ گھنٹے ۵۷ منٹ میں طے کیا۔ دونوں بندرگاہوں کے بیچ کا فاصلہ ۶۰۰ میل ہے۔ اور جب مسوری کی طوفانی حالت میں پیش آنیوالی دقتوں کا خیال کیا جاتا ہے تو لوکس کا یہ کارنامہ قابل تحسین معلوم ہوتا ہے۔

۱۸۷۰ میں نیو آرلینز سے سینٹ لوئی تک کا جو فاصلہ آر۔ ای۔ لی نے نیچز کیساتھ مشہور روڈ میں طے کیا وہ سب سے اچھی دوڑ کی ایک تاریخی شہادت ہے۔ اور چونکہ اس دوڑ سے ساری قوم کی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اس لئے یہاں اس جہاز کے ایک بندرگاہ سے دوسرے بندرگاہ تک پہونچنے کا وقت بالتفصیل دیا جاتا ہے:۔

نیو آرلینز سے بروز جمعرات مورخہ ۳۰ جون ۱۸۷۰ کو سہ پہر کو ۴ بجکر ۵۵ منٹ پر روانہ ہوا اور

	دن	گھنٹے	منٹ
کیرولٹن پہونچا	–	–	۲۷ ۱/۲
ہیری ہل	–	۱	۰ ۱/۲

منٹ	گھنٹہ	دن		
۳۹	۱	-	۔	ریڈ چرچ
۳۸	۲	-	،،	بون کنیر سے
۵۰	۳	-	،،	سائیج پوائنٹ
۵۹	۴	-	۔	ڈونالڈس دے
۵½	۷	-	،،	پےکو یامنی
۲۵	۸	-	،،	ہیلٹو روچ
۲۶	۱۰	-	،،	بیبو سارا
۵۶	۱۲	-	،،	ریڈ رور
۵۶	۱۳	-	،،	اسٹیپس
۵½	۱۵	-	،،	برائی ایرہ
۲۹	۱۶	-	،،	ہنڈرسر
۱۱	۱۷	-	،،	نیپیئر
۵۳	۱۸	-	،،	کونز کریک
۲۱	۱۹	-	،،	دام پوٹ
۴۵	۲۰	-	،،	روڈنی
۲	۲۱	-	۔	سینٹ جوزف
۶	۲۲	-	۔	گراونڈ کلف
۱۸	۲۳	-		ارڈٹائی
۰	۰	۱		اون ائل باد وار نشی
۳۸	۰	۱		وکربرگ
۳۷	۲	۱		ملکنبرہ جنڈ
۴۸	۳	۱		بیبٹر
۴۷	۵	۱		ایک سیرا وپڈ مینس

گرینل دے	۱	۱۰	۵۵
نیپولین	۱	۱۶ ۔	۲۲
	دن	گھنٹہ	منٹ
وہائٹ ریور پہنچا	۱ ۔	۱۶ ۔	۵۶
اسٹریلیا	۱ ۔	۱۹ ۔	۰
ہیلینا	۱ ۔	۲۳ ۔	۲۵
ہلف آئل بلو سینٹ فرانسس	۲ ۔	۰ ۔	۰
میمفس	۲ ۔	۶ ۔	۹
فٹ آف آئی لینڈ ۳۷	۲ ۔	۹ ۔	۰
فٹ آف آئی لینڈ ۲۶	۲ ۔	۱۳ ۔	۳۰
ٹاوہیڈ ۲۶	۲ ۔	۱۷ ۔	۲۳
نیومیڈرڈ	۲ ۔	۹ ۔	۵۰
ڈرائی بار ۱	۲ ۔	۲۰ ۔	۳۷
فٹ آف آئی لینڈ ۸	۲ ۔	۲۱ ۔	۲۵
اپرٹاوہیڈ ۔ لوکس بینڈ	۳ ۔	۰ ۔	۰
کیرو	۳ ۔	۱	
سینٹ لوئی	۳ ۔	۱۸ ۔	۱۴

جہاز "لی" سینٹ لوئی ۴ جولائی ۱۸۷۰ء کو دن کے ۱۱ بجکر ۲۵ منٹ پر پہنچا۔ یہ جہاز "نیچز" سے ۱ گھنٹے ۴۴ منٹ پہلے آگیا۔ نیچز کے افسران نے یہ دعوٰی کیا کہ ان کے دیر سے آنے کی وجہ یہ تھی کہ ان کے جہاز کو ۷ گھنٹے اور ۱ منٹ کہرے اور مشین کی مرمت کی وجہ سے راستے میں رکنا پڑا۔ آر۔ ای۔ لی جہاز میں کپتان جون۔ ڈبلو۔ کینن صاحب تعینات تھے اور "نیچز" کپتان تھومس پی لتھرس جو جنوب کے پرانے جہازراں مانے جاتے تھے، کے اختیار میں تھا۔

سترھواں باب

دریا کا کٹاؤ اور اسٹیفن صاحب کی داستان

ان بے تعلق تفصیلات کی بھی ایک اہمیت ہے۔ ان سے ہمیں مسوری کی ایک قدیم خصوصیت کا پتہ لگتا ہے اور وہ یہ کہ یہ دریا وقتاً فوقتاً اپنی لمبائی مختصر کرتا رہتا ہے۔ اگر آپ ایک لمبا لچکیلا سیب کا چھلکا اپنے کندھے پر رکھ لیں تو اس کی شکل قریب قریب ایسی ہی بن جائے گی جیسی کہ دریائے مسسپی کے کسی حصے کی ہے۔ مثلاً کیرو سے الی نوائے تک جنوب میں نیو آرلینز کی طرف والے حصے کی شکل اس سے مشابہ ہو گی۔ کیونکہ سیب کے لچکیلے چھلکے کی طرح یہ حصہ بھی بہت ٹیڑھا میڑھا ہے اس دریا میں صرف کہیں کہیں اور وہ بھی خاصے وقفے کے بعد کچھ سیدھا راستہ ملتا ہے۔ البتہ کیرو سے شمال کی طرف سینٹ۔ لوئیس تک کا راستہ ٹیڑھا نہیں ہے کیونکہ یہاں زمین پتھریلی ہے اور دریا بہت کٹاؤ نہیں بنا سکا۔

دریائے مسسپی کے جنوبی حصے میں دھارے نے سیلابی کناروں کو اتنا گہرا کاٹ دیا ہے کہ وہاں گھوڑے کی سُموں جیسے خم ہو گئے ہیں واقعی یہاں کٹاؤ اتنا خمدار ہے کہ کچھ جگہوں پر اگر آپکو ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر جانا ہو تو دوسرے کنارے پر پہنچنے کیلئے صرف آدھا یا پون میل چلنا پڑے گا اور جب تک آپ کا جہاز دس میل کی رفتار سے سارے خمدار راستے کو طے کر کے اسی مقام پر پہنچیگا جہاں آپ پہنچے تو اس وقت تک آپ دو گھنٹے آرام بھی کر چکے ہوں گے۔ جب دریا میں پانی بڑی تیزی سے چڑھ رہا ہو تو کوئی بدمعاش جس کا باغ کنارے کے عقبی حصے میں ہو اور پانی دور ہونے کی وجہ سے تر و تازہ نہ ہو، شرارت کر کے اس دریا سے فائدہ اٹھا سکتا ہے وہ اس طرح کہ وہ رات کے وقت ندی کے خمدار راستے کے سب سے تنگ حصے کو کاٹ

دیگا یعنی وہاں کھائی کھود دے گا اور پانی کے راستے کو ایکدم چھوٹا کر دیگا۔ دریا کا پانی ایکدم اس کھائی میں بھرنے لگے گا۔ اس بدمعاش کا باغ تو پانی کے کنارے پر ہو جائے گا اور اسکی قیمت پہلے سے چوگنی ہو جائے گی۔ جبکہ کسی دوسرے کا باغ جو ابتک دریا کے کنارے تھا اب دریا کے نئے راستے سے دُور ہو جائیگا اور یوں لگے گا جیسے وہ کسی بڑے سے جزیرے پر واقع ہو۔ کیونکہ اب دریا کے پرانے راستے میں جو باغ کے پاس تھا پانی پایاب ہو جائیگا اور اس میں کم از کم دس میل تک کشتیاں نہیں چل سکیں گی اور اس باغ کی قیمت پہلے کے مقابلے میں چوتھائی رہ جائیگی اس لئے ضرورت کیوقت ایسے راستوں پر پہرے بٹھا دئے جاتے ہیں اور اگر کسی آدمی کو کھائی کھودتے پکڑ لیا جاتا ہے تو اسکو ایسی سزا ملتی ہے کہ آئندہ وہ یہ کام کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اب ذرا اس کھائی کھودنے کے کام کے نتائج دیکھیے۔ ایک مرتبہ لوئیزیانہ میں واقع ہڈسن بندرگاہ کے سامنے دریا کے چکردار راستے کا سب سے تنگ حصہ ایک مقام پر صرف نصف میل چوڑا تھا اس راستے کو پیدل چل کر پندرہ منٹ میں پار کیا جا سکتا تھا لیکن کشتی پر دریا کے راستے کا پورا چکر کاٹ کر آنا ہو تو پینتیس میل کا سفر پڑتا تھا۔ ۱۷۲۲ء میں دریا اس تنگ راستے کو کاٹنے کے لئے تیزی سے بڑھا اور اپنا پرانا راستہ چھوڑ کر اس نے یہ ۳۵ میل کا فاصلہ کم کر لیا۔ اسی طرح اس نے بلیک ہاک مقام پر ۱۶۹۹ء میں ۲۵ میل اور دریائے ریڈ کے جنوب کی طرف ریکی کا کٹاؤ پر جو چالیس یا پچاس سال پہلے بنا تھا ۲۸ میل کا فاصلہ کم کر لیا تھا۔ آجکل اگر آپ دریا سے جنوب کے سب سے دور والے کنارے سے چلکر شمال میں سب سے اوپر والے کٹاؤ تک جانا چاہیں تو یہ فاصلہ صرف ۷۰ میل ہوگا مگر ایک سو چھہتر سال پہلے یہی فاصلہ ایک سو اٹھاون میل تھا۔ اس چھوٹے سے فاصلے میں دریا نے اپنا راستہ اٹھاسی میل کم کر لیا ہے۔ بہت قدیم زمانے میں لوئیزیانہ میں وڈیلیا کے شمال میں جزیرہ نمبر ۹۲ پر ایک کٹاؤ جزیرہ نمبر ۸۲ پر دو کٹاؤ اور ہیلینز کے مقام پر تیسرا کٹاؤ تھا۔ ان کٹاؤں سے ندی کا فاصلہ اوسطاً ستر میل کم ہو گیا۔

جب میں مسیسپی پر کام کرتا تھا اسوقت سے ابتک ہری کین آئی لینڈ پر، آئی لینڈ نمبر ۱۰۳ پر، ارکنساس میں نپولین مقام پر، وال نٹ کے موڑ کے اوپر اور کونسل بینڈ پر دریا نے

کئی کٹاؤ بنائے۔ ان سے اوسطاً ۶۰ میل کا فاصلہ کم ہوا۔ خود میرے زمانے میں امریکن بینڈ
پر ایک کٹاؤ بنا جس نے دریا کے راستے کو کم و بیش دس میل کم کر دیا تھا۔

۱۷۶ ۔۔۔۔۔۔ سال پہلے دریائے مسیسپی کیرو اور نیو آرلینز کے درمیان
۱۲۱۵ میل لمبا تھا لیکن ۱۷۲۲ کے کٹاؤ کے بعد یہ صرف ۱۱۸۰ میل رہ گیا اور امریکن بینڈ
کے کٹاؤ کے بعد یہ ۱۰۴۰ میل رہ گیا۔ اس وقت سے اب تک اس نے ۶۷ میل کا فاصلہ کم کیا ہے
جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب دریا کی لمبائی صرف ۹۷۳ میل رہ گئی ہے۔

اگر میں ایک فکر سائنس داں بننا چاہتا اور مجھ سے یہ کہا جاتا کہ الہامی انکشافات کے ذریعے
نظریہ اندازہ لگاؤں کہ عہد ماضی میں کیا کیا ہوگا یا جو کچھ ماضی میں ہوا ہے اسکے مطابق نظریہ قائم
کی کوشش کروں کہ مستقبل میں کیا ہوگا تو اس تحقیق کیلئے اس دریا سے بڑھ کر کہاں مدد مل سکتی
ہے۔ علم طبقات الارض بھی اس سلسلے میں اتنا سودمند نہیں ہو سکتا کیونکہ ان علوم کے مطالعہ کے دوران میں
مجھے ایسے ٹھیک اعداد و شمار نہیں ملے کہ جن سے میں کوئی نتیجہ اخذ کر سکتا اور نہ علم حیوانات
کے مطالعہ سے مجھے بھی ایسی تحقیق کا موقعہ ہاتھ آیا۔ برف کے پہاڑوں کے مطالعہ سے بھی
واقفیت حاصل ہوتی ہے مگر اس سے بھی کوئی یقینی بات معلوم نہیں ہوتی۔ ذرا غور کیجئے
کہ ۱۷۶ سال کے عرصے میں مسیسپی کا جنوبی حصہ ۲۴۲ میل چھوٹا ہو گیا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ
ہوتا ہے کہ یہ دریا ہر سال اوسطاً ایک میل سے کچھ زیادہ ہی چھوٹا ہو رہا ہے۔ اس سے یہ
ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی بھی شخص بشرطیکہ وہ اندھا یا بیوقوف نہ ہو یہ جان سکتا ہے کہ
پرانے اولڈ سلورین عہد میں جسکو اگلے نومبر میں دس لاکھ سال ہو جائیں گے مسیسپی
کے نچلے حصے کی لمبائی تیرہ لاکھ میل سے زائد تھی اور وہ میکسیکو کی کھاڑی کے اوپر مچھلی پکڑنے
کی بنسی کی شکل میں پھیلی تھی۔ اس مثال سے ہم یہ بھی سمجھ سکتے ہیں کہ اب سے ۷۴۲ سال
بعد مسیسپی کا نچلا حصہ صرف ۱ ۳/۴ میل رہ جائیگا اور کیرو اور نیو آرلینز کی سڑکیں آپس میں مل جائیں
گی اور ایک ہی میونسپلٹی میں ہونے کی وجہ سے دونوں شہر ایک میئر کی صدارت اور بلدیاتی بورڈ کے
تحت آجائیں گے اور انکے لیجسلیٹو کا بورڈ بھی ایک ہی ہوگا۔ سائنس کی کچھ باتیں بہت
ہی دلکش اور حیرت انگیز ہوتی ہیں۔ معمولی اعداد و شمار سے بہت سی تعجب خیز قیاس

آرائشیاں ہو سکتی ہیں۔ دریائے مسیسپی کا پانی ایسی کھائیوں میں جن کا میں نے ذکر کیا ہے رہ نکلتا ہے تو وہاں کے
قرب و جوار میں رہنے والے لوگوں کو وہاں سے فوراً چلے جانا چاہیئے۔ پانی کناروں کو ایسے کاٹتا ہے
جیسے کوئی چاقو سے کسی چیز کو کاٹ رہا ہو۔ جب کھائی ۱۲ یا ۱۵ فٹ گہری ہو جاتی ہے تو مصیبت
آنے میں کوئی دیر نہیں رہتی کیونکہ اب دنیا کی کوئی طاقت پانی کو نہیں روک سکتی۔ جب کھائی کی
چوڑائی سو گز تک پہونچ جاتی ہے تو کنارے کٹ کٹ کے قریب ایک ایک ایکڑ کے پتلے پتلے ٹکڑوں
میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ پہلے موڑ پر گولائی میں گھومتی ہوئی ندی کی رفتار اگر صرف ۵ میل فی گھنٹہ
تھی تو اب فاصلہ کم ہو جانے کی وجہ سے اسکی تیزی بے انتہا بڑھ جاتی ہے۔ میں نے اس دریا میں
سب سے پہلے اسوقت سفر کیا تھا جب دریا مورگن بینڈ کے کنارے پر بہنے لگا تھا اور ہماری کشتی اس
کٹاؤ کو پار نہیں کر سکتی تھی کیونکہ آدھی رات کا وقت تھا اور بجلی کی کڑک چمک اور تیز بارش طوفان
برپا کر رہے تھے۔ یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ کٹاؤ میں دریا کی رفتار ۱۵ یا ۲۰ میل فی گھنٹہ تھی اور ہماری
کشتیوں کی رفتار زیادہ سے زیادہ ۱۲ یا ۱۳ میل فی گھنٹہ تھی۔ اسلئے کم از کم خراب موسم میں بھی کٹاؤ میں
کشتی ڈالنا ہوتی تھی لیکن ہمارے پائلٹ مسٹر براؤن بڑے عزم کے تھے اور وہ برابر کشتی چلانے
کی کوشش کرتے رہے۔ کنارے پر قتان کے نیچے جو بھنور تھا اس میں بھی پانی اتنا ہی تیز تھا جتنا
کہ بیچ دھارے میں۔ ہم لوگ کنارے پر بھی اتنی تیزی سے بہتے جا رہے تھے جیسے ہم کسی تیز ریل گاڑی میں جا رہے
ہوں۔ بلا مبالغہ ہم کنارے کے قریب پہنچ جاتے تھے تاکہ ضرورت پڑنے پر کشتی کو قابو میں رکھ سکیں۔ اگر ہم کسی
بھنور میں پھنس جاتے تو برسوں کے انتظار میں کھڑے ہو جاتے۔ لیکن ہماری تیاریاں سب بے
سود تھیں کیونکہ جیسے ہی ہم دھارے سے ٹکراتے ہماری کشتی لٹو کی طرح گھومنے لگتی اور پانی کشتی کے اگلے حصے
میں بھر جاتا اور کشتی کو اتنا تیز جھکا کرنا پڑتا تھا کہ ہم لوگوں کیلئے عرشے پر جا کے کھڑا رہنا مشکل ہو جاتا۔ دوسرے
ہی لمحہ ہم لوگ پھر دھارے کے بہاؤ پر آجاتے اور پوری طاقت کیساتھ خطرے سے بچنے کی کوشش کرتے۔ اسطرح ہم نے چار مرتبہ
کشتی کو کٹاؤ میں سے نکال لیجانے کی کوشش کی۔ میں کشتی کے اگلے حصے میں کھڑا صورتحال کا جائزہ لیتا رہا۔ یہ دیکھکر
مجھے بڑا تعجب ہوتا تھا کہ کشتی کیسے اچانک چکر کھانے لگتی تھی۔ جوں ہی وہ بھنور سے نکل کر دھارے کے
تھپیڑوں میں پہنچتی ہمیں بہت پریشانی ہو جاتی اس سے جو دھکا ہوتا اور کشتی میں جو لچک پیدا

ہوتی وہ بالکل اسی طرح کی ہوتی جیسی کہ کشتی کے پوری رفتار پر آتے ہوئے کسی ریتیلے کنارے سے ٹکرانے سے ہوتی ہے۔ بجلی کے کوندنے میں باغات اور انکے اندر جھونپڑے اور زرخیز کھیت ٹوٹ پھوٹ کر دریا میں غرق ہوتے ہوئے صاف دکھائی دیتے اور انکے ٹوٹنے کی آواز کے باوجود بجلی کی کڑک ویسی ہی سنائی دیتی۔ ایکبار جب ہماری کشتی بھنور میں چکر کھا رہی تھی تو ہمارے قریب صرف بیس فٹ کی دوری پر ایک مکان تھا جسکے اوپر کھڑکی میں چراغ جل رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ مکان کشتی کے پاس گر کر پانی میں غرق ہو گیا۔ کشتی کے اگلے حصے میں بھی کسی کا ٹھہرنا مشکل ہوتا تھا جیسے ہی ہم دھارا میں کشتی ڈالتے ویسے ہی پانی اس میں سے ہو کر نکل جاتا تھا چوتھی بار بڑی کوشش سے ہم کشتی کو کٹاؤ سے دو میل جنوب میں لے آئے جہاں ساحلوں پر جنگل بکثرت تھے۔ تمام علاقے میں پانی ہی پانی تھا۔ ایک دو دن کے بعد یہ کٹاؤ پون میل تک پھیل گیا اور کشتیاں اس میں سے بغیر کسی دقت کے گذرنے لگیں۔ یوں ہم نے دس میل کا فاصلہ کم کر لیا

قدیم زنجیروں کٹاؤ کی وجہ سے دریا کی لمبائی ۲۰ میل کم ہو گئی اس واقعہ کے ساتھ ایک روایت بھی وابستہ ہے کہا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ وہاں ایک کشتی رات کے وقت آگئی اور اس کے ملاح کے مطابق اس سے جو آگے ٹھہرا پورا انگریز کا [illegible] بالکل کو دے [illegible] کہ یہ کس کا کنارہ ہو چکا ہے۔ رات بہت بھیانک اور ہیبت ناک تھی اور اندھیرے میں برچھیاں ہیم اور [illegible] دیتی تھی۔ دریا کے پانی کے [illegible] پہلی بھرنا [illegible] تھا [illegible] جلتی ہو [illegible] وہ کبھی کبھی کسی پتھر سے ٹکرا بھی جاتی تھی گھبرائے ہوئے ملاح [illegible] دعا مانگنے لگتے اور کبھی کبھی نا امید ہو کر یہی خواہش کرنے لگتے [illegible] جنگ سے [illegible] تجربے

حالتوں میں اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ انسان [illegible] کوئی [illegible] بات منظور ہوتی ہے جبکہ اسکی بہتر [illegible] [illegible] جہاز کا بھوت اس [illegible] پادری کے [illegible] کی کوشش کر [illegible] کسی سمجھدار [illegible] سمجھے [illegible] انہوں نے اس دریا میں اس کشتی کے بھوت کو دیکھا ہے۔ [illegible] چمکتی ہوئی دکھائی دیتی اور [illegible] سے نکلتی ہوئی ایک مدھم سی آواز [illegible] آواز [illegible]

پیسہ بیباق نہ کرسکنے کی معافی مانگتے ۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت آگئی کہ جب کبھی انھیں غریب ایٹس آتے دکھتا تو وہ وہاں سے کھسک جاتا اور اگر اسکے پاس کوئی ہوتا تو اُسے بھی وہاں سے لیجاتا۔ لیکن اِس سے بھی کیا فائدہ ۔ اسکا قرضدار اسکے پیچھے پیچھے بھاگتا اور اسے گھیر لیتا۔ تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ ہانپتے ہوئے اسٹیفن صاحب آتے اور ہاتھ پھیلا کر مشتاق نظروں سے ایٹس صاحب اور انکے ساتھیوں سے ملتے اور انکی بات چیت میں مخل ہوجاتے۔ وہ اپنے دونوں بازو دہلا کر کہتے "عزیز من" میں نے تم سے ملنے کے لئے کیسی دوڑ لگائی۔ مجھے یہ معلوم ہوا کہ تم نے مجھے نہیں دیکھا ہے اس لئے میں پوری طاقت سے بھاگا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم سے ملاقات ہی نہ ہوسکے۔ اب تم مل گئے۔ ذرا کھڑے ہو جاؤ تاکہ میں جی بھر کر تمہیں دیکھ لوں۔ ارے ذرا کھڑے ہو جاؤ! کیا بھولا بھالا شریف چہرہ ہے! (ایٹس کے دوست سے مخاطب ہو کر) ذرا انکی طرف دیکھو! ذرا دیکھئے! کیا انکا چہرہ اتنا خوبصورت نہیں ہے کہ اسے دیکھتے ہی رہو؟ کیوں ہے نا۔؟ کیا یہ تصویر کی طرح خوبصورت نہیں معلوم ہوتے؟ کچھ لوگ تو انھیں تصویر ہی کہتے ہیں لیکن میں تو انھیں مرقع کہونگا اور واقعی یہ مرقع ہیں بھی ۔ بالکل مرقع ۔ ہاں ایک بات مجھے اور یاد آئی ۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میں تم سے ایک گھنٹہ قبل مل لیتا۔ چوبیس گھنٹوں سے میں نے تمہارے ڈھائی سو ڈالر بچا کر تمہیں دینے کے لئے رکھے ہوئے تھے اور اسکے لئے تمہیں ہر جگہ ڈھونڈ رہا تھا۔ میں نے بلینڈرس کے یہاں تمہارا انتظار کل ۷ بجے شام سے آج صبح دو بجے تک کیا۔ اس دوران میں میں نے نہ کھانا کھایا اور نہ آرام کیا۔ میری بیوی نے مجھ سے پوچھا " تم تمام رات کہاں رہے ۔؟ میں نے کہا " یہ قرض میرے دماغ پر بری طرح سوار ہے" اس نے کہا میں نے اپنی تمام زندگی میں ایسا کوئی آدمی نہیں دیکھا جو قرض ادا کرنے کی اتنی فکر کرتا ہو۔ میں نے کہا ۔ یہ میری فطرت ہے ۔ میں اِسے کیسے بدل سکتا ہوں ۔ اس نے کہا " اچھا جاؤ، ذرا آرام کر لو۔ میں نے کہا " جب تک اس شریف نیک دل نوجوان کو اپنا پیسہ نہیں مل جاتا مجھے آرام کہاں ۔ اسلئے میں تمام رات بیٹھا رہا اور آج صبح ہی وہاں سے اٹھا اور جس شخص سے میں سب سے پہلے ملا اس نے مجھے بتایا کہ تم "گراند ٹرک" جہاز میں نیو آرلینز کے لئے روانہ بھی ہوچکے تھے ۔ پھر کیا تھا جناب میں ایک دیوار کے سہارے کھڑے ہو کر رونے لگا۔ میں نے چلا چلا کر کہا " اے خدا میری مدد کر

جس شخص کے گھر کی دیوار کے پاس کھڑا ہیں رو رہا تھا وہ اپنے مکان کی صفائی میں مصروف تھا۔ وہ ایک چھترا لئے ہوئے باہر نکلا اور بولا "میں یہ پسند نہیں کرتا کہ لوگ میرے مکان کے پاس اس طرح روئیں اور چلائیں" اور پھر مجھے ایسا لگا گویا ساری دنیا میرے خلاف ہو گئی ہے اور میرے زندہ رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اسوقت کسی کو کیا معلوم کہ میرے دل پر کیا گذر رہی تھی۔ صرف ایک گھنٹہ قبل جب میں اسطرف آرہا تھا تو راستے میں جم وکسن سے میری ملاقات ہو گئی۔ ان کے بھی مجھ پر ڈھائی سو ڈالر واجب الادا تھے اسوجہ سے وہ رقم میں نے انھیں کو دیدی اور اب تم مجھے یہاں ملے ہو تو میرے پاس ایک سینٹ بھی نہیں ہے۔ لیکن یقین جانیے کہ میں اتنا ہی سچ کہتا ہوں جتنی سچ یہ بات ہے کہ میں یہاں اس جگہ ایک اینٹ پر کھڑا ہوں۔ میں نے اس اینٹ پر کھرونچ کر ایک نشان بنادیا ہے تاکہ مجھے یاد رہے کہ مجھے روپیہ اُدھار لیکر کل ٹھیک بارہ بجے تک تمھیں ادا کر دینا ہے۔ ذرا کھڑے ہو جاؤ تاکہ میں ایک نظر تمھیں اور دیکھ لوں"۔

غرضیکہ انکا معاملہ اسی طرح چلتا رہا ایٹس کی زندگی دوبھر ہو گئی۔ اس قرض ادا سے بچنے کی کوئی صورت ہی نہ تھی اور اسے اسکی فرضی مصیبتوں کی داستان کہ کیوں اُسے قرض ادا نہ کرسکا سننی پڑتی تھی اُسے سڑک پر چلنے میں شرم آتی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کہیں اسے اسٹیفن صاحب ملجائیں جو کسی کونے میں کھڑے راہ دیکھ رہے ہونگے۔

بوگارٹ کی بلیرڈ سیلون اسوقت پائلٹوں کے ملنے کا بہت بڑا مرکز تھا۔ وہ لوگ اس جگہ دریا کے متعلق تبادلۂ خیالات کرنے اور کھیلنے کیلئے اکٹھے ہوتے تھے۔ ایکدن صبح ایٹس صاحب وہاں موجود تھے۔ اسٹیفن صاحب بھی وہاں پہنچ گئے تھے مگر نگاہ سے اوجھل تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ جب شہر کے سب پائلٹ وہاں جمع ہو گئے تو اسٹیفن صاحب اچانک ظاہر ہوئے اور ایٹس کی طرف ایسی گرمجوشی سے جھپٹے جیسے کوئی شخص اپنے کھوئے ہوئے بھائی کے ملنے پر اس سے بغلگیر ہونے کے لئے دوڑتا ہے۔

"ارے" کتنی خوشی ہوئی تم سے ملکر۔ اے میری جان، تمھاری صورت سے میری آنکھوں کو کسی راحت ملتی ہے۔ صاحبان۔ میں تمہارا سب کا قرضدار ہوں۔ غالباً تمھارا سب کا مجھ پر چیالیس ہزار ڈالر قرض ہے۔ میں اُسے ادا کرنا چاہتا ہوں۔ میرا قطعی ادا کرنے کا ارادہ ہے۔ آخری سینٹ تک میں ادا کرنا چاہتا ہوں۔ تم سبکو معلوم ہے اور مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے

کہ اتنے لمبے عرصے تک جو مجھ پر آپ جیسے فراخ دل اور متحمل مزاج اشخاص کا اتنا زبردست احسان رہا ہے اسکا میرے دل پر کتنا اثر ہے اور نادہندگیٔ قرض کا مجھ پر کتنا وزن اور صدمہ ہے ۔ لیکن سب سے زیادہ تکلیف اور صدمہ جو مجھے ہوا ہے وہ اس شریف زادہ نیک دِل انسان کے قرض ادا نہ کرنے کا ہوا ہے اور آج صبح میں یہاں خاص طور پر اسی لئے آیا ہوں کہ آپکے سامنے یہ اعلان کر دوں کہ مجھے ایک ایسا طریقہ یاد آگیا ہے جس سے میں آپ سب کا قرض ادا کر سکوں گا۔ میری منشا یہ بھی کہ جب میں یہ اعلان کروں تو مسٹر ایٹیس یہاں ضرور ہوں ۔ ہاں میرے لائق و وفادار دوستو، میرے مخلص دوستو، مجھے وہ طریقہ آگیا ہے ہاں واقعی ایک ایسا طریقہ آگیا ہے جس سے آپ سب کا قرض بیباق کر سکوں گا اور آپ سبکو اپنا اپنا روپیہ مِل جائے گا" اب ایٹس صاحب کی آنکھوں میں بھی اُمید جھلکنے لگی کہ شاید ان کا روپیہ بھی مِل جائے اسی وقت اسٹیفن صاحب نے بڑی مہربانی کا اظہار کرتے ہوئے ایٹس کے سر پہ ہاتھ رکھا اور کہا "میں سب لوگوں کا قرضہ حروفِ تہجی کے سلسلے سے ادا کروں گا۔ اسکے بعد اسٹیفن صاحب مڑ کر غائب ہوگئے ۔ مگر حیرت زدہ اور دلچسپی کے ساتھ سننے والے سامعین کو اسٹیفن صاحب کے قرضے کی ادائیگی کے طریقے کی وضاحت یا اہمیت معلوم نہ ہو سکی جبتک کہ مسٹر ایٹس نے کچھ نہ کہا۔ اب انھوں نے ایک آہ بھری اور کہا "اچھا، صاحبان، جن کے نام واؤ سے شروع ہوتے ہیں انکے کیلئے بڑا شاندار موقع ہے ۔ غالباً اسٹیفن صاحب اس دنیا میں حرف ع سے آگے تجاوز نہیں کرینگے اور دوسری دنیا میں بھی ایک غیر معینہ مدّت ختم ہونے کے بعد بھی اسٹیفن صاحب مجھے اسطرح سے خطاب کریں گے "وہ غریب الوطن پائلٹ جو جیتھڑوں میں ملبوس سینٹ لوئی سے یہاں آیا تھا۔"

اٹھارواں باب

میں نے کچھ اور تعلیم حاصل کی

دو ڈھائی سال کی شاگردی میں میں نے کئی پائلٹوں کی ماتحتی میں کام کیا اور مجھے دخانی کشتی میں کام کرنے کے طرح طرح کے تجربے ہوئے۔ میں نے مختلف قسم کی دخانی کشتیاں بھی دیکھیں مسٹر بکسبی کیلئے مجھے ہر وقت اپنے ساتھ رکھنا ممکن نہیں تھا اور اسی لئے مجھے وہ مختلف پائلٹوں کیساتھ بھیجتے رہتے تھے۔ میں آجتک اِن دنوں کے تجربوں سے فائدہ اٹھا رہا ہوں۔ اس مختصر اور سخت تعلیم کے دوران میں میری ملاقات ایسے مختلف قسم کے انسانوں سے ہوئی جنکا تذکرہ ناولوں سوانح حیاتوں اور تواریخوں میں آیا کرتا ہے اور یہ صداقت روز بروز مجھے آشکارا ہو رہی ہے کہ جہازرانی کی معمولی ملازمت کیلئے کم از کم چالیس سال کا تجربہ اور تربیت چاہیئے۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ میں اپنے تجربے سے ابتک فائدہ اٹھا رہا ہوں تو اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں مردم شناسی میں ماہر ہو گیا ہوں۔ یہ بات ہرگز نہیں ہے میرے خیال میں مردم شناسی کی صلاحیت جبلّی اور فطری ہوتی ہے، اکتسابی نہیں۔ مجھے جو صلاحیت حاصل ہوئی ہے وہ مختلف قسم کی ہے اور مختلف درجے کی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں جس چیز کی قدر میں سب سے زیادہ کرتا ہوں وہ ہے میرا آئندہ کی تعلیم کیلئے اشتیاق۔ جب کسی ناول یا سوانح عمری میں مجھے کسی کی شخصیت کا اچھا بیان ملتا ہے تو مجھے اسمیں بڑی دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ مجھے فوراً یاد آجاتا ہے کہ ایسے شخص سے میں اپنے دریا کے دورانِ قیام میں پہلے ہی متعارف ہو چکا ہوں۔

اس گذرے ہوئے زمانے کی دھندلی یادگاروں میں جو شخصیت مجھے اکثر یاد آتی ہے وہ مسٹر براؤن کی ہے جو پینسلوانیا نامی جہاز پر پائلٹ تھے اور جنکا ذکر میں پچھلے باب میں کرچکا ہوں نیز

جنکی یاد میرے ذہن میں تازہ ہونیکے ساتھ ساتھ تکلیف دہ اور بے لطف بھی ہے۔ ادہ ادھیڑ عمر کے چھریرے بدن کے چوڑی ہڈی والے، صاف داڑھی مونچھ والے چہرے کے گھوڑے کی طرح لمبے منہ والے، جاہل قسم کے کنجوس، بد طینت، غصہ میں اکثر غراتے والے، نکتہ چیں، تل کو پہاڑ بنانے والے اور ظالم قسم کے انسان تھے۔ جب میں انکے سامنے پہرے پر آیا کرتا تھا تو مجھے بڑا ڈر لگا کرتا تھا۔ پہرے کے علاوہ وقت میں مجھے چاہے کتنی ہی خوشی، راحت اور دلجمعی کیوں نہ حاصل ہو اور کشتی لیکر آگے بڑھنے میں مجھے کتنی ہی اُلوالعزمی کا احساس کیوں نہ ہوتا ہو مگر جیوں ہی میں پائلٹ ہاؤس میں داخل ہوتا تو میرا دل ایکدم افسردہ ہو جاتا تھا۔

مجھے اب بھی وہ وقت یاد ہے جب پہلی مرتبہ میں مسٹر براؤن کے سامنے گیا تھا۔ کشتی سینٹ لوئی سے واپس آرہی تھی اور بہاؤ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں بڑی شان کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر پائلٹ ہاؤس میں گھسا کیونکہ مجھے فخر تھا کہ میں ایک چھوٹا موٹا افسر تو تھا ہی اور ایک مشہور و معروف تیز رفتار کشتی کے منتظمین میں سے گنا جاتا تھا۔ اس وقت براؤن صاحب پہیے پر بیٹھے تھے۔ میں کمرے کے بیچ ہی میں رُک گیا۔ میں بے حس و حرکت کھڑا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ کب براؤن صاحب مجھ سے مخاطب ہوں اور میں سلام کروں۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے کنکھیوں سے مجھے دیکھ لیا تھا لیکن چونکہ دوبارہ انھوں نے اس طرح سے بھی مجھے نہ دیکھا تو میں سمجھا کہ میرا پہلے والا خیال غلط تھا اسی وقت وہ خطرناک رکاوٹوں کے بیچ ایک جنگلی علاقے کے برابر برابر کشتی کو گھسیٹے جا رہے تھے۔ اسلئے اسوقت ان کے کام میں رکاوٹ ڈالنا مناسب نہیں تھا۔ اسلئے میں اونچی بینچ پر جا کر بیٹھ گیا۔

دس منٹ تک خاموشی رہی۔ تب براؤن صاحب میری طرف مخاطب ہوئے انھوں نے مجھے سر سے پیر تک غور سے دیکھا اور اچھی طرح جائزہ لیا۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ وہ مجھے پندرہ منٹ تک دیکھتے رہے۔ اسکے بعد انھوں نے اپنا رُخ پھیر لیا۔ کچھ سیکنڈ تک میں نے انھیں نہیں دیکھا۔ تب انھوں نے دوبارہ میری طرف رُخ کیا اور اس سوال کے ساتھ میرا استقبال کیا۔

"کیا تم ہوریس بکسبی کے شاگرد ہو؟"

"ہاں جناب" میں نے کہا۔

اسکے بعد وہ تھوڑی دیر کے لئے رُکے اور پھر بولے۔

"تمہارا نام کیا ہے۔؟"

میں نے انھیں اپنا نام بتایا۔ انھوں نے اُسے دہرایا اور بھول گئے مگر غالباً یہی ایک چیز ایسی تھی جو وہ کبھی بھولے ہونگے کیونکہ میں انکے ساتھ مہینوں رہا' انھوں نے مجھے نام لیکر... نہیں پکارا۔ وہ صرف اتنا کہہ دیا کرتے تھے "ذرا سُننا"، اور تب اپنا حکم صادر فرمادیا کرتے تھے ایکبار انھوں نے پوچھا "تم کہاں پیدا ہوئے تھے۔؟"

میں نے کہا "میں مسوری کے علاقے میں بمقام فلورڈا پیدا ہوا تھا"

براؤن صاحب تھوڑی دیر رُکے اور پھر بولے۔

"تو پھر تم وہیں رہتے تو اچھا ہوتا"

اسی طرح ایکدن اور انھوں نے بڑے سیدھے اور دلچسپ سوالوں کے ذریعہ میرے اور خاندان کے متعلق بہت سی باتیں معلوم کرلیں۔ جسوقت وہ مجھ سے سوالات کر رہے تھے اسوقت کراسنگ پر پنسال پانی میں ڈال کر پانی کی گہرائی معلوم کی جارہی تھی اسوجہ سے انکے سوالوں میں رکاوٹ پڑی۔ جب پنسال پڑ چکے تو انھوں نے مجھ سے پھر سوالات شروع کردیئے۔

"تم اس دریا میں کب سے آئے ہو۔؟"

میں نے انکو بتلادیا۔ ذرا دیر رک کر وہ پھر بولے۔

"تم نے یہ جوتے کہاں سے لئے۔؟"

میں نے ان کو یہ بھی بتلادیا۔

پھر وہ بولے "ذرا اپنا پیر اٹھا کر دکھاؤ۔

میں نے ایسا ہی کیا۔

وہ پیچھے ہٹ گئے۔ میرا جوتا غور سے اور ذرا حقارت کی نظر سے دیکھا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے اپنا سر کھجلانے لگے، پھر اپنی پہاڑی ٹوپی کو ذرا آگے سرکایا تاکہ دیکھنے میں مدد ملے۔ تب وہ بولے "مجھ پر خدا کا قہر نازل ہوگا"

مگر ان پر قہر کیوں نازل ہوگا یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی اور میرے لئے ابتک ایک

مُعمّہ بنی ہوئی ہے۔ میری اُن سے بات چیت کل پندرہ منٹ ہوئی ہوگی۔ یہ وقفہ بڑی بے لطفی میں گذرا۔ اسوقت رہ رہ کر مجھے گھر کی یاد آرہی تھی طبیعت بڑی بیقرار تھی اور میں بالکل خاموش بیٹھا رہا۔ اسی وقت وہ لانبے منہ والا پھر میری طرف مخاطب ہوا اور تب میں نے دیکھا کہ اسکے چہرے میں کچھ تبدیلی آگئی تھی۔ اسوقت انکا چہرہ آگ کی طرح سرخ ہو رہا تھا اور ران کی رگ رگ پھڑک رہی تھی۔ اب وہ چلا کر بولے "دیکھو کیا تم وہیں پر تمام دن بیٹھے رہو گے۔؟"

بجلی کی طرح پھڑک کر میں بیچ فرش پر گر پڑا۔ مجھے بڑا تعجب ہو رہا تھا کہ مسٹر براؤن ایکدم اتنے ناراض کیوں ہو گئے۔ میں کچھ بیہوش سا ہو گیا اور ہوش آنے پر بھی مجھے بولنا مشکل ہو رہا تھا۔ بڑی معذرت کیساتھ میں نے اتنا کہا "جناب نے مجھے کوئی حکم نہیں دیا تھا۔"

"ارے۔ تمہیں ابھی تک کوئی حکم نہیں ملا۔ ہم لوگ بھی عجیب مخلوق ہیں۔ ہمیں حکم ضرور دیدینا چاہیئے تھا۔ ہمارے باپ شریف آدمی تھے۔ انکے پاس غلام ہوا کرتے تھے مگر ہم نے اسکولوں میں تعلیم پائی ہے۔ ہاں۔ ہم بھی شریف آدمی ہیں اور ہمیں حکم دینا چاہیئے۔ اچھا کہیں خدا کا قہر مجھ پر نہ ہو اسلئے میں تمہیں سبق سکھاؤں گا کہ شان دکھلانے اور حکم عدولی کرنے کا کیا حشر ہوتا ہے۔ پہیّے سے دور ہٹ جاؤ (اُسوقت میں بلا ارادہ پہیّے کے پاس جاکر کھڑا ہو گیا تھا)۔

اب میں ایک دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور ایسا کھویا کھویا سا ہو گیا جیسے کھڑے کھڑے خواب دیکھ رہا ہوں۔ براؤن صاحب کے اس جنون اور غصے کیوجہ سے میرے ہوش و حواس اڑ گئے تھے۔ وہ پھر ناراض ہو کر بولے۔

"تم یہاں کس لئے کھڑے ہو۔ اس برف کی صراحی کو عرشے کے مال گودام میں لے جاؤ۔ جاؤ، جلدی جاؤ۔ مگر تمام دن اسی کام میں مت لگا دینا۔"

جوں ہی میں پائلٹ ہاؤس میں واپس پہنچا، مسٹر براؤن نے کہا۔

"دیکھو تم وہاں ابتک کیا کر رہے تھے۔"

میں نے کہا "مجھے عرشے پر سامان کی کوٹھری کا پتہ نہیں چلا۔ مجھے مال گودام تک جانا پڑا مگر وہ جگہ نہیں ملی جہاں صراحی پہنچانی تھی۔"

"اچھا تو جھوٹی کہانی گھڑ لی۔ جاؤ اسٹوو میں تیل بھرو۔"

یں نے حکم کی تعمیل کی۔ براؤن صاحب مجھے بلی کی طرح تاکتے رہے فوراً ہی چلا کر بولے
" اس بیلچے کو رکھ دو۔ ایسا کوڑھ مغز آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ کیا تم میں اتنی عقل نہیں ہے
کہ اسٹو دمیں تیل کیسے بھرتے ہیں ؟"
غرضیکہ پہرے کے دوران میں مجھ پر اسی طرح اُن کا قہر نازل ہوتا رہتا کئی مہینے تک یہی حال
رہا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ مجھے دراصل ڈیوٹی پر آتے ہی ڈر لگنے لگتا تھا۔ جوں ہی میں مسٹر
براؤن کے سامنے آتا' خواہ دن ہوتا' خواہ رات' مجھے انکی لال پیلی آنکھیں دیکھتے ہی ڈر لگنے لگتا'
اور انکی آنکھیں دیکھتے ہی میں سمجھ جاتا تھا کہ وہ مجھ پر زہر اُگلنے والے ہیں صرف کوئی بہانہ تلاش کر رہے
ہیں۔ شروع شروع میں وہ مجھ سے کہتے۔
" دیکھو' پہیہ پر آؤ " اور پھر دو منٹ بعد ہی
" تم کس ملک کی طرف جا رہے ہو۔ کشتی کو روکو۔ روکو " اور پھر اگلے ہی لمحے وہ کہتے " کیا
تم اسے تمام دن روکے ہی رہو گے۔ جاؤ۔ اسے چلاؤ " تبھی وہ خود بینچ سے کود کر میرے ہاتھ
سے پہیہ چھین لیتے اور اسے خود چلاتے اور ساتھ ہی ساتھ برابر مجھ پر غصہ جھاڑتے رہتے۔
جارج رچی دوسرے پائلٹ کا شاگرد تھا۔ وہ اُسوقت مزے کر رہا تھا کیونکہ اس کا
افسر جارج ایلر اتنا ہی رحمدل تھا جتنا براؤن سنگدل۔ پچھلے موسم میں رچی نے براؤن کے ساتھ
کام کیا تھا۔ اسلئے وہ خوب جانتا تھا کہ کیسے میرا مذاق اڑائے اور خود تفریح کرے۔ اسکے لئے
اُسے صرف ایک ہی کام کرنا پڑتا تھا۔ جب کبھی ایلر صاحب کا پہرہ ہوتا تھا اور میں پہیے پر پہونچ
جاتا تھا تو رچی پیچھے بینچ پر بیٹھ جاتا اور براؤن صاحب کی نقل اُتارنے لگتا۔
وہ کشتی کو پکڑو۔ روکو۔ ایسا بزدل انسان میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ دیکھو تم جا کہاں رہے
ہو۔ کیا اُس درخت سے ٹکر مارو گے۔ کشتی کو روک لو۔ کیا تم میرا حکم نہیں سُن رہے ہو۔ پہیہ نیچا کرو۔
ارے دیکھو۔ وہ کہاں جا رہی ہے یہی مجھے اندیشہ تھا۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا۔ جاؤ پہیے سے
ہٹ جاؤ۔" وغیرہ وغیرہ۔
اسلئے پہرہ چاہے کسی کا ہوتا میرا وقت بڑا بے لُطفی سے گذرتا تھا کبھی کبھی تو مجھے ایسا
محسوس ہوتا تھا کہ رچی کا مذاق بھی مجھے دق کرنا اتنا ہی تکلیف دہ تھا... جتنا براؤن صاحب کا سنجیدگی

سے مجھ پر نکتہ چینی کرنا اور میرے پیچھے پڑ جانا۔

میرے دل میں اکثر براؤن صاحب کو مار ڈالنے کی خواہش پیدا ہوتی تھی۔ لیکن ایسا موقع کبھی ہاتھ نہیں آتا تھا۔ شاگرد کو اپنے اُستاد کی ہر بات برداشت کرنی پڑتی ہے چاہے وہ نکتہ چینی اور طعنہ زنی ہی کیوں نہ ہو ہم سب کا خیال تھا کہ امریکہ میں ایسا قانون بھی ہے کہ جو پائلٹ ڈیوٹی پر اُسے دھمکانا یا مارنا ایسا جرم ہے جس کے لئے اصلاحی سزائے قید بھگتنی پڑتی ہے۔ تاہم میں تصور میں تو انھیں مار سکتا ہی تھا اور اس پر کوئی قانونی پابندی بھی نہیں تھی، اور یہ کام تو میں روز سونے سے پہلے کیا کرتا تھا۔ بجائے اسکے کہ سونے سے پہلے میں دریا کے متعلق دن بھر کے تجربات کا جائزہ لوں اور اسے اپنے دماغ میں محفوظ رکھوں، میں اپنے تصور میں براؤن صاحب کو مارا کرتا تھا۔ میں نے مہینوں تک ہر روز رات کو براؤن صاحب کو مارا صرف فرق اتنا سمجھئے کہ سب کی طرح پرانے گھِسے پٹے طریقے سے میں نے انھیں نہیں مارا بلکہ ایک نئے حسین طریقے سے مارا۔ اس ہولناک ماحول میں بدلہ لینے کا یہ انوکھا طریقہ تھا۔

براؤن صاحب نکتہ چینی کیلئے کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈتے رہتے اور اگر انھیں کوئی معقول بہانہ نہ ملتا تو وہ من سے کوئی نہ کوئی بات گھڑ لیتے تھے۔ اگر میں کشتی کو کنارے کے قریب سے لے کر چلتا تو وہ اعتراض کرتے اور اگر کنارے سے دور چلتا تو بھی اعتراض کرتے۔ اگر ریت کی ساحلی دیوار سے چھوتے ہوئے گذرتا تو وہ نکتہ چینی کرتے اگر ایسا نہ کرتا تو بھی وہ نقص نکالتے۔ اگر کشتی بغیر حکم کے روک لیتا تو بُرا بھلا کہتے اور اگر حکم نہ ملنے پر نہ روکتا تو بھی ملامت کرتے اگر بلا حکم حاصل کئے ہوئے بندوق چھوڑ دیتا تو اعتراض کرتے اور اگر ایسا کرنے کے لئے حکم کا انتظار کرتا تو بھی نقص نکالتے۔ مختصر یہ کہ اسکا یہ مستقل قاعدہ بن گیا تھا کہ جو کام بھی میں کرتا اس پر وہ اعتراض ضرور کرتے اور دوسرے یہ کہ جو کچھ بھی وہ کہتے بڑے تحقیر آمیز لہجے میں کہتے۔

ایک روز جب ہم ہنو میڈرڈ کے قریب پہونچے تو ہماری کشتی میں سامان بہت بھرا ہوا تھا اور پہا چھی طرح بندھا ہوا تھا۔ براؤن صاحب پہیے کے ایک طرف بیٹھے کشتی چلا رہے تھے میں پہیے کے دوسری طرف بیٹھا تھا اور میرا کام کشتی کو روکنے یا اسے آگے دھکا دینے کا تھا۔ براؤن صاحب خفیہ طور پر مجھے کبھی کبھی دیکھ لیا کرتے تھے۔ میں بہت دنوں سے ان کی نگاہ کا

مطلب سمجھنے لگا تھا۔ انکا واحد مقصد مجھے قصوروار ٹھہرانے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کرنا تھا۔ مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ اب نہ معلوم وہ کیا الزام لگائیں گے۔ رفتہ رفتہ وہ پہیئے سے پیچھے آئے اور حسبِ معمول غراتے ہوئے انھوں نے مجھ سے کہا "دیکھو کیا تمہیں کشتی کو گھمانا آتا ہے؟" اسمیں کوئی شُبہ نہیں کہ اسوقت میں بآسانی قصوروار بن گیا کیونکہ انھوں نے مجھے پہلے کبھی کشتی کو گھمانے کی اجازت نہیں دی تھی اسلئے میں کیسی ہی ہوشیاری سے اسے گھماتا وہ نقص ضرور نکال سکتے تھے چنانچہ انھیں بہانہ مِل گیا اور نتیجہ وہی ہوا جو انھوں نے پہلے ہی سوچ رکھا تھا۔ ایک چوتھائی منٹ کے اندر ہی میں گھبرا گیا اور میری سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا کروں میں نے جلدی میں گھبرا کے کشتی کو گھمانا شروع کر دیا اور جب میں نے براؤن صاحب کی طرف دیکھا تو انکی آنکھوں میں مجھے فتحیابی کی خوشی کی جھلک دکھائی دی۔ بہرحال میں نے اپنی غلطی درست کر لی اور ایک بار پھر جہاز پر کشتی کو گھمایا مگر میں نے پھر غلطی کی اور پھر اسے دُرست کرنے کی کوشش کی۔ لیکن آخر کار میں اتنا گھبرا گیا اور اتنا فکر مند ہو گیا کہ میں ایک بہت ہی بیہودہ غلطی کر گیا کشتی کو گھمانے سے پہلے میں اس کو بہت نشیب میں لے گیا اب براؤن صاحب کو مجھے ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا موقع مِل گیا۔

غصے سے انکا چہرہ لال ہو گیا۔ انھوں نے ایک چھلانگ لگائی اور ہاتھ مار کر مجھے پائلٹ ہاؤس کی طرف دھکیل دیا۔ پہیئے کو روک دیا اور مجھ پر لعنت و ملامت کا زہر اُگلنا شروع کر دیا۔ بکتے بکتے انکی سانس پھولنے لگی۔ انھوں نے مجھے ہر قسم کی وہ گالیاں جو وہ دے سکتے تھے' دیں' بلکہ ایکبار تو مجھے ایسا خیال ہوا کہ وہ مجھے بد دُعا دیتے جا رہے ہیں۔ لیکن ایسا انھوں نے کبھی نہیں کیا تھا اور نہ انھوں نے اس مرتبہ کیا۔ سب سے بڑی بد دعا جو وہ دیتے تھے وہ تھی "وہ تمھیں خدا سمجھے" کیونکہ وہ ایسے ماحول میں پیدا ہوئے تھے کہ انھیں خدا کا بہت ڈر تھا۔

وہ وقت میرے لئے بہت تکلیف دہ ثابت ہوا کیونکہ اسوقت اوپری عرشے پر بہت سے لوگ جمع تھے جو یہ واقعہ دیکھ رہے تھے۔ جب رات کو میں سونے کے لئے لیٹا تو میں نے مسٹر براؤن کو سترہ مرتبہ نئے اور مختلف طریقوں سے قتل کیا۔

انیسواں باب

میرے اور براؤن صاحب کے درمیان نوک جھونک

دوسفر اور کرنے کے بعد میں ایک سخت مصیبت میں گرفتار ہوگیا۔ براؤن صاحب کشتی چلا رہے تھے۔ میں پہیہ کو نیچے دبا رہا تھا۔ میرا چھوٹا بھائی بالائی عرشے پر آیا اور اس نے زور سے چلا کر کہا "براؤن صاحب! ایک میل کے بعد کسی گھاٹ پر کشتی روک دینا" مگر براؤن صاحب نے ایسا کوئی اشارہ نہیں کیا جس سے یہ معلوم ہوتا کہ انھوں نے اسکی بات سن لی تھی۔ لیکن انکا تو رویہ ہی ایسا تھا۔ اتنے مہربان وہ کہاں تھے کہ ایک چھوٹے کلرک کی بات سن لیتے۔ دوسرے ہوا بھی تیز چل رہی تھی اور براؤن صاحب تھے بہرے (حالانکہ وہ یہی ظاہر کرتے تھے کہ وہ بہرے نہیں ہیں) اسی لئے مجھے شک ہے کہ انھوں نے میرے بھائی کی بات سن لی ہوگی۔ اگر میرے دو سر ہوتے تو میں ضرور بولتا، لیکن چونکہ میرے ایک ہی سر تھا اسلئے عقلمندی اسی میں تھی کہ میں اپنے سر کی حفاظت کروں۔ اس لئے میں خاموش رہا۔

کشتی چلاتے ہوئے ہم بہت جلد ہم اس باغ تک پہونچ گئے جہاں ہمیں رکنا تھا کپتان کلن فیلڈ عرشے پر آئے اور بولے "جناب کشتی کو یہاں آنے دیجئے۔ آنے دیجئے۔ کیا ہنری نے آپ سے نہیں کہا ہے کہ یہاں ساحل پر رکنا ہے۔؟"

"نہیں جناب" براؤن صاحب نے جواب دیا۔ میں نے اسکو بھیجا تھا" کپتان نے کہا براؤن صاحب بولے "نہیں صاحب۔ وہ آیا ضرور ہوگا۔ بس اتنا ہی اس نے کیا ہوگا۔ خدا سمجھے اس بیوقوف کو۔ اس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا" پھر کپتان نے مجھ سے پوچھا "کیا تم نے بھی اسکی بات نہیں سنی۔؟" اس معاملے میں میں دخل دینا نہیں چاہتا تھا لیکن اس سے بچنے کا بھی کوئی ذریعہ

نہ تھا۔ اسی لئے میں نے کہا۔

"ہاں جناب"

میں جانتا تھا کہ براؤن صاحب کا اگلا جواب کیا ہوگا۔ انکے کہنے سے پہلے ہی میں سمجھ گیا۔ جواب یہ تھا "اپنا منہ بند کرو۔ تم نے ایسی کوئی بات نہیں سُنی"

میں نے حسبُ الحکم اپنا منہ بند کر لیا۔ ایک گھنٹہ بعد ہنری پائلٹ ہاؤس میں داخل ہوا۔ اُسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اُس کے آنے سے پہلے کیا واقعہ ہو چکا تھا۔ وہ ایک بے آزار لڑکا تھا اور اُسے دیکھ کر مجھے دُکھ ہوا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ براؤن صاحب تو اس پر رحم کریں گے نہیں۔ فوراً ہی براؤن صاحب بولے"

"ارے۔ تم نے مجھ سے۔۔۔کیوں نہیں کہا کہ ہمیں یہاں نو آبادی کے پاس رُکنا ہے۔؟"

"مسٹر براؤن' میں نے کہا تھا۔ وہ بولا۔

"تم جھوٹ بولتے ہو۔"

"آپ خود جھوٹ بولتے ہیں۔ اُس نے آپ سے کہا تھا" میں نے کہا۔

براؤن صاحب میری طرف تعجب سے گھورنے لگے اور ایک لمحے تک بالکل نہ بول سکے تب وہ چلائے۔ "میں تمہاری طرف آدھے منٹ میں رجوع ہوتا ہوں" تب وہ ہنری سے بولے "تم پائلٹ ہاؤس چلے جاؤ۔ نکل جاؤ۔"

چونکہ ایسا قانون بنا ہوا تھا کہ پائلٹ جو حکم دے اسے ماننا پڑتا تھا اسی لئے لڑکا چلا گیا اور ابھی اس کا قدم دروازے کے باہر اوپری سیڑھی پر ہی ہوگا کہ براؤن صاحب غصے میں بھر کر ایک دس پونڈ کا کوئلے کا ڈھیلا لئے ہوئے اسکے پیچھے جھپٹے۔ لیکن بیچ ہی میں ایک بھاری اسٹول لیکر میں آگیا اور میں نے براؤن پر اتنا زور کا وار کیا کہ وہ چاروں خانے چت ہو گئے۔

میں نے ایک بہت بڑا جرم کیا تھا۔ میں نے ڈیوٹی پر تعینات ایک پائلٹ پر ہاتھ اٹھایا تھا مجھے معلوم تھا کہ مجھے اصلاحی سزائے قید بھگتنا پڑے گی اور اگر میں اپنا لمبا جھگڑا اُن سے طے کرنے کا موقع پالیتا تو مجھے اور بھی زیادہ سزا ملتی۔ اسی لئے بس انکو پکڑے رہا اور میں نے مکّوں سے ان کی خوب مرمّت کی۔ مجھے پتہ نہیں کہ میں کتنی دیر انھیں مارتا رہا کیونکہ مجھے بڑا مزہ آرہا تھا لیکن آخرکار

مسٹر براؤن کوشش کرکے میری گرفت سے نکل گئے اور پہیے پر پہونچ گئے۔ اسوقت کشتی کا کنٹرول لازمی تھی کیونکہ ہماری کشتی پندرہ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پانی کاٹ رہی تھی اور کوئی بھی پہیہ پر نہیں تھا۔

یہاں سے اگلا موڑ قریب قریب دو میل تھا اور کنارہ لبالب ہونیکی وجہ سے پہلے کے مقابلے میں بہت لمبا اور گہرا معلوم ہوتا تھا مگر کشتی ٹھیک بیچ دھارا میں جارہی تھی اور کنارے کی گہرائی سے وہ کوئی فائدہ نہیں اٹھارہی تھی اتفاق سے کشتی ٹھیک جارہی تھی۔ ورنہ ہوسکتا تھا کہ کہیں کسی بہتے ہوئے پیڑ سے ٹکرا جاتی۔

یہ دیکھ کر کہ جہاز پینسلوانیا خطرے سے باہر ہے براؤن صاحب نے ایک چھوٹی دوربین اٹھاتے ہوئے مجھے حکم دیا کہ میں پائلٹ ہاؤس سے ایکدم نکل جاؤں لیکن اب مجھے انکا بالکل ڈر نہیں تھا۔ اس لئے باہر جانے کے بجائے میں وہیں رکا رہا اور اسکی زبان میں قواعد کی غلطیوں کی نکتہ چینی کرنے لگا" اسکی خوفناک گفتگو کی اصلاح کرنے لگا اور اسی کے الفاظ کو اچھی شائستہ انگریزی میں کہہ کر بتانے لگا۔ اور پھر میں نے انکی توجہ اسطرف دلائی کہ وہ جس علاقے سے آئے تھے یعنی پینسلوانیا کی کوئلہ کی کان والا علاقہ، اسکی زبان غیر مستند اور غیر مہذب تھی۔ پھر میں یہ بتانے لگا کہ صاف ستھری انگریزی بولنے کے کیا فوائد ہیں۔ مگر مسٹر براؤن تو صرف گالیوں کی گولہ باری کرنے میں ماہر تھے انھیں اچھی زبان جو گفتگو میں کام آئے آتی کہاں تھی۔ اسلئے انھوں نے شیشے کو ہاتھ سے رکھدیا اور پہیے کو ہاتھ میں لے لیا۔ وہ بڑبڑا بھی رہے تھے اور اپنا سر بھی ہلا رہے تھے۔ میں بینچ پر جا بیٹھا۔ اس غل غپاڑے کی وجہ سے ہر شخص بالائی عرشے پر آگیا تھا اور میں اسوقت اور بھی زیادہ خوفزدہ ہوگیا جب میں نے بڑھے کپتان کو بھیڑ کے بیچ میں سے اپنی طرف آتے دیکھا تو میں نے دل ہی دل میں کہا کہ اب میری شامت آگئی۔ اگرچہ اصولاً وہ باپ کی طرح ہم پر مہربان تھا اور ہم سے محبت کرتا تھا اور معمولی غلطیوں پر کچھ نہیں کہتا تھا مگر کوئی بڑی غلطی ہونے پر وہ سختی سے بھی کام لیتا تھا۔

میں نے یہ سوچنے کی کوشش کی کہ وہ ایک ایسے امیدوار پائلٹ کیساتھ کیا برتاؤ کریں گے۔ جس سے ایسی بڑی خطا سرزد ہوگئی ہو اور وہ بھی اس کشتی پر کہ جسمیں قیمتی سامان لدا ہوا ہو اور جو مسافروں سے بھی بھری ہو۔ ہمارا پہرہ قریب قریب ختم ہوچکا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ میں کہیں جاکر چھپ رہوں گا اور پھر ساحل پر اتر جانے کا موقع تلاش کروں گا۔ یہی سوچ کر

میں پائلٹ ہاؤس سے کھسک گیا اور سیڑھیوں سے نیچے اتر کر عرشے کے دروازے کے قریب کہیں رُک گیا اور وہیں کسی جگہ پر چھپنے کو تھا کہ کپتان صاحب سے آمنا سامنا ہو گیا۔ میں نے سر نیچا کر لیا وہ میرے برابر ایک دو لمحے تک خاموش کھڑے رہے پھر بڑے موثر طریقے سے انھوں نے کہا۔ "میرے پیچھے پیچھے آؤ۔"

میں انکے پیچھے پیچھے چلدیا۔ وہ مجھے عرشے کے سب سے اگلے کمرے میں لے گئے ہم دونوں کے سوا وہاں کوئی نہ تھا۔ انھوں نے میرے اندر آنے کے بعد پیچھے والا دروازہ بند کر لیا اور پھر آگے بڑھ کر آگے والا دروازہ بھی بند کر لیا۔ وہ بیٹھ گئے۔ میں انکے سامنے کھڑا ہو گیا۔ کچھ دیر تک وہ میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر بولے۔

"تو تم مسٹر براؤن سے لڑتے رہے ہو۔"

میں نے عاجزی سے سر جھکا کر جواب دیا "ہاں جناب۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ بہت سنگین معاملہ ہے۔"

"جی ہاں۔"

"کیا تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ تمھارے جھگڑے کی وجہ سے کشتی دریا میں پورے پانچ منٹ تک بغیر پائلٹ کے چلتی رہی۔؟"

"ہاں جناب"

"کیا براؤن صاحب کو پہلے تم نے مارا۔"

"ہاں جناب۔"

"تم نے کس چیز سے انھیں مارا"

"جناب۔ اسٹول سے۔"

"کیا اسٹول سخت تھا۔"

"معمولی سخت تھا، جناب"

"کیا وہ اس سے گر پڑے تھے۔"

"ہاں جناب۔"

"کیا تم نے انھیں پھر مارا۔ کیا تم نے اس سے آگے بھی کوئی شرارت کی۔؟"

"ہاں جناب"

"تم نے کیا کیا میں نے انھیں گھونسوں سے مارا"

"کیا تم نے گھونسے مارے"

"ہاں جناب"

"کیا تم نے اُنکے بہت گھونسے مارے یعنی بہت زیادہ مارا"

"ہاں جناب۔ آپ ایسا کہہ سکتے ہیں۔ یہ ممکن ہے۔"

"میں تم سے بہت خوش ہوں۔ سنو۔ یہ کبھی مت کہنا کہ تم نے ایسا کیا ہے (چپکے سے کان میں) تم نے بہت بڑا جرم کیا ہے۔ اب آئندہ ایسا مت کرنا۔ لیکن سنو۔ اسے ساحل پر لیجا کر گرا دینا اور اسکی خوب مرمت کرنا۔ جو خرچ ہوگا میں دوں گا۔ جاؤ تم یہ باتیں کسی کو ہرگز نہ بتانا۔ نکل جاؤ۔ چلے جاؤ۔ کتے کے پلے۔ تم نے بہت بڑا جرم کیا ہے۔؟"

میں باہر آگیا۔ مجھے خوشی تھی کہ میں صاف بچ آیا اور ایک بہت بڑے خفیہ کام کے لئے مجھ پر بھروسہ کیا گیا اور جیسے ہی باہر نکل کر میں نے کپتان کے کمرے کا دروازہ بند کیا تو میں نے انھیں ہنستے ہوئے اور اپنی موٹی رانوں کو تھپتھپاتے ہوئے سنا۔

جب براؤن صاحب ڈیوٹی سے واپس آئے تو سیدھے کپتان صاحب کے پاس گئے۔ کپتان صاحب بوائلر ڈیک پر کسی مسافر سے بات چیت کر رہے تھے۔ مسٹر براؤن نے یہ مانگ کی کہ مجھے نیو آرلینز میں جہاز سے اتار دیا جائے انھوں نے یہ بھی دھمکی دی کہ اگر میں جہاز پر رہا تو وہ جہاز نہیں چلائیں گے۔

کپتان صاحب نے کہا "مسٹر براؤن۔ جب آپ ڈیوٹی پر ہونگے تو وہ آپ کے پاس نہیں آئے گا۔"

براؤن صاحب بولے "اس لڑکے کے ساتھ میں کشتی پر نہیں رہوں ۔ ۔ ۔ گا۔ ہم میں سے ایک کو ساحل پر اترنا ہوگا۔"

کپتان صاحب بولے۔ اچھی بات ہے۔ آپ اتر جائیے گا" اور اسکے بعد وہ پھر

مسافروں سے بات چیت کرنے لگے۔ اس بقیہ ذرا سے سفر میں مجھے یہ محسوس ہوا کہ غلامی سے آزاد ہونے والے آدمی کو کتنی خوشی ہوتی ہے کیونکہ اسوقت میری اپنی حالت یہی تھی۔ جبتک جہاز لنگر ڈالے رہتا' اسوقت تک میں جارج ایلر صاحب کی بانسری سنتا رہتا یا انکو دو میں سے ایک نہ ایک بائبل کی آیتیں پڑھتے ہوئے سنتا۔ انکی دو بائبلیں تھیں گولڈ اسمتھ اور شیکسپیر کی تصانیف۔ یا میں انکے ساتھ شطرنج کھیلتا اور کبھی کبھی انکے ہارنے کی نوبت بھی آجاتی۔ مگر ہر بار وہ آخری چال کچھ ایسی چلتے کہ بساط ہی بدل جاتی۔

بیسواں باب

حادثۂ عظیم

ہم نیو آرلینز میں تین دن ٹھہرے' لیکن کپتان صاحب کو کوئی دوسرا پائلٹ نہ ملسکا۔ لہٰذا انھوں نے یہ تجویز کیا کہ دن کی ڈیوٹی میں دوں اور رات کی جارج ایلر۔ لیکن مجھے ڈر لگتا تھا کیونکہ ابتک میں نے اکیلے کبھی ڈیوٹی نہیں دی تھی اور مجھے اندیشہ تھا کہ کسی نہ کسی ڈھلان پر میں ضرور مصیبت میں پھنس جاؤں گا یا کسی قریبی کنارے پر کسی ریت کے ٹیلے سے ٹکرا کر کشتی کو دریا کی تہ میں پھنسا دوں گا۔ براؤن میرے ساتھ سفر کرنے کو تیار نہ تھے۔ اسلئے کپتان صاحب نے مجھے اے۔ ٹی۔ لیسی نامی جہاز کے کپتان کے پاس ایک چٹھی دیکر بھیجا جس میں انھوں نے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے سینٹ لوئی تک پہونچا دے انھیں اُمید تھی کہ وہاں پہونچ کر انھیں کوئی نہ کوئی اور پائلٹ ملجائے گا اور مجھے میری نوکری پھر مل جائے گی۔ لیسی جہاز پینسلوانیا سے دو دن بعد روانہ ہونیوالا تھا۔

جہاز "پینسلوانیا" کے روانہ ہونے سے ایک رات پہلے ہنری اور میں پشتے پر سامان کے ڈھیر کے اوپر بیٹھے آدھی رات تک بات چیت کرتے رہے۔ ہماری بات چیت کا موضوع ایک ایسا تھا جس پر ہم نے پہلے کبھی بات چیت نہیں کی تھی۔ یہ موضوع تھا دخانی کشتیوں کی تباہیاں۔ انھیں میں سے ایک تباہی ہم پر آنے والی تھی جسکا ہمیں شبہ تک نہیں تھا۔ یہ حادثہ اسٹیم پھٹ جانے سے ہونا تھا اور جس پانی سے اسٹیم بننا تھی وہ اسوقت جبکہ ہم بات چیت کر رہے تھے دریا کی چڑھائی پر ۵۰۰ میل پر کسی مخصوص جگہ پر بہ رہا ہوگا لیکن وہ پانی بہتے بہتے ٹھیک وقت پر ٹھیک جگہ پہنچ گیا۔ ہم اس بات پر اظہار خیال کر رہے تھے کہ حادثے اور دہشت کے وقت چھوٹی حیثیت کے لوگ زیادہ خدمت انجام نہیں دیتے اور صرف افسر ہی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں۔ بہرحال ہم نے یہ طے کیا کہ اگر کبھی حادثہ ہوا تو ہم لوگ کشتی کے اندر رہیں گے اور جیسا موقع و محل ہوگا کچھ نہ کچھ خدمت انجام دیں گے۔ بعد کو جب واقعی حادثہ پیش آیا تو ہنری کو وہ سب باتیں یاد آگئیں اور اس نے وہی کچھ کیا۔

جہاز "لیسی" "پینسلوانیا" کے پیچھے پیچھے ۲ دو روز بعد روانہ ہوا اور ۲ دو ہی دن بعد ہم میمفس کے کنارے گھریں پہ پر جا لگے۔ وہاں کسی نے چلا کر کہا "شپ آئی لینڈ پر "پینسلوانیا" میں آگ لگ گئی اور ایک سو پچاس ۱۵۰ جانیں ضائع ہوگئیں"۔

ارکنسا میں ہیلینا کے مقام پر اسی روز شام کو میمفس اخبار کے ایک ثانوی شمارے میں اس حادثے کی تفصیلات دی ہوئی تھیں۔ ان میں میرے بھائی کا بھی ذکر تھا۔ خوش قسمتی سے اسکے کوئی چوٹ نہیں لگی تھی۔

اسکے بعد دریا کے چڑھاؤ پر ایک مزید شمارہ اسی اخبار کا ملا۔ اسمیں بھی میرے بھائی کا ذکر تھا لیکن اس بار اسمیں یہ لکھا تھا کہ میرے بھائی کے شدید چوٹ آئی ہے اور اسکا جانبر ہونا مشکل ہے لیکن جبتک ہم میمفس نہیں پہونچے۔

ہمیں اس حادثے کی تفصیلات نہیں ملیں یہ ایک افسوس ناک کہانی ہے۔ گرمی کا موسم تھا اور صبح کے چھ بجے کا وقت تھا۔ پینسلوانیا جہاز شپ آئی لینڈ کے شمال میں آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ یہ میمفس سے ۶۰ میل دور جنوب کی طرف تھا۔ اسمیں اسٹیم آدھی تھی اور یہ ایک لکڑی کے مکان کو جو بہت تیزی سے جاتی کیلئے رکا تھا گھسیٹ رہا تھا۔ میرے خیال میں جارج ایلر .... پائلٹ ہاؤس میں اکیلے تھے۔ دوسرا
....

انجینیر۔۔۔اور ایک اسٹرائکر انجن کے کمرے میں ڈیوٹی پر تھے اور دوسرا نائب کپتان عرشے پر ڈیوٹی دے رہا تھا جارج بلیک، مسٹر وڈ، میرا بھائی، اور کلرک لوگ سب سو رہے تھے۔ نیز۔۔۔۔ بڑے انجینیر مسٹر براؤن، بڑھئی، بڑا نائب کپتان اور ایک اسٹرائکر بھی سو رہے تھے۔ کپتان کلین فیلڈر نائی کی کرسی پر بیٹھے تھے اور نائی انکی حجامت بنانے کی تیاری کر رہا تھا کیبن کے اندر کافی مسافر تھے۔ عرشے پر بھی تین چار سو مسافر تھے۔ مگر چند ایک مسافر ہی جاگ رہے تھے۔ مکان میں سے اب سب لکڑی نکالی جا چکی تھی۔ اپلر صاحب نے گھنٹی بجائی کہ اسٹیم پوری چھوڑ دی جائے اور دوسرے ہی لمحے آٹھ میں سے چار بوائلر بجلی کی کڑک کی طرح شور کرتے ہوئے پھٹ گئے جنکے پھٹنے سے کشتی کا اگلا تہائی حصہ آسمان کی طرح لٹکا ہوا دکھائی دیا اور ملبے کا زیادہ تر ڈھیر جسمیں چمنیاں تھیں کشتی پر آگرا اس ملبے میں سب سامان خلط ملط ہو کر ایک اونچا سا ڈھیر بن گیا اور کچھ ہی دیر بعد اسمیں آگ لگ گئی۔

بہت سے لوگ دور دور تک اڑ کر دریا میں جا گرے۔ ان میں مسٹر وڈ، بڑھئی، اور میرا بھائی بھی تھے۔ بڑھئی اسوقت بھی اپنی چٹائی پر لیٹا ہوا تھا جب وہ کشتی سے ۴۰ فٹ کی دوری پر پانی سے جا ٹکرایا کشتی کے پھٹنے کے بعد براؤن صاحب جو پائلٹ تھے اور جارج بلیک جو چیف کلرک تھے، کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی اور نائی کی کرسی مع کپتان کے، جو اسکے اندر ہی بیٹھے رہے اور ان کے کوئی چوٹ بھی نہیں آئی تھی کشتی ہی میں رہ گئی۔ کرسی کا تکیہ اور اسکی پیٹھ تو ضرور بچ رہے مگر اس کا اگلا حصہ اور باقی سب چیزیں اڑ گئیں اور نائی جسکے ہوش و حواس باختہ ہو چکے تھے اور جو صحیح سلامت بچ گیا تھا ایک پیر خلا میں اٹھائے کھڑا تھا اور غیر شعوری طور پر اب بھی صابن کے جھاگ تیار کر رہا تھا۔ وہ ساکت و جامد ہو کر رہ گیا تھا۔

جب جارج اپلر نے اپنے سامنے چمنی کو ہوا میں اڑتے دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ کیا خطرہ درپیش ہے۔ انھوں نے اپنا چہرہ کوٹ کے کالر میں چھپا لیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے زور سے دبا لیا تاکہ بھاپ انکے منہ اور ناک میں نہ جانے پائے۔ عرشے پہ جاتے ہوئے اور واپس آتے ہوئے انھوں نے سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ وہ فوراً ان بوائلروں کے سروں پر پہنچے جو نہیں پھٹے تھے۔ پائلٹ ہاؤس سے یہ جگہ چالیس فٹ نیچی تھی۔ اس کے ساتھ انکا پہیہ اور دوسرا بہت سا سامان تھا۔ یہاں انھیں

جلا ڈالنے والی بھاپ کے بادل نے گھیر لیا۔ بہت سے لوگ جنکی ۔سانس کے ذریعہ بھاپ اندر چلی گئی تھی مر گئے ۔ ان میں سے کوئی نہیں بچا۔ مگر ایڈ نے بھاپ میں سانس نہیں لی ۔ وہ جتنی جلدی ہو سکا کھلی ہوا میں آ گیا ۔ جب بھاپ نکل گئی تب وہ لوٹا اور پھر اس نے ہوا ملے دوں پر چڑھ کر اپنی بانسری کے ٹکڑے اور شطرنج کے مہرے اکٹھے کئے ۔

اب آگ بہت تیز ہو چکی تھی اور خطرہ بہت بڑھ چکا تھا۔ ہوا میں ہر طرف چیخ و پکار اور کراہنے کی آوازیں آ رہی تھیں ۔ بہت سے آدمی جل چکے تھے اور بہت سے اپاہج ہو چکے تھے ۔ اس دھماکے کیساتھ ایک لوہے کی سلاخ ایک آدمی کے جسم میں گھس گئی ۔ میرا خیال ہے کہ لوگوں نے مجھے یہ بتایا تھا کہ وہ شخص پادری تھا۔ وہ فوراً تو نہیں مرا مگر اُسے جو تکلیف ہوئی وہ بڑی ہولناک تھی ۔ فرانسیسی بحری فوج کا ایک سپاہی جو صرف پندرہ سال کا تھا اور جو ایک فرانسیسی امیر البحر کا لڑکا تھا اسقدر جل گیا تھا کہ اُسے دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ لیکن اس نے یہ سخت اذیتیں بڑی بہادری سے برداشت کیں ۔ دونوں نائب کپتان بری طرح جل گئے تھے لیکن وہ اپنی ڈیوٹی پر ڈٹے رہے انھوں نے لکڑی کی کشتی کو جہاز کے عقبی حصے میں سے کھینچ لیا اور وہ اور کپتان مدد دیتے ہوئے پردیسی لوگوں کو جو بدحواس ہو رہے تھے اسوقت تک ہٹاتے رہے اور ان سے اس وقت تک جدو جہد کرتے رہے جبتک انھوں نے سبھی زخمیوں کو نئی کشتی میں سوار نہ کر دیا۔

مسٹر وڈ اور ہنری جو پانی میں گر پڑے تھے تیر کر کنارے پر پہونچنے کی کوشش کر رہے تھے اور کنارہ اُن سے صرف چند سو گز کی دوری پر تھا لیکن ہنری نے سمجھا کہ اُسے بالکل چوٹ نہیں لگی (حالانکہ یہ اسکی بہت بڑی بھول تھی) اس لئے سوچا کہ وہ واپس کشتی پر جائے گا اور زخمیوں کی امداد کرے گا۔ اس خیال سے وہ مسٹر وڈ سے الگ ہو گیا اور کشتی کی طرف لوٹ گیا۔ اسوقت تک آگ اور بھی خوفناک شکل اختیار کر چکی تھی اور بہت سے لوگ جو ملبے کے نیچے مدفون ہو چکے تھے وہ دردناک انداز سے مدد کی بھیک مانگ رہے تھے ۔ آگ بجھانے کی سب کوششیں بیکار ثابت ہوئیں ۔ اسلئے پانی کے ڈول تو الگ پھینک دئے گئے اور سب افسران کلہاڑیاں لیکر کشتی کو کاٹ کاٹ کر آگ میں پھنسے ہوئے لوگوں کو باہر نکالنے کی کوشش کرنے لگے اِن پھنسے ہوئے لوگوں میں ایک اسٹرانگر بھی تھا۔ اس نے کہا کہ اس کے کوئی چوٹ

ہنیں لگی ہے لیکن وہ اپنے آپ کو نکال نہیں سکا، اور جب اس نے دیکھا کہ آگ تو کام کرنے والوں کو بھی ختم کرنا چاہتی ہے تو اس نے خواہش ظاہر کی کہ کاش اُسے کوئی گولی مار دے تاکہ جلنے والوں کی ہولناک موت سے وہ بچ جائے، لیکن آگ نے کلہاڑی چلانے والوں کو دور ہٹا دیا اور انھیں نہایت بے بسی سے اس بیچارے کی ہلتیں سننی پڑیں یہاں تک کہ آگ نے اس کی مصیبتوں کا خاتمہ کر دیا۔

آگ سے بچا کر جسقدر ممکن ہو سکا اتنا سامان لکڑی کی کشتی میں لاد دیا گیا۔ تب کشتی کو علیحدہ کر کے بہا دیا گیا اور وہ کشتی اور جلتا ہوا جہاز دونوں دریا کے بہاؤ کی طرف شپ آئی لینڈ کی طرف بہنے لگے۔ ملاحوں نے جزیرے پر پہونچ کر کشتی کو ساحل پر روک دیا۔ یہاں جھلستی ہوئی دھوپ میں کسی سایہ کے بغیر اُن مسافروں کو نیم برہنہ رہنا پڑا۔ نہ انکے پاس کھانا تھا اور نہ طاقت بحال کرنیوالی کوئی دوا اور نہ اُن کے پاس زخموں کی مرہم پٹی کا کوئی سامان۔ غرضیکہ وہ لوگ تمام دن بلا کسی امداد کے پڑے رہے۔ بالآخر ایک جہاز اس طرف سے گزرا اور وہ ان بدنصیب لوگوں کو میمفس لے گیا جہاں انھیں ہر طرح کی امداد ملی۔ اسوقت تک ہنری بیہوش تھا ڈاکٹروں نے اسکے زخموں کا معائنہ کیا اور اسے نا قابلِ علاج قرار دیدیا۔ لہٰذا اس سے توجہ ہٹا کر وہ دوسرے مریضوں کو دیکھنے لگے جو کم زخمی تھے اور جن کی جانیں بچائی جا سکتی تھیں۔

چالیس زخمیوں کو بڑے ہال کے فرش پر بچھے ہوئے ایک گدّے پر لٹا دیا گیا۔ اُن لوگوں میں ہنری بھی تھا۔ میمفس کی عورتیں روز پھول، پھل اور اچھی اچھی غذائیں اور نفیس نفیس چیزیں لیکر آیا کرتی تھیں اور وہاں رہ کر زخمیوں کی خدمت کرتی تھیں۔ سب ڈاکٹر وہاں ڈیوٹی دینے آیا کرتے تھے، نیز ڈاکٹری پڑھنے والے طلبا بھی ان مریضوں کو آکر دیکھتے تھے۔ علاوہ اسکے شہر کے باقی لوگ روپیہ یا اور ضروری چیزوں سے ان مریضوں کی امداد کرتے تھے۔ میمفس کے لوگ اس تواضع اور ہمدردی کے کام کو خوب جانتے تھے کیونکہ پینسلوانیا جہاز کی طرح نہ معلوم کتنے جہاز میمفس کے قریب مصیبت میں گرفتار ہو چکے تھے۔ اس شہر کے لوگ دوسرے شہر والے لوگوں کے مقابلے میں نیک ہمدردی لوگوں کے کردار کا نمونہ کہیں بہتر طور پر پیش کرتے تھے۔

اس بڑے ہال میں داخل ہو کر جو نظارہ میں نے دیکھا وہ میرے لئے نیا اور انوکھا تھا۔ چالیس سے زیادہ افراد دو قطاروں میں چت لیٹے ہوئے تھے ہر ایک کے چہرے اور سر پر ڈھیلی ڈھالی روئی کی بھدی سی گدی رکھی تھی۔ یہ بڑا بھیانک نظارہ تھا۔ میں وہاں چھ دن اور چھ رات رہا اور مجھے مریضوں کو دیکھ دیکھ کر بہت دکھ ہوا۔ میرے لئے یہ بڑا تلخ تجربہ تھا۔ میرے لئے ایک بات خاص طور پر تکلیف دہ تھی۔ اس نے میرے دل کو بہت آزردہ کیا۔ اور وہ یہ تھی کہ جب کوئی مریض قریب المرگ ہوتا تھا تو اُسے سب سے الگ ایک کمرے میں منتقل کر دیا جاتا تھا تاکہ اس مرنے والے کو دیکھ کر دوسرے مریضوں کا حوصلہ پست نہ ہو۔ جہاں تک ممکن ہوتا وہ مرنے والے کو چپ چاپ ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجاتے تھے اور مریض کی ڈولی کے سامنے شفاخانے کے بہت سے مریض اس طرح کھڑے ہو جاتے تھے کہ باقی مریضوں کی نظر اس خطرناک مریض کی ڈولی پر نہ پڑے لیکن دراصل اس احتیاط سے کوئی فائدہ نہ ہوتا تھا۔ بقیہ مریضوں کے سامنے اسطرح ملازمین کا کھڑا ہونا اور اپنے قدموں کی آواز کو دبانے کی کوشش کرنا اور انکا دھیرے دھیرے چلنا ان سب باتوں کا مطلب اور ہو ہی کیا سکتا تھا۔ چنانچہ مریضوں کی نگاہیں یہ سب واقعات حسرت کیساتھ دیکھتی تھیں اور پھر موت کا خوف وہراس ان سب پر طاری ہو جاتا تھا۔

میں نے خود بہت سے لوگوں کو اس موت کے گھر میں منتقل ہوتے دیکھا اور پھر انھیں کبھی لوٹتے نہیں دیکھا ...... لیکن میں نے اپنے نائب کپتان کو دیکھا جسے کئی بار اس موت کے گھر میں لیجایا گیا۔ اسکے جسم میں آگ سے ہوئی ضربات اور اسکے جلے ہوئے اعضا کو دیکھ کر بڑا خوف آتا تھا۔ اسکے بدن پر کمر تک السی کا تیل لگا تھا اور وہ روئی میں اسطرح لپٹا ہوا تھا کہ اُسے دیکھ کر یہ گمان کرنا مشکل تھا کہ یہ ایک انسان ہے۔ اکثر اوقات اس کا دماغ چل جایا کرتا تھا اور درد کے مارے وہ بہکی بہکی باتیں کرتا۔ کبھی چلاتا اور کبھی روتا چیختا۔ پھر تھوڑی دیر چپ مردہ سا پڑا رہتا۔ اسکے دماغ میں عجیب و غریب خیال آتے۔ کبھی وہ شفاخانے کے کمرہ کو جہاز کے ملاحوں کا کمرہ سمجھنے لگتا، اور اِدھر سے اُدھر جلدی جلدی جاتی پھرتی نرسوں کے گروہ کو ملاحوں کا گروہ سمجھتا اور اٹھ کر بیٹھ جاتا اور چلا چلا کر کہتا "کمر جھکاؤ۔ کمر۔ ارے او سنجر جیسے جسم والو، ارے او کھوکھے کی طرح سست لوگو ارے او مُردہ اٹھانے والو کیا صرف اپنے پیٹ کا بوجھ اٹھانے ہی کے قابل ہو؟

کیا تم جہاز کے پھٹنے کی آواز کو اپنی گالیوں کی بوچھار سے جو آسمان پر چھا رہی ہیں اور بڑھانا چاہتے ہو۔ لیکن جب تک تمہارا منہ کھلا ہوا ہے گالیوں کی بوچھار تو نکلتی ہی رہے گی۔ اسطرح وقتاً فوقتاً جب اُسے جنون ہوتا تھا تو وہ روٹی کو ہاتھ سے نوچ نوچ کر پھینکنے لگتا تھا اور اُسکا جلا بھنا پن نظر آنے لگتا تھا۔ یہ بڑا ہولناک نظارہ تھا جب شور و شر ہوتا اور تماشائی اکٹھے ہو جاتے تو اسکی وحشت میں اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ اسی لیے ڈاکٹروں نے یہ طے کیا کہ مریض کو دوا میں افیون دیکر خاموش کر دیا جائے لیکن اسے افیون کھلانا جبکہ اسکا دماغ ٹھیک ہوتا چاہے خراب بیحد مشکل تھا۔ اسکو ہمیشہ یہ وہم رہتا تھا کہ اسی خطرناک دوا سے اسکی بیوی کا انتقال ہوا تھا اسلئے وہ مر بھلے ہی جائے مگر افیون نہیں کھائے گا۔ اسے یہ بھی شبہ ہو گیا تھا کہ ڈاکٹر لوگ دوسری دواؤں یا پانی ہی میں ملاکر اسے افیون کھلانا چاہتے تھے۔ اسلئے اس نے کسی قسم کی دوا حتیٰ کہ پانی کو بھی ہونٹوں سے لگانا بند کر دیا تھا۔ ایکدن جبکہ بہت زیادہ گرمی تھی اور دو روز سے اس نے پانی نہیں پیا تھا اس نے اپنے ہاتھ میں پانی کا پیالہ لیا۔ اسوقت ایک طرف تو صاف ستھرا الٹیا تا ہوا پانی تھا اور دوسری طرف پیاس کی تکلیف۔ دونوں نے اسے اتنا مجبور کر دیا کہ وہ اپنے پر قابو نہیں پا سکتا تھا۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھال ہی لیا اور پانی کو پھینک دیا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے پانی کو اپنے پاس تک نہ آنے دیا۔ میں نے اسکو موت کے کمرے میں تین بار جاتے ہوئے دیکھا جبکہ وہ بالکل بیہوش تھا اور قریب المرگ تھا۔ لیکن ہر بار وہ بچ گیا اور اپنے معالجین کو برا بھلا کہنے لگا اور ہر بار یہ مانگ کی کہ اُسے وارڈ میں بھیجا جائے جہاں سے اُسے لایا گیا تھا۔ لیکن یہی ایک واحد مثال تھی جسمیں مریض کو موت کے گھر بھیجا کر زندہ واپس لایا گیا تھا جہاز پر پھر نائب کپتان بننے کے لیے وہ بچ نکلا۔ ایک مشہور ڈاکٹر ہیٹن نے جس میں اعلیٰ اخلاق سبھی خوبیاں موجود تھیں اپنی پوری قابلیت اور سوجھ بوجھ سے مریض کے علاج کی کوشش کی مگر جیسا کہ اخباروں میں شروع شروع میں شائع ہوا تھا اسکے زخم ناقابل علاج تھے۔ چھٹے روز شام کو اسکا پریشان دماغ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو کر جہانِ جاودانی میں پہونچ گیا اور اسکا بے حس و حرکت جسم اُسکے بستر پر پڑا پایا گیا۔ اسکا دقت آ گیا تھا لہٰذا اُس غریب کو موت کے کمرے میں بھیجا گیا۔ بے چارہ۔!

اکیسواں باب

میری سوانح حیات کا ایک حصہ

مناسب وقت کے بعد مجھے پائلٹ کا لائسنس مل گیا۔ اور میں مکمل پائلٹ بن گیا۔ مجھے کبھی کبھی اتفاقیہ ملازمتیں بھی ملتی رہیں اور کوئی آفتِ ناگہانی پیش نہیں آئی۔ پھر اتفاقیہ ملازمت کے بجائے لمبی اور مستقل ملازمتیں بھی ملنے لگیں۔ وقت آسانی سے گذرنے لگا اور میں خوشحالی کی زندگی بسر کرنے لگا۔ اب مجھے یہ امید ہوگئی کہ میں اپنی بقیہ زندگی دریا پر ہی گذاروں گا اور اپنا کام پورا ہو جانے پر اسی ملازمت میں مروں گا۔ لیکن رفتہ رفتہ جنگ شروع ہوگئی۔ تجارت رک گئی اور میری ملازمت بھی ختم ہوگئی۔

مجھے اب گذر اوقات کے لئے کوئی اور ذریعہ معاش تلاش کرنا پڑا اور میں نوادا کے علاقے میں ایک چاندی کی کان میں کام کرنے لگا۔ پھر اخباری نامہ نگار بنا، پھر کیلیفورنیا میں ایک سونے کی کان میں ملازم ہوا، پھر فرانسسکو میں اخباری نامہ نگار، پھر سینڈوچ آئی لینڈ میں خصوصی نامہ نگار، پھر یورپ اور مشرقی ملکوں میں گشتی نامہ نگار اور بعد ازاں ایک جگہ لیکچرار ہو کر تقریریں دینے کا کام کرتا رہا اور آخر میں نیوانگلینڈ کی دوسری پہاڑیوں پر اطمینان سے بیٹھ کر کتابیں لکھنے لگا۔

بہت تھوڑے الفاظ میں میں نے بتا دیا ہے کہ پائلٹ ہاؤس سے نکل کر میں نے کیسے اپنی زندگی کے اکیس سال مختلف شعبوں میں گذارے۔ آئیے اب پھر وہیں لوٹ چلیں۔

بائیسواں باب

میں اپنے پرانے پیشے کو پھر اپناتا ہوں

اکیس۲۱ برس کی طویل مدت گذرنے کے بعد مجھے زبردست خواہش ہوئی کہ میں دریائے مسیسپی کو دیکھنے، وہاں کشتیوں پر کام کرنے اور اپنے پرانے دوستوں سے ملنے جاؤں۔ چنانچہ میں نے وہاں جانے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اپنے ساتھ چلنے کے لئے میں نے ایک شاعر کو راضی کرلیا۔ نیز ایک مختصر نویس کو بھی اپنے ساتھ لیا کہ وہ اس شاعر کی شاعری کو نوٹ کرتا رہے۔ میں وسط اپریل میں مغرب کی طرف روانہ ہوا۔

چونکہ میرا خیال تھا کہ میں شاعری کو لکھوا کر شائع کراؤں گا اسلئے میں نے اس کام کا ایک باقاعدہ منصوبہ بنایا۔ میں نے گمنام رہنا پسند کیا۔ میں نے سوچا کہ اگر میں دریا پر مشہور ہو گیا تو مجھے اور کہیں آنے جانے، بات چیت کرنے تفتیش کرنے یا کوئی خفیہ باتیں معلوم کرنے کے لئے اتنی فرصت نہیں ملے گی جتنی کہ گمنام رہ کر مل سکتی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد آیا کہ پرانے زمانے میں دخانی کشتیوں کے ماحول میں یہ رواج تھا کہ جب کوئی اجنبی ملتا تو اُسے دریا کے متعلق اچھی اچھی باتیں بڑھا چڑھا کر بتائی جاتیں تھیں تاکہ جب وہ غریب الوطن اپنے وطن واپس جائے تو محض جھوٹے اور غیر حقیقی افسانے لے کر جائے۔ اسی لئے میں نے تہیہ کر لیا کہ ہم لوگ اپنے فرضی نام رکھ لیں تاکہ اپنا کام چلانے میں آسانی ہو۔ یہ خیال واقعی بہت عمدہ تھا لیکن اس سے پریشانی بھی بے انتہا بڑھ جاتی تھی کیونکہ ایسے نام جیسے "اسمتھ"، جونس اور جونسن بظاہر تو آسان ہیں مگر جب کسی مخصوص موقع پر انھیں یاد کرنے کی ضرورت پڑتی ہے تو یاد نہیں آتے۔ مجرم لوگ کیسے اپنا "عرف" یاد رکھتے ہیں اسمیں ضرور کوئی راز ہے کیونکہ مجھے وقت

ضرورت اپنا فرضی نام مشکل سے ہی یاد آتا تھا غالباً اسلئے میں تو مجرم تھا نہیں اور اگر میں کوئی
جرم کرکے اپنے ضمیر کو گندہ کرلیتا تب تو مجھے کوئی بھی نام یاد رکھنا مشکل ہوجاتا۔

ہم لوگ ۸ اراپریل کی صبح کو ۸ بجے پینسلوانیا ریلوے سے چل دئے میرے
قلمبند کئے ہوئے روزنامہ کے حالات حسب ذیل ہیں :۔

شام۔ لباس کے بارے میں گفتگو۔ نیویارک سے جتنی دُور جائیے حسن اور شائستگی
اتنی ہی کم ہوتی چلی جاتی ہے۔

میری یادداشتوں میں یہ جملہ بھی محفوظ ہے۔ چاہے آپ کسی سمت میں جائیں یہ حقیقت
اپنی جگہ اٹل ہے۔ آپ شمال، جنوب، مشرق یا مغرب کسی طرح جائیں ہر روز صبح اٹھتے ہی آپ
یہ فرق دیکھیں گے۔ اگر آپ کو یہ اندازہ کرنا ہو کہ آپ نیویارک سے کتنی دور نکل آئے ہیں تو
آپ جہاں اسوقت پہونچ چکے ہیں وہاں کے لوگوں کے لباس کو دیکھئے اور غور کیجئے کہ اسکی خوبصورتی
اور خوشنمائی میں نیویارک کے لوگوں کے لباس سے کتنا فرق ہے۔ اسی حساب سے نیویارک کے
فاصلے کا اندازہ لگائیے۔ یہ اندازہ آپ کو صرف عورتوں کے لباس سے ہی نہیں بلکہ مردوں کے
لباس سے بھی ہوجائیگا۔ لباس کا چال ڈھال پر خاص اثر ہوتا ہے اور میرے خیال میں
یہ کہنا درست ہی ہے کیونکہ شہروں میں بہت سے مرد اور عورتیں ایسی ہیں جنکے لباس نیویارک
کے بہترین درزیوں یا لباس فروخت کرنیوالے لوگوں نے بنواکر دئے ہونگے لیکن اس بات کا
کوئی اثر مذکورہ بالا حقیقت پر نہیں ہوتا اور کوئی بھی سمجھدار شخص انکے لباس کی وجہ سے انہیں
...... نیویارک کا باشندہ نہیں سمجھتا۔ دراصل جو لوگ نیویارک میں پیدا ہوتے ہیں اور
پرورش پاتے ہیں انکی زندگی میں ایک خاص وقار شائستگی اور دہریت ہوتی ہے جو محض
ویسے کپڑے پہننے سے نہیں آتی۔

۱۹ اراپریل۔ آج صبح ہم لوگ اُس علاقے میں پہونچے جہاں کے لوگ بکرے کی
سی داڑھی رکھتے ہیں اور داڑھی کیساتھ ساتھ کبھی کبھار مونچھیں بھی رکھ لیتے ہیں۔

ایسی جگہ جہاں ایسا متروک اور بھدا رواج ہو ماحول کچھ عجیب سا لگتا ہے اور ایسا
محسوس ہوتا ہے جیسے اچانک آپکا کوئی قدیم ملاقاتی جسے آپ کبھی کا مرا ہوا تصور کرچکے

ہوں آپکے روبرو آجائے اس قوم کے لوگ خاصے وسیع علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ انکا حضرت
آدم اور بائبل میں درج پیدائش کی تاریخ پر ایسا کٹر عقیدہ ہے کہ اُسے بدلا نہیں جا سکتا۔ علمِ سائنس
کی تحقیقات انکے عقیدے پر قطعاً اثر انداز نہیں ہو سکیں۔

ب پھر:-
ریلوے اسٹیشن پر آوارہ گرد اپنی پینٹوں کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈال کر چلتے ہیں۔ اس
سے پیشتر یہ دیکھا جاتا تھا کہ لوگ ایک ہاتھ پینٹ سے باہر رکھتے تھے مگر یہاں یہ رواج کبھی
نہیں رہا۔ یہ علم جغرافیہ کا ایک اہم نکتہ ہے۔

اگر کسی ملک کی خصوصیات کا وہاں کے لفنگوں کے کردار سے اندازہ لگایا جائے تو یہ اور
بھی اہم بات ہوگی۔

اس سے پیشتر یہاں کے لفنگوں کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ انکی ایک عادت یہ۔۔۔۔
تھی کہ وہ ایک پیر کی پنڈلی دوسرے پیر سے کھجلایا کرتے تھے مگر اب یہاں اس طرح کی چیزیں دیکھنے کو نہیں
ملیں گی۔ کیونکہ یہ عادت اب منحوس سمجھی جاتی ہے۔

کچھ عرصے بعد ہم اس علاقے میں پہونچے جہاں لوگ تمباکو بہت چباتے تھے۔ پچاس سال
پہلے تمام امریکہ میں تمباکو کو چبانے والے لوگ تھے لیکن اب کئی ریاستوں میں اسکی کاشت پر
پابندی ہے۔

اور آگے بڑھنے پر وہ علاقہ آیا جہاں لوگ ٹخنوں تک کے جوتے پہنتے تھے مگر ایسے لوگ یہاں
بہت بڑی تعداد میں نہیں تھے البتہ مسیسپی کے نشیبی علاقے میں یہ جوتے عام طور پر پہنے جاتے
تھے۔ ریاستہائے متحدہ کے دوسرے علاقوں میں جہاں کیچڑ ختم ہو چکی ہے، ان جوتوں کا
رواج اٹھ رہا ہے اور امید ہے کہ جب سڑک کے دونوں طرف پیدل چلنے والوں کے لئے پٹریاں
بن جائیں گی تو دیہاتوں میں بھی اور خصوصاً دریا کے کنارے کے دیہاتوں میں بھی ان
جوتوں کا رواج ختم ہو جائے گا۔

ہم سینٹ لوئی رات کے دس بجے پہونچے۔ وہاں کے ہوٹل کیلئے بھی میں نے جلد ہی سے
اپنا ایک فرضی نام رکھ لیا اور یہی نام وہاں کے کلرک کو بتا دیا۔ مگر اس بے پروائی سے اتنی

آسانی سے نام بدلنے کی کوشش کامیاب نہ ہو سکی کلرک کو مجھ پر شک ہو گیا مگر اُس نے بڑی ہمدردی
اور رحمدلی سے میری طرف بغور دیکھا جیسے کوئی معزز انسان کی جو مشکوک حالت میں پایا جائے
جانچ کرے پھر اُس نے کہا یہ ٹھیک ہے مجھے معلوم ہے کہ آپ کس طرح کا کمرہ چاہتے ہیں
میں نیو یارک کے سینٹ جیمز میں بھی کلرک کی حیثیت سے کام کر چکا ہوں "
یہ تھی ایک دھوکے بازی کی زندگی کی خراب شروعات۔ ہم اُوپر کے کمرے میں گئے اور وہاں
دو اور آدمیوں سے ملے جن سے میری ملاقات پیشتر بھی ہو چکی تھی یہ کتنی عجیب بات ہے۔ کہ بدمعاش
اور دھوکے باز لوگ جگہ جگہ میرے فرضی نام سے لیکچر دیتے ہیں اور کوئی ان پر شبہ بھی نہیں
کرتا لیکن جب ایک ایماندار آدمی کسی کو فریب دینے کی کوشش کرتا ہے تو فوراً اسکی پول
کھل جاتی ہے۔
اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر اس جگہ پر ایسے لوگ اکٹھے ہوتے ہیں کہ جنکو دھوکہ نہیں
دیا جا سکتا تو بہتر ہے کہ ہم لوگ یہ جگہ چھوڑ کر دوسرے ہی روز دریا کے بہاؤ کی طرف روانہ
ہو جائیں ۔ تاہم اس طرح سینٹ لوئی سے فوراً چل دینا ہمیں بڑا ناگوار گذرا کیونکہ ہمارا یہاں کم
از کم ایک ہفتہ قیام کرنے کا ارادہ تھا۔ "ساوزرن" یہاں کا ایک اچھا ہوٹل تھا اور ہمیں یہاں
خاصا آرام ملنے کی اُمید تھی یہ ہوٹل تھا بھی بڑا اور یہاں کا انتظام بھی اچھا تھا۔ یہاں کی
سجاوٹ کو دیکھ کر وہ اکتاہٹ ہرگز نہیں ہوتی تھی جو شکاگو کے "پامر ہاؤس" کو دیکھ کر ہوتی
تھی۔ اسمیں شک نہیں کہ یہاں جو بلیرڈ کی میزیں رکھی تھی وہ قدیم سلورین زمانے کی تھی اور چھو
چھڑیاں اور گیندیں تھیں وہ پلوسین کے عہد کی تھیں۔ لیکن ایسی چیزیں تکلیف دہ نہیں ہوتیں
کیونکہ پرانی چیزوں کو غور سے دیکھنے سے سکون اور تفریح کا احساس ہوتا ہے۔
بلیرڈ کے کمرے میں یہ بھی البتہ کھٹکتی تھی کہ یہاں کوئی ملاح دکھائی نہیں دیتا تھا۔
اگر کوئی ملاح یا جہاز کا کوئی دوسرا ملازم یہاں ہوگا بھی تو اس نے اپنا نام و پتہ فرضی لکھا
دیا ہوگا اور وہ بھیس بدلے کھڑا ہوگا کیونکہ وہاں جو لوگ میں نے دیکھے ان میں کوئی شیخی یا
شان نہیں تھی اور نہ اپنے پیسے کا دکھاوا یا فضول خرچی کی عادت جو ملاحوں کی خاص خوبیاں
ہوتی ہیں۔ قدیم زمانے میں دخانی کشتیوں پر ملازمت کرنے والے ملاح اور خشکی پر رہنے والے

عوام میں یہی فرق ہوتا ہے اور یہ فرق خصوصاً اسوقت اور بھی نمایاں ہوتا تھا جب قدیم زمانے
میں سب طرح کے لوگ سینٹ لوئی کے بلیرڈ کے کمروں میں جمع ہوتے تھے ان دنوں خاص
خاص دکانوں میں ملاح لوگ کثیر تعداد میں ٹھہرتے تھے۔ فرض کیجئے کہ اگر وہاں پچاس آدمی
اکٹھے ہوتے تو سمجھئے کہ اسمیں سے تیس یا پینتیس ملاح ضرور ہوتے تھے۔ لیکن مجھے شک ہے کہ
اب وہ ملاحوں کا درجہ نہیں ہے اور نہ پہلے کی طرح انکی نوابی شان و شوکت ہے۔ میرے زمانے میں
ملاح ریسٹورینٹ کے ملازم کو بل، جو "یا" نام کہا کرتے تھے اور اسکے کندھوں پر ڈھول جمایا کرتے
تھے۔ میں نے یہ خود دیکھا تھا۔ لیکن اب اِن لوگوں میں سے کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ
ملاحوں کی جو شان پہلے تھی وہ اب نہیں تھی ان اکیس[۲۱] سالوں میں بالکل ختم ہو چکی تھی۔

جب میں اپنے کمرے میں گیا تو وہاں ایک شخص مسمّی روجرس کو روتے ہوئے دیکھا۔
دراصل اس شخص کا نام روجرس نہ تھا نہ اس کا نام جونس، براؤن، ڈیکسٹر، فرگوسن یا بیکم
تھا اور نہ تھا میلسن تھا لیکن اگر ضرورت کے وقت کوئی اُسے مذکورہ بالا کسی نام سے پکارتا تو وہ
فوراً جواب دیتا تھا اُسے صرف یہ معلوم ہو جانا چاہیئے تھا کہ آپ اسی کو بلانا چاہتے ہیں وہ مجھ سے
بولا: "اگر یہاں کسی شخص کو پیاس لگے تو وہ کیا کرے کیا یہ کیچڑ پیئے۔؟

کیا آپ اسے نہیں پی سکتے۔؟

وہ اگر میں اسے کسی دوسرے پانی سے دھو سکوں تو پی سکتا ہوں" اس نے جواب
دیا۔

دریائے مسیسپی کے پانی میں برسوں کے بعد بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اسکے پانی
کا گدلا رنگ بالکل نہیں بدلا تھا شاید صدیوں بعد بھی اسمیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ
پانی دریائے مسوری کا ہے جس میں بڑا تلاطم برپا رہتا ہے اور جو اپنے کناروں کو ہمیشہ
کاٹتا رہتا ہے۔ اسکے ایک گلاس پانی میں قریب ایک ایکڑ زمین کی مٹی گھلی ہوتی ہے۔ مجھے
اس علاقے کے نشیب میں یہ حقیقت معلوم ہوئی۔ اگر آپ اپنا گلاس آدھ گھنٹے تک رکھا رہنے
دیں تو آپ مٹی کو پانی سے بڑی آسانی سے علیحدہ کر سکتے ہیں اور آپکو دونوں چیزیں اچھی
حالت میں ملیں گی۔ ایک چیز کھانے میں اچھی ہو گی اور دوسری پینے میں۔ یہ مٹی بہت زرخیز

ہوتی ہے اور یہ پانی بہت صحت بخش۔ ایک چیز سے بھوک مٹتی ہے اور دوسری سے پیاس لیکن یہاں کے باشندے دونوں چیزوں کو علیحدہ علیحدہ استعمال نہیں کرتے بلکہ دونوں کو ساتھ ساتھ پیتے ہیں کیونکہ قدرت نے دونوں کو ملا دیا ہے۔ جب انھیں گلاس کے پیندے پر ایک انچ موٹی مٹی کی تہ ملتی ہے تو وہ اسے ہلاتے ہیں اور تب اسکا گھونٹ ایسے بھرتے ہیں جیسے دلیا کھا رہے ہوں۔ مگر ایک اجنبی کے لئے یہ عادت ڈالنا مشکل ہے لیکن اگر ایکبار اس مٹی کو کھانے کی عادت پڑ جائے تو پھر وہ اسے صاف پانی پر ترجیح دے گا اور ہونا بھی یہی ہے۔ کشتی چلانے اور پینے کے لحاظ سے یہ پانی بہت عمدہ ہے لیکن اس کا سوائے بپتسمہ کرانے کے اور کوئی مصرف نہیں ہوتا۔

دوسرے روز صبح ہم لوگ شہر میں گھومنے گئے۔ بارش ہو رہی تھی۔ شہر بالکل پہلے جیسا ہی معلوم ہوتا تھا۔ مگر دراصل یہ شہر بہت بدل چکا ہے گو ایسا معلوم نہیں ہوتا کیونکہ سینٹ لوئی میں لنڈن یا پٹس برگ کی طرح آپ کسی چیز کو بھی نئی نہیں کہہ سکتے کیونکہ کوئلے کے دھوئیں سے ہر چیز میلی سی لگنے لگتی ہے۔ اس شہر کی آبادی پہلے جب میں یہیں کا باشندہ تھا اسوقت سے ابتک دُگنی ہو چکی ہے۔ اب یہاں کی آبادی چار لاکھ ہے پھر بھی اسکے کاروبار کی جو مخصوص جگہیں ہیں انمیں بظاہر کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے البتہ مجھے یقین ہے کہ سینٹ لوئی شہر میں اب پہلے اُتنا دھواں نہیں دکھائی دیتا جتنا پہلے دکھائی دیتا تھا۔ پہلے تو شہر کے اُوپر دھواں ایک کالے ہر لون والے شامیانے کی طرح چھایا رہتا تھا جسکی وجہ سے آسمان نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تھا، مگر دھوئیں کی تہ اب پہلے کے مقابلے میں بہت پتلی ہوتی ہے۔ پھر بھی۔۔۔۔ میرے خیال سے دھواں وہاں اب بھی کافی ہوتا ہے گو میں نے کوئی شکایت نہیں سنی۔ لیکن شہر کے قرب وجوار میں تبدیلیاں کافی ہو چکی ہیں خاصکر رہنے کے مکانوں کی بناوٹ میں۔ نئے مکانات عمدہ خوبصورت اور نئے فیشن کے ہیں۔ ان مکانات کے اردگرد ہرے بھرے گھاس کے میدان ہیں جنکے پس منظر میں یہ مکانات بہت خوبصورت لگتے ہیں۔ مگر قدیم عمارتیں ایک ہی سلسلے میں بنی ہوئی ہیں اور ایک ہی نمونے کی ہیں جنمیں ایک سی کھڑکیاں ہیں۔ انمیں محرابیں ہیں جو ناہموار پتھروں کی بنی ہوئی ہیں۔ قدیم زمانے میں چونکہ اس قسم کے مکانات بڑے شاذونادر ہوتے تھے اسلئے بڑے خوبصورت سمجھے جاتے تھے۔

شہر میں ایک تبدیلی اور بھی ہوئی ہے اور وہ ہے "فارییسٹ پارک" میرے لئے یہ چیز نئی تھی۔ یہ پارک بہت خوبصورت اور کشادہ ہے اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اسکا بیشتر حصّہ قدرتی ہے مصنوعی نہیں۔ یہاں دوسرے خوبصورت پارک بھی ہیں جیسے "ٹاور۔ گروو" اور بوٹینیکل گارڈینس" دراصل سینٹ لوئی میں اور شہروں کے مقابلے میں باغبانی کا بہت زیادہ شوق ہے۔

اگر میں چاہتا تو پہلی بار جب میں نے اس شہر کو دیکھا تھا میں اسے ساٹھ لاکھ ڈالر میں خرید لیتا۔ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی کہ میں نے یہ کام نہیں کیا۔ اسی لئے اب مجھے بہت افسوس ہوتا ہے جب میں اس گول گنبد والے اور اونچے برجوں والے شہر کو دیکھتا ہوں جہاں کی وہ قدرتی خوبصورتی بالکل ختم ہو گئی ہے اور اب وہاں صرف اینٹ اور چونے کی عمارتیں بہت دور تک پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں جو زیادہ فاصلے کی وجہ سے دھندلی سی معلوم ہوتی ہیں مجھے رہ رہ کر پچھتاوا ہوتا ہے کہ میں نے ایسا موقع کیوں ہاتھ سے جانے دیا۔ مگر اب تو اس بات کو سوچنا محض بیوقوفی ہے کہ اسکا کوئی علاج نہیں۔ البتہ میرے اُسے نہ خرید سکنے کی کچھ وجوہات بھی تھیں۔

اسکاٹ لینڈ کے ایک باشندہ مسٹر چارلس آگسٹس نے قریب بیتالیس یا پچاس سال پہلے اس شہر کے بارے میں لکھا تھا:۔

"یہاں کی سڑکیں تنگ ہیں اور انکے دونوں جانب کی پٹریاں بھی خراب ہیں۔ اور نہ یہاں روشنی کا انتظام ہی ٹھیک ہے۔" سڑکیں تو اب بھی تنگ ہیں اور پٹریاں بھی خراب ہیں لیکن روشنی کے انتظام کی شکایت اب نہیں ہو سکتی یہاں ایک ہی مشہور عمارت تھی اور وہ تھی کیتھولک چرچ جسکی تعریف کرنے کے لئے خفیہ طور پر مسٹر مرے کو بلوایا گیا تھا۔ اس میں یونانی طرز کی برساتی بنی ہوئی تھی جسکے اوپر ایک برجی بھی تھی۔ یہ اور عمارتوں کی نسبت بہت چھوٹی تھی اور اس پر طرح طرح کے نقش و نگار بنے ہوئے تھے جنکو وہ اسکاٹ لینڈ کا باشندہ جسکی قوت متخیلہ کمزور تھی بیان نہیں کر سکا۔ لہٰذا جب ایک جرمنی کے باشندے نے اسکی خوبیوں کو اُسے سمجھایا تو وہ اس جرمن باشندے کا بہت شکر گذار ہوا۔ جرمن باشندے نے اپنے الفاظ میں کہا "یہ تو ملینگ کے پایوں جیسی لگتی ہے۔"

اب سینٹ لوئی میں بہت ہی خوبصورت اور شاندار سرکاری عمارتیں بن چکی ہیں

اور نتیجتہً اس چھوٹے سے گرجا گھر کی جس پر کبھی یہاں کے لوگوں کو بڑا فخر تھا اہمیت بہت دنوں سے ختم ہو چکی ہے لیکن پھر بھی اگر مسٹر مترے واپس آ کر دیکھیں تو ان کو کوئی تعجب نہیں ہو گا کیونکہ انھوں نے بڑے زبردست اعتماد کیساتھ یہ پیش گوئی کی تھی کہ مستقبل میں سینٹ کوئی بہت بڑا شہر بن جائے گا۔

اسطرح معائنہ کرتے ہوئے ہم لوگ جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے ہم پر یہ بات واضح ہوتی چلی گئی کہ پچھلی بار جب ہم نے اس شہر کو دیکھا تھا تب سے یہاں بہت ترقی ہو چکی ہے۔ پہلے کے مقابلے میں اب ہمیں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں بھی یہاں جو لگاتار ہوتی رہی تھیں زیادہ نمایاں معلوم ہونے لگیں۔ ان تبدیلیوں سے شہر کی ترقی اور خوشحالی کا پتہ چلتا تھا

لیکن سب سے بڑی تبدیلی ان پشتوں میں ہوئی تھی جو مسیپی کے کنارے بنائے گئے تھے۔ جہاں پہلے ایک میل تک جہاز ہی جہاز چلتے نظر آتے تھے وہاں اب صرف نصف درجن مریل سی دخانی کشتیاں کھڑی تھیں۔ یہ دیکھ کر ہمیں افسوس بھی ہوا اور برا بھی لگا ......

...... ہمیں یہ بتایا گیا کہ بلیر ڈو ایے کہ یہ کادہ خوش مزاج ملازم بھی اب وہاں نہیں ہے اس کی ملازمت ختم ہو گئی تھی اور وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔ اب وہ بھی ایک عام سا آدمی ہو کر رہ گیا تھا۔ گمنامی کی حالت میں اب وہ کہیں کسی مل میں نوکری کرتا تھا۔ اسکا رسوخ ختم ہو چکا تھا۔ جہاں کبھی ہزاروں تجارتی جہاز اکٹھے ہوا کرتے تھے اور لوگ آپس میں لڑتے جھگڑتے تھے اور جہاں بڑی رونق رہتی تھی وہاں اب ویرانی سی نظر آتی تھی۔ صرف کہیں چند بے رونق دخانی کشتیاں کھڑی تھیں یا کہیں کوئی دہسکی کے نشے میں چور حبشی پڑا سو رہا تھا۔ باقی ایک میل لمبا گھاٹ قبرستان سا معلوم ہوتا تھا کیسی شاعر نے اس کا نقشہ یوں کھینچا تھا۔

"قدیم سمندر آنکھوں میں آنسو بھرے بیقرار ہونٹوں سے بڑبڑاتا ہوا معلوم ہوتا ہے گویا وہ ویران پلوں یا پشتوں سے ٹکراتے ہوئے ہزاروں قدیم گمشدہ جہازوں کو پکار رہا ہو"

جہازوں کو کھینچنے والی کشتیوں اور ریلوں نے دخانی کشتیوں کو بیکار کر دیا تھا ــــ انھوں نے اپنا کام اتنی اچھی طرح اور مکمل طور پر انجام دیا کہ اب دخانی کشتیوں کی ضرورت

ہی نہیں رہی تھی۔ وہ مضبوط پل جو ہمارے سروں کے اوپر دُور تک پھیلا ہوا تھا اُسے قتل اور لوٹ مار میں غنیموں نے اڑا دیا پرانے ملاحوں نے جو ابھی زندہ تھے مجھے بتایا کہ اُس پل کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ اگرچہ جس گولہ بارود سے پل کو اڑا دیا گیا تھا وہ بھی اچھے قسم کا نہیں تھا مگر اس بات سے ان لوگوں کو جنکی جانیں ضائع ہو چکی ہیں کیا تسلی اور فائدہ ہو سکتا ہے؟

دریا کے دونوں ساحلوں پر پیدل چلنے والوں کا راستہ بھی خراب و خستہ حالت میں تھا اور ٹہلنے کے لئے جو سڑکیں بنائی گئی تھیں وہ بھی اب مرمت طلب تھیں کیچڑ بیحد تھی مگر یہاں کے لوگ ان چیزوں کے عادی ہو چکے تھے اور مطمئن تھے مگر پہلے جیسے ٹھیلوں کے ہجوم، مسافروں کی بھیڑ، انکا لڑنا جھگڑنا، اور سامان کے انبار، یہ سب چیزیں اب کہیں دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ اب تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا یہاں کوئی عبادت گاہ یا آرام گاہ ہو جہاں خاموشی چھائی رہتی ہے۔ صرف ماہی گیروں کی کشتیاں پہلے کی طرح بدستور دکھائی دیتی تھیں گو کاروبار ان کا بھی اب سرد تھا۔ زہر نوش یعنی آئرلینڈ کے شرابیوں کا ہجوم بھی اب کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اب انکی جگہ چند ایک چیتھڑوں میں ملبوس غریب رہ گئے تھے جو دور تک منتشر تھے۔ کچھ شراب پی رہے تھے اور کچھ پیئے ہوئے تھے۔ کچھ نیند میں جھوکے کھا رہے تھے اور کچھ پڑے سو رہے تھے۔ سینٹ لوئی ایک بڑا خوش حال اور ترقی یافتہ شہر تھا لیکن دریا کا ساحل بے رونق تھا اور اب اسکی رونق کا بحال ہونا ناممکن تھا۔

مسیسپی میں دخانی کشتیوں کی آمدورفت ۱۸۱۲ء میں شروع ہوئی تھی۔ پہلے تیس سال کے عرصے میں اِن کا رواج بہت زیادہ بڑھا اور پھر اگلے تیس سال میں یہ ختم بھی ہو گیا اتنی اچھی چیز کی اتنی تھوڑی زندگی۔ اگر دخانی کشتیوں کا رواج ابھی بالکل ختم نہیں ہوا ہے اور نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس اسّی سالہ پرانی سواری کے جو کسی زمانے میں دریا کی ہموار سطح پر تیس تیس فٹ تک اچھل سکتی تھی، اجزا بیکار ہو گئے ہیں البتہ ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ مسیسپی کی دخانی کشتی جو گذشتہ زمانہ میں بہت مفید سواری ثابت ہوئی تھی اور جس کا رواج اُس وقت بڑے زوروں پر تھا اب قریب قریب متروک اور معطل ہو چکی تھی۔

دخانی کشتی نے پرانے فیشن کی کشتیوں کو بالکل ختم کر دیا کیونکہ نیو آرلینز تک سامان

ڈھونڈنے میں دخانی کشتی پرانی کشتی سے ایک ہفتہ کم لیتی تھی لیکن ریلوں کی ایجاد نے مسافروں کو زیادہ سہولتیں پہونچائیں اور جہازوں کے ذریعہ لوگوں نے سفر کرنا بہت کم کر دیا کیونکہ جو سفر کشتی سے ایک ہفتے میں ہوتا تھا وہ ریل کے ذریعے صرف دو یا تین دن میں ممکن ہو گیا تھا۔ باربرداری والے جہازوں کو جہاز کھینچنے والی کشتیوں نے ختم کر دیا کیونکہ یہ کشتیاں اسباب سے بھرے چھ یا سات جہازوں کو دریا کے بہاؤ پر ایکدم کھینچ سکتی ہیں اور ان میں اتنا کم صرفہ آتا ہے کہ اب باربرداری کے جہازوں میں آپسی مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تاہم ابھی تک سامان اور مسافروں کے بحری راستے کے جانے کے لئے دخانی کشتیاں موجود ہیں اور یہ کشتیاں دریائے مسسپی میں دو ہزار میل کے فاصلے میں جو سینٹ پال اور نیو آرلینز کے درمیان ہے چلتی ہیں۔ اور ان کا انتظام دو یا تین کارپوریشنیں کرتی ہیں جنکے پاس کافی پونجی ہے۔ انکی دیکھ بھال قابل سربراہوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے جو جہازرانی کے کام سے جس سے کسی زمانے میں لوگ مالا مال ہو جاتے تھے اب بھی کافی پیسہ کماتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ نیو آرلینز اور سینٹ لوئی پر اس انقلاب کا اثر کچھ زیادہ نہیں ہوا مگر دریا کے کنارے جنگلات میں رہنے والے لوگ تباہ ہو گئے۔ یہ لوگ مسسپی کے کنارے تمام راستے پر سفر کرتے تھے انکا سامان پاس پاس قطاروں میں رکھا ہوتا تھا اور ایک شہر سے دوسرے شہر تک ان کشتیوں کے ذریعہ ہی پہنچتا تھا۔ انکی لکڑی یا تانت بے انتہا مقدار میں بہ سہال نقد داموں میں فروخت ہوتی تھی۔ مگر اب جو دخانی کشتیاں رہ گئیں ہیں وہ کوئلہ جلاتی ہیں۔ لہٰذا اب دریائے مسسپی پر لکڑی کے ڈھیر تو شاذ و نادر ہی دکھائی دیتے ہیں۔ وہ طبقہ جو جنگل سے روٹی کماتا تھا اب کہاں گیا۔؟

تیئیسواں باب

بھیس بدل کر سفر کرنا

میرا ارادہ تھا کہ میں سینٹ لوئی اور نیو آرلینز کے درمیان ہر شہر میں کچھ مدت تک ٹھہر ٹھہر کر سفر کروں ۔ اسکے لیے یہ ضروری تھا کہ میں تھوڑی تھوڑی دور چلنے والے جہازوں میں سفر کروں ۔ بیس سال پہلے ایسا منصوبہ بنانا اور اس پر عمل کرنا بہت آسان تھا لیکن اب یہ ممکن نہیں تھا کہ آجکل کشتیاں زیادہ دور تک ہی چلتی ہیں ۔

میں یہ سفر سینٹ جنیویو (St. Genevieve) اور کیا سکا سکیہ (Kas Kas Kia) سے جو سینٹ لوئی سے ساٹھ میل جنوب میں پر رونق فرانسیسی نوآبادیات ہیں شروع کرنا چاہتا تھا اس علاقے کیلئے ایک ہی کشتی کا اشتہار میں نے دیکھا تھا ۔ اسکا نام [illegible] اور [illegible] ہمارے لیے ایک ہی کشتی کافی تھی ۔ لہٰذا ہم اسے دیکھنے گئے ۔ کشتی پرانے ڈھنگ کی تھی جو کسی اجڑے ہوئے پرانے محل سے مشابہ تھی اور سفر کے مطالب کی ہرگز نہیں تھی ۔ یہ کسی شخص کی ذاتی ملکیت [illegible] میں [illegible] تھی کہ وہ کمپنی کی ذاتی ملکیت ہونے کی بجائے کرائے کی [illegible] ہوتی تھی لہٰذا اس پر زیادہ محصول لگایا گیا تھا وہ ٹھیکے کی تھا شیڈا سکیم [illegible] ایسی جگہ بھی ہیں جہاں اس جہاز کے مالک عرشے ایک پچیس ۱۲۵ ڈالر فی ایکڑ کے حساب سے کرایہ پر اٹھا سکتے تھے ۔ کیونکہ اسکے اندر عرشے پر جو مٹی پڑی تھی وہ بہت زرخیز تھی جسکی وجہ سے دروازوں کے کونوں میں گیہوں کے پودے اُگ آئے تھے ۔ اسکا زینہ خشک ریتیلی مٹی کا بنا تھا اور اگر اس پر تھوڑی سی مٹی کی تہہ اور لگا دی جاتی اور اسے جنوب کے رُخ پر کھلا رکھا جاتا تو اس پر انگور بہت اچھے اُگتے ۔ بوائلر ڈیک کی سطح [illegible] پتھریلی مٹی کی تھی اور چراگاہ کیلئے موزوں تھی صرف ایک حبشی لڑکے کی یہاں ڈیوٹی تھی ۔ اسکے علاوہ یہاں کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا ۔ ہمیں اس لڑکے نے بتایا کہ یہ جہاز مشتہار ....

کیمطابق ہی جائے گا۔ اس نے کہا" اگر سواری مِل گئی تو یہ ضرور جائے گی۔ اگر نہیں مِلی تو وہ انتظار کرے گی۔"

میں نے پوچھا" ابھی تک کچھ سواریاں آئی ہیں۔؟"

لڑکے نے جواب دیا" میرے مالک۔ ابھی نہیں۔ ابھی تو اس پر سے سامان بھی نہیں اترا ہے یہ آج صبح ہی آئی ہے۔"

لڑکے کو علم نہیں تھا کہ جہاز کو سفر کرنے کا کب موقع ملے گا لیکن اس کا خیال تھا کہ اسے کل سواریاں ملجائیں گی یا اس سے اگلے روز۔ مگر اس سے ہمارا کام نہیں چلتا تھا۔ لہٰذا ہم نے ایک زراعتی کشتی پر سفر کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ہمارے پاس اب ایک ترکیب اور تھی۔ وکس برگ کا ایک جہاز جس کا نام گولڈ ڈسٹ تھا شام کو ۵ بجے چھوٹنے والا تھا۔ میمفس جانے کے لئے ہم نے اس جہاز کا ٹکٹ لے لیا اور جگہ جگہ رُکنے کا خیال چھوڑ دیا کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ جہاز صاف ستھرا اور آرام دہ تھا۔ ہم نے بوائلر ڈیک پر اپنا بستر لگایا اور وقت کاٹنے کے لئے کچھ سستی کتابیں خرید لیں۔ کتاب فروش آئرلینڈ کا باشندہ تھا اور شکل و شباہت سے باعزت اور مہربان لگتا تھا مگر وہ باتونی بہت تھا۔ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ وہ سینٹ لوئی میں چوبیس ۲۴ سال رہا تھا اور اس مدت میں دریا کے پار کبھی نہیں گیا تھا۔ تب اس نے بہت رواں اور سلیس زبان میں لیکچر دینا شروع کیا۔ جس میں اس نے قدیم یونانی یا رومی نام اور روایات کا بکثرت استعمال کیا۔ روانی کے اعتبار سے اسکا لیکچر واقعی بہت تعجب خیز تھا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ لیکچر اس نے پہلی بار نہیں بلکہ پچاس سے بھی زیادہ مرتبہ وہ یہ تقریر کر چکا تھا۔ بہر حال وہ ایک اچھی شخصیت کا مالک تھا۔ ایک جملے میں جب اس نے اتفاقاً جو کی شراب اور آئرلینڈ والوں کی زندگی کا ذکر کیا تو اسوقت مجھے یہ نادر خیال آیا کہ جن رسیلی کتابوں کو وہ بیچ رہا تھا انکے مقابلے میں اسکی اپنی شخصیت کہیں زیادہ دلچسپ تھی اور وہ ہمارے لئے ایک اچھا مصاحب بن سکتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا" جناب آئرلینڈ والے جو کی شراب نہیں پیتے۔ وہ اُسے پی ہی نہیں سکتے۔ اگر کسی آئرلینڈ والے کو ایک ہفتہ تک آپ جو کی شراب پلائیں تو وہ مر جائیگا۔ آئرلینڈ والوں کے جسم میں تانبا ہوتا ہے اور جو کی شراب تانبے کو جلا دیتی ہے۔ لیکن ہوسکی تانبے پر پالش کا کام کرتی ہے لہٰذا وہ آئرلینڈ والوں کی زندگی کی حفاظت کرتی ہے۔

تقریباً آٹھ بجے ہم لوٹے اور ہم نے دریا کو عبور کیا۔ گہرے اندھیرے میں جب ہم کنارے کی طرف رینگتے ہوئے بڑھے تو اچانک ہمارے جہاز کے باہری کمرے سے سنہری بجلی کی روشنی کی چندھیا دینے والی چمک نکلی، اور اس نے پانی اور تمام سامان کو ایسا چمکا دیا جیسے کوئی چیز دوپہر کی تیز دھوپ میں چمک اٹھے۔ یہ دوسری بڑی تبدیلی سامنے آئی۔ لپلپاتی، دھواں دینے والی، نارکول نکالنے والی مدھم مشعلوں کی ٹوکریوں کا رواج اب ختم ہو گیا تھا۔ علاوہ اس کے روشنی کے مچان کو سنبھالنے کے لئے جہاں پہلے بیس۲ بیس۲ آدمیوں کی ضرورت پڑتی تھی وہاں اب صرف دو۲ آدمیوں اور تھوڑی سی اسٹیم سے ہی مچان کو اس جگہ سے جہاں وہ لٹکا ہوتا تھا مشین سے نیچے اتارنے اور اسکو ٹھیک جگہ پر رکھنے کا کام ہو سکتا تھا۔ اور جتنی دیر میں صفائی کے ساتھ یہ سب کام ختم ہو جاتا تھا اتنی دیر میں قدیم زمانے میں تو نائب کپتان اپنی ناقص مشینوں کو مشکل سے چالو کر پاتا تھا۔ یہ اب تک ایک معمہ ہے کہ مچان کو اتارنے چڑھانے کا یہ نیا اور آسان طریقہ لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آیا تھا جبکہ دخانی کشتیوں کی ایجاد ہو گئی تھی۔ البتہ اس سے یہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ ایک عام انسان کتنا کند ذہن اور سست ہوتا ہے۔

بالآخر ہم صبح کے دو بجے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ چھ بجے صبح جب ہم نے دیکھا کہ ہمارا جہاز ایک پہاڑی کے پاس چکر کاٹ رہا ہے جہاں ایک پتھر کی مال گودام کی عمارت تھی یا کم از کم وہاں مال گودام کے آثار ابھی باقی تھے۔ اسکے قریب ہی دو یا تین مسمار مکان بھی تھے جو ہرے بھرے پہاڑوں کے سائے میں تھے لیکن یہاں کسی انسان یا جانور کی زندگی کے آثار نہیں پائے جاتے تھے۔ مجھے تعجب ہوا کہ شاید میں دریا کو بھول گیا تھا کیونکہ میرے ذہن میں اس جگہ کا کوئی نقش باقی نہ تھا۔ نہ تو مجھے دریا کا حلیہ یاد رہا تھا اور نہ یہاں کسی طرف کوئی اور ایسی چیز تھی جسکے بارے میں مجھے یاد ہو کہ میں نے پہلے کبھی دیکھی تھی۔ مجھے تعجب ہوا۔ مایوسی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔

ساحل پر اترنے والوں میں سب سے اچھی پوشاک پہنے ایک عورت اور کچھ مرد تھے اور دو عمدہ پوشاک پہنے نوجوان لڑکیاں بھی تھیں جنکے ہاتھوں میں روسی چمڑے کے مختلف قسم کے تھیلے تھے۔ ایسے لوگوں کے لئے یہ منظر عجیب جگہ تھی یہاں انھیں کوئی سواری بھی نہ ملی

اسلئے یہ لوگ جنگل دار دیہاتی راستے پر پیدل ہی چل پڑے گویا کہ کوئی سواری ملنے کی امید انھیں پہلے سے ہی نہ ہو۔

مگر جب ہم آگے بڑھے تو یہ راز کھلا کہ یہ لوگ بظاہر ایک بڑے قصبے کو جا رہے تھے جو ایک نئے جزیرے کے عقبی حصے میں تھا اور اس گھاٹ سے قریب دو میل دور تھا۔ مجھے اس قصبے کے بارے میں کچھ یاد نہ آسکا۔ نہ اس کا محل وقوع اور نہ نام۔ اس وجہ سے میرا مزاج کچھ بگڑ رہا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ یہ قصبہ سینٹ جنیویو ہوگا اور یہ وہی نکلا۔ اب اس لاابالی دریا کے کارنامے دیکھئے اس نے اس بیکار جزیرہ کو ٹھیک اس قصبے کے سامنے بنا ڈالا تھا اور اسلئے اس قصبے تک دریا کے ذریعہ آمد و رفت کا راستہ ختم ہو گیا تھا کیونکہ اس نے قصبے کو ساحل سے بالکل الگ تھلگ کر دیا تھا اور اس کی اہمیت کم ہو جانے سے اب یہ قصبہ ہو کر رہ گیا تھا ویسے یہ قصبہ ایک عمدہ قسم کی قدیم جگہ ہے اور یقیناً اس قابل ہے کہ اسکو ترقی دی جائے۔ اس قصبے کو فرانسیسیوں نے آباد کیا تھا اور یہ اس وقت کی یادگار ہے جب تم سینٹ کے دہانے سے کیوبک تک برابر فرانسیسی علاقے میں اور فرانسیسی حکومت میں سفر کر سکتے تھے۔

میں فوراً بالائی عرشے پر چڑھ گیا اور سینٹ پلٹ گھر کی طرف ایک اشتیاق بھری نگاہ ڈالی۔

چوبیسواں باب

میرا راز کھل جاتا ہے

ڈیوٹی پر کھڑے ہوئے پائلٹ کو بغور دیکھنے کے بعد مجھے اطمینان ہو گیا کہ میں نے اس کو پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ لہٰذا میں اسکے پاس چلا گیا۔ پائلٹ نے بھی مجھے بغور دیکھا اور میں نے پھر پائلٹ کو بغور دیکھا۔ جب یہ ابتدائی اور رسمی ملاقات ہو چکی تو میں ایک اونچی سی بینچ پر بیٹھ گیا اور وہ منہ پھیر کر اپنے کام پر چلا گیا۔ پائلٹ ہاؤس کی ہر چیز سے میں واقف تھا۔ صرف ایک چیز مجھے نہیں معلوم تھی۔ اور وہ تھا ایک بڑے منہ والا اسٹوب جو برلیٹ بورڈ کے نیچے لگا ہوا تھا۔ میں اس چیز کو جاننے کے لئے کافی دیر تک الجھن میں رہا۔ پھر کوشش چھوڑ کر میں نے پائلٹ سے پوچھ لیا۔ "یہ ٹیوب کس کام آتا ہے۔؟"

اس نے جواب دیا۔ "انجن کی گھنٹیوں کی آواز سننے کے لئے۔ یہ کل بھی اتنی مفید تھی کہ اسکی ایجاد پچاس سال پیشتر ہی ہو جانی چاہیئے تھی۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ پائلٹ نے مجھ سے پوچھا۔ "کیا آپ جانتے ہیں کہ یہ رسی کس لئے ہے۔؟"

بغیر کچھ کہے میں نے اس سوال سے گریز کرنے کی کوشش کی۔ میں نے ایک دوسرا سوال کر کے اسے ٹالنا چاہا۔ مگر اس نے کچھ سوال کیا۔

"کیا آپ پہلی بار پائلٹ ہاؤس میں بیٹھے ہیں۔؟"

میں اس سوال کو بھی گول کر گیا۔

پھر اس نے سوال کیا "آپ کہاں سے آرہے ہیں۔؟"

میں نے جواب دیا۔ "نیو انگلینڈ سے۔"

اس نے پھر پوچھا" کیا آپ پہلی بار مغربی علاقے میں آئے ہیں۔؟"
میں اس سوال پر بھی خاموش رہا۔
دوبارہ اس نے کہا" اگر آپ ایسی چیزوں میں دلچسپی رکھتے ہیں تو میں آپکو ان سب چیزوں کے بارے میں بتلا سکتا ہوں"
میں نے کہا" میں ضرور جاننا چاہوں گا"
اس پر اس نے گھنٹی کھینچنے کی رسّی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا" یہ آگ سے خبردار کرنے کے لئے ہے" تب اگلی گھنٹی پر ہاتھ رکھ کر" یہ ہوٹل کے ملازم (Texas Tender) کو بلانے کے لئے ہے" پھر وسل کے لیور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے" وہ کپتان کو بلانے کے لئے ہے" اور اس طرح وہ ایک ایک چیز کی طرف اشارہ کر کر کے بتاتا رہا۔ اسکی باتیں جھوٹ کا پُلندہ تھیں۔
مسافر کی حیثیت سے سفر کرنے میں اتنا مزہ مجھے پہلے کبھی نہیں آیا۔ میں نے ہر نئی بات کیلئے اس کا بہت شکریہ ادا کیا۔ اس طرح حاصل شدہ معلومات کو میں نے اپنی ڈائری میں نوٹ کر لیا۔ پائلٹ کو یہ دیکھ کر اور جوش آیا۔ ملاحوں کے پرانے انداز سے وہ مجھے بہت سی باتیں بتاتا رہا۔ کبھی کبھی مجھے خدشہ ہونے لگتا کہ کہیں وہ بیچارہ اپنی بناوٹی باتوں کو خود ہی جھوٹا ثابت نہ کردے۔ لیکن وہ برابر بولتا چلا گیا اور اس نے سب کہہ ڈالا۔ اس نے رفتہ رفتہ دریا کے لاابالی پن کی داستانیں یکے بعد دیگرے بڑے آسان پیرائے میں سنا ڈالیں۔ جن کو سمجھانے کیلئے کچھ اچھی مبالغہ آمیز مثالیں بھی دیں۔ مثلاً اس نے کہا" کیا آپ وہاں پانی سے باہر نکلی ہوئی اُس چھوٹی سی شکستہ چٹان کو دیکھ رہے ہیں۔ جب میں پہلی بار یہاں آیا تھا تو یہ چٹان ایک مضبوط پہاڑی کی چوٹی تھی۔ قریب ساٹھ فیٹ اونچی اور دو میل لمبی مگر پانی سے کٹ کٹ کر اب یہ اتنی سی رہ گئی ہے" (یہ بتاتے وقت اُس نے ایک آہ بھری)
اب مجھے یہ زبردست خواہش ہوئی کہ میں اسکے جھوٹ کا پول کھول دوں۔ لیکن مجھے ایسا لگا۔ کہ معمولی سی بات پر اس کو جھوٹا ثابت کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ یہ سزا تو اسکے لئے بہت ہی کم ہوگی۔
یک مرتبہ ایک عجیب و غریب کشتی جس میں ایک بڑا کوئلہ دان تھا جو ترچھا تھا اور

ایک شہتیر کے سہارے سُدّ کا تھا، دھواں دیتی ہوئی جب دُور سے نظر آئی تو اس نے بڑی بے اعتنائی کیساتھ (جیسے وہ کسی چیز کو بہت دنوں سے دیکھتے دیکھتے اکتا گیا ہو) مجھے وہ کشتی دکھائی۔ اور کہا "یہ الیگٹر کشتی ہے۔" میں نے پوچھا "یہ کشتی کس لئے ہوتی ہے؟" جواب ملا۔ "اس سے مگر مچھ نکالے جاتے ہیں" میں نے متعجب ہو کر کہا "اچھا! مگر مچھ نکالتے ہیں۔؟" میں نے پھر پوچھا "مگر مچھ کیا اتنی زیادہ تعداد میں ہوتے ہیں کہ ان سے جہاز کو خطرہ لاحق ہو۔؟" جواب ملا۔ "اب تو زیادہ نہیں ہیں کیونکہ گورنمنٹ انکی تعداد کو بڑھنے نہیں دیتی۔ لیکن پہلے انکی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اب یہ ہر جگہ نہیں بلکہ کچھ مخصوص جگہوں میں جہاں انھیں سہولیت ہوتی ہے یعنی جہاں دریا زیادہ چوڑا اور اتھلا ہوتا ہے ملتے ہیں ۔ جیسے پلم پوائنٹ ۔ اسٹیک آئی لینڈ وغیرہ وغیرہ یہ جگہیں مگر مچھ کے اڈے کہلاتی ہیں۔

میں نے پوچھا "کیا واقعی ان سے جہاز رانی میں رکاوٹ پڑتی تھی؟"

"ہاں بہت سال پہلے اتھلے پانی میں ضرور رکاوٹ پڑتی تھی۔ شاید ہی کوئی ایسا سفر ہوتا ہوگا جب ہم دریا کی تہ میں مگرمچھوں سے نہ ٹکراتے ہونگے۔"

مجھے اب ایسا محسوس ہوا کہ میں اپنا ہتھیار استعمال کر دوں۔ مگر میں نے ضبط کیا اور کہا۔

"تب تو یہ بڑا خطرناک جانور ہوگا۔"

اس نے کہا "ہاں جہاز رانی میں یہ ایک بڑی رکاوٹ تھی چونکہ پانی کے بارے میں یہ کہنا بہت مشکل تھا کہ وہاں کوئی خطرہ ہے یا نہیں۔ یہ خطرناک جانور پانی کے اندر اِدھر اُدھر چلتے رہتے تھے۔ یہ پانچ منٹ بھی ایک ہی جگہ پر خاموش نہیں پڑے رہتے۔ ہوائی چٹان (wind Reef) کو دیکھتے ہی فوراً پہچانا جا سکتا ہے کسی رکاوٹ کا بھی فوراً پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ ریت کی چٹان (sand Reef) بھی چھپی نہیں رہتی۔ کیونکہ اسکو پہچاننا بڑا آسان ہے۔ لیکن مگرمچھ کی شکل کی چٹان ہرگز نظر نہیں آتی۔ تم وثوق کے ساتھ نہیں بتا سکتے کہ گہرا پانی کہاں ہے اور جہاں تمہیں پانی دکھائی دے گا وہاں پہنچنے پر تمہیں پانی نہیں

لے Alligator

ملے گا کیونکہ اسی اثنا میں مگرمچھ وہاں جا کر اکٹھے ہو جائینگے۔ البتہ چند پائلٹ ایسے ضرور ہیں
جو یہ جان جاتے ہیں کہ مگرمچھ والا پانی کہاں ہے ٹھیک جسطرح کہ وہ دیگر رکاوٹوں کو پہچان
لیتے ہیں۔ لیکن یہ جاننے کے لئے انہیں قدرتی لیاقت ہونی چاہیئے۔ یہ چیز سیکھنے کی نہیں ہوتی
ہے۔ یہ لیاقت تو پیدائشی ہونی چاہیئے۔ ایسے بہت سے لوگ ہو چکے ہیں جن میں یہ لیاقت تھی۔
مثلاً بیں تھارن برگ۔ بیگ جالی۔ اسکوائر جیل۔ ملو یسس بکسبی۔ میجر فاؤ ننگ اور جان
اسٹیونیس۔ انکے علاوہ بیلی گارڈن۔ جم بریڈی۔ جارج ایلر اور بل ینگ بلڈ۔ یہ سب
صف اول کے اعلی گیڈ پائلٹ تھے۔ یہ مگرمچھ کے پانی کو ایسے ہی پہچان لیتے تھے جیسے عیسائی حفاظ
دسکی کو۔ کیا وہ پڑھ کر بتاتے تھے؟ آہ! نہیں۔ پڑھنا ان کو کہاں آتا تھا۔ کاش کہ میرے
لئے ڈالروں کا جمع کرنا اتنا ہی آسان ہوتا جتنا ان لوگوں کیلئے ڈیڑھ میل کی دوری سے مگرمچھ
والے پانی کا پہچان لینا۔ دراصل اس سے انھیں فائدہ بھی بہت ہوتا تھا۔ اسی لئے ایک
عمدہ ایلیگیٹر پائلٹ کو ہمیشہ پندرہ سو ڈالر ماہانہ ملتا تھا۔ دوسرے لوگ تو رات میں مگرمچھ
کیلئے گھات لگاتے۔ مگر یہ پائلٹ کبھی آنکھ گھات میں نہیں بیٹھے۔ وہ سوائے کہرے کے کسی
اور رکاوٹ سے نہیں گھبراتے تھے۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ وہ سونگھ کر بتا دیتے تھے کہ پانی میں
مگرمچھ کس جگہ پر ہوں گے۔

میں کہہ نہیں سکتا کہ یہ بات کہاں تک درست ہے۔ جو شخص دوسرے لوگوں کی
باتوں کا یقین نہیں کرتا اور خود ہی ہر چیز کی کھوج کرنا چاہتا ہے اسکے پاس اتنا وقت کہاں ہے
کہ وہ دوسروں کے پاس جا جا کر انکی باتوں کی تصدیق کرے۔ حالانکہ ایسے بہت سے لوگ ہیں
جو اسوقت تک دوسروں کی تائید کرتے رہتے ہیں جبتک انھیں کچھ نہ کچھ عجیب و غریب باتیں سننی
نصیب ہوتی رہتی ہیں۔ مگر رابرٹ اسٹائل کا یہ اصول نہیں ہے۔ وہ ہر بات میں کچھ نہ کچھ
گنجائش رکھتے تھے۔ مثلاً جب وہ کہتے دو مین فیدم" تو ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ دیتے تھے کہ ممکن
ہے کہ چوتھائی فیدم کم ہو۔ مجھے یہ سنکر بہت حیرت آیا اور میں نے اپنے دل میں کہا" ارے کیا
اب اسٹائل یہ تھا؟" مگر یہ تو مونچھوں والا اور شاندار وضع قطع کا آدمی تھا۔ جبکہ میرے زمانے
میں تو وہ ایک نحیف و دبلا سا امیدوار پائلٹ تھا۔ پچیس سال میں بھی یہ کتنا خوبرو جوان

ہوگیا۔ اور اس نے مبالغہ آمیزی کا کتنا اچھا ہنر سیکھ لیا۔ یہ سوچ کر میں نے اس سے کہا" میرا خیال ہے کہ مگر مچھوں کو پکڑنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا ہوگا۔ کیونکہ وہ پھر پانی میں چلے جاتے ہونگے۔"

وہ بولا" اگر تمہیں مگر مچھوں کا اتنا تجربہ ہوتا جتنا مجھے ہے تو تم اس طرح کی بات نہ کرتے ایکبار تم ایک مگر مچھ کو پانی سے باہر نکال لو تو وہ یا تو وہ مر جائیگا یا مار ڈالا جائیگا۔ اسکے بارے میں آپکو اور کوئی خبر نہیں مل سکے گی۔ وہ کسی طرح بھی واپس پانی میں نہ جاسکے گا۔ مگر مچھ کیلئے سب سے زیادہ باعث تکلیف یہی ہے کہ اسے پانی سے باہر نکالا جائے۔ مگر ان کو صرف باہر ہی نکالا نہیں جاتا بلکہ انھیں دیگر ممالک میں بھیج دیا جاتا ہے۔ لوگ انھیں جہاز کے تہ خانے میں ڈال لیتے ہیں اور جب نیو آرلینز کا سفر کرتے ہیں تو انھیں وہاں گورنمنٹ فیکٹریوں میں لیجاتے ہیں۔

"کس لئے؟" میں نے پوچھا۔

"کس لئے کہا۔ وہاں ان کی کھال سے سپاہیوں کیلئے جوتے بنائے جاتے ہیں۔ جتنے گورنمنٹ کے جوتے بنتے ہیں سب ان ہی کی کھال سے بنائے جاتے ہیں۔ اس کی کھال کے جوتے دنیا میں سب سے عمدہ ہوتے ہیں۔ پانچ پانچ سال تک یہ جوتے چلتے ہیں۔ پانی بھی ان پر اثر نہیں کرتا۔ مگر مچھوں کی کھال کی تجارت گورنمنٹ نے سنبھال رکھی ہے۔ شاہ بلوط کے درختوں کی طرح سب مگر مچھ بھی گورنمنٹ کا مال ہیں۔ اگر آپ کسی سرسبز شاہ بلوط کے درخت کو کاٹیں تو آپکو ۵ ڈالر تاوان ادا کرنا پڑے گا۔ اور اگر ایک مگر مچھ ماریں تو آپ کو قید بامشقت کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ گویا یہ جرم گورنمنٹ سے بغاوت کرنے کے مترادف ہے یہ آپ کی خوش قسمتی ہوگی اگر آپ کو پھانسی کی سزا نہ دی جائے۔ لیکن اگر آپ ڈیموکریٹ ہیں تو آپکو پھانسی کی سزا بھی دی جاسکتی ہے۔ جنوبی علاقے میں بزرگ کو متبرک پرندہ سمجھا جاتا ہے اور کوئی اسے ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ اسی طرح مگر مچھ گورنمنٹ کی متبرک چیز ہے۔ اور اسے چھونے کی اجازت نہیں۔

میں نے پوچھا" کیا اب بھی تم بھی مگر مچھ پانی سے نکالتے ہو؟"

اس نے کہا" ارے نہیں۔ برسوں سے ایسا نہیں ہوا۔"

میں نے پوچھا" تو پھر مگر مچھ پکڑنے والی ناؤ کو اب بھی کیوں کام میں لایا جاتا ہے؟"

اس نے کہا۔ "کیونکہ یہ پولیس کی لگائی ہوئی ڈیوٹی ہے۔ اس سے زیادہ اس کا کوئی مقصد نہیں ہے۔ کشتیاں کبھی کبھی دریا کے چڑھاؤ یا بہاؤ پر جاتی رہتی ہیں۔ اب تو نئی نسل کے مگرمچھ بھی ان کشتیوں کو اسی طرح پہچانتے ہیں۔ جیسے چھوٹے بچے چوکیدار کو۔ جب وہ کسی کو آتا دیکھتے ہیں تو وہاں سے ہٹ جاتے ہیں۔ اور چھپ جاتے ہیں۔"

مگرمچھوں کی داستان اور تجارت گھما پھرا کر بیان کرنیکے بعد اس نے اس موضوع کو ختم کر دیا اور پھر بڑے سکون کیساتھ ایک تاریخی موضوع پر گفتگو چھیڑ دی۔ اور قدیم زمانے کی نصف درجن دخانی کشتیوں کے، جن سے وہ واقف تھا، زبردست کارنامے سنانے لگا۔ اور خصوصاً ایک کشتی کے جس سے وہ بخوبی واقف تھا چند غیر معمولی کارنامے اس نے بالتفصیل سنائے۔ اسکی روداد یوں تھی۔

وہ کشتی کا نام سائیکلون تھا اور اس کا یہ آخری سفر تھا۔ وہ کشتی اسی سفر میں ڈوب گئی۔ کپتان کا نام ٹام بیلو تھا۔ جو ایسا سفید جھوٹ بولتا تھا۔ جیسا کبھی کسی نے نہ سنا ہوگا۔ وہ سچ بولنا جانتا ہی نہیں تھا۔ البتہ وہ اپنے سحر خیز بیان سے آپکے رونگٹے کھڑے کر سکتا تھا۔ وہ جھوٹ کی وجہ سے بیحد بدنام تھا۔ میں نے بالآخر اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ کیونکہ میں جھوٹ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک کہاوت ہے "جیسا آقا ویسا نوکر"۔ اگر آپ ایسے جھوٹے شخص کیساتھ رہیں گے تو آہستہ آہستہ لوگ آپ پر بھی شبہ کرنے لگیں گے۔ یہ بات اتنی سچ ہے کہ اسے ثبوت کی ضرورت ہی نہیں۔ وہ کپتان مزدوری بہت اچھی دیا کرتا تھا۔ مگر میں نے اپنے دل میں کہا کہ اگر کسی کی نیک نامی خطرے میں ہو تو مزدوری سے کیا فائدہ۔؟ چنانچہ نیک نامی کے مقابلے میں میں نے پیسے کو کوئی اہمیت نہ دی۔ میرا تو ہمیشہ یہی نظریہ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے اپنے کئے پر افسوس نہیں ہوا۔ دنیا میں اچھی شہرت سے بڑھ کر کوئی شئے نہیں ہے۔

مگر وہ کپتان بڑا خود غرض شخص تھا۔ دنیا میں غالباً ایسے دو آدمی بھی نہیں ہوں گے جن میں خود غرضی بدرجہ اتم موجود تھی۔ شاید اسی خود غرضی کے بوجھ کے سبب اسکا سر پیچھے کی جانب سے زیادہ بھاری تھا۔ سامنے کا چہرہ ہلکا ہونے کی وجہ سے اسکی ناک ہمیشہ اوپر کی طرف ہوا میں اٹھی رہتی تھی۔ لوگ اسے غرور سے تعبیر کرتے تھے حالانکہ یہ غرور نہیں تھا بلکہ

بدنیتی تھی۔ اگر آپ صرف اس کا پیر دیکھتے تو یہ سمجھتے کہ یہ آدمی انیس[19] فٹ لمبا ہوگا۔ لیکن ایسی کوئی بات نہ تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اسکا پیر نسبتاً زیادہ بڑا تھا۔ اگر اس کا پیر پہلے بنایا گیا ہوتا تو بلاشبہ اسکی اونچائی بھی انیس[19] فٹ بنائی جاتی۔ لیکن وہ اتنا لمبا نہیں تھا۔ وہ صرف پانچ فٹ دس انچ لمبا ... تھا۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور اب بھی اتنا ہی ہے۔ اگر اس میں سے اس کا جھوٹ نکال دو تو وہ سکڑ کر تمہارے ہیٹ کے برابر رہ جائے گا۔ تم اگر اسکے کینہ کو اسکے دل سے نکال دو تو اس کا کوئی وجود ہی نہیں رہے گا۔ اسکا سائیکلون جہاز چلتے وقت گھر گھڑاتا تھا جس کی وجہ سے اسکے چلنے سے پانی میں ایک قسم کی موسیقی پیدا ہو جاتی تھی۔ کبھی کسی جہاز کی چال اتنی مزیدار معلوم نہیں ہوئی اگر آپ ایک بڑے دریا میں اس جہاز کو دوسرے جہازوں کے درمیان ڈال دیں اور اسے چلنے دیں تو پھر اپنا کام ختم سمجھئے۔ وہ ایک ستارے کے سہارے تمام رات چلتا رہتا اسکے پتوار کو سنبھالنے کیلئے کبھی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس کو چلانا اتنا ہی آسان تھا جتنا جنوبی کارولینا (Carolina) میں ری پبلیکن پارٹی کے دوٹوں کو گننا۔ ایک دن صبح سویرے جب وہ اپنے آخری سفر پر جا رہا تھا تو لوگ اسکے پتواروں کو مرمت کے لئے لے گئے۔ مجھے اسکے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ میں اسکو لکڑی کے انبار کے پیچھے سے نکال کر لایا۔ اور کشتی کو دریا کے پانی میں بڑے اطمینان سے گھماتا ہوا قریب تیئس[23] میل دور پہنچ گیا اور جب میں نے چار بڑے خطرناک شوری مقامات کو پار کر لیا تو کسی نے پوچھا: "کیا کشتی کو بغیر پتوار کے ہی لا رہے ہو"

"ہاں۔ یہ کپتان ٹام صاحب تھے۔ جو چھت پر آ کر مجھ پر نکتہ چینی کرنے لگے کہ تم تاریک رات میں کیوں تیر دوڑا رہا تھا۔"

میں نے درمیان میں دخل دیکر پوچھا۔

"کیا کہا آپ نے؟ تاریک رات کی کیا بات تھی۔؟"

وہ بولا "جو کچھ میں نے کہا ہے اسمیں شک کرنے کی ضرورت نہیں۔ واقعی اسوقت رات ایسی تاریک تھی جیسا کہ آج کا سر ملا نکو جلد ہی چاند ابھرنے لگا تھا۔

میں نے پوچھا تمہارا مطلب سورج سے تو نہیں؟ کیونکہ تم نے بتایا تھا کہ تم دن نکلتے ہی روانہ ہوئے تھے۔ عجیب بات ہے۔ یہ اس سے پہلے کا ذکر ہے جب تم کپتان صاحب سے اس وجہ سے ناراض

ہو کر علیحدہ ہو گئے تھے کہ وہ جھوٹ بولتا تھا یا"

وہ بولا "یہ اتنی سے بہت پہلے کی بات ہے۔ ہاں۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ وہ....

میں نے پوچھا "کیا وہ جہاز اسی سفر میں ڈوبا تھا یا......

اس نے جواب دیا" ارے نہیں وہ تو کئی ماہ بعد ڈوبا۔ اور اسی طرح نہ بوڑھا آدمی بھی۔

تب میں نے کہا" تب تو اس جہاز نے دو آخری سفر کیے۔ کیونکہ تم کہہ چکے ہو......"

اتنا سنتے ہی وہ پہیئے سے پیچھا ہٹا اور اپنا پسینہ پونچھتے ہوئے بولا۔ (یہاں مجھے نام سے مخاطب کرتے ہوئے) اسے پکڑو اور چلاؤ اور ذرا جھوٹ بولنے کی کوشش کرو تم نے میرے مقابلے میں کہیں زیادہ جہاز رانی کی ہے۔ تم اجنبی اور انجان بنتے ہو۔ لیکن میں نے تمہیں اسی وقت پہچان لیا تھا جب تم نے صرف چند لفظ ہی بولے تھے۔ اور میں نے اندازہ کر لیا تھا تمہاری پول کھول کر رہوں گا۔ تم سب کچھ دریافت کرنا چاہتے تھے۔ میں نے تمہیں بتا بھی دیا۔ کیا نہیں بتایا؟ اب پہیہ سنبھالو اور تفتیش ختم کرو۔ آئندہ صاف صاف بات کرنا پھر تمہیں راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔"

اس طرح فرضی نام کا قصہ ختم ہوا۔ اور ابھی سینٹ لوئیس سے چلے چھ گھنٹے سے بھی زائد نہیں ہوئے تھے۔ لیکن مجھے ایک فائدہ ہو ہی گیا کیونکہ میرے ہاتھ پہیہ تھامنے کیلئے بیقرار تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ میں دریا کو تو بھول چکا ہوں لیکن نہ تو دخانی جہاز چلانا بھولا ہوں اور نہ ہی جہاز رانی سے لطف اندوز ہونا۔

پچیسواں باب

کیرو سے ہلمین تک

سینٹ لوئی سے کیرو تک کا دو سو میل کا علاقہ بہ خوبصورت اور قدرتی مناظر سے بھرپور ہے۔ پہاڑیوں پر ہر طرف موسم بہار کی ہریالی بچھی ہوئی تھی۔ وادی کے بیچوں بیچ اُودوڑ دریا پوری شان و شوکت کیساتھ بہ رہا تھا۔ ہمارا سفر بھی ایک مبارک دن شروع ہوا۔ حالات موافق تھے۔ دھوپ خوشگوار اور موافق تھی۔ ہماری کشتی قابل اطمینان رفتار سے میلوں تک کا سفر طے کر گئی۔

الی نوائے میں جیسٹر کے مقام تک ریل بھی آگئی تھی جیسٹر میں مجرموں کی اصلاح کیلئے ایک جیل تھی۔ ویسے بھی وہاں ترقی ہو رہی تھی۔ ایک ریل گرانڈ ٹاور اور دوسری کیپ گیراڈیو کے مقام تک پہنچ چکی تھی۔ پہلے اس شہر کا نام ایک پہاڑی کے ایک بڑے ستون سے لیا گیا تھا۔ یہ ستون مسی سپی اور مسوری کے سنگم پر واقع ہے۔ یہ قدرت کا بنایا ہوا ایک نادر نمونہ ہے۔ یہ یہاں کا سب سے خوبصورت قدرتی منظر ہے۔ قرب و جوار کے لوگوں کا کہنا ہے کہ اس مینار میں شیطان کا چولھا رکھا ہوا ہے۔ وہ غالباً اسلئے ایسا کہتے ہیں کہ یہ تنور دوسرے تنوروں سے زیادہ مشابہ نہیں ہے۔ اسکے علاوہ انہیں شیطان کی چائے پینے کی میز بھی ہے۔ یہ اس چٹان کی سب سے زیادہ شفاف اور ہموار حصہ ہے۔ آئین شراب کے پیالوں کی ڈنڈیاں بنی ہوئی ہیں۔ جو اب گھستی جا رہی ہیں۔ چٹان کا یہ حصہ دریا کی سطح سے پچاس ساٹھ فٹ بلند ہے۔ اسکے پاس ہی پھولوں اور کھجوروں سے ڈھکی ہوئی ایک دوسری چٹان ہے۔ چائے کی میز والی سطح تو ہو بہو چائے کی میز ہی لگتی ہے خواہ وہ شیطان کیلئے رہی ہو یا کسی میسائی کیلئے۔ دریا کے بہاؤ پر تھوڑے ہی فاصلے پر شیطان کی کہنی اور شیطان کے دوڑ لگانے کا راستہ ہے۔ اور ایسی متعدد چیزیں ہیں جو مجھے اسوقت یاد نہیں آرہی ہیں۔

گرانڈٹملور کا قصبہ پہلے سے کہیں زیادہ گنجان آباد اور پُررونق ہے۔ البتہ وہاں کہیں کہیں مرمت کی ضرورت ہے۔ ساری عمارتوں پر سفیدی کرانے کی ضرورت ہے۔ پھر بھی پرانی سفیدی اور پلاسٹر کو ایک بار پھر دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ چچا ہیمفورڈ نے جو ہمارے افسر دویم تھے بتایا کہ یہ جگہ مسلسل سیلاب کی زد میں آتی رہی ہے۔ اور اسی لئے یہ جیسی ہونی چاہیئے ویسی خوبصورت نہیں ہے۔ لیکن اگر ان عمارتوں کی سفیدی خراب نہیں ہوئی تو اسمیں تعجب کی کوئی بات نہیں تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اسمیں چونا زیادہ اور اچھی قسم کا تھا۔ ایسی عمدہ سفیدی مغربی خطے کے کسی شہر میں کہیں نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا کہ یہاں ڈیری فارم پر آپکو کافی کے لئے دودھ نہیں ملیگا اور نہ شکر کے کارخانے سے شکر ملیگی۔ لیکن یہ بھی تو عقلمندی نہیں ہوگی کہ چونے کے اس قصبے میں محض سفیدی ہی دیکھی جائے۔

میرے ذاتی تجربے کے پیشِ نظر انکی بتلائی ہوئی پہلی دو باتیں درست تھیں۔ اور انکا یہ کہنا بھی درست تھا کہ جو لوگ شکر بیچتے ہیں وہ شکر کی پرواہ نہیں کرتے۔ اسلئے چچا ہیمفورڈ کے اس بیان میں بھی کچھ سچائی تھی کہ جو مزدور چونا بناتے ہیں وہ بہ نسبت سفیدی کے مذہب سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ چچا ہیمفورڈ نے بتایا کہ گرانڈٹاور کوئلے کی کانوں کا مرکز اور بہت خوشحال جگہ تھی۔

کیپ گیرارڈیو پہاڑی کے نشیب میں واقع ہے۔ یہ بڑی خوبصورت جگہ ہے۔ یہاں لڑکوں کے لئے ایک بڑا اچھی اسکول ہے جو قصبے کے نیچے دریا کے کنارے واقع ہے۔ چچا ہیمفورڈ نے کہا کہ اچھی تعلیم کے اعتبار سے یہ اسکول مسوری کے کسی بھی اسکول سے مقابلہ کرسکتا تھا۔ چوٹی پر ایک کالج اور بھی تھا۔ جسکی عمارت نئی اور خوبصورت تھی۔ اس عمارت کی بُرجیاں بہت خوبصورت اور دیکھنے کے قابل تھیں۔ اس عمارت میں بڑی بڑی پیپے دار کرسیاں تھیں جنکے ساتھ شراب یا سرکہ کی بوتلیں بھی لگی رہتی تھیں۔ چچا ہیمفورڈ نے بتایا کہ کیپ گیرارڈ لو مسوری کا ایتھنس تھا۔ اور یہ کہ ان مذکورہ بالا تعلیم گاہوں کے علاوہ وہاں کئی اور تعلیم گاہیں بھی تھیں اور سب کی سب کسی مذہبی نقطۂ نگاہ سے قائم کی گئی تھیں۔ انھوں نے میری توجہ اس قصبے کے مکینوں کے مضبوط اور [illegible] اعتقاد کی طرف مبذول کرائی۔ لیکن مجھے یہ یقین نہ ہوا کہ اس قصبے کے لوگ [illegible] پہاڑی قصبوں کے لوگوں جو اسی طرح کی ڈھلوان پہاڑیوں پر آباد تھے اور جہاں کی عمارتیں بھی اسی [illegible] کی اینٹوں کی بنی تھیں زیادہ خدا پرست تھے۔ بات

دراصل یہ ہے کہ تعصب کی عینک لگا کر دیکھنے سے اصلیت نہیں معلوم ہوتی۔

چچا ہمفوروڈ اس دریا پر تیس سال سے نائب کپتان کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ ہر بات کا عملی تجربہ رکھتے تھے۔ انھوں نے دنیا دیکھی تھی اور وہ بڑے سلیم الطبع تھے۔ ہر معاملہ میں اپنی رائے رکھتے تھے۔ انکی نثر میں بھی شاعری کو دخل تھا۔ تقریر کے فن سے کما حقہٗ واقف تھے انکی آواز میں کرختگی تھی۔ باتوں باتوں میں جب وہ روحانیت کے میدان میں پرواز کرتے تو دو چار قسمیں ضرور کھا جاتے۔ وہ زمانہ قدیم کی مہربان اور پاک ہستیوں میں سے تھے اور جب جہاز چلتا تو وہ اس وقت وہ بہت سنجیدگی سے بڑبڑاتے ہوئے چاروں طرف گشت لگانے لگتے۔ اسطرح وہ ملاحوں کی خوشی کو کم کرکے انکے دلوں میں ایام گذشتہ کی عیش و عشرت کیلئے جواب انھیں کبھی میسر نہ ہوگی وہ حسرت پیدا کردیتے وہ ملاحوں سے کہتے۔ جاؤ وہاں بیٹھ جاؤ کیا تمام دن کھڑے ہی رہوگے جاؤ تم نے جہاز پر آنے سے پہلے یہ کیوں نہیں بتایا کہ تمہاری ٹانگیں بیکار ہیں۔؟

اپنے ملاحوں کے ساتھ انکا رویہ منصفانہ اور ہمدردی سے بھرپور تھا۔ لیکن وہ بات کے دھنی تھے۔ اسلئے ملاح انہیں پسند کرتے اور ان کے ساتھ رہنا چاہتے تھے۔ وہ اب تک پرانے زمانے کے نائب کپتانوں کی سی میلی کچیلی پوشاک پہنتے تھے۔ لیکن مستقبل میں لنگر کے محکمہ (اینکر لائن) والے انھیں مجبور کرینگے وہ محکمہ کی منظور شدہ وردی پہنیں جو نیلے رنگ کی صاف ستھری بحری پوشاک ہے اور جسمیں چمکتے ہوئے پیتل کے بٹن لگے ہوتے ہیں۔ ایسی ہی پوشاک محکمہ لنگر کے سبھی افراد پہنتے ہیں۔ تب انکی شخصیت پہلے سے بالکل مختلف معلوم ہوگی۔

دریائے مسی سپی کے محکمہ جہازرانی کی وردیاں عجیب و غریب ہیں۔ آپکو یہ سنکر تعجب ہوگا۔ کہ ابتک بتنی تبدیلیاں اس دریاؤں کمیٹی میں دیکھی گئی ہیں ان میں سب سے زیادہ تبدیلی وردیوں میں ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر یہ پیز اتنی لازمی ہے کہ یہ خیال پہلے ہی آجانا چاہئے تھا۔ ان پچاس سالوں سے کئی بار غلط فہمیاں ہوتی ہیں۔ اجنبی مسافر (جن کو دریا کی اطلاع کی ضرورت ہوتی) غلطی سے نائب کپتان کو باورچی اور کپتان کو نائی سمجھ لیتے جس سے انھیں بڑی ندامت اٹھانی پڑتی تھی لیکن اب ان کی مصیبت ختم ہو گئی ہے۔ محکمہ کی وردی میں اصلاح ہونے سے بہت فائدہ ہوا اور اس سے عملے کے ملازمین میں امتیاز کرنا آسان ہو گیا۔

کیپ گیرارڈیو کے جنوبی موڑ کی طرف چلے۔ اس موڑ کو لوگ اسٹیئرس مینس بینڈ[1] کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ یہاں ہمیشہ کافی پانی ہوتا تھا۔ اور جہاز رانی میں بڑی آسانی رہتی تھی۔ دریا کے بالائی حصے میں صرف یہی ایک جگہ ایسی تھی جہاں کو سیکھنے والا کر تعطیلات میں بھی جہاز رانی کی اجازت دیدی جاتی تھی۔

گرانڈ ٹمپل کے سرے پر تھیبس اور اسکے دامن میں کائرو ایسے شہر تھے جو اب بھی آسانی سے پہچانے جا سکتے تھے کیونکہ انمیں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اسکے جزیروں کے سلسلے میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ کیونکہ یہ سلسلہ پانی میں ڈوبی ہوئی چٹانوں کا سلسلہ ہے اور اس طرح سے واقع ہوا ہے کہ رات کے وقت خراب موسم میں دخانی کشتیاں ان سے ٹکرا کر تباہ ہو سکتی ہیں۔ بہت سی کشتیوں کے ملبے یہاں پانی میں دفن ہیں اور نظر نہیں آتے۔ ان کشتیوں میں میری ایک غمگسار کشتی "پال جونس" بھی تھی جو چور چور ہو گئی تھی اور یہیں پر ایک برتن کی طرح تہ آب ہو گئی تھی جیسا کہ مورخوں نے مجھے بتایا (یعنی چچا ہیمفورڈ نے) اس کشتی میں ایک جوڑی گھوڑی اور ایک واعظ بھی سوار تھا۔ میرے خیال میں یہی دونوں کشتی کی تباہی کا موجب ہے۔ ہیمفورڈ بیان کرتے ہیں "لیکن بہت سے ایسے بھی جاہل ہونگے جو اس واقعہ کا مضحکہ اڑائیں گے۔ اور اسے ضعیف الاعتقادی سے تعبیر کرینگے۔ لیکن ایسے لوگوں نے کبھی جوڑی گھوڑی اور ایک واعظ کیساتھ سفر نہیں کیا ہوگا۔ لیکن مجھے ایکمرتبہ الدورلو ایکساتھ سفر کرنیکا اتفاق ہوا ہے۔ ہم بلڈی کے بیرد پر جا لگے پھر ہم ہیننگ پہنچے۔ پھر اسی شہر کائرو کے ذرا جنوب میں رکے۔ جب ہم ایکلے کے گھاٹ سے میور ڈیم راک سے گذرے اور بعد ازاں گوز آئی لینڈ کے عقبی حصے میں قبرستان کے بہت بڑے غار سے جا ٹکرائے۔ راستہ میں گھاٹ کا ایک مزدور ہماری کشتی سے ٹکرا گیا۔ ہمارا ایک بوائلر جل گیا۔ ایک ہیٹر ٹوٹ گیا۔ دھوئیں کی ایک چمنی ٹوٹ گئی۔ جب کیرو پہنچے تو ہمارے جہاز کے گودام میں نو فٹ پانی داخل ہو چکا تھا۔ ہو سکتا ہے اس سے کچھ کم ہو یا کچھ زیادہ ہو۔ مجھے یہ واقعہ اچھی طرح یاد ہے جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔ لوگ خوف سے گھبرا گئے اور واعظ نے گھوڑی پر [illegible] دیا اور اسے شہر کے سامنے چھوڑ دیا۔ اور واعظ کو جہاز سے دریا میں پھینک دیا۔ لیکن وہ واعظ کو پانی سے باہر نکال لیا اور اس کی جان بچالی [illegible] تسلیم کر لیا [illegible] اس واقعہ کو یاد [illegible] آج تک [illegible]

---

[1] steers man's Bend

جیسے یہ کل کی بات ہو۔

ایک واعظ اور ایک بھوری گھوڑی کے یکجا ہونے سے ایسی مصیبتیں آسکتی ہیں۔ یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے اور بظاہر ناقابل یقین بھی لیکن اس بات کے حق میں ایسا ناقابل تردید ثبوت مل چکا ہے کہ اس پر نہ یقین کرنا فہم و ادراک کی توہین کرنا ہے۔ مجھے اس سلسلہ میں کپتان صاحب کا ایک قصہ یاد آتا ہے ان کپتان صاحب کو ان کے کئی دوستوں نے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ اپنے ساتھ بھوری گھوڑی اور کسی واعظ کو نہ لیجائیں۔ لیکن لوگوں کی تنبیہہ کے باوجود وہ اپنی ضد پر اڑے رہے اور دونوں ہی کو اپنے ساتھ لے گئے نتیجہ یہ ہوا کہ اُسی روز یا دوسرے دن جیسا کہ لوگ کہتے ہیں (کو میرے خیال میں اُسی روز) وہ شراب پی کر مدہوش ہو گئے اور جہاز کے عرشے سے نیچے سمندر میں گر گئے۔ گھر پر تو انکی لاش ہی پہنچی۔ یہ واقعہ حرف بحرف صحیح ہے۔

ہیٹ آئی لینڈ کا تو نشان ہی نہیں ملتا۔ اسکا ہر ٹکڑا بہ کر سمندر میں پہونچ چکا ہے۔ اب مجھے یہ بھی یاد نہیں کہ یہ جزیرہ دریا کے کس حصّہ میں آباد تھا۔ سوائے اس کے کہ یہ جزیرہ کہیں سینٹ لوئی اور کیرو کے درمیان واقع تھا۔ قدیم زمانے میں دریا کا وہ حصّہ جو ہیٹ آئی لینڈ کو گھیرے ہوئے تھا بڑا خطرناک تھا۔ ایک کسان نے جو الی نوائے کے کنارے رہا کرتا تھا، ایک مرتبہ کہا کہ انتیس ۲۹ جہاز اسکے مکان کے قریب ایک ہی جگہ غرق ہو گئے۔ سینٹ لوئی اور کیرو کے درمیان کشتیوں کے ٹوٹنے کے حادثے اتنے زیادہ ہوتے تھے کہ اوسطاً ہر میل میں ایک جہاز کی تباہی کا اندازہ لگتا ہے۔ سب ملاکر کُل دو سو کشتیاں تباہ ہوئی تھیں۔

کامرس کے شہر سے بہاؤ کی طرف کی بڑی بڑی تہ بہ ریلیوں کو میں آسانی سے پہچان سکتا تھا۔ ہیو رڈام راک اسوقت شہر کے وسط میں تھا۔ یہ بڑی عجیب و غریب تبدیلی ہے کیونکہ پہلے یہ چٹان کنارے پر ہوا کرتی تھی اور کشتیاں اس کے باہر سے ہو کر جایا کرتی تھیں۔ علاوہ بریں ایک بڑا جزیرہ جو کچھ دوری پر دریا کے وسط میں ہوا کرتا تھا، اب مسوری کے کنارے پر پہونچ گیا تھا۔ اور اب کشتیاں اسکے پاس سے نہیں گذرتی تھیں۔ جیکٹ پیٹرن کا جزیرہ چھوٹا ہوتے ہوتے ایک گاؤدم مثلث کی شکل کا رہ گیا تھا اور خیال ہے کہ یہ جلد ہی بالکل ختم ہو جائیگا۔ گوز آئی لینڈ تو بالکل ختم ہو ہی چکا ہے اب ایک چپٹی مچھلی جیسا نظر آتا ہے اور اس کا رقبہ ایک دخانی کشتی کے رقبہ سے زائد نہ

ہوگا خطرناک قبرستان جیسے متعدد غاروں کے بیچ میں ہم بہت آہستہ آہستہ اور احتیاط کے ساتھ چلتے تھے اب اصل دھارا سے دور ہو گیا ہے۔ اب کسی کو اس سے کوئی ڈر نہیں رہا۔ دو جزیرے جن کو ٹوسسٹرس (دو بہنیں) کہتے تھے انمیں ایک تو بالکل ختم ہو چکا ہے۔ اور دوسرا جو الی نوائے کے ساحل کے پاس تھا۔ اب مسوری کی طرف پہونچ گیا ہے اور دریائے مسی سپی سے ایک میل دور ہو گیا ہے۔ یہ جزیرہ مسوری کے ساحل سے اب اتنا ملحق ہے کہ یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ جوڑ کہاں پر ہے۔ بہر حال آج اب ابھی الی نوائے کے علاقہ میں ہی شمار ہوتا ہے۔ جو لوگ یہاں رہتے ہیں وہ ناؤ کے ذریعہ الی نوائے جاتے ہیں اور وہاں سڑکوں پر کام کرتے ہیں اور الی نوائے کی ریاست کو ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ یہ سب واقعی عجیب و غریب ہے۔!

دریا کے دہانے والے پرانے سبھی جزیرے جو اب وہاں نہیں تھے بہہ کر دریا میں پہونچ گئے تھے۔ لیکن کیرو اب بھی وہیں تھا اور اسی چوڑے پوائنٹ کے کونے پر جہاں یہ واقع ہے دور سے دکھائی دیتا تھا۔ لیکن ہمیں وہاں تک پہنچنے کے لئے کافی چکر کاٹ کر جانا پڑا۔ جس وقت ہم دریا کے بالائی حصے سے باہر نکل سیلاب سے لبریز او ہیو کی طرف بڑھ رہے تھے تو شام ہو چکی تھی ہم بلا کسی رکاوٹ کے آگے بڑھے جا رہے تھے کیونکہ پوشیدہ چٹان جو ہمارے راستہ کے دائیں جانب واقع تھی وہ دھارے کے چڑھاؤ پر بہت دور تک ہٹ چکی تھی۔ یا یوں کہئے کہ چٹان مسوری پوائنٹ سے ایک ضلع کی دوری تک دریا میں چلی گئی تھی اور کیمڈ پوائنٹ کی طرف نیچے نیچے اور زیادہ پھسل گئی تھی۔

مسسی پی بڑا منصف مزاج اور دیانت دار دریا ہے۔ اگر یہ کسی کسان کے کھیت کو غرق کر دیتا ہے تو اتنے ہی رقبے کی زمین یا س ہی میں کہیں اس کے لئے چھوڑ بھی دیتا ہے اس وجہ سے کسی کو کوئی غم نہیں ہوتا۔

کیرو جاتے ہوئے ہم ایک دخانی کشتی سے ٹکرانے سے بچے شاید وہ کشتی تباہ ہو جاتی کیونکہ اس نے ہماری سیٹی پر کوئی دھیان نہیں دیا۔ وہ ہمارے آگے سے راستہ کاٹ کر جانا چاہتی تھی اپنی کشتی کو ایک دم پیچھے ہٹا کر ہم نے اس کشتی کو بچایا۔ ورنہ اس حادثہ سے ایک اچھی خاصی

لہ Two sisters

داستان بن جاتی ۔

کیرو اب بارونق شہر ہے اور یہاں کافی عمارتیں بن چکی ہیں اور جیسا کہ مسٹر ڈکسن نے کہا ہے کہ اب یہ شہر پہلے کے مقابلے بہت بدل چکا ہے ۔ مگر جب میں نے اسے پہلے بار دیکھا تھا تو یہاں اینٹوں کی بنی عمارتیں بن رہی تھیں ۔ یہ اسوقت کی بات ہے جب کرنل گرانٹ جو اب جنرل گرانٹ کہلاتے ہیں پہلے پہل اپنی ڈیوٹی پر تعینات ہو کر آئے تھے ۔ اور سپاہیوں کو فوجی تربیت دے رہے تھے ۔ چچا میمفورڈ کہتے ہیں کہ لائبریریوں اور اتوار کو کھلنے والے اسکولوں نے کیرو میں بہت اچھا کام کیا ہے ۔ کیرو میں ریل اور دریائی راستوں سے تجارت کی جاتی ہے دو دریاؤں کے اتصال پر قائم اس شہر کی جائے وقوع اس کیلئے بڑی فائدہ مند ہے اور اس کی خوشحالی یقینی ہے ۔

جب میں صبح اٹھا تو میں نے دیکھا کہ ہمارا جہاز کولمبس اور ہکمین سے گذر چکا تھا ۔ اور ہکمین کے قریب پہونچ چکا تھا ۔ ہکمین ایک خوبصورت شہر ہے جو ایک خوبصورت پہاڑی پر آباد ہے ۔ ہکمین ایک مالدار تمباکو والے علاقے میں آباد ہے ۔ پہلے یہاں تمباکو کی بیحد منافع بخش تجارت ہوتی تھی ۔ اس علاقے میں تمباکو دور دور سے لاکر گوداموں میں جمع کر لیا جاتا تھا ۔ پھر کشتیوں کے ذریعہ اس کو جہاز پر لاد دیا جاتا تھا لیکن چچا میمفورڈ کہتے ہیں کہ ہکمین میں اس تجارت کو فروغ دینے کیلئے ایک ریلوے بھی بنائی گئی ہے مگر مسٹر میمفورڈ کے خیال سے اس ریلوے سے فائدے کے بجائے نقصان زیادہ ہوا ہے کیونکہ اب زیادہ تر مال علاقے کے اندر ایک جگہ اکٹھا ہونے کی بجائے تمام ریلوے لائن پر علاقے کے باہر چلا جاتا ہے ۔

واپس آیا اور پھر توپخانہ لاد کرلے گیا۔ میرے ساتھی نے کہا کہ وہ لڑائی دیکھنے جا رہا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ میں بھی اسکے ساتھ جاؤں۔

میں نے کہا مجھے وہاں جانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں لڑائی کا نظارہ پائلٹ ہاؤس سے ہی کرلوں گا اس پر اس نے کہا "تم بزدل ہو" لڑائی کا نظارہ بڑا ہولناک تھا۔ جنرل چینتھم نے حکم دیا کہ سب آدمی اپنے کوٹ اُتار کر ان کا ایکطرف ڈھیر لگا دیں اور پھر حکم دیا "میرے پیچھے پیچھے آؤ یا تو ہمیں فتح نصیب ہو گی یا ہم جہنم رسید ہو جائیں گے۔ میں نے اپنے پائلٹ ہاؤس سے جنرل کو یہ احکام صادر کرتے ہوئے سنا اور دیکھا کہ یہ کہہ کر وہ اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑاتے ہوئے سب سے آگے آگے چلنے لگا۔ سفید بالوں والے بڈھے جنرل پلو بھی ایک سنہرے گھوڑے پر سوار ہو کر میدان جنگ میں کود پڑے۔ وہ اپنے سپاہیوں کی رہنمائی نوجوانوں کی سی گرمجوشی سے کر رہے تھے۔ رفتہ رفتہ مرکزی حکومت کے طرفداروں نے باغیوں کو مار بھگایا۔ دھر باغی کو چیرتے پھاڑتے اور انھیں شیطان کے سپرد کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ باغیوں نے اس دریا کے کنارے پر پہنچ کر پناہ لی۔ میں پائلٹ ہاؤس میں کھڑکی سے اپنے پیر باہر لٹکائے بیٹھا تھا یکایک میں نے ایک زنانے کی آواز سنی جو میرے کانونکے پاس سے نکل گئی۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ بندوق کی گولی تھی۔ میں نے سوچنے میں کوئی تاخیر نہ کی اور فوراً پیچھے کی طرف سرک کر عرشے کے فرش پر اُتر پڑا اور وہیں پڑا رہا۔ گولیاں برابر بھناتی ہوئی آرہی تھیں۔ توپوں کی تین گولیاں جہاز کی چمنیوں میں لگیں اور ایک گولی پائلٹ ہاؤس کے کنارے سے چھوتی ہوئی نکلی۔ چاروں طرف گولوں کا شور اور انکے پھٹنے کی آواز آرہی تھی۔ گولیوں کی بوچھار جاری تھی۔ میں نے دل ہی دل میں کہا کاش میں یہاں نہ آتا۔ میں پائلٹ ہاؤس کے فرش پر پڑا تھا اور گولیاں برابر برس رہی تھیں۔ انکی رفتار برابر تیزی پکڑتی جارہی تھی۔ تب میں فرش کے بیچوں بیچ بڑے اسٹوو[1] کے پیچھے سرک کر پہونچ گیا۔ فوراً ایک 'منی' بال کہ گولی آتشدان کو چیرتی ہوئی آئی جس سے میرا سر جھل گیا اور ہیٹ کٹ گیا۔ میں نے سوچا کہ اب یہاں سے بھاگنا بہتر ہوگا۔ کپتان صاحب اور وہ سرخ سر والا میجر جو میمفس سے آیا تھا دونوں جہاز کی چھت پر موجود تھے۔ ان کی باتیں سنکر مجھے معلوم ہوا

---

[1] آتشدان۔

کہ وہ جہاز کو چھوڑ کر بھاگنا چاہتے ہیں اور انھیں یہ بھی کہتے سُنا گیا کہ پائلٹ مر چکا ہے۔ میں دائیں طرف کو بڑھا کہ جہاز کو پیچھے ہٹانے کے لئے گھنٹی کی رسّی کھینچوں۔ جب میں نے اُچک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ کھڑکی کے شیشے میں گولیوں کے لگنے سے پندرہ سوراخ ہو گئے ہیں۔ گولیاں اتنی جلدی جلدی لگی تھیں کہ میں انھیں دیکھ بھی نہ پایا تھا۔ پھر میں نے باہر پانی کی طرف دیکھا جہاں گولیوں کی بوچھار بدستور جاری تھی۔ اِن حالات میں میں نے یہی مناسب سمجھا کہ وہاں سے بھاگ نکلوں۔ چنانچہ میں ذرا نیچے پائلٹ ہاؤس میں خیمے کی رسیوں تک گیا اور بجائے پیروں کے سر کے بل گر کے نیچے سرکا اور جیسے ہی میں عرشے پر پہونچا کپتان نے مجھ سے کہا کہ ہمیں یہاں سے بھاگ جانا چاہیئے۔ لہٰذا میں پھر رسّی کے سہارے چڑھا اور فرش پر آ گیا اسی وقت لوگوں نے میرے ساتھی کو پکڑ لیا دو سپاہیوں کی حراست میں وہ پائلٹ ہاؤس میں لایا جا رہا تھا۔ کسی نے یہ کہہ دیا تھا کہ میں مارا گیا میرے ساتھی نے اپنا سر دروازے کے اندر کر کے مجھے فرش پر سرکتے ہوئے اور جہاز کو پیچھے کرنے کے لئے استعمال کی جانیوالی گھنٹیوں تک جاتے دیکھا۔ اس نے کہا " ارے غضب۔ یہ نہیں مرا ہے اور وہ دونوں آدمیوں کو جو اس کا کالر پکڑے لئے جا رہے تھے جھٹکا دیکر اور خود کو چھڑا کے نیچے بھاگ گیا۔ ہم سہ پہر تین بجے تک وہیں رہے اور پھر وہاں سے خیریت سے بچ کر نکل آئے۔

اسکے بعد جب میں اپنے ساتھی سے ملا تو میں نے کہا۔ اب ایمانداری سے مجھے سچ سچ بتائیے کہ کیا بات تھی۔ تم اس لڑائی کو دیکھنے کے لئے کہاں گئے تھے۔؟ اس نے بتایا کہ میں نیچے تہ خانے میں گیا تھا۔

جب تک لڑائی چلتی رہی میں اتنا ڈرتا رہا کہ قریب المرگ ہو گیا۔ اس نے کہا " میں اتنا ڈر گیا تھا کہ مجھے کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہوا۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ سوائے میرے کسی کو میرے ڈر کا علم نہیں تھا۔ دوسرے روز جنرل پوک نے مجھے بلایا اور میری بہادری اور دلیرانہ طرز عمل کی داد دی۔" میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس بات کو وہیں ختم کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ اس کی کہانی غلط تھی لیکن میں خاموش رہا۔ اتنے بڑے افسر کا نام لیکر جو بات کہی جائے اسکی تردید کرنا میرے لئے مناسب نہیں تھا۔

اسکے فوراً بعد میں بیمار پڑ گیا اور بہت کمزور ہو گیا۔ مجھے صحتیابی کے لئے ہاٹ اسپرنگ جانا

پڑا۔ وہاں مجھے کمانڈروں کے بہت سے خطوط ملے جن سب کا مدعا یہ تھا کہ میں ڈیوٹی پر واپس آجاؤں۔ مگر میں نے انکار کر دیا کیونکہ نہ میں ابھی صحتیاب ہوا تھا اور نہ میری قوت بحال ہو پائی تھی۔ میں آرام سے پڑا رہا اور یہ طے کیا کہ جو شہرت مجھے اب تک حاصل ہوئی تھی اسکا بھرم بنائے رکھوں۔

یہ ایک سیدھی سادی کہانی تھی جو بہت سیدھے سادے انداز سے بیان کی گئی تھی لیکن مسٹر میمفورڈ نے مجھے بتایا کہ پائلٹ نے اس قصے میں کہیں کہیں تصرف کر کے اپنے ڈر کو مبالغہ آمیز کر دیا ہے جسکا ثبوت جنگ کے دوران میں خود اس کی زندگی سے مل گیا۔

ہماری کشتی آئی لینڈ نمبر ۸ کی ڈھلان میں سے ہو کر گذری۔ میں نیچے ایک مسافر سے بات چیت کرنے چلا گیا۔ یہ مسافر خاصا خوبرو تھا اور اسکی چال ڈھال ... دلکش تھی اور اسکے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ ذہین آدمی ہے۔ ہم آئی لینڈ نمبر ۱۰ کے قریب پہنچ گئے تھے یہ جگہ جنگ کے دوران میں بہت مشہور تھی۔ اس شخص کا وطن یہیں کہیں ساحل کے قریب تھا۔ میں نے اسکے ساتھ جنگ کے متعلق بات چیت کی لیکن جلد ہی بات چیت کا رُخ خانہ جنگی کی طرف مڑ گیا۔ کیونکہ جنوب کے کسی حصے میں انتقامی لڑائیاں مسلسل اور اتنی تیزی سے نہیں پھیلیں یا اتنے لمبے عرصے تک خاندانوں کے درمیان نہیں چلیں جتنی کہ اس مخصوص خطے میں۔ اس شخص نے مجھے بتایا۔

”زمانہ قدیم میں انتقام کے سلسلے میں قتل کی وارداتیں ہوا کرتی تھیں۔ لیکن میری دانست میں ڈارنل اور واٹسن کے درمیان جو لڑائی ہوئی وہ سب سے زیادہ خطرناک تھی کسی کو یہ نہیں معلوم کہ جھگڑا شروع کہاں سے ہوا تھا کیونکہ یہ سلسلہ بہت پرانا ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ ڈارنل اور واٹسن گھرانوں کو بھی نہیں معلوم ہوگا کہ دراصل ان کے جھگڑے کی بنا کیا تھی۔ ان کے خاندانوں میں سے شاید ہی کوئی ایسا شخص زندہ ہو جو بنائے مخاصمت کو جانتا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ جھگڑے کی شروعات کسی گھوڑے یا کتے کی وجہ سے ہوئی تھی بہرحال جو کچھ بھی ہو وجہ بہت معمولی سی تھی۔ یہ معاملہ روپیہ پیسے کا بھی نہیں تھا کیونکہ دونوں خاندان مالدار تھے۔ بات آسانی سے طے ہو سکتی تھی۔ لیکن اس سے دونوں کی تسلی نہیں ہوئی۔ دونوں میں تو تو میں میں تو ہو ہی چکی تھی اس لئے اب سوائے کشت و خون کے اور کوئی چارہ نہیں تھا وہ کھولا دیا گیا تے جو کچھ بھی وہ تھا سا ٹھ سال تک دو خاندانوں کے درمیان قتل و غارت کا موجب بنا رہا۔ ہر سال کسی نہ کسی طرف

کا کوئی آدمی اپنے کسی مخالف کو گولی مار دیتا اور جب ایک خاندان کے سب بڑے لوگ مارے جاتے
تو ان کے بچے بڑے ہوکر اس جھگڑے کو پھر تازہ کر دیتے اور اسے جاری رکھتے۔ تب سے ابتک یہ
جھگڑا چلا آرہا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو گولی مارنے کے کام کو بڑا متبرک سمجھتے تھے۔ یہ قتل وخون
اتنے عرصے سے چل رہا تھا کہ لوگ بہت زمانے سے بھول چکے تھے کہ جھگڑا کس وجہ سے تھا۔
جب کبھی ڈاونلی خاندان کا کوئی شخص دشمن گھرانے کے کسی شخص کو یا داشن کا کوئی فرد کسی ڈانلی
کے آمنے سامنے ہوتا تو دونوں میں سے ایک کا زخمی ہونا یقینی تھا۔ سوال صرف یہ تھا کہ دیکھیں
کون کس پر پہلے وار کرتا ہے وہ ایک دوسرے کو اسکے گھر والوں کے سامنے مار ڈالتے تھے۔ البتہ
وہ ایک دوسرے کو ڈھونڈنے نہیں جاتے تھے؛ لیکن جب کبھی ان کا سامنا ہوجاتا تو وہ ایک دوسرے
کو پکڑتے اور لڑنے لگتے آدمی لڑکوں کو اور لڑکے آدمیوں کو گولی سے مار دیتے تھے۔ ایک شخص
نے دشمن کے ایک بارہ سال کے لڑکے کو جو اسے جنگل میں مل گیا تھا گولی مار دی۔ اس بیچارے
کو جواب میں وار کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ اگر لڑکے کو ذرا بھی موقع ملتا تو وہ بھی اسے زندہ نہ چھوڑتا۔
حالانکہ دونوں خاندان ایک ہی مذہب کے ماننے والے تھے پھر بھی اس سے انکے جھگڑے میں کوئی
کمی نہیں آئی۔ ان پچاس یا ساٹھ سالوں کے آپسی... جھگڑے کے باوجود دونوں خاندان ہر اتوار
کو عبادت کے لئے گرجا گھر میں جاتے تھے۔ (کیونکہ یہاں ہر آدمی مذہبی تھا) گرجا گھر دریا کے کنارے
ایک گھاٹ پر جسے کپر ومانہ رکھتے تھے واقع تھا۔ آدھا گرجا گھر اور اس کا آدھا بغلی راستہ کینٹکی علاقے میں
شامل تھا اور دوسرا آدھا ٹینیسی کے علاقے میں۔ اتوار کو دونوں خاندانوں کے آدمی، عورتیں اور
بچے ایک مخصوص لباس پہن کر گرجا گھر کے بیچ والے راستے کے آس پاس الگ الگ قطاروں میں آمنے
سامنے عبادت کے لئے کھڑے ہوتے تھے۔ وہاں یہ لوگ خاموشی اور سلیقہ کے ساتھ بیٹھتے تھے۔ ایک
خاندان گرجا گھر کے کینٹکی والے حصے میں اور دوسرا ٹینیسی والے میں بیٹھتا۔ مرد اور لڑکے اپنی بندوقوں
کو دیوار کے سہارے کھڑا کر دیتے اور تب اکٹھے ہوکر دعا میں شامل ہو جاتے۔ حالانکہ یہ کہا جاتا
ہے کہ ہر خاندان کا سرغنہ جو گرجا کے بغلی راستے کے سرے پر کھڑا ہوتا تھا اپنے خاندان کے دیگر
افراد کے ساتھ دعا کے لئے نہیں جھکتا تھا کیونکہ وہ پہرے کا کام انجام دیتا تھا۔ حالانکہ مجھے یہ
سب نہیں معلوم کیونکہ میں اپنی زندگی میں کبھی اس گرجا میں نہیں گیا لیکن مجھے یاد ہے کہ جو کچھ

اسکے متعلق کہا جاتا تھا وہ سب درست تھا۔

بتیس[2] یا پچیس[25] سال گذرے کہ ایک گھرانے کے لوگوں نے دشمنی کی وجہ سے ایک انیس[19] سالہ لڑکے کو پکڑ کر مار ڈالا۔ یہ یاد نہیں کہ یہ لڑکا ڈارنل کا تھا یا وانشو کا یا کسی اور جھگڑالو خاندان کا۔ مگر واقعہ یہ تھا کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر کہیں جا رہا تھا۔ اسوقت ایک دخانی کشتی وہاں لنگر ڈالے ہوئی تھی۔ پہلی چیز جو اس لڑکے نے دیکھی وہ دشمن کا ایک گروہ تھا۔ لڑکا فوراً ایک لکڑی کے ڈھیر کے پیچھے گھوڑے سے نیچے اترا۔ لیکن اسکے دشمن گھوم کر پھر آگئے اور انھوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ لڑکے نے بھی اُن پر گولی چلائی مگر وہ لوگ گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے شور مچاتے چنگھاڑتے ہوئے پوری طاقت سے اس پر ٹوٹ پڑے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ لڑکے نے اپنے دشمنوں کو زخمی کر دیا۔ لیکن ان سب نے ملکر اسکو گھیر لیا اور اسے پکڑ کر دریا میں پھینک دیا اور جب وہ تیر کر ندی پار کرنے لگا تو یہ لوگ بھاگ کر اس کا پیچھے کرنے لگے اور اس پر گولی برساتے رہے یہاں تک کہ جب وہ کنارے پر پہونچا تو وہ مر چکا تھا۔ ونڈن مارشل نے مجھے یہ سب قصہ سنایا۔ یہ اس کا چشم دید واقعہ ہے۔ لنگر انداز کشتی کا وہی کپتان تھا۔

کئی سال گذرے جب ڈارنل خاندان اسقدر تباہ و برباد ہو گیا کہ اس میں صرف ایک بڈھا اور اسکے دو لڑکے بچ رہے تو انھوں نے یہ طے کیا کہ اب وہ ملک ہی چھوڑ کر کہیں چلے جائیں لیکن وانشو لوگوں کو اس کا پتہ چل گیا اور جب یہ دونوں نوجوان ڈارنل اپنی بیویوں کو لے کر عرشے پر جانے کے لئے زینے پر چڑھ رہے تھے کہ وانشو لوگ آ پہونچے بس پھر کیا تھا۔ لڑائی شروع ہو گئی اور وہ بیچارے آگے نہ بڑھ سکے۔ دونوں نوجوان ڈارنل مارے گئے۔ اسکے بعد بڈھا ڈارنل ناؤ والے سے لڑ پڑا۔ ناؤ والا بری طرح زخمی ہوا اور مر گیا تب اسکے دوستوں نے بڈھے ڈارنل پر گولی چلا دی اور اسکو گولیوں سے اتنا چھید دیا کہ اُسنے وہیں دم توڑ دیا۔ وہ دیہاتی شخص جس نے مجھے یہ سب باتیں بتائیں اچھی تعلیم اور اچھے اخلاق کا آدمی تھا۔ اس کی پرورش بڑے عیش و آرام سے ہوئی تھی البتہ وہ قواعد کی غلطیاں ضرور کرتا تھا جو غالباً اس کی بے پروائی کی وجہ سے ہوتی تھیں یا لاعلمی کی وجہ سے۔ مغرب کے ممالک میں پڑھے لکھے آدمیوں میں یہ بہت بڑی کمزوری پائی جاتی ہے گو کہ یہ بات ہر جگہ نہیں ہے۔ بڑے شہروں میں چاہے نہ ہو مگر قصبوں کے

لوگوں میں یہ کمزوری اکثر پائی جاتی ہے اور اتنی کثرت سے ملتی ہے کہ ہر شخص اسے محسوس کرتا ہے اور تعجب کرتا ہے۔ میں نے مغرب کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص کی تقریر سنی اس شخص کو ہر کہیں قابل آدمی مانا جاتا تھا مگر کچھ بھی ہو قواعد کی کئی فحش غلطیاں اس نے کیں اور تعجب یہ ہے کہ کسی نے کچھ کہا نہیں حتیٰ کہ ایک اچھی تعلیم یافتہ عورت نے بھی جو اس شہر میں مدت سے رہتی تھی اور جس نے اس شخص کی تقریر سنی تھی اس کی قواعد کی غلطیوں پر کوئی دھیان نہیں دیا، البتہ بعد کو جب میں نے اسکی توجہ اُس طرف دلائی تو اسکی سمجھ میں آیا اور اس نے اعتراف بھی کیا کہ واقعی اس شخص کی زبان میں قواعد کی غلطیاں تھیں مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ وہ غلطیاں اسکے کانوں کو ناگوار نہیں لگتی تھیں۔ اب اس اعتراف سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جب تعلیم یافتہ لوگ ہی قواعد کی ایسی غلطیوں کو سنکر چُپ رہ سکتے ہیں تو اسکا یہ مطلب ہے کہ یہ اغلاط ان لوگوں کے نزدیک معمولی اور قابل معافی ہیں یا یوں سمجھئے کہ ان غلطیوں کو سنتے سنتے ان لوگوں کے کان ان کو سننے کے عادی ہو جاتے ہیں اور ان کا احساس مٹ جاتا ہے۔

بیشک دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جو اغلاط سے بالکل پاک . . . ہو اور قواعد کے اعتبار سے بالکل صحیح زبان استعمال کرتا ہو اور یہ حقیقت ہے کہ ابتک ایسی کوئی تحریر نہیں لکھی گئی جو اغلاط سے بالکل پاک ہو۔ اغلاط سے پاک بولنے والا نہ اس دنیا میں ہے اور نہ ہو سکتا ہے خواہ کسی دینی کتاب کا لکھنے والا ہی کیوں نہ ہو۔ لہٰذا اس ... وادی کے لوگوں سے ہی صحیح قواعد کے استعمال کی توقع نیکیوں کی جائے لیکن اگر ایسے تمام لوگوں سے مطالبہ کیا جائے کہ وہ جان بوجھ کر اور ارادتاً انگریزی قواعد کے اصول کو نہ بگاڑیں اور زبان کو خراب نہ کریں تو یہ مطالبہ بیجا نہ ہوگا۔

جزیرہ نمبر دس ہند میں نے دریا میں . . . . . نمایاں تبدیلی دیکھیں جہانتک مجھے یاد تھا یہ جزیرہ قریب ۳ میل لمبا اور چوتھائی میل چوڑا تھا۔ یہاں شہتیر بہت تھے۔ یہ کینٹکی ساحل سے تقریباً دو سو گز کے فاصلہ پر تھا۔ یہ جزیرہ اتنا چھوٹا . . تھا کہ دوربین سے ہی دیکھا جا سکتا تھا۔ اب وہاں گھاس کے ایک بہت چھوٹے ٹکڑے کے سوا اور کوئی آثار باقی نہیں تھے اور یہ ٹکڑا بھی اب کینٹکی ساحل کے پاس نہیں تھا بلکہ یہ اب دوسرے کنارے سے ایک میل دور پہنچ گیا تھا لڑائی کے زمانے میں یہ جزیرہ ایک بڑی اہم جگہ تھی کیونکہ اس

جگہ سے جنگ کی کل صورت حال کا جائزہ لیا جا سکتا تھا اور چونکہ چاروں طرف سے یہ مکمل طور پر محفوظ تھا اسلئے غنیم کا یہاں تک پہونچنا ناممکن تھا اس جزیرے کی بابت وقوع و یاستہائے متحدہ کی شمالی اور جنوبی علاقوں کے فوجی ہیڈ کوارٹرس کے بیچ میں تھی اور یہی جزیرہ دونوں فوجوں کے لئے حدِّ فاصل کا کام کرتا تھا۔ بعد کو مسوری کے ایک تنگ موڑ پر دونوں سرحدوں کا نقطۂ اتصال تھا۔ لیکن چونکہ اس موڑ پر یہ جزیرہ بھی حائل تھا اسلئے اس وسیع دریا کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

اس علاقے میں دریائے ۔۔۔۔ مسیسپی کینٹکی سے گذر کر ٹینیسی کی طرف بہتا ہے اور پھر مسوری کے علاقے میں واپس آتا ہے اور پھر لوٹ کر کینٹکی اور وہاں سے پھر ٹینیسی کے علاقے میں آجاتا ہے۔

میڈرڈ کا قصبہ خراب وخستہ حالت میں تھا مگر یہاں کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ یہاں کے مکانات پہلے کی طرح اسی ہموار میدان میں بنے ہوئے تھے اور انکے ارد گرد ویسے ہی جنگلات تھے لیکن پہلے کی طرح اب یہاں امن وسکون نہیں تھا حالانکہ شہر پہلے سے نہ بڑھا تھا اور نہ گھٹا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ گذشتہ سیلاب یہاں تک پہونچ گیا تھا اور اس نے یہاں کے خوبصورت نظارے کو بگاڑ ڈالا تھا۔ اس سے سننے والوں کو بڑا تعجب ہوتا ہے کیونکہ یہاں پانی بہت اتھلا تھا اور ساحل بہت اونچا یعنی قریب پچاس فٹ تھا اور میرے زمانے میں اتنے اتھلے پانی میں سیلاب کا کناروں سے اونچا ہوجانا ناممکنات میں شمار کیا جاتا تھا۔ ۱۸۸۲ء کا موجودہ سیلاب تو تاریخ میں کئی نسلوں تک ایک اہم یادگار رہے گا۔ اور کم از کم اس وقت تک اسکی اہمیت کم نہ ہوگی جب تک کہ اس غضب کا سیلاب پھر نہ آئے۔

اس سیلاب میں کیرو سے مسیسپی کے دہانے تک تمام غیر محفوظ نشیبی علاقوں میں پانی بھر گیا تھا اور دریا کے دونوں طرف کے پشتے جگہ بجگہ ٹوٹ گئے تھے۔ جنوب کے کچھ علاقوں میں جہاں سیلاب کا زور سب سے زیادہ تھا مسیسپی کی چوڑائی ستر میل تک ہوگئی تھی۔ بہت سی جانیں ضائع ہوگئیں اور جو مالی نقصان ہوا وہ تو بہت ہی تباہ کن تھا فصلیں ضائع ہوگئیں۔ مکان بہہ گئے اور بے پناہ انسانوں اور جانوروں کو جگہ جگہ کسی اونچے ٹیلے کھیتوں یا جنگلوں میں پناہ

لینی پڑی۔ وہ خطرے اور مصیبت میں پڑے اسوقت تک مدد کا انتظار کرتے رہے جبتک کہ مقامی اور قومی حکومتوں اور اخبار کے اداروں نے کشتیاں بھیجکر اُن اَن گنت لوگوں کے نکالنے کا انتظام نہ کیا ہزاروں لوگوں کی جائداد مہینوں تک تہ آب رہی اور اگر مدد مناسب مقدار میں اور وقت پر نہ پہونچتی تو بیچارے ہزاروں آدمی بھوکوں مرجاتے۔ حالانکہ کافی عرصے سے پانی کم ہو رہا ہے لیکن اب بھی بہت سی جگہوں پر ساحل تہ آب ہے۔

ستائیسواں باب

کچھ اہم تحریریں

نیو میڈرڈ میں ہمیں دو دخانی کشتیاں ملیں دو کشتیوں کا بیک وقت دکھائی دینا نئی بات تھی کیونکہ سنسان دریائے مسیسپی میں شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس سنسان دریا میں ایک اور عظیم اور خطرناک طوفان آجائے تو نظارہ کتنا پُرجلال اور دہشتناک ہوگا ایک ایک لیگ کے فاصلے پر عموماً اس دریا میں چاکلیٹ رنگ کی اونچی اونچی لہریں نظر آتی ہیں۔ اسکے دونوں ساحلوں پر جنگلات کی ٹھوس دیواریں ہیں۔ اسکے ساحل قریب قریب غیر آباد ہیں۔ یہاں کی بھیانک ناخوشی اور تنہائی کو توڑنے کے لئے شاذ و نادر ہی کوئی کشتی یا ایسی ہی کوئی اور متحرک چیز نظر آتی ہے۔ اسطرح دن گذرتا ہے، رات آتی ہے، پھر رات گذرتی ہے اور دن آتا ہے اور پھر وہی سلسلہ شب و روز۔ وہی پُر وقار اور کبھی نہ ہارنے والی گمبھیرتا اور خاموشی۔ اسکو آپ کاہلی اور سستی سے بھی تعبیر کرسکتے ہیں۔ مگر اس کیفیت میں جو ابدیت ہے اس میں بہشت کی وہ تصویر نظر آتی ہے جو پادری اور پیغمبر لوگ ہمارے سامنے پیش کیا کرتے ہیں اور جسکی خواہش نیک اور سادہ لوح انسان کیا کرتے

ہیں۔

۱۸۱۲ء کی لڑائی کے فوراً بعد انگلستانی سیاح امریکہ میں آنے لگے پہلے اِکّا دُکّا اور پھر گروہوں کی تعداد میں۔ ان لوگوں کا ہجوم بڑے صبر و اطمینان سے برسوں تک اس نئے علاقے میں بڑھتا رہا۔ ہر سیاح اپنے سفر کے تجربات قلمبند کیا کرتا تھا اور اپنے وطن واپس لوٹ کر ایک کتاب کی شکل میں انہیں شائع کرا دیا کرتا تھا۔ یہ کتاب سکون اور بُردباری سے مرتب کئے گئے سچے اور صحیح حالات پر مشتمل ہوتی تھی لیکن ہمارے نازک مزاج آباؤ اجداد کو یہ حالات حقیقت کے برعکس معلوم ہوتے تھے۔ ان سیاحوں کی کتابوں کو سرسری طور پر پڑھنے سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ مسیسپی کے کئی پہلوؤں میں سیاحوں کے آنے سے اس وقت تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے بلکہ وہی صورتِ حال اب بھی ہے جو پہلے تھی، لیکن مسیسپی کے نظارے سے ان سیاحوں کے دلوں میں جو جذبات اُبھرے وہ ایک جیسے نہیں تھے۔ وہ مختلف طرح کے تھے کیونکہ سب سے پہلے جو لوگ یہاں آئے انکے محسوسات اپنے تجربوں پر مبنی تھے۔ پرانے ملکوں کے معاملے میں لوگ اپنے پیشرووں کے جذبات سے متاثر ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی چیز کو دیکھ کر جذبات کی تشکیل کرنا دنیا میں سب سے مشکل کام ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ سلسلۂ واقعات کا گڑھ لینا آسان ہے مگر ایک جذبہ پیدا کرنا مشکل ہے۔ کپتان آر۔ این۔ بیسل ہال نے ۵۵ سال پہلے لکھا تھا۔

"جس چیز کو دیکھنے کی میری خواہش اتنے طویل عرصے سے رہی تھی وہ چیز آج میں نے دیکھی۔ یہاں پہنچنے میں مجھے جتنی بھی تکلیفیں ہوئی تھیں آج مجھے ان سب کا خاطر خواہ معاوضہ مل گیا ہے۔ میں وہاں کھڑے کھڑے بہتے دریا کو دیکھتا ... رہا حتیٰ کہ شام ہو گئی اور اندھیرا ہونے کی وجہ سے چیزوں کا صاف نظر آنا مشکل ہو گیا۔ اس شاندار دریا کے نظارے کو صحیح صحیح جاننے اور سمجھنے کیلئے میں نے کم از کم اُسے دس بارہ مرتبہ دیکھا۔"

مندرجہ ذیل جذبات مسز ٹرولوپ کے ہیں جنھوں نے کپتان صاحب سے چند ہی مہینوں بعد اُسی سال یعنی ۱۸۲۷ء میں مسیسپی کے دہانے پر آ کر یہ سطور قلمبند کی تھیں۔

"اس ملک میں داخل ہوتے ہی پہلی چیز جو ہمارے نظروں کے سامنے آئی وہ یہ عظیم الشان دریا تھا جو اپنا گدلا پانی انڈیلتا ہوا گہری اور نیلے پانی والی خلیج میکسیکو میں گرتا ہے۔

میں نے اتنی سنسان جگہ کبھی نہیں دیکھی جتنا کہ دریائے مسیسپی کا یہ دہانہ۔ اگر دانتے شاعر اسے دیکھتا تو وہ اس ہولناک نظارہ کی تصویر اپنے الفاظ میں ویسے ہی کھینچتا جیسی اس نے دریائے دوزخ کی کھینچی تھی۔ گرداپوں سے اتھل پتھل پانی میں صرف ایک ہی چیز پانی سے اوپر نظر آتی ہے اور وہ تھا اس جہاز کا مستول جو بہت دن پہلے جبکہ کشتی دریا کے دہانے کو پار کر رہی تھی، برباد ہو گیا تھا۔ یہ اس خوفناک تباہی کی ایک دھندلی سی یادگار اور ساتھ ہی ساتھ آئندہ ہونے والی تباہی کا پیش خیمہ بھی۔

اس کے سات سال بعد جناب چارلس آگسٹس مرے نے اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا۔

"جب آپ اس زبردست دریا میں پچاس یا سو میل تک منبع کی طرف چلے جائیں اور قدرت کے نظاروں کو دیکھیں اور اپنی قوتِ متخیلہ کو کام میں لائیں تبھی آپ اس دریا کے جلال اور اسکی شان و شوکت کو سمجھ سکیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ یہ دریا ایک بیکراں وادی کو سیراب کر کے اُسے زرخیز بناتا ہے اور جنگلوں کو کاٹتا ہوا ہزاروں میل بلا روک بہتا ہے اور متعدد فائدے اس ملک کو پہونچاتا ہے۔ کہیں کہیں تو بڑے بڑے وسیع میدانوں کو مع انکے پیڑ بودوں کے تہِ آب کر دیتا ہے اور کہیں نئے نئے جزیرے بناتا ہے جو آئندہ نسلوں کی رہائش کے لئے موزوں ثابت ہوتے ہیں۔ اُسوقت بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ اس دریا نے ابھی ڈھائی تین ہزار میل کا ہی فاصلہ طے کیا ہے اور اسے اپنی منزل مقصود یعنی سمندر تک پہونچنے میں ایک ہزار تین سو میل کا سفر اور طے کرنا ہے۔"

اب آپ کپتان آر۔ این۔ جا ربٹ کے محسوسات سنئے جنھوں نے مسٹر مرے کے تین سال بعد ۱۸۳۷ء میں سمندری کہانیوں کی ایک کتاب لکھی۔ مسیسپی کی شورش انگیز اور خونچکاں کہانی سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قوموں کی تواریخ میں شاید ہی کوئی ایسی دوسری صدی ہوگی جسمیں نہ جرائم کی نوعیت بدلی اور نہ ان میں کوئی کمی واقع ہوئی۔ ان جرائم کی جن کا خیال اس غضبناک اور خون آلود دریا کی تاریخ پر جھلکتا ہے۔ یہ ان بہت سے خوبصورت دریاؤں کی طرح نہیں ہے جو دیکھنے میں خوبصورت لگتے ہیں اور اپنے راستے کی زمین کو زرخیز بناتے رہتے ہیں۔ یہ ایسا دریا

نہیں ہے جو دعوت نظارہ دے اور آپ اسکے ساحلوں پر بے خوف گھوم پھر سکیں کیونکہ اسکی دھارا کے لاابالی پن کی وجہ سے اسکے ساحل ہمیشہ دہشتناک ہوتے ہیں۔ اس کا دھارا خوفناک، تند اور غارت گر ہے جسمیں سیلابی مٹی بھری رہتی ہے۔ جو ایکبار اسکے پانی میں گر پڑے وہ شاید ہی نکل سکے کیونکہ بنا کسی لٹھے کے سہارے کے کوئی اسکے دھارے میں دیر تک نہیں ٹھہر سکتا۔ اس دریا میں وہ موٹی اور سخت قسم کی مچھلیاں ہوتی ہیں جو انسانی خوراک کے لئے موزوں نہیں جیسے کیٹ فش یا اسی قسم کی دوسری مچھلیاں۔ جیسے ہی آپ اس کے کناروں پر اتریں گے تو وہاں بدبودار گھڑیال پڑے ملیں گے اور ساتھ ہی کناروں پر جھاڑیوں میں چھپے ہوئے اور انسانی پہونچ سے باہر تیندوے دھوپ میں پڑے رہتے ہیں۔ اس دریا کا تیز رو پانی ان جنگلی راستوں میں سے ہو کر بہتا ہے جو پیڑوں سے بھرا ہوا ہے مگر وہ پیڑ سوائے ایندھن کے اور کسی کام نہیں آتے۔ دھارا جنگلوں کے بیچوں بیچ ہو کر بہتا ہے اور اسکے بہاؤ کی تیزی میں جنگل کے جنگل ٹوٹ کر شور مچاتے ہوئے بہنے لگتے ہیں کیونکہ اس کا پانی جو مٹی سے بھرا ہوتا ہے پیڑوں سے چاروں طرف سے ٹکراتا ہے۔ البتہ ان پیڑوں کی جڑوں کو اس مٹی سے خوراک بہم پہونچتی ہے۔ کبھی کبھی یہ پیڑ دریا کے بہاؤ کو روکتے بھی ہیں اور دھارے کو راستے سے ہٹا بھی دیتے ہیں مگر رکنے پر اسکے پانی کا زور بڑھ جاتا ہے گویا دریا اور بھی غضبناک ہو جاتا ہے اور پھر یہ ایکدم ساحل کو عبور کرتا ہے اور چاروں طرف ایک بڑے علاقے میں پھیل جاتا ہے اور پھر جب پرانے راستے میں زور سے بہتا ہے تو ہر طرف پیڑ اور پودے جڑ سے ایسے اکھڑ جاتے ہیں جیسے کسی شہنشاہ کو تخت سے اتار دیا گیا ہو۔ چنانچہ جنگلات کے یہ معزول شدہ حکام (جن کی شاخوں پر اب نہ کبھی کوئی چڑیا بیٹھے گی، نہ کوئی اپوسم یا گلہری چڑھے گی) ان بہم جو ملاحوں کے لئے جو دخانی کشتیوں کو اس دریا میں چلاتے ہیں رکاوٹ ثابت ہوتے ہیں اور انھیں پھانس کر تباہ کر دیتے ہیں۔ ملاح بیچارے ان پوشیدہ خطروں میں الجھ کر کشتی کو کنارے تک نہیں پہونچا پاتے کیونکہ یہ پیڑ کشتی کے تختوں میں پھنس جاتے ہیں اور کشتی دریا میں غرق ہو جاتی ہے۔ مغربی امریکہ کے اس بڑے گندے نالے کے ساتھ، جو اپنی کیچڑ میکسیکو کی کھاڑی میں ڈالتا ہے اور دہانے

۱۔ ان دنوں [illegible] حد درجہ عام تھا [illegible] کو تیرنے کی اجازت دیتا ہے اور نہ کسی [illegible]
والے [illegible] ۔

سے میلوں تک صاف نیلے پانی کو گدلا کر دیتا ہے۔ جو واقعات وابستہ ہیں وہ بڑے ناخوشگوار ہیں۔ یہ ایک ویران علاقے میں بہنے والا دریا ہے۔ یہ اُن دوسرے دریاؤں کی طرح نہیں ہے جو ایک فرشتے کی زمین پر انسانی بھلائی کے لئے اُترے ہیں۔ اسکے برعکس یہ دیو یا ایک ایسے زبردست شیطان کی طرح نازل ہوا ہے جسکے اوپر صرف بھاپ کی حیرت انگیز طاقت یعنی دخانی جہازوں نے ہی فتح پائی ہے۔"

گو یہ موضوع اس شخص کے لئے جسکا مذاق ادبی ہو اور جو لکھنے پڑھنے کا عادی رہا ہو کچھ بے لطف و بے ڈھنگا سا ہے پھر بھی یہ ان جذبات کا مرقع ہے جو کبھی ایک سیاح کے دل میں کبھی موجزن ہوئے تھے۔ ان جذبات کو بیان کرنا بڑا اہم معلوم ہوتا ہے۔ البتہ اس کیفیت اور ان اعداد و شمار میں جو دریا کے متعلق بیان کئے گئے ہیں غلطی ہوئی ہے۔ جسکی وجہ سے اسکے دریا کے قلمبند حالات کی اہمیت ضرور کم ہو جاتی ہے مثلاً کیٹ فش کے متعلق یہ لکھنا کہ وہ انسانی خوراک کے لئے موزوں نہیں ہے غلط ہے کیونکہ کیٹ فش ہر شخص کی مرغوب غذا ہے۔ اور نہ وہاں ایسے تیندوے ہیں جو انسانی پہونچ سے باہر ہوں۔

ان سیاحوں کے بعد والے سیاحوں میں الیگزینڈر میکے کا نام آتا ہے۔ جو مڈل ٹیمپل کے ایک بیرسٹر تھے۔ جنکا ہاضمہ بہت اچھا تھا اور جنھوں نے کھانے میں کبھی کیٹ فش نہیں کھائی تھی۔ وہ لکھتے ہیں۔

"میں اپنے ان جذبات کو بیان نہیں کر سکتا جو میرے دل میں اسوقت موجزن ہوئے جب میں نے مسیسپی کو دیکھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میں اس دریا میں تیر رہا ہوں۔ میں نے اپنے اسکول میں طالب علمی کے زمانے میں اور بعد میں اکثر ٹہلتے ٹہلتے تخیل میں اسی شاندار دریا کی تصویر آنکھوں نے بارہا کھینچی ہے اور خیال کیا ہے کہ میں بھی اسکے طوفانی دھارے میں اس علاقے میں لڑھکتا ہوا اچھلا جا رہا ہوں جسکا نام مسیسپی کے نام سے موسوم ہے اس علاقہ میں منطقہ معتدلہ کے مختلف عرض البلاد اور مختلف آب و ہوا میں بہنے والے معاون دریاؤں کا پانی آ آکر مسیسپی میں ملتا ہے اور اس طرح سمندر تک پہونچتا ہے۔ یہاں یہ دریا اپنی اصلی کیفیت اور وسعت میں سامنے آتا ہے۔ چنانچہ میں نے ایک دخانی کشتی میں بیٹھ کر اسوقت سیر کی جبکہ پانی چڑھ رہا

تھا اور پھر اس شاندار دریائے اعظم کو میں نے ایسی مودبانہ نگاہوں سے دیکھا جیسے کوئی قدرت کے کسی بڑے معجزے کو دیکھ رہا ہو۔"

غیر یہ سب باتیں تو ہیں جذباتی قسم کی۔ البتہ اس انتہائی خلوت پسند عظیم دریا کے بارے میں مختلف سیاح مختلف بیانات دیتے رہے ہیں۔ کپتان بیسل ہال جس نے اس کو سیلابی حالت میں دیکھا کہتا ہے "میں کبھی کبھی تو میں نے بیس، بیس اور تیس تیس میل کے فاصلے بالکل غیر آباد دیکھے۔ اگر کوئی آرٹسٹ کسی سیلاب کی ایک تصویر بنانے کے لئے کچھ اشاروں کی تلاش میں یہاں آتا۔ تو اُسے یہاں سینکڑوں ایسے اشارات ملجاتے جو اسکے مطلب کے ہوتے۔"

مگر پہلے سیاح کا نام تو ہمیں آخر تک یاد رہے گا۔ ٹھیک دو سو سال ہوئے سب سے پہلا غیر ملکی سیاح جو یہاں آیا اور جو سب سے بہادر اور سب کا پیشوا اور پیشرو تھا اور جس نے اپنا شکل اور تھکا دینے والا سفر اس دریائے اعظم کی مقدس وادی میں کیا وہ تھا لاسیلے جس کا نام اُس وقت تک قائم رہے گا جبتک دریا قائم ہے۔ پارک مین صاحب لکھتے ہیں۔

"کسی طرح وہ لوگ اپنے سفر کے اختتام پر پہونچ گئے۔ ۶ اپریل کو دریا تین حصّوں میں منقسم ہو گیا۔ لاسیلے نے مغرب کا راستہ اختیار کیا اور ڈی آترے نے مشرق کا جبکہ ٹونٹی نے بیچ کا راستہ اختیار کیا۔ جب وہ نشیبی اور دلدلی کناروں کے درمیان جا رہا تھا تو وہ پانی کی گدلی دھار میں بہک گیا اور اس جگہ جا پہونچا جہاں کھاری پانی نمکین پانی میں بدل جاتا ہے اور جہاں نمکین ہوا کی وجہ سے سمندر کی ہوا تازہ معلوم ہونے لگتی ہے یہاں سے بڑی خلیج کی وسیع سطح دکھائی دینے لگی۔ جسمیں لاتعداد خاموش مگر بیچین لہریں اچھل رہی تھیں یہاں نہ کوئی کشتی دکھائی دیتی تھی اور نہ زندگی کے آثار۔"

تب ایک سخت جگہ پر لاسیلے نے ایک ستون بنایا جس پر فرانس کے اسلحہ کا امتیازی نشان بنا تھا اس جھنڈے کے نیچے فرانسیسی لوگ جمع ہو گئے اور انھوں نے فرانسیسی گیت گانا شروع کیا۔ نیو انگلینڈ کے قبائلی اور انکی بیویاں ان فرانسیسیوں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

تب بندوقچیوں نے بندوقیں چھوڑ کر خوشی کے نعرے لگائے۔ فتحیاب متلاشی نے ایک ستون نصب کیا اور بلند آواز میں ایک اعلان کیا۔ یہ اعلان اس خوشی میں کیا گیا کہ ان لوگوں نے شاہ

فرانس کی طرف سے دریائے مسیسپی اور اس سے سیراب ہونے والے اس وسیع ملک پر قبضہ کر لیا ہے۔
ستون پر مندرجہ ذیل عبارت لکھی ہوئی تھی۔ کوئی اعظم شاہ فرانس اور نوار ے کے شہنشاہ
نو اپریل ۱۶۸۲ء

نیوآرلینز کے لوگ اس سال کو خوشی سے منانا چاہتے تھے یہ جشن اس شاندار کھوج کے واقعہ کی پچاسویں سالگرہ تھی لیکن جب وہ دن آیا تو اسوقت ملک میں طوفان آیا ہوا تھا اور جسکی وجہ سے ہر طرف بربادی اور تباہی مچی تھی اور ملک کی طاقت اور دولت کے سب ذرائع اور وسائل اس طوفان کو روکنے کے لئے درکار تھے۔

اٹھائیسواں باب

چچا میمفرڈ کے تجربات و تاثرات

تمام دن ہم دریا کے ... اوپر چلتے رہے ہچکولے کھاتے رہے اور ساری اسٹیم اپنے بچاؤ کے کام میں ... رہے۔ پہلے جب کبھی دریا کی یہ حالت ہوتی تھی تو ہمیں رستے میں عمارتی لکڑی کے لٹھے بیسیوں ایکڑ جگہ میں پھیلے ہوئے ملتے تھے اور درجنوں کوئلے سے بھری کشتیاں ملتی تھیں۔ علاوہ اسکے کبھی کبھی وہ چھوٹی چھوٹی تجارتی کشتیاں بھی ملتی تھیں جو ایک بستی سے دوسری بستی تک جاتی تھیں اور جن پر ملاح کا سارا خاندان سوار ہوتا تھا۔ یا کبھی بھدی سی چپٹے پیندے کا جہاز دکھائی دیتا تھا جس پر چھوٹے چھوٹے حروف میں ہیملٹ اینڈ کو لکھا ہوتا تھا اور جو ... یا ... بڑی دور ... کرتی تھی جو بگڑ جاتا ... ار کھاتی پھرتی تھی۔ بعض ... سب ہملیں ... رسینہ

Hamlet and Co.

میں ایسی کوئی چیز نہ ملی۔ دن میں بہت فاصلے پر ہم نے ایک دخانی کشتی دیکھی، اور وہ بھی صرف ایک ہی، زیادہ نہیں۔ وہ کسی جگہ سائے میں کھڑی سستا رہی تھی۔ دوربین سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ اس کشتی پر میرا نام لکھا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کا نام میرے ہی نام پر رکھا گیا ہو۔ آپ جو چاہے کہہ لیجئے۔ چونکہ اس سفر میں پہلی مرتبہ مجھے اس قسم کی عزت بخشی گئی تھی اسلئے اس کا ذکر کرنا بیجا نہ ہوگا۔ اسکے ساتھ ہی میں افسران کی توجہ بھی اسطرف مبذول کرونگا کہ اس کشتی کو پہچاننے میں میں نے کتنی کاہلی برتی۔

آئی لینڈ نمبر ۱۲ پر دریا میں ایک بہت بڑی تبدیلی نظر آئی۔ پہلے یہ جزیرہ کافی بڑا تھا اور بیچ دھارے میں واقع تھا، لیکن اب یہ ساحل سے ملا ہوا تھا اب چونکہ یہ جزیرہ نہیں رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسلئے اب یہاں پہلی جیسی تجارت بھی نہیں تھی۔

جب ہم پلم پوائنٹ پر پہونچے جو کافی مشہور اور خوفناک جگہ ہے تو اندھیرا ہو چلا تھا لیکن آجکل کے زمانے میں اندھیرے سے کوئی نہیں گھبراتا کیونکہ اب قومی حکومت نے دریائے مسیسپی کی دو تین ہزار میل کی لمبائی میں مشعلوں کی ایک قطار سی لگا دی ہے۔ ہر ایک کراسنگ کے آگے اور ہر کراسنگ کے نیچے گورنمنٹ نے ایک صاف روشنی والا لیمپ لگا دیا ہے۔ اسلئے آپ کو گھپ اندھیرا تو اب کہیں پریشان نہیں کریگا۔ ہمارے سامنے یہ ایک روشنی کا مینار رہنا ہے آگے بھی پیچھے بھی اور دائیں بائیں بھی۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ لیمپ ضرورت سے زیادہ لگا دیئے گئے ہیں۔ بہت سے ایسے کراسنگ بھی ہیں جہاں پر اسوقت جب وہ بنے تھے پانی اتھلا تھا اور نہ اسکے بعد آج تک وہاں کبھی پانی اتھلا ہوا ہے، مگر وہاں بھی روشنی کے لیمپ لگا دیئے گئے ہیں۔ یہ کراسنگ اتنے سیدھے اور صاف ہیں کہ کوئی بھی دخانی کشتی اگر ایک بار دھارے میں داخل ہو جائے تو پھر اسے کسی مدد کی ضرورت نہیں رہے گی تاہم یہ روشنی کے لیمپ بالکل بیکار بھی نہیں ہوتے کیونکہ پائلٹوں کے لئے انکے سہارے چلتے رہنا بہت آسان ہوتا ہے جبکہ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جبکہ کنارہ بالکل دکھائی نہیں دیتا سیدھا چلنا مشکل ہوتا ہے۔ اسکے علاوہ ان کی وجہ سے کشتی چلانے کا خرچ بھی کم ہو جاتا ہے کیونکہ روشنی میں پتوار کشتی میں رکھ کر بھی برابر سیدھا چلا جا سکتا ہے جبکہ اندھیرے میں پتوار کو آگے اور پیچھے برابر چلانا پڑتا ہے جس سے اسکی رفتار کم ہو جاتی ہے۔

لیکن اس انتظام کی وجہ سے بڑی حد تک جہاز رانی کی رومانی کیفیت جاتی رہی گو کہ اسکے علاوہ بھی اور کئی چیزیں ہیں جنکی وجہ سے یہ رومانی کیفیت قریب بالکل ختم ہو چکی ہے۔ مثال کے طور پر بہتے ہوئے پیڑ اب پہلے کی طرح جہازوں کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن پاتے کیونکہ گورنمنٹ کی کشتیاں اِن کو ہٹانے کے لئے دریا میں چڑھاؤ لندہ بہاؤ کی طرف برابر آتی جاتی رہتی ہیں اور وہ برابر دریا سے ان پیڑوں کو باہر کھینچتی رہتی ہیں۔ انھوں نے بہت سے خطروں کو جنکی وجہ سے بہت سے مقامات خاصے دہشتناک بنے ہوئے تھے قریب قریب بالکل ختم کر دیا ہے اور نئی رکاوٹوں کو وہ اکٹھا نہیں ہونے دیتے۔ قدیم زمانے میں اگر آپ کی کشتی اندھیری رات میں بہکر کھنٹھوں میں پھنس جاتی تو یہ آپ کے لئے باعثِ تشویش ہوتا تھا۔ یہی حالت آپکی اس وقت ہوتی تھی جب آپ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کسی تنگ ڈھلان سے ہو کر گذرتے تھے لیکن اب صورتِ حال بدل چکی ہے۔ اب آپ بجلی کی روشنی پھیلا کر ایک لمحے میں رات کو دن میں تبدیل کر دیتے ہیں اور آپ کے سامنے کے خطرات اور آپ کے تمام تفکرات ختم ہو جاتے ہیں۔ ہورس بکسبی اور جارج رِچی نے سب موڑوں کا ایک چارٹ بنایا ہے اور قطب نما کے ذریعے جہازوں کے راستے مقرر کر دئے گئے ہیں۔ انھوں نے ہر چارٹ کے ساتھ ایک لیمپ بھی لگا دیا ہے اور سب چیزوں کو رجسٹرڈ کر دیا ہے۔ ان چیزوں کی مدد سے اب ملّاح کہرے میں بھی حفاظت اور خود اعتمادی کے ساتھ جہاز رانی کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بات پہلے نہیں تھی۔

کھنٹھوں جیسی رکاوٹوں کے ہٹ جانے، لاتعداد روشنی کے میناروں کے لگ جانے، بجلی کی روشنی، جسے جب چاہو کھول لو کی سہولیت سے اور قطب نما اور چارٹوں کی امداد سے جس سے کہرے میں بھی جہاز کو بے خطر چلا سکتے ہیں اب دُور تک پانی میں جہاز رانی اتنی ہی آسان اور بے خطر ہو گئی ہے جتنا کہ موٹر کا سڑک پر چلانا بلکہ اب وہ کار چلانے کے برابر بھی رومان خیز نہیں رہ گئی ہے۔

ان دنوں جبکہ بے انتہا تبدیلیاں ہو رہی ہیں محکمہ جہاز رانی نے کپتان کی تنخواہ بڑھا کر اس کا درجہ پائلٹ سے اونچا کر دیا ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ انھوں نے یہ قاعدہ بھی بنا دیا ہے کہ ڈیوٹی کے وقت پائلٹ کو اپنی جگہ پر رہنا پڑے گا خواہ کشتی چل رہی ہو خواہ کنارے پر

لنگر انداز ہو۔ ہم پائلٹ لوگ جو کبھی دریا کے طبقۂ اُمرا میں سے گنے جاتے تھے اب وہ رُتبہ نہیں رکھتے جو پہلے تھا۔ پہلے جب سینکڑوں ٹن مال گھسیٹ گھسیٹ کر کشتی پر چڑھایا جاتا تھا تو ہم لوگ پڑے سوتے تھے اور ہمیں مال کے چڑھانے اُتارنے سے کوئی مطلب نہیں ہوتا تھا۔ لیکن اب ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ ہمیں پائلٹ ہاؤس میں ہی بیٹھنا پڑتا ہے اور جاگنا بھی پڑتا ہے۔ دراصل اب ہمیں صرف نائب کپتان یا انجینیر کے برابر رُتبہ دیا جاتا ہے گورنمنٹ نے ہمارے پیشے کی پرانی رومانی کیفیت اور کمپنی نے اس کی پرانی شان و شوکت ختم کر دی ہے۔

پلم پوائنٹ اب بھی ویسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسا کہ رات میں پہلے معلوم ہوتا تھا۔ فرق صرف اب اتنا ہو گیا ہے کہ کراسنگ کو پہچاننے کے لئے روشنی کے مینار لگا دیئے گئے ہیں اور اسکے علاوہ اس مقام پر اور اس کے ساتھ ساتھ ساحل پر روشنی کے اور بھی بہت سے ذرائع ہو گئے ہیں۔ یہ روشنی کچھ تو امریکہ کے رور کمیشن کے جہازی بیڑے سے ہوتی ہے اور کچھ ایک قریبی دیہات سے آتی ہے جہاں افسروں نے دفتروں اور ملازمین کے رہنے کے لئے مکان بنائے ہیں۔ ریور کمیشن کے ملٹری انجینیروں نے دریائے مسیسپی کو ایک نئی شکل دینے کی ذمہ داری اپنے اُوپر لے لی ہے۔ پہلے جو اسکیم اس دریا کو جہاز رانی کے قابل بنانے کی تھی اس اسکیم کی توسیع کر کے اب اس دریا کی ہیئت ہی بدلی جا رہی ہے۔ وہ لوگ جگہ جگہ اس دریا پر دونوں طرف پشتے بنا رہے ہیں تاکہ اس کے دھارے کو دوسرے راستوں میں بہا سکیں۔ بہت سے ایسے پشتے بنائے جا رہے ہیں جن سے اسکو بہت تنگ نہروں میں کاٹا جا سکے۔ نیز کچھ باندھ بھی اسلئے بنائے گئے ہیں کہ پانی کو ہمیشہ ادھر ہی روکے رکھیں۔ اب مسیسپی کے ساحل پر بہت دُور تک انجینیر لوگ اسکے ساحل کے کنارے درختوں کو گرا گرا کر ساحل کو پچاس پچاس گز پیچھے تک بڑھا کر صاف کر رہے ہیں جہاں سے ساحل اتھلے پانی کے نشانات تک ایک ڈھلوان چھت کی طرح نیچا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس جگہ کو پتھروں سے بھر کر پختہ کر رہے ہیں۔ بہت سی جگہوں پر انھوں نے گرتے ہوئے کناروں کو کھریلوں کی قطاریں لگا کر روکا ہے۔ جو شخص دریائے مسیسپی کے بہاؤ کی تیزی کو جانتا ہے وہ ظاہراً نہیں تو کم از کم دل میں یہ اعتراف ضرور کرتا ہے کہ ایک تو کیا ایسے دس ہزار دریائی کمشن دنیا بھر کے خزانوں کی مدد سے بھی اس لاابالی دریا پر قابو نہیں پا سکتے اور نہ اسکی تیزی کو کم کر سکتے ہیں اور نہ اسے محدود ہی کر سکتے ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں کر سکتے کہ

اس کو کسی مخصوص راستے سے بہائیں دوسرے راستے سے نہ بہائیں۔ اس سے ایسی محکومیت کی
امید نہیں کی جاسکتی۔ جس ساحل کو اس نے ہڑپ کرنا شروع کر دیا ہے اُسے بہ بچا نہیں سکتے۔
ایسی کوئی رکاوٹ نہیں ہے جو اسکے راستے میں حائل ہوسکے کیونکہ یہ ہر رکاوٹ کو کاٹ پھینکے گا
یا اس پر سے اُچھل کر بہنے لگے گا اور وہ ہر رکاوٹ اور روکنے والی کوشش کا مذاق اڑائے گا لیکن
ایک عقلمند آدمی اپنی زبان سے یہ الفاظ نہیں کہے گا کیونکہ ویسٹ پوائنٹ کے انجینیر اپنا ثانی نہیں
رکھتے وہ اپنے دقیق علم کے بارے میں سب کچھ جانتے ہیں اور چونکہ انکو یقین ہے کہ وہ اس دریا
کی تیزی کو روک کر اسے قابو میں کر لیں گے اور پھر جیسا چاہیں گے اس سے کام لیں گے اسلئے
جو لوگ سائنس نہیں جانتے ان کو خاموش رہ کر انتظار کرنا چاہیئے کہ دیکھیں انجینیر کیا کرتے
ہیں۔ کپتان ایڈس نے مسوری کے دہانے پر پشتے باندھ باندھ کر وہ کام کر لیا ہے جو بالکل ناممکن
معلوم ہوتا تھا۔ اسلئے اب ہم بھروسے کے ساتھ یہ پیشن گوئی نہیں کر سکتے کہ کوئی کام ناممکن ہے۔
ہو سکتا ہے کہ کوئی کہہ اٹھے کہ اگر ریورکمیشن والے دریائے مسیسی کو قابو میں کر کے اُسے ٹھیک اور
مفید راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ ایکرن سیاروں کو بھی دھمکا کر
انھیں اپنا راستہ بدلنے پر مجبور کر دیں اور ان سے جیسا چاہیں ویسا کام لیں۔

میں نے چچا میمفرڈ سے اس معاملے اور اس سے متعلق دوسرے معاملات پر بات چیت کی
اور میری بات چیت سے جو نتیجہ نکلا اسے میں یہاں لکھ رہا ہوں۔ جو باتیں چچا میمفرڈ نے مجھے
بتلائیں انھیں میں نے مختصر نویسی[1] میں لکھ لیا تھا۔ اسلئے انکی دی ہوئی مکمل اور مجمل کی توں
اطلاع میں آپ کو دے رہا ہوں۔ میں نے صرف وہ فقرے چھوڑ دیئے ہیں جو انھوں نے لوگوں
سے خطاب کرتے ہوئے کہتے تھے جیسے "تم اب اس پیپے کو اٹھا کر آگ کی لپٹوں میں کہاں جا رہے
رہو" وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ ان فقروں سے نہ اطلاع میں کوئی اضافہ ہوتا ہے اور نہ اس کی
وضاحت میں۔ بلکہ اُن سے اس بیان کی روانی میں کمی آتی ہے۔ تاہم میں نے ایسے سب فقرات
کو نہیں چھوڑا ہے۔ میں نے صرف ان فقروں کو نکال دیا ہے جو بظاہر بے تعلق تھے، لیکن جہاں
کہیں کوئی ایسا فقرہ تھا جو کسی ضروری سوال کے متعلق تھا تو اسے میں نے بیان میں رہنے

---

[1] SHORT HAND

دریا ہے۔

چچا ہیمفرڈ کے تاثرات

چچا ہیمفرڈ نے کہا، "قریب تیس سال کی مدت کے دوران میں جب میں ایک دخانی کشتی کا نائب کپتان رہا میں نے اس دنیا کو غور سے دیکھا اور اس کا اچھی طرح مطالعہ کیا ہے۔ ہو سکتا ہے ویسٹ پوائنٹ پر اس دریا کے متعلق زیادہ سیکھ لیتا لیکن اگر میں اس کا یقین کروں تو میری خواہش ہوتی ہے کہ میں اتنا ہی واقف کار ہوتا جتنا کہ آپ مجھے دیکھنا چاہتے تھے۔ تب میں کہتا ارے۔ آپ لوگ اپنی انگلیوں کو کیوں چوس رہے ہیں؟ کیلوں کے اس جال کو پکڑ لو۔ چار سال تک میں ویسٹ پوائنٹ پر رہا۔ میرا خیال ہے کہ کتابیں اور اسکول کی پڑھائی آدمی کو اور علم تو سکھا دیتی ہیں لیکن وہ دریا کے متعلق مکمل واقفیت نہیں کرا سکتیں۔ اگر آپ یورپ کے کسی چھوٹے دریا کے متعلق جس کی تہ سخت ہو اور پانی صاف، ریور کمیشن کے انجینیروں سے کہیں کہ اسکو انسان کے لئے مفید بنا دیں تو یہ انکے لئے بائیں ہاتھ کا کام ہوگا۔ وہ اس پر پشتے اور باندھ بنا ڈالیں گے اور اسکے دھارے کو قابو میں کر لیں گے، اس کو جدھر چاہیں گے موڑ دیں گے، اُسے جہاں چاہیں گے لیجائیں گے اور جہاں چاہیں گے اسے ٹھہرائیں گے اور جیسا چاہیں گے اس سے کام لیں گے۔ لیکن دریائے مسیسپی ایسا دریا نہیں ہے۔ مگر اس دریا پر بھی انھوں نے بڑی خود اعتمادی سے کام شروع کیا ہے اور ان کے ارادے بھی اس دریا سے مفید ترین کام لینے کے ہیں۔ لیکن وہ ابھی پورے نہیں ہو رہے ہیں۔ کیا توریت کے باب ۱۲ پیرا ۱۳ میں ایسا نہیں لکھا ہے "ان کا چھوٹا سا کھیل گڑبڑ ہو جائے گا" اب ذرا آپ ان انجینیروں کے اس طریقۂ کار کو ملاحظہ فرمائیے جس سے انھوں نے اس دریا کے بالائی حصے میں کام لیا ہے۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ ڈیولس آئی لینڈ[1] پہ پانی کو کسی مخصوص راستے سے لیجائیں لیکن پانی دوسرے راستے سے جانا چاہتا تھا اسلئے انھوں نے دریا میں ایک پتھر کی دیوار بنادی۔ لیکن دریا بھلا ایسی دیوار کی کیا پرواہ کرتا ہے جب دیوار بن کر تیار ہوئی تو پانی اوپر اٹھ کر دیوار توڑ کر بہ نکلا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ دوسری دیوار زیادہ مضبوط بنالتے اور وہ ٹھہر جاتی اور پانی کو روک لیتی۔ لیکن

---

[1] Devil's Island

دریا میں اگر وہ دوسری دیوار نہیں بنا سکے۔ دریا کے نشیبی حصّے میں انھوں نے کچھ روک کھڑی کر کے پانی کو ساحل سے ہٹا دیا تا کہ وہ تھوڑا تھوڑا کناروں کو کاٹتا نہ رہے۔ یہ تو ٹھیک ہے مگر کیا یہاں سے ذرا دور دریا نے کناروں کو اور جگہوں پر کاٹنا شروع نہ کر دیا ہوگا۔؟ غالباً ضرور کاٹتا ہوگا۔ کیا وہ سارے ساحل پر اسطرح کی روک لگا سکتے ہیں۔؟ اور اس پر جو کثیر رقم خرچ ہوگی اس سے تو یہی سستا رہیگا کہ وہ نئی زمین خرید کر اس پر ایک نیا دریا مسیسپی بہا دیں۔ اب وہ لوگ بلیٹن ٹاو ہیڈ کے مقام پر ساحل کے پاس روک لگانے کا کام کر رہے ہیں لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اگر اس جزیرے کے پاس دریا نے کچھ مٹی جمع کر رکھی ہے تو دریا وہاں سے خود بخود ہٹ جائیگا۔ روک آپ چاہے لگائیں چاہے نہ لگائیں۔ اس سے تھوڑی دُور نشیب کی طرف جا کر انھوں نے ریت کی ایک خشک آدھ میل لمبی دیوار کے بیچ میں دو قطاریں کھمبوں کی لگا دی ہیں۔ جب پانی اتھلا ہوتا ہے تو یہ دیوار پانی سے چالیس فٹ باہر ہوتی ہے۔ آپکے خیال میں یہ کس لئے ہے؟ اگر میں یہ بات جانتا تو میں تو یہ خواہش کرتا کہ اگر آپ اس منصوبے کے بانی مبانی ہوں تو آپ کو ہی وہاں اُتار دیا جائے۔

دیکھیے ملیکنس موڑ پر انجینیر کیا کر رہے ہیں۔ اس طرف دریا نے ایک جگہ کٹاؤ کیا ہے جسکی وجہ سے وکسبرگ سرد علاقے میں آگیا ہے اور اب یہ دیہاتی قصبہ ہوگیا ہے۔ دریا اسکے جنوب میں بہتا ہے اور کشتی بجز سیلاب کے اس جگہ سے اوپر نہیں جا سکتی۔ اور اب وہ لوگ مقام ۱۰۳ کے مقابل ایک پشتہ بنا رہے ہیں اور ایک پرانی کھائی میں سے دریا کو پھر نکال رہے ہیں یعنی اس جگہ سے جہاں دریا کبھی زمانہ قدیم میں بہتا تھا۔ وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ دریا کو اسی راستے سے پھر بہا سکتے ہیں تا کہ وہ وکسبرگ کے شمال میں ہو کر بہے جیسے کہ وہ پہلے بہتا تھا اور وکسبرگ کو پھر باقی دنیا سے جوڑ دیں۔ اسکا مطلب یہ ہوگا کہ وہ دریائے مسیسپی کو موڑ کر کئی میل اوپر کی جانب لیجانا چاہتے ہیں۔ ٹھیک ہے ہم ان انجینیروں کی تعریف کرتے ہیں جو ایسے منصوبے بناتے ہیں۔ اور کوئی ان کی حمایت کرے یا نہ کرے ہمیں انکے کارنامے یاد رکھنے چاہئیں۔ البتہ تمھیں یہ یقین کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ وہ لوگ ایسی کرامات کر سکتے ہیں تاہم تم یہ بھی یقین نہیں کر سکتے

لہ Bulletin Tow head

کر دہ ایسے کام نہیں کر سکتے۔ اس صورت میں میرے خیال میں آسان راستہ یہی ہے جہاں تک ہو سکے اس معاملے میں خاموش رہ کر انتظار کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ وکسبرگ میں کافی جائداد خرید لی جائے تاکہ اگر اس شہر کو دریا سے فائدہ پہنچے تو آپکے نقصان کی بھی تلافی ہو سکے۔ گورنمنٹ مسیسپی کو کار آمد بنانے کے لئے بہت روپیہ خرچ کر رہی ہے۔ جب اس دریا میں چار ہزار دخانی کشتیاں دس ہزار ایکڑ کوئلہ ڈھونے والے جہاز، بہت سی لٹھوں والی کشتیاں نیز تجارتی مال سے بھری ہوئی کشتیاں چلا کرتی تھیں تو اسوقت سینٹ پال سے نیو آرلینز تک ایک بھی لالٹین نہیں لگی تھی اور بہتے ہوئے درخت اتنی زیادہ تعداد میں پائے جاتے تھے جتنی تعداد کہ غالباً سؤر کی پیٹھ پر رونگٹوں کی بھی نہ ہوگی اور اب جہاں صرف تین درجن دخانی کشتیاں چلتی ہیں اور ایک بھی جنگی جہاز یا لٹھوں کا بیڑا نہیں ہوتا اور گورنمنٹ نے بھی بہتے ہوئے درختوں کو باہر نکال پھینکا ہے اور رات میں کناروں کو اتنا روشن کر دیا ہے کہ جیسے رات نہ ہو دن ہو۔ اسوقت اس دریا میں کشتی اتنی محفوظ رہتی ہے جیسے وہ بہشت کی کسی ندی میں تیر رہی ہو۔ اور میرا اندازہ ہے کہ جبتک ایک بھی کشتی دریا میں چلتی رہے گی اسوقت تک ریور کمیشن پرانے حالات بدلتا رہے گا۔ دریا کی حدوں کی بھی احاطہ بندی کی جائے گی اور انکی صفائی کا بھی انتظام ہوگا اور ان سب انتظامات کی بدولت جہاز رانی مکمل طور پر بے ضرر ہی نہیں بلکہ بیحد مفید ثابت ہوگی۔ ہر روز وہی لطف رہے گا جو اتوار کی سیر و تفریح میں رہتا ہے اور سب نائب کپتان سنڈے اسکول کے واعظوں کی طرح ملاحوں سے کہا کریں گے۔ "مدشم کس لئے بیوقوفی کر رہے ہو۔ اے بے ایمان کی اولاد اور اے بربادی کے وارث تمہیں ساحل پر جاتے ہوئے ایک سال ہوگیا کیا تمھیں وہاں شراب کا پیپا ملیگا۔؟"

نیو آرلینز تک جانے اور واپس آنے میں ہم نے دریا کے آدمیوں کے ساتھ بہت سی باتیں کیں۔ بافلت کے مالکوں سے، جرنلسٹوں سے اور ریور کمیشن کے افسران سے، لیکن نتیجہ وہی متضاد خیالات اور الجھا دینے والی باتیں۔ خلاصہ یہ ہے :-

ا۔ کچھ لوگ تو کمیشن کے اس منصوبے میں یقین رکھتے تھے کہ کمیشن خود مختارانہ ڈھنگ سے اور مستقل طور سے اس دریا کو گہرا کر کے جہاز رانی کے راستے معین کر دے

اور محفوظ کناروں کو محفوظ رکھے۔

۲۔ کچھ لوگ اس بات میں یقین رکھتے تھے کہ کمیشن کا روپیہ صرف نئے پشتوں کے بنانے یا پرانے پشتوں کی مرمت میں خرچ ہو۔

۳۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ آپ جتنے اونچے اونچے پشتے بنائیں گے دریا کی تہ اتنی ہی اونچی اٹھے گی اور یہ کہ آخر میں پشتوں کا یہ سلسلہ ایک غلطی ثابت ہوگی۔

۴۔ کچھ لوگ اس بات میں یقین کرتے تھے کہ سیلاب کے وقت دریا کا فالتو پانی لیک بوجن[1] وغیرہ جھیلوں میں ڈالکر اسکی تیزی کو کم کیا جائے۔

۵۔ اور کچھ لوگوں کی رائے یہ تھی کہ شمال کی جھیلوں میں پانی اکٹھا کرنے کا جو انتظام ہے اس سے مسیسپی میں اس موسم میں پانی چھوڑا جائے جب اس دریا میں پانی کناروں سے بہت نیچا رہ جاتا ہے۔

اگر آپ کو کوئی ایسا آدمی ملتا ہے جو مذکورہ بالا اصولوں میں سے کسی ایک میں یقین رکھتا ہے تو پھر آپ اگلے آدمی سے بات چیت کیجئے اور یہ فرض کر کے بات چیت کیجئے کہ وہ آپ کے اصولوں میں یقین نہیں کرتا اور جب آپ کو مختلف لوگوں سے بات کر کے تجربہ حاصل ہو جائے تو آپ جو راستہ اختیار کریں وہ بلا کسی شک و شبہ کے کرینگے بلکہ آپکا اعتقاد اس قابل جیسا ہوگا جو مر رہا ہو یعنی جسکی کایا کلپ ہو رہی ہو۔ کیونکہ اب آپ کو معلوم ہو چکا ہوگا اور بڑے اطمینان کیساتھ یقین بھی ہو چکا ہوگا کہ کوئی بھی دو انسان آپ کو ایسے نہیں ملیں گے جو ایک ہی اصول کے ماننے والے ہوں۔ انمیں اختلاف ہونا ضروری ہے بالکل ایک سی رائے لوگوں کی کبھی نہیں ہوتی علاوہ اس کے جب آپ آگے بڑھیں گے تو آپکو دو ایک اور بھی نئی باتیں نظر آئیں گی۔ کچھ لوگوں میں جو بے چینی ہوتی ہے وہ چھوت کی بیماری کے مثل جلد ہی دوسرے لوگوں میں پھیل جاتی ہے اور جہاں بھی آپ جاتے ہیں اس مرض کے شکار آپ کو ضرور ملجاتے ہیں۔ آپ اپنے آپ کو اس بیماری سے محفوظ رکھنے کے لئے چاہے کتنی ہی تدبیریں کر لیں مگر وہ سب بے سود ثابت ہونگی۔ ایسا معلوم ہوگا کہ آپ احتیاط کی وجہ سے اس بیماری سے بچے ہوئے ہیں مگر دراصل ایسی بات نہیں ہوگی۔ جبھی آپ ان نظریوں

---

[1] Lake Bogne

میں سے کسی ایک کو ماننے والے سے ملتے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ آپ کا ذہنی سکون منتشر ہونیوالا ہے۔ ہاں آپ یقیناً بےچینی کا شکار ہو جائینگے لیکن نظریہ پیش کرنیوالے کا کام صرف آپ کو تکلیف پہنچا کر ختم نہیں ہو جاتا۔ یہ تو اس کے کام کا ایک پہلو ہے۔ دراصل جو کوئی آپ کے سامنے کوئی نظریہ پیش کرتا ہے اسکی حیثیت آپکے خاندانی ڈاکٹر کی سی ہو جاتی ہے۔ اگر وہ کنبڑوں کا علاج کرنے جاتا ہے تو سرخ بخار اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ اگر آپ کا نظریہ پیش کرنیوالا ان لوگوں میں سے ہے جنھوں نے لیک بورجن کو درست کرنے کے لئے نظریے پیش کئے تھے تو وہ بیکار کے واقعات و اعداد و شمار کا ایک ڈھیر آپکے سامنے ڈال دیگا جو یقیناً آپکو اس بیماری میں مبتلا کرے گا لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ آپکو دوسرے پانچ نظریوں میں سے ہر ایک سے چھٹکارا دلا دیگا جو کبھی آپکے دماغ میں مرتسم ہوئے تھے۔

میں نے قریب قریب پانچوں نظریوں کو پڑھا ہے اور ان کو برا کہا ہے۔ لیکن ماتمی صورت بنا کر مجھ سے یہ مت پوچھئے کہ ان میں سے کس سے مجھے سب سے زیادہ تکلیف پہونچی یا لوگ کس نظریئے کے زیادہ شکار پائے گئے۔ مجھے یہ سب یاد نہیں۔ دراصل پہلے سوال کا جواب کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ مسیسپی کی اصلاح ابتک ایک کٹھن موضوع بنا ہوا ہے۔ کیرو سے جنوب کی طرف ساحل پر ہر آدمی اسکے بارے میں ہر روز بات کرتا ہے اور خاصکر ان لمحات میں جب انھیں جنگ کے ذکر سے فرصت ہوتی ہے۔ ان نظریوں میں ہر نظریہ کو ماننے والے جوشیلے لوگ ملجائیں گے لیکن جیسا کہ میں نے کہا یہ بتانا ناممکن نہیں کہ کس نظریئے کے ماننے والے سب سے زیادہ تعداد میں موجود ہیں۔

بہرحال ایک بات پر سب لوگ متفق تھے اور وہ یہ کہ اگر کانگریس روپیہ پیسے کا ٹھیک ٹھیک انتظام رکھے تو اس سے بہت فائدہ ہوگا۔ تبھی سے انتظام ٹھیک ہونے لگا ہے۔ اسکے لئے جو رقم مخصوص کی گئی ہے وہ معقول تو ہے لیکن بہت زیادہ نہیں۔ یہ بھی امید رکھنی چاہیئے کہ پیشنگوئی آیندہ چل کر پوری ہو جائے گی۔

ایک بات مطالعہ کنندہ کو ضرور ماننی پڑے گی کہ مسٹر ایڈورڈ ایٹکنس کی رائے کسی بھی بڑے قومی تجارتی معاملہ میں اہل اقتدار کی رائے سے کم نہیں ہے اور انکی اہمیت امریکہ میں کسی اور کی رائے کی نہیں ہے۔ دریائے مسیسپی کی اصلاح کے بارے میں جو کچھ اس نے کہا ہے وہ اس کتاب کے تتمہ میں آپ پڑھیں گے۔

کبھی کبھی جس مضمون کی اہمیت کو دس ہزار محنت سے لکھے ہوئے الفاظ مبہم اور غیر واضح چھوڑ دیتے ہیں اس کو صرف نصف درجن تصویریں اتنا واضح کر دیتی ہیں جیسے بجلی کے کوندنے کی روشنی میں کوئی تاریک چیز اُجالے میں آجاتی ہے۔ اس امر کی ایک واضح مثال نیچے کے پیراگراف میں جو "سنسناٹی کامرشل" اخبار سے لیا گیا ہے آپکو ملے گی۔

ایک سامان کھینچنے والی کشتی جس کا نام جاسن بی ڈیمس ہے سامان سے بھری بتیس کشتیوں کو کھینچ رہی ہے یہ سامان کشتی کے اندر ہی کے چھ لاکھ بشل کوئلہ پر مشتمل ہے یہ نیو آرلینز جا رہی ہے یہ کشتی غالباً سب سے بڑی کشتی ہے جو نیو آرلینز یا دریا کے کسی مقام پر کبھی پہنچی ہوگی۔ تین سینٹ فی بشل کرایہ کی وجہ سے یہ کشتی اٹھارہ ہزار ڈالر محصول کا مال لے جا رہی ہے اگر یہ سامان مال گاڑیوں سے ڈھویا جاتا تو ہمیں اٹھارہ سو ایسی مال گاڑیوں کی ضرورت پڑتی جنمیں سے ہر ایک میں تین سو تینتیس بشل سامان آتا اور اگر دس ڈالر فی ٹن کا محصول لیا جاتا تو ایک گاڑی کا محصول سو ڈالر اور کل محصول ایک لاکھ ۸۰ ہزار ڈالر ہوتا کیونکہ ریل سے فاصلہ زیادہ طے کرنا پڑتا یا یوں سمجھئے کہ جہاز کے مقابلہ ریل سے ایک لاکھ باسٹھ ہزار ڈالر زیادہ محصول دینا پڑتا۔ مگر سامان کھینچنے والی کشتی پٹس برگ سے نیو آرلینز تک چودہ پندرہ دن میں پہنچ جاتی ہے۔ ریل سے اس سامان کو لیجانے میں ایکسو ایسی مال گاڑیوں کی ضرورت پڑتی جنمیں سے ہر ایک میں اٹھارہ اٹھارہ ڈبے ہوتے اور اگر مال گاڑیاں بہت ہی تیز رفتار سے جاتیں تو بھی اس کوئلے کے ڈھونے میں سارا موسم گرما ختم ہو جاتا۔

جب دریا اچھی حالت میں ہو اور وہ اتنے سامان کو ڈھونے میں آپکی الا کھ باسٹھ ہزار ڈالر کی اور کل موسم گرما کے وقت کی بچت کر دے تو اس بات کو ایک معمولی سمجھ کا آدمی جس کا تجارت سے کوئی تعلق نہیں ہے سمجھ لے گا کہ دریا کو اچھی حالت میں رکھنا کتنا دور اندیشی کا کام ہے اور اس کام میں خرچ کرنا کتنا واجب ہے۔

اُنتیسواں باب

کچھ بدمعاش لوگ جو بظاہر نیک تھے

ہم پام پوائنٹ علاقے سے گزرے اور کریگ ہیڈ پوائنٹ کی طرف مڑے اور اُس فورٹ پلو سے جو کسی وقت بڑا خطرناک سمجھا جاتا تھا ہم بلا کسی خطرے کے آسانی سے گزر گئے۔ یہ قلعہ اسلئے بھی مشہور تھا کہ جنگ کے دوران میں یہاں برابر قتلِ عام ہوتا رہا تھا۔ قتلِ عام کئی عیسائی قوموں کی تواریخ میں وقتاً فوقتاً اور جگہ جگہ ہوتے رہے ہیں۔ لیکن امریکہ کی تاریخ میں بھی ایک مقام ایسا ہے جہاں قتل کی زیادہ وارداتیں ہوئی ہیں اور غالباً قتلِ عام جیسے بھاری جرم کے عنوان کیلئے بھی مقام زیادہ موزوں ہے۔ بوسٹن کے قتل میں صرف دو یا تین آدمی مارے گئے تھے لیکن جتنا المناک سانحہ فورٹ پلو میں ہوا اس کا ثانی کل انیسویں صدی کی تاریخ میں ملنا مشکل ہے۔ خواہ ہم تاریخ کے اس ذخیرے میں قدیم زمانے کے سیرڈی لائن جو اپنے وقت کا بڑا [illegible] کے کارنامے بھی شامل کر دیں۔

اس دریا کے اور بھی عجوبے دیکھیے۔ زمانہ قدیم میں دریا آئی لینڈ نمبر ۳۷ کے شمال میں بہتا تھا اور برانڈی وائن ہارسٹ گزر کر آئی لینڈ نمبر ۳۹ کی طرف جاتا تھا۔ بعد میں اس نے اپنا راستہ بدل دیا اور برانڈی وائن سے ڈیولس ایلبو [illegible] و گمین کی ڈھلان میں سے ہو کر آئی لینڈ نمبر ۳۶ تک بہنے لگا۔ یہ دور تک تو اس کا راستہ پہلے سے بالکل الٹ ہو گیا۔ یہ دریا پانچ میل تک بجائے جنوب کی طرف بہنے کے دریا۔۔ شمال کی طرف بہنے لگا۔ اس طرح اس نے کل ملا کر قریب ۱۵ میل کا فاصلہ کم کر ڈالا۔ یہ ۱۸۷۶ء میں ہوا۔ اب اس علاقے کو سینٹینیل آئی

لینڈ کہتے ہیں۔

یہ کہاوت چلی آرہی ہے کہ آئی کینڈ نمبر، ۳ "مشہور میورل کے گروہ" کے چھپنے کی جگہ تھی یہ ڈاکوؤں، گھوڑوں کے چوروں اور حبشی غلام بیچنے والوں اور ٹھگوں کی بہت بڑی جماعت تھی جو قریب پچاس ساٹھ سال پہلے اس دریا کے کنارے اپنے سیاہ کارنامے کیا کرتی تھی۔ دیہاتوں میں سے ہو کر سینٹ لوئی کی طرف بڑھتے ہوئے ہمیں مسلسل جیسی جیمس کی کبھی نہ ختم ہونے والی ہیجان خیز داستان سننی پڑی۔ کیونکہ اُسے حال ہی میں مسوری کے گورنر کے ایک کارندے نے قتل کر دیا تھا اور اسکا حال اخباروں میں خوب زور و شور سے اور تفصیل سے شائع ہو رہا تھا اخباروں کے وہ نسخے جن میں اُس کی داستان شائع ہوئی تھی خوب بکتے تھے اور لڑکے ان کو گاڑیوں کے اندر بیچا کرتے تھے ان روایتوں کے مطابق وہ اپنی قسم کا بڑا حیرت انگیز انسان تھا۔ ایسا آدمی کسی نے پہلے شاید ہی دیکھا ہو، حالانکہ یہ کہنا بجا ہو گا کیونکہ جرأت، جبر، ظلم، وحشیانہ پن، سنگدلی، دھوکا بدی اور بے شرمی میں میورل اس سے کم نہیں تھا بلکہ کچھ دوسرے پہلوؤں کے اعتبار سے وہ جیسی جیمس سے بھی آگے تھا۔ جیمس بذاتِ خود ایک بدمعاش تھا اور میورل بدمعاشوں کا سرغنہ۔ جیمس کی ذہانت معمولی قسم کی تھی۔ اس کی عقل کی اُڑان منصوبے بنا کر موٹر کاروں، گھوڑے گاڑیوں اور دیہاتی بینکوں کو لوٹنے سے زیادہ نہیں تھی جبکہ میورل نے منصوبہ بنا کر حبشی لوگوں سے بغاوت کروا دی اور نیو آرلینز پر قبضہ کر لیا۔ اسکے بعد موقع ملنے پر بھی میورل ممبر پر کھڑے ہو کر انجمن کو اخلاقی تلقین بھی کر سکتا تھا۔ اس شاندار پرانے جرائم پیشہ کے سامنے جیمس مکر و فریب سے وعظ دینے اور بغاوت کرانے اور شہر پر قبضہ کر لینے کی قابلیت تھی اور جسکے ہزاروں آدمی ایسے مرید تھے کہ اسکی بُری خواہشات کے مطابق کام کرنے کو ہر وقت تیار رہتے تھے بیچارہ جیمس اور اس کے نصف درجن گنوار بدمعاش کیا حیثیت رکھتے تھے۔

اس بڑے فتنہ کار کے متعلق ایک نئی مگر فراموش شدہ کتاب میں مندرجہ ذیل حالات جو دو پیرا گراف پر مشتمل ہیں، اس طرح درج تھے:-

"دیکھنے سے ہی پتہ لگ جاتا تھا کہ یہ شخص بہت ہی ہوشیار اور پکا بدمعاش ہے۔ جب وہ سفر کیا کرتا تو عموماً ایک گشتی واعظ کا بھیس بدل کر چلتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسکے

وعظ بظاہر اتنے دلپذیر ہوتے تھے اور لوگوں کو انہیں اتنا لطف آتا تھا کہ وہ اپنے گھوڑوں کی طرف بھی جن پر وہ چڑھ کے آتے تھے، دیکھنا بھول جاتے تھے۔ لہٰذا وہ انھیں اپنے وعظ میں مشغول رکھتا تھا اور اسکے شریک کار انکے گھوڑوں کو لیکر بھاگ جاتے تھے۔ لیکن گھوڑوں کا ایک ریاست سے چرا کر دوسری ریاست میں بیچ دینا انکے سیاہ کارناموں کا محض ایک معمولی ساحصہ تھا۔ زیادہ آمدنی کا دھندہ تو غلاموں کو بیچنا تھا۔ وہ ایک حبشی غلام بہلا پھسلا کر اسکے مالک کے یہاں سے بھگا دیتے اور پھر اُسے دوسری ریاست میں لیجا کر اسے کسی دوسرے خریدار کے ہاتھ بیچ دیتے۔ یہ کام اس طرح کیا جاتا تھا۔ وہ لوگ حبشی غلام سے یہ کہا کرتے تھے کہ اگر وہ اپنے موجودہ مالک کے یہاں سے بھاگ جائے اور انکے ذریعہ کہیں دوسری جگہ بک جائے تو وہ اس قیمت میں سے اسے بھی کچھ حصہ دینگے۔ غریب بدقسمت غلام اس امید میں کہ اسے بھی کچھ روپیہ ملجائے گا اور قدرے آزادی بھی، ان لوگوں کے حسب منشا عمل کرنے کو آمادہ ہو جاتا تھا۔ اسطرح اسے دوسرے نئے مالک کے ہاتھ فروخت کیا جاتا اور پھر اسے وہاں سے بھی بھگا دیا جاتا۔ کبھی کبھی وہ اس طرح اسے تین یا چار مرتبہ بیچتے اور تین یا چار ہزار ڈالر ہتھیا لیتے۔ لیکن چونکہ ان ٹھگوں کو بھی اپنے پکڑے جانے کا اندیشہ ہوتا تھا اسلئے وہ یہ کوشش کرتے کہ ان کے جرم کا ثبوت نہ مل سکے۔ اور یہ ثبوت ہو سکتا تھا یہی غریب حبشی غلام۔ لہٰذا وہ اس کو قتل کر دیتے تھے، اور اسکی لاش کو دریائے مسیسپی میں پھینک دیتے تھے، اور اگر حبشی کے قتل ہونے سے پہلے ہی یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ ان ٹھگوں نے اُسے چرایا ہے تو وہ سزا سے بچنے کے لئے اُسے کہیں چھپا دیتے۔ اس گمشدہ حبشی کے بارے میں اشتہار نکالا جاتا تھا اور اسکو پکڑنے والے کے لئے انعام کا اعلان کیا جاتا تھا اعلان میں حبشی کو تلاش کر کے لانیوالے کو بطور انعام حبشی کو ہی پالنے کا اختیار دیا جاتا تھا اور اسطرح وہ حبشی ان لوگوں کی ہی ملکیت بن جاتا تھا مگر وہ اسے بطور امانت کے رکھ سکتے تھے بیچ نہیں سکتے تھے اور اگر انھوں نے اُسے فروخت کر دیا تو یہ جرم چوری کا تو نہیں البتہ امانت میں خیانت کا ضرور مانا جاتا تھا اور اسکے اصلی مالک کو یہ اختیار دیا جاتا تھا کہ وہ عدالت میں خیانت کرنیوالے پر مقدمہ چلا سکے مگر اسطرح کے مقدمہ چلانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا کیونکہ مقدمے کا خرچہ یا نقصان کا معاوضہ مدعی کو کبھی نہیں ملتا تھا۔ یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے کہ میورل لنچ کے قوانین سے کیسے بچ جاتا تھا؟ یہ بات بڑی

LYNCH

آسانی سے سمجھ میں آجائے گی۔ میورل کے ایک ہزار سے زیادہ شریک کار تھے اور یہ لوگ خبر ملتے ہی ایک لمحہ کے اندر اپنے مصیبت میں گرفتار ساتھیوں کی امداد کو تیار ہو جاتے تھے۔ میورل کے جو خاص خاص بدمعاش ساتھی تھے انکے نام ایک بار خود اسی کی زبانی معلوم ہوئے تھے اور کیسے معلوم ہوئے اس کا حال بھی میں آپ کو بتاتا ہوں۔ اس بڑے گروہ میں دو طرح کے لوگ تھے۔ ایک جماعت تو تھی سرداروں کی جسے مجلس کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ اس جماعت کے لوگ صرف منصوبہ بناتے تھے اور پالیسی وضع کرتے تھے۔ اس پر عمل یہ خود نہیں کرتے تھے۔ یہ چار سو کے لگ بھگ تھے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو پہلی جماعت کے بنائے ہوئے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتے تھے اور ہمیشہ عمل کے لئے مستعد رہتے تھے۔ ان کو مارنے والی جماعت کہتے تھے۔ ان کی تعداد قریب ساڑھے چھ سو تھی۔ مگر یہ جماعت پہلی جماعت کے لوگوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی کی طرح تھی۔ حالانکہ خطرہ سب مارنیوالے لوگ ہی مول لیتے تھے مگر ان کو مال غنیمت کا بہت تھوڑا حصہ ملتا تھا اور یہ ہمیشہ سرغنہ لوگوں کے زیر اثر رہتے تھے۔ کیونکہ وہ کسی بھی وقت یا تو انھیں قانون کے حوالے کر سکتے تھے یا انکے جسم کے ٹکڑے کر کے انھیں مسیسپی میں ڈلوا سکتے تھے۔ ان بدمعاشوں کے ملنے کی جگہ عام طور پر دریائے مسیسپی کے اس طرف ہوتی تھی جدھر اوکنسا واقع ہے۔ یہیں یہ اپنے حبشی غلاموں کو دلدلوں یا جنگل کی جھاڑیوں میں چھپا دیتے تھے۔

اس عظیم گروہ کی لوٹ مار سے عام پبلک میں بڑی کھلبلی مچی ہوئی تھی، لیکن ان لوگوں کے منصوبے اتنی طرح بنائے جاتے تھے کہ اگرچہ میورل کا ہاتھ ہر کام میں ہوتا تھا اور اسکی موجودگی کا شبہ ہر جگہ کیا جاتا تھا مگر اسکے مجرم ہونے کا کوئی ثبوت نہیں مل پاتا تھا۔ ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ اسٹیورٹ نامی ایک نوجوان کی ملاقات اچانک میورل سے ہو گئی۔ اسٹیورٹ ان دو حبشی غلاموں کی دیکھ بھال کر رہا تھا جنھیں میورل بھگا لایا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے میورل کا اعتماد حاصل کر لیا یہانتک کہ وہ میورل کا رازدار بھی بن گیا تھا اور اسے گروہ کی مجلس عامہ میں شامل کر لیا گیا۔ حالانکہ اسٹیورٹ نے راز افشا نہ کرنے کی قسم کھائی تھی پھر بھی اس نے دھوکا دیا اور گروہ کے سب راز حکومت کو بتا دیئے اس نے گورنمنٹ کو گروہ کی دونوں جماعتوں کے سب نام بتا دیئے اور اس طرح میورل کے خلاف عام خواہ شہادت پیدا ہو گئی اور اسے اصلاحی قید کی سزا دی گئی (میورل

کو چودہ سال قید کی سزا ملی) اسی طرح بہت سے لوگ جو ایماندار سمجھے جاتے تھے اور جو امریکہ کی مختلف ریاستوں میں بڑی عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اس گروہ کے رکن نکلے۔ اُنکے نام اس بڑی مجلس کی فہرست میں جسکو سٹیورٹ نے شائع کرایا تھا پائے گئے۔ یہ تعداد اتنی بڑی تھی کہ لوگوں کو اسکی سچائی پر یقین نہیں آتا تھا۔ بہت سی کوششیں کی گئیں کہ سٹیورٹ کے دعووں کو جھوٹا ثابت کیا جائے۔ اس کے چال چلن کو بدنام کیا گیا اور کئی بار اسے قتل کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُسے جنوبی ریاستوں کو چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ مگر اب تو پوری طرح یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ مسٹر اسٹیورٹ نے جو کچھ بتایا تھا وہ درست تھا اور اگرچہ لوگ اس پر اس بات کا الزام لگاتے ہیں کہ اس نے اپنی قسم توڑ دی مگر وہ اس بات سے انکار نہیں کرتے کہ جو راز افشا کئے وہ سب درست تھے۔ میں یہاں ایک دو اقتباسات میورل کے اِن اعترافات سے پیش کرونگا جو اس نے مسٹر اسٹیورٹ سے کئے تھے جبکہ وہ ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ اِن بیانات سے میں نے یہ اخذ کیا ہے کہ میورل اور اسکے ساتھیوں کے ارادے جیسا کہ میں نے خود کہا ہے بہت اونچے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان کا مقصد امریکہ میں گورے لوگوں کے مقابلے میں حبشیوں کو صف آرا کرنا تھا۔ جو نیو آرلینز پر قبضہ کر کے اُسے لوٹنا اور اس علاقے کا خود مالک بن جاتا تھا۔ اقتباسات یہ ہیں:۔

"میں نے نیو آرلینز کے قریب اپنے سب ساتھیوں کو ایک دوست کے مکان پر جمع کیا اور ہم نے چار دن متواتر صلاح و مشورہ کے بعد اپنا منصوبہ مکمل کیا۔ پھر ہر خطرے کا مقابلہ کرتے ہوئے ہم نے بغاوت کرنیکا ارادہ کیا اور اس مقصد کے لئے اپنے دوستوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں جمع کیا۔ ہر آدمی کے سپرد کوئی نہ کوئی کام کر دیا گیا۔ اسکے بعد میں نیو آرلینز میں اپنا گھوڑا بیچ کر نیچز کو پیدل روانہ ہوا کیونکہ میرا ارادہ گھوڑا چرانے کا تھا۔ چار دن تک میں پیدل چلتا رہا کیونکہ مجھے گھوڑا چرانے کا کوئی موقع ہاتھ ہی نہ آیا۔ پانچویں دن بارہ بجے کے قریب چونکہ میں تھک گیا تھا اسلئے میں ایک چھوٹی سی ندی کے کنارے پانی پینے اور آرام کرنے کی غرض سے رک گیا۔ میں ایک لٹھے پر بیٹھا ہوا تھا اور سڑک کی طرف جدھر سے میں آیا تھا دیکھ رہا تھا کہ مجھے ایک آدمی ایک خوبصورت گھوڑے پر سوار آتا دکھائی دیا۔ جوں ہی میں نے اسے دیکھا میں نے اس کا گھوڑا چھیننے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ صرف دیکھنا یہ تھا کہ وہ مسافر ہے یا کوئی اور۔ وہ گھوڑے پر سوار میری طرف آ رہا تھا۔ اسکے ساز و سامان سے مجھے پتہ چل گیا کہ وہ واقعی ایک مسافر ہے۔ میں

اٹھا اور میں نے ایک عمدہ سی پستول جو میرے پاس تھی اسکی طرف تانی کر اُسے گھوڑے سے اترنے پر مجبور کیا۔ وہ گھوڑے سے اُتر پڑا۔ میں نے اس گھوڑے کی لگام پکڑ لی اور اس کو ندی کے پاس لے گیا اور مسافر کو حکم دیا کہ وہ میرے آگے آگے چلے۔ میں کوئی سو دو سو گز چل کر رک گیا۔ میں نے گھوڑے کو بٹھا دیا اور مسافر کو حکم دیا کہ وہ اپنے سب کپڑے قمیص، پتلون وغیرہ اتار دے پھر میں نے اُسے حکم دیا کہ وہ میری طرف اپنی پیٹھ کر لے۔ اس نے کہا "اگر تم نے مجھے مارنے کا ہی ارادہ کر لیا ہے تو مجھے اتنا وقت دیدو کہ میں خدا کو یاد کر لوں۔" میں نے جواب دیا کہ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ میں تمہیں عبادت کا موقع دوں۔ وہ گھوم کر زانو کے بل جھک گیا اور میں نے اسکے سر کے پچھلے حصے میں گولی مار دی۔ پھر میں نے اس کا پیٹ چیرا اور اسکی آنتیں نکال لیں اور اس کی لاش کو ندی میں ڈبو دیا۔ تب میں نے اس کے کپڑوں کی جیبوں کی تلاشی لی جن میں مجھے چار سو ڈالر اور پینتیس سینٹ ملے۔ کچھ کاغذات بھی تھے جنھیں دیکھنے کا میرے پاس وقت نہیں تھا میں نے اسکی پاکٹ بک کاغذات اور اسکا ہیٹ ندی میں ڈبو دیا۔ اسکے جوتے بالکل نئے تھے اور میرے پیر میں بڑے مزے میں آ گئے۔ میں نے انھیں پہن لیا اور ان کے بدلے اپنے جوتے ندی میں ڈبو دئے۔ اسکے کپڑے کپڑوں کو تہ کر کے میں نے اسی کے چمڑے کے تھیلے میں رکھ لیا کیونکہ اسکے کپڑے بالکل نئے تھے۔ میں گھوڑے پر سوار ہوا۔ اتنے اچھے گھوڑے پر میں اس سے پہلے کبھی نہیں بیٹھا تھا۔ اب میں نیجز کی ڈف اور ہی شان سے روانہ ہوا۔ گذشتہ پانچ دنوں میں اس شان سے سفر کرنے کا موقعہ کہاں ملا تھا۔!

اس طرح میں نے اور میرے ایک ساتھی کرنیشا نے چار اچھے گھوڑے جمع کر لئے اور ہم دونوں چارجیا کو روانہ ہو گئے۔ کمبرلینڈ پہاڑ پر پہونچنے سے قبل ہمیں ایک نوجوان مسافر ساؤتھ کیرولینا کا رہنے والا ملا۔ کرنیشا نے بہت جلد اس آدمی کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں۔ یہ شخص سور خریدنے ٹینیسی گیا تھا لیکن وہاں جا کر معلوم ہوا کہ سور کا دام جتنا وہ سمجھ رہا تھا اس سے زیادہ ہے اسلئے اس نے خریداری نہیں کی۔ ہم لوگوں نے فوراً سمجھ لیا کہ یہ شکار ہمارے مطلب کا ہے کرنیشا نے میری طرف آنکھ سے اشارہ کیا اور میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ کرنیشا

اس سڑک پر پہلے بھی سفر کر چکا تھا لیکن میں اسطرف کبھی نہیں گیا تھا۔ کئی میل تک ہم لوگ پہاڑوں
پر چلتے رہے۔ چلتے چلتے ہم ایک بڑی سی چٹان کے پاس سے گذرے جیسے ہی ہم اسکے پاس پہونچے
کرنیشا نے مجھ سے میرا کوڑا مانگا جسکی مونٹھ میں سیسہ بھرا ہوا تھا۔ میں نے اُسے دیدیا۔ اُسے لے کر
وہ ساتھ کر ولینیوں کی بغل میں پہونچا اور اسکے سر پر ایک بھرپور وار کیا اور اُسے گھوڑے سے
گرا دیا۔ ہم اپنے گھوڑوں سے اُترے اور اسکی جیبوں کی تلاشی لی۔ ہمیں بارہ سو باسٹھ (۱۲۶۲) ڈالر ملے۔
کرنیشا نے کہا کہ اُسے ایک ایسی جگہ معلوم ہے جہاں وہ اس مسافر کی لاش چھپا سکتا ہے۔ چنانچہ
اسکی لاش کو وہ اپنی گود میں اٹھا کر چل پڑا میں اسکے ساتھ ساتھ گیا۔ ہم نے اس مسافر کی لاش
کو ایک گہرے غار میں پھینک دیا اور اسطرح وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا تب ہم نے اس کے
گھوڑے کی زین بھی غار میں پھینک دی اور گھوڑا جو دو سو ڈالر کی قیمت کا تھا اپنے قبضہ میں کر لیا۔

یہاں ہم کچھ دن رُکے۔ اس اثنا میں ہمارا دوست قریب کے ایک چھوٹے سے دیہات
میں گیا جہاں اُس نے ایک اشتہار دیکھا جو ایک حبشی کو پکڑنے کے لئے دیا گیا تھا۔ یہ حبشی ہمارے
ہی قبضے میں تھا۔ اس اشتہار میں ان دو آدمیوں کا اتا پتہ تھا جنہوں نے اُسے خریدا تھا۔ اشتہار
میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ حبشی کے بیان کے مطابق ان مشکوک لوگوں کا منشا کیا ہو سکتا تھا۔
اس وقت طوفان آیا ہوا تھا اور ہمیں کسی بندرگاہ پر ہی پناہ مل سکتی تھی۔ ہم حبشی کو ایک چشمے کے
کنارے جو ہمارے دوست کے کھیت کے قریب ہی تھا لے گئے۔ وہاں کرنیشا نے اس کے سر میں
گولی مار دی اور اسکی آنتیں نکال کر اسے چشمے میں ڈبو دیا۔ اس نے ایک دوسرے حبشی کو تیسری
مرتبہ ارکنساس ندی پر پانچسو ڈالر سے زائد میں بیچ دیا اور پھر اُسے چرا لایا اور پھر اسے اپنے ایک
دوست کو دیدیا جو اُسے ایک دلدلی علاقے میں لے گیا اور اس طرح اس خوفناک واقعہ کی پردہ
پوشی کر دی گئی اس نے اس حبشی سے کل معلومات حاصل کر کے اس کو قسم دلائی کہ وہ کبھی اس کا
یہ راز افشا نہیں کرے گا کیونکہ یہ دھوکا بہت دنوں نہیں چل سکتا تھا تاوقتیکہ راز آپس ہی میں نہ
رہے۔ اس دوست نے اس حبشی کو پہلی اور آخری مرتبہ دو ہزار ڈالر میں بیچ دیا اور اس طرح اس نے
حبشی کو اس کے تعاقب کرنے والوں کی دسترس سے باہر کر دیا کیونکہ جبتک حبشی نہیں ملتا تھا کرنیشا
پر الزام نہیں لگ سکتا تھا اور اب تو یہ ممکن ہی نہیں کیونکہ اس حبشی کی لاش بھی کچھوؤں اور مٹی کا

مچھلیوں نے کبھی کی کھا ڈالی تھی۔ اس کی ہڈیوں پر کئی روز تک مینڈک خوشی سے اُچھلتے کودتے رہے ہوں گے۔

اب ہم میمفس کے قریب پہونچ رہے تھے۔ خانہ جنگی کے دوران میں سب سے زبردست دریائی لڑائی اس شہر کے سامنے ہوئی تھی اور یہاں کے لوگوں نے اُسے بچشم خود دیکھا تھا۔ دو شخاص نے جنکی ماتحتی میں میں نے ملازمت کی تھی خود اس لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ یہ دو اشخاص تھے مسٹر بکسبی جو کہ یونین کے جہازی بیڑے کے سب سے بڑے پائلٹ تھے اور مارٹ گومری جو ریاست ہائے متحدہ کے بیڑے کے صدر کپتان تھے دونوں نے دورانِ جنگ میں کافی سرگرمی سے حصہ لیا تھا اور اپنی ہمت اور قابلیت کی وجہ سے بہت شہرت حاصل کی تھی۔

جب ہم میمفس کے قریب پہونچے تو ہم یہ بہانہ ڈھونڈھنے لگے کہ کسی نہ کسی طرح ہم گولا ڈسٹ جہاز ہی میں ٹھہریں اور اس میں ہی دکمبرگ تک سفر کریں۔ یہاں ہمیں اتنا آرام مل رہا تھا کہ ہم اس جہاز کو چھوڑ کر دوسرے میں نہیں جانا چاہتے تھے۔ مجھے ارکنسا میں واقع نیپولین شہر میں ایک ضروری پیغام پہونچانا تھا لیکن اس کو میں جہاز سے اترے بغیر کسی نہ کسی کے ہاتھ پہونچا سکتا تھا۔ میں نے لوگوں سے یہی کہہ دیا اور ہم لوگوں نے یہی طے کیا کہ ہم اسی جہاز میں سفر جاری رکھیں گے۔ اس کشتی کو میمفس میں دوسرے روز صبح تک ٹھہرنا تھا۔ میمفس ایک خوبصورت شہر ہے۔ اسکا محل وقوع ایک اونچی پہاڑی پر ہے جو دریا کے سامنے ہے۔ یہاں سڑکیں سیدھی اور کافی چوڑی ہیں مگر ان پر پلاسٹر نہیں ہے ورنہ ہر کوئی ان کی تعریف کرتا۔ البتہ اس شہر میں نالیوں کا جو سسٹم ہے اسکی تعریف تو کرنی ہی پڑے گی۔ یہ انتظام بالکل مکمل ہے گو حال ہی میں یعنی دو سال پہلے اس میں ایک اصلاح اور ہوئی تھی۔ یہاں پہلے بخار کی وبا پھیلی اور اس وبا سے لوگوں کو ایک سبق حاصل ہوا۔ اس وبا کے خوفناک دنوں میں لوگ سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں مر گئے یا بھاگ گئے اور تعداد اتنی کم ہو گئی کہ یہاں کی آبادی محض تین چوتھائی رہ گئی اور یہ کمی کچھ عرصے تک برابر رہی۔ جب کاروبار رک گیا اور سڑکیں ایسی سنسان معلوم ہونے لگیں جیسے کہ یہاں اتوار کا دن ہو اور کاروبار کی چھٹی ہو۔

ایک جرمن سیاح نے جو اپنی آنکھوں سے یہ سب حال دیکھ چکا تھا میمفس کی اس وقت

کی بربادی کی بڑی اچھی تصویر اپنے الفاظ میں کھینچی ہے۔ اس کا یہ بیان ماش کی کتاب کے ساتویں باب میں جو جرمن اخبار لیبزگ سسپی فارشمان ارنسٹ وان ہیسی وارٹگ میں شائع ہوا ہے' اس طرح ہے:

اگست میں پہلے بخار کی وبا عروج پر تھی۔ ہر روز سینکڑوں لوگ اس خطرناک بیماری کے شکار ہو جاتے تھے۔ شہر ایک بہت بڑا قبرستان بنا ہوا تھا۔ قریب دو تہائی آبادی نے شہر خالی کر دیا تھا۔ صرف غریب بڈھے اور بیمار ہی لوگ پڑے رہ گئے تھے اور وہ اس مکار وبا کے آسانی سے شکار ہو رہے تھے۔ مکان بند تھے۔ بہت سے مکانوں کے آگے روشنی بھی نہیں تھی اور یہ اس بات کی علامت تھی کہ موت ان مکانوں میں داخل ہو چکی ہے۔ ایک ایک مکان میں کئی کئی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ کھڑکیوں پر کالے پردے پڑے ہوئے تھے۔ سامان کے ذخیرے بند پڑے تھے کیونکہ انکے مالک مر گئے تھے یا بھاگ گئے تھے۔

واقعی یہ بڑی خوفناک وبا تھی۔ کچھ ہی مدت میں اس نے بہت سے انسان مار دیئے۔ تندرست سے تندرست انسان بھی اس کی زد سے نہ بچ سکے۔ پہلے ذرا سی طبیعت خراب ہوتی پھر ایک گھنٹہ بخار آتا تھا اور پھر خوفناک سرسامی حالت اور اسکے بعد موت سڑکوں کے موڑوں پر۔ پارکوں اور میدانوں میں بیمار پڑے ہوئے تھے جو اچانک اس بیماری کی زد میں آ گئے تھے۔ کئی لاشیں بکھری پڑی تھیں جو پڑے پڑے مسخ ہو گئی تھیں اور لکڑی کی مانند اکڑ گئی تھیں۔ اشیائے خوردنی خراب ہو گئیں۔ متعفن اور مضرت رساں ہوائیں گوشت تو چند ہی گھنٹوں میں خراب ہو کر کالا پڑ جاتا تھا۔

بہت سے گھروں سے رونے چلانے کی ہولناک آوازیں آ رہی تھی۔ لیکن کچھ وقفہ کے بعد آہ وزاری بند ہو جاتی اور گہری خاموشی چھا جاتی تھی۔ شریف النفس اور ایثار کرنے والے لوگ مردوں کے تابوت اٹھائے قبرستان جاتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ رات کو رات کو ہر طرف سناٹا چھایا ہوتا تھا۔ سڑکوں پر یا تو حکیم لوگ دکھائی دیتے تھے یا مردوں کو ڈھونے والی گاڑیاں۔ تمام سڑکوں پر ریلوں کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دیتی تھی۔ یہ میل گاڑیاں رکے بغیر بھاگی سی تیزی سے اس منحوس شہر کے اسٹیشنوں سے گذر جاتی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ریلیں بھی وبا کے ڈر سے

جلد جلد بھاگ رہی تھیں "

لیکن اب یہاں کافی رونق ہے۔ یہاں کی آبادی چالیس ہزار سے زیادہ ہے اور ابھی مسلسل بڑھ رہی ہے تجارت بہت عروج پر ہے۔ ہم شہر میں کار میں بیٹھ کر گھومے ہم پارک میں بھی گئے اور ہم نے ہری گھاس پر کے جھنڈ کے جھنڈ دیکھے۔ ہم نے شاندار مکانات دیکھے جن کے باہر گلاب کے پودے لگے ہوئے تھے اور جو ویسے بھی دلکش معلوم ہوتے تھے۔ ہم نے ایک ہوٹل میں ناشتہ بھی کیا جو بڑا ذائقہ دار تھا۔

یہاں ایک دوسری خوشحال جگہ مسیسپی کے علاقہ میں واقع ہے شہر گرینڈ سیمر ٹیمز سٹی ہے جو بہت بڑی تجارتی جگہ ہے اور جہاں ہزاروں آدمیوں کو روزی ملتی ہے۔ یہاں دھاتوں کو گلانے اور ڈھالنے مشینوں، مال گاڑی کے ڈبوں اور بنولے کے تیل کے کارخانے ہیں اور مستقبل قریب میں سوتی کپڑے کی ملیں اور بوجھ ڈھونے کی مشینیں لگنے والی ہیں۔

یہاں کے ملوں کے لئے باہر سے آنیوالی روئی کی گانٹھوں کی تعداد گذشتہ برس پانچ لاکھ تک پہونچ گئی تھی یعنی پچھلے سال سے ساٹھ ہزار گانٹھیں زیادہ۔ اس مالدار تجارتی شہر میں پانچ خاص ریلوے لائنیں ہیں اور اب بھی کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔

آج کا میمفس زمانہ قدیم کے میمفس سے جس کا ذکر قدیم زمانے کے غیر ملکی سیاحوں نے کتابوں میں کیا ہے مختلف ہے۔ پہلے ان سیاحوں کے گروہ کے گروہ یہاں آتے تھے لیکن اب وہ دکھائی نہیں دیتے۔ مسز ٹرولوپ (جنکی یاد اب لوگوں کے حافظہ سے اتر چکی ہے، مگر جنکی شہرت پہلے بہت تھی اور جن سے لوگ نفرت بھی کرتے تھے) کے زمانے میں میمفس شہر میں صرف ایک لمبی سڑک تھی جسکے دونوں طرف لکڑی کے مکانات تھے۔ ان مکانات کے عقب میں کچھ چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنی ہوئی تھیں جنکے دروازے جنگل کی طرف کو ہوتے تھے یہاں اکثر سور آجاتے تھے۔ یہ بات بچپن سال پہلے کی ہے جب مسز ٹرولوپ یہاں ایک ہوٹل میں مقیم تھیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ہوٹل وہ نہیں تھا جہاں ہم نے ناشتہ کیا تھا۔ مسز ٹرولوپ لکھتی ہیں:۔

وہ میز پر پچاس آدمیوں کے لئے کھانا لگا ہوا تھا اور میز قریب قریب بھری ہوئی تھی۔ لوگ بڑی خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے اور اتنی حیرت انگیز جلدی سے کہ ہمارے کھانا

شروع کرنے سے پہلے ان کا کھانا بھی ختم ہو گیا۔ انکے کھانے میں جو تھوڑی بہت آواز ہوتی تھی وہ صرف ان کے چھری کانٹوں سے یا انکے کھانسنے وغیرہ سے ہوتی تھی۔

یہاں کھانسنے' کے ساتھ 'وغیرہ' کا جو لفظ استعمال کیا گیا ہے اسکے پیچھے ایک ناخوشگوار یادگار ہے۔ اس ناخوشگوار یادگار کی وضاحت مسٹر ترولوپ نے اپنی گفتگو میں کبھی نہیں کی۔ البتہ تحریر میں انھوں نے اسکی وضاحت کردی ہے اور آپ اس وضاحت کو ذیل کے اقتباس میں پائیں گے۔ یہ بیان انھوں نے دخانی کشتی کے اندر ملنے والے کھانے کے بارے میں لکھا ہے یہ کھانا انھوں نے کئی مالدار ذی اقتدار تعلقہ داران کے ہمراہ کھایا تھا۔ وہ لوگ سب دولتمند اور خاندانی تھے۔ انکے ناموں کے ساتھ فوجی اور عدالتی چمک دمک والے خطابات وابستہ تھے جو ان دنوں بہت زیادہ پسند کئے جاتے تھے جب سستی اور جھوٹی شہرت اور شیخی کا رواج زوروں پر تھا۔

"کھانے کی میز پر عام طور پر جس اخلاق اور آداب کی ضرورت ہوتی ہے وہ ندارد تھا وہ لالچی پن جسکے ساتھ پیٹو "جلدی جلدی اشیاء خوردنی کو جھپٹ کر اٹھاتے اور منہ میں رکھ کر نگل جاتے" انکی بول چال کے وہ الفاظ جو بڑے جاہلانہ تھے" ان کا تلفظ جو بڑا بھدا تھا اور انکے تھوکنے کا طریقہ جسے دیکھ کر گھن آتی تھی اور پیک کی چھینٹوں سے اپنے کپڑے بچانا مشکل ہو جاتا تھا" انکا چاقوؤں سے کاٹ کاٹ کر کھانے کا طریقہ جسے دیکھ کر ڈر لگتا تھا اور جس میں چاقو کا سارا پھل انکے منہ کے اندر چلا جاتا تھا کھانے کے بعد چاقو سے دانت صاف کرنا جو اور بھی وحشتناک تھا" ان سب باتوں کو دیکھ کر خواہ مخواہ یہ احساس ہونے لگتا تھا کہ ہم "پرانی دنیا" کے جنرلوں کرنلوں اور میجروں کے درمیان نہیں بیٹھے ہیں اور یہ کہ کھانے کا وقفہ کسی طرح بھی تفریح طبع کا باعث نہیں بن سکتا۔

تیسواں باب

چند مختصر خاکے

سینس سے جنوب کی جانب دریا کی لمبائی چوڑائی خاصی زیادہ ہے۔ کناروں تک ہر جگہ پانی بھرا رہتا ہے اور بسا اوقات کناروں کے اوپر پہونچ جاتا ہے اور اندر کی طرف میلوں تک کھیتوں اور جنگلوں میں سیلاب آجاتا ہے۔ کہیں کہیں تو پانی پندرہ فٹ تک گہرا ہو جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے محنت مشقت سے کئے ہوئے کاموں پر پانی پھر جاتا ہے اور انھیں دوبارہ ان ہی کاموں میں جتنا پڑتا ہے۔ اس سے پیسہ بھی ضائع ہوتا ہے اور ہمت بھی پست پڑ جاتی ہے۔ یہ بلا اکثر آتی رہتی ہے اور سیکڑوں میل تک اسکا اثر ہوتا ہے۔

گھنے جنگلات کے کناروں پر میلوں تک نہ کوئی کھیت ہوتا ہے نہ کوئی لکڑی کا بازار نہ کوئی میدان اور نہ کسی اور قسم کی کوئی چیز دریا پر روشنی کے پہرے دار کو اپنا فرض منصبی ادا کرنے کے لیے میلوں تک کشتی میں بیٹھ کر جانا پڑتا ہے اور اکثر اسے یہ کام خراب موسم میں کرنا پڑتا ہے مگر جیسا کہ مجھے بتایا گیا یہ لوگ اپنا کام بڑی وفاداری سے انجام دیتے ہیں اور آدمی ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی اس کام کو بخوبی انجام دیتی ہیں۔ جب کبھی آدمی بیمار پڑ جاتے ہیں تو ان کی عورتیں ان کے فرض کو انجام دیتی ہیں۔ گورنمنٹ ان لوگوں کو تیل مہیا کرتی ہے اور بتی جلانے اور اسکی رکھوالی کرنے کے لئے انھیں دس یا پندرہ ڈالر ماہانہ تنخواہ بھی دیتی ہے۔ گورنمنٹ کی کشتی ہر ماہ ہر پہرے دار کو اسکی تنخواہ بانٹنے جاتی ہے۔

شپ آئی لینڈ کا علاقہ ہمیشہ سے جنگلی رہا ہے اور اس میں کاشتکار کبھی سکونت پذیر نہیں ہوئے۔ دراصل اب یہ جزیرہ ہی نہیں رہا۔ یہ اصل ساحل سے جا ملا ہے۔

جہاں جانے کے لئے پہلے دخانی کشتی استعمال ہوتی تھی وہیں اب گھوڑے گاڑیاں چلتی ہیں یہاں پوینسلوینیا جہاز کی جو تباہی ہوئی تھی اسکی اب کوئی یادگار باقی نہیں ہے۔ شاید کسی دن کوئی کسان ہل چلاتے وقت ان ہڈیوں کو کھود نکالے اور انھیں دیکھ کر حیرت زدہ رہ جائے۔

ہم دریا کے بہاؤ پر چلتے ہوئے اس جگہ پہونچے جہاں حبشی لوگ اپنا وطن چھوڑ کر آ بسے تھے۔ یہ غریب لوگ غلامی کے زمانے میں کبھی سفر نہیں کر سکے۔ اسی لئے اب وہ اس نقصان کی تلافی کر رہے تھے۔ جب تک وہ چاہتے کسی کھیت پر کام کرتے۔ جب انھیں آگے سفر کی خواہش ہوتی تو وہ پھر اپنا سامان باندھتے اور کسی دخانی کشتی کا خیر مقدم کرتے اور اس پر سوار ہو کر آگے چلے جاتے۔ ان کا ارادہ کسی خاص جگہ پہنچنے کا نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ صرف چلتے رہنا چاہتے تھے اور انکے باقی کام آبادی ہونے پر منحصر رہتے۔ اگر وہ پچاس میل جا سکتے تو پچاس ہی بھی اور اگر کم سفر کر پاتے تو وہیں ڈیرے ڈال دیتے۔

دو دنوں میں ہم نے کئی بار ان کے استقبال کا جواب دیا۔ اس علاقے میں پانی سے بھیگی کشتیاں جو شکستہ ہوتیں اکثر حبشی لوگوں سے بھری رہتی تھیں۔ وہاں گورے لوگ دکھائی نہیں دیتے تھے۔ جگہ جگہ بغیر گھاس اگی سوکھی زمین دکھائی دیتی تھی۔ کہیں کہیں کچھ گرے ہوئے درخت دکھائی دیتے تھے۔ دبلے پتلے جانور خچر اور گھوڑے ان کی پتیاں کھاتے اور انکی چھال کھرچتے دکھائی دیتے تھے کیونکہ اس علاقے میں جہاں اشیائے خوردنی برباد ہو چکی تھیں ان کیلئے یہی کھانا میسر ہو سکتا تھا۔ کہیں کہیں انکی دکی کوئی کیبن دکھائی دیتی تھی جہاں لوگ جہاز سے اتر کر جا سکتے تھے اسکے قریب ہی ایک حبشی خاندان رہتا تھا اسنے ہمارا خیر مقدم کیا۔ اکثر چھوٹے بڑے بڈھے اور جوان اپنے گھریلو سامان کے چھوٹے سے ڈھیر پر بیٹھے دکھائی دیتے۔ اس سامان میں زنگ خوردہ بندوق، کچھ نرم پروں کے گدے، صندوق، ٹین کے ڈبے، اسٹول، فرسودہ سا آئینہ، پرانی آرام کرسی اور چھ سات گھٹیا نسل کے بھدے اور سست کتے جو گھروں میں رسیوں سے بندھے رہتے تھے۔ انکے ساتھ ان کے کتے ضرور رہتے تھے۔ کتوں کے بغیر وہ باہر نہیں جاتے تھے۔ لیکن کتے خوشی سے انکے ساتھ نہیں جاتے تھے اور ہمیشہ جانے میں حجت کرتے تھے۔ یکے بعد دیگرے ان کو زبردستی باہر نکالا جاتا تھا اور ایک مضحکہ خیز جلوس کی شکل میں ان کو گھسیٹ گھسیٹ کر جہاز تک لے جایا

جاتا تھا۔ ایکے سر میں رسی باندھ کر ان کو جہاز پر چڑھایا جاتا اور وہاں ان کو باندھ دیا جاتا۔ انھیں کھینچنے والا ثابت قدمی سے آگے آگے چلتا رہتا تھا وہ جھک جھک کر پوری طاقت سے چلتا اور بوجھ کو اچھی طرح کھینچنے کے لیے رسی کو اپنے کاندھے پر ڈال لیتا۔ یہ لوگ اپنے بچے کو تو کنارے پر چھوڑ سکتے تھے لیکن کتوں کا لیجانا کبھی نہیں بھولتے تھے۔

پائلٹ ہاؤس میں عموماً دریا کے متعلق گپ شپ ہوتی رہتی تھی۔ آئی لینڈ نمبر ۹۲ کے عقب میں ایک خوبصورت ڈھلان ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ قدیم زمانے میں "اسکائی لارک" نامی جہاز میں مسٹر جیسی جیمسن کے ساتھ ایک پائلٹ اس جہاز میں سفر کر رہا تھا یہ ایک غریب شکستہ حال پنشن یافتہ شخص تھا جیسی نے اس کی ڈیوٹی پہیے پر لگا دی اسوقت جہاز ۹۲ نمبر کی ڈھلان پر تھا۔ بڈھا ملاح کشتی کو ڈھلان کے اوپر لے گیا اور پھر دریا کے بہاؤ پر لے آیا۔ پھر ڈھلان پر چڑھا اور پھر اترا اور اس طرح چڑھتا اترتا رہا۔ آخر تین گھنٹے بڑی صدق دلی سے کوشش کرنے کے بعد اس نے مجبور ہو کر کشتی دوسرے پائلٹ کے حوالے کر دی جو ڈیوٹی پر اسے چھٹی دینے کے لیے آیا تھا۔ اسوقت کشتی وہیں تھی جہاں پر اسوقت تھی جب اس نے پہیہ سنبھالا تھا۔ اس جزیرے میں جہاں اس نے پہیہ اپنے ہاتھ میں لیا تھا ایک حبشی نے جو کنارے پر کھڑا تھا اور جس نے کشتی کو تیرہ مرتبہ جاتے آتے دیکھا تھا کہا "خدا کی پناہ۔ اگر آج اسکائی لارکوں کی قطار کی آرہی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں" ایک واقعہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ شہرت کے اثر سے کس طرح انسانوں کی رائے بدل جایا کرتی ہے۔ جہاز ایکلپس اپنی تیزی کے لئے مشہور تھا۔ ایک روز جب وہ گذر رہا تھا تو ایک بڈھا حبشی کنارے پر کھڑا تھا۔ وہ کسی سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ کونسا دخانی جہاز ہے۔ تبھی کسی نے پوچھا۔

"کیا کوئی کشتی منبع کی طرف گئی ہے"

"ہاں جناب"

"کیا وہ بہت تیز جا رہی تھی۔؟"

"کچھ ایسی تیز تو نہیں تھی"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ وہ کشتی کونسی تھی"

"نہیں جناب۔"

"ارے اچھا وہ ایکلپس تھی؟"

"نہیں۔ کیا وہ ایکلپس تھی؟ ہاں میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایکلپس ہی تھی کیونکہ وہ اتنی تیز رفتار تھی کہ پلک جھپکنے ہی میں نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔"

تاریخ میں کئی ایسے واقعات ہیں جو یہاں رہنے والے لوگوں کی تیز مزاجی کا حال بیان کرتے ہیں۔ پچھلا ... سیلاب کے شروع شروع میں مسٹر اے کے مکان کا جنگلا بہہ کر مسٹر بی کی زمین پر اور مسٹر بی کا جنگلا بھنور میں پھنس کر اور بہہ کر مسٹر اے کی زمین پر جا لگا۔ مسٹر اے نے کہا "اب معاملے کو ایسے ہی رہنے دو۔ میں تمہارا جنگلا استعمال کر لوں گا اور تم میرا کر لینا۔ مگر مسٹر بی نے اعتراض کیا۔ اس نے کہا: "ایسا نہیں ہوگا" اور جب ایک روز مسٹر اے مسٹر بی کی زمین پر اپنا جنگلا لینے آئے تو مسٹر بی نے کہا۔ میں تمہیں مار ڈالوں گا اور اس نے اپنا ریوالور مسٹر اے کی طرف تان دیا۔ مسٹر اے نے کہا "میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے"۔ لہٰذا مسٹر بی نے جو ہر کام کو مناسب ڈھنگ سے کرنے کے عادی تھے، اپنا ریوالور پھینک دیا اور چاقو نکال لیا اور اس سے مسٹر اے کا گلا کاٹ دیا۔ مگر چونکہ اس کی توجہ گلے کے اگلے حصے پر ہی تھی یہ پیچھے سے پوری طرح نہ کٹ سکا۔ ادھر مسٹر اے نے جھٹ جھپٹا کر پھینکے ہوئے ریوالور تک اپنا ہاتھ پہنچا لیا اور اسی ریوالور سے مسٹر بی کے گولی مار کر اسے مار ڈالا۔ بعد ازاں اس کے زخم بھر گئے اور وہ شفایاب ہو گیا۔

اس کے بعد کچھ دیر اور گپ شپ چلتی رہی جس کے بعد ہر شخص سہ پہر کی کافی پینے چلا گیا اور مجھے یہیں پر اکیلا چھوڑ گیا۔ اچانک کسی چیز نے مجھے اس وقت کی یاد دلائی جب میں سینٹ لوئی میں تھا۔ اس مدت کا تھوڑا سا حصہ میں نے ہری کین ڈیک یعنی جہاز کے بالائی عرشے پر صرف کیا۔ وہاں میری ایک اجنبی سے ملاقات ہوئی۔ جو مجھ سے باتیں کرنے لگا۔ وہ ایک چست و چالاک نوجوان تھا جو بتلاتا تھا کہ وہ وسکونسن کے کسی دیہاتی علاقے میں پیدا ہوا تھا اور ایک ہفتہ پہلے تک اس نے دخانی کشتی نہیں دیکھی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ جب وہ "لاکراس" سے جنوب کی طرف سے آرہا تھا تو اس نے کشتی کا اتنی دلچسپی سے معائنہ کیا تھا کہ اس نے جہاز کے اگلے حصے سے لے کر

چوٹی کی تھاپی تک ہر چیز بخوبی یاد کر لی تھی۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں سے آرہا ہوں۔ میں نے بتایا کہ نیو انگلینڈ سے۔ اس نے پھر پوچھا "آپ امریکن ہیں؟" اسی طرح میری "ہاں" یا "نہ" کا انتظار کئے بغیر وہ برابر باتیں کرتا رہا۔ اس نے میرے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اگر میں اسے ساری کشتی میں گھماؤں تو وہ مجھے مختلف کل پرزوں کے نام اور ان کا استعمال بتائے گا اور پیشتر اس کے کہ میں کوئی بہانہ تلاش کروں یا انکار کر دوں وہ مجھے جاری جلدی جلدی نہایت روانی کے ساتھ اپنی معلومات سے مستفید کرنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ وہ چیزوں کے نام غلط بتا رہا تھا اور ایک اجنبی کا وقت ضائع کر کے بڑی غیر مہماں نوازی کا ثبوت دے رہا تھا۔ اسکا مقصد محض اپنی تفریح تھی۔ میں خاموش سُنتا رہا اور جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا وہ اسے کہنے دیا۔ اس نے مجھے بہت غلط اطلاعیں دیں، اور جتنا وہ بولتا گیا اُتنی ہی اسکے تصوّر کی پرواز بلند ہوتی گئی۔ اور اُتنا ہی زیادہ وہ اپنے اس ظالمانہ دھوکے سے محفوظ ہوتا رہا۔ کبھی کبھی مجھ سے کوئی نہایت بیہودہ ڈھنگ قسم کا جھوٹ بول کر اسے اتنی ہنسی آتی تھی کہ وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے ایک منٹ کے لئے ایک طرف کو ہٹ جاتا تاکہ میں اس پر شبہ نہ کرسکوں۔ جب تک اسکا یہ سوانگ ختم نہیں ہوا میں وفاداری سے اسکے پاس رُکا رہا۔ تب اس نے کہا کہ اس نے دخانی کشتی کے متعلق سب کچھ بتانے کا ذمہ لیا تھا اور اس کام کو کر بھی دکھایا لیکن اگر وہ کوئی بات بھول گیا ہو تو میں اس سے دریافت کرسکتا ہوں اور وہ مجھے بتا دے گا۔ اس نے ... کہا .... "اس کشتی کے متعلق کوئی بھی چیز جو تم نہیں جانتے مثلاً کسی چیز کا نام یا کسی چیز کا کام تو تم میرے پاس آؤ، میں تمھیں بتلاؤں گا۔ میں نے کہا میں آؤں گا اور اسکے بعد میں تھا اس سے رخصت لی اور غائب ہو گیا اور پھر جب کبھی اس طرف گیا تو اس سے پہلو بچا کر نکلا تاکہ وہ مجھے نہ دیکھ سکے۔ وہ وہاں اکیلا بیٹھا تھا۔ وہ بار بار پہلو بدلتا تھا تاکہ ہنستے ہنستے اسکے پیٹ میں بل نہ پڑ جائیں۔ اسکے بعد وہ کئی دنوں تک نظر نہیں آیا۔ شاید وہ بیمار پڑ گیا ہو۔ اس دوران میں میں ان واقعات کو بھی بھول گیا۔

وہ منظر مجھے اب بھی یاد ہے جبکہ میں اکیلا پہیئے پر کام کر رہا تھا۔ پائلٹ ہاؤس میں کھڑے ہوئے اس نوجوان آدمی کو میں نے پھر دیکھا۔ وہ دروازے کے ہینڈل کو پکڑے کھڑا

تھا اور میری طرف خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ میرے خیال میں میں نے اتنا مجروح انسان کبھی نہیں دیکھا تھا جتنا کہ وہ اس وقت لگ رہا تھا۔ میری طرف وہ ملامت آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا اور کچھ سوچ رہا تھا۔ آخر میں نے دروازہ بند کر دیا اور وہ چلا گیا۔ ایک منٹ عرشے پر رکنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ پھر واپس آیا اور پھر دروازے پر کھڑا ہو گیا اس کا چہرہ پھر ویسا ہی اداس اور مصیبت زدہ لگتا تھا۔ اس نے دھیمی آواز میں مجھے برا بھلا کہا۔ اس نے کہا "تم نے مجھے اجازت دی تھی کہ میں تمھیں دخانی کشتی کے بارے میں کچھ سکھاؤں۔ کیا تم نے اجازت نہیں دی تھی؟"

"ہاں" میں نے اقبال کیا۔

"ہاں"

"تم وہ آدمی ہو جو۔۔۔۔۔ جو۔۔۔۔" اور یہاں پہنچ کر اس کی قوتِ گویائی جواب دے گئی۔

اس نے بیکار کوشش کی۔ تب اس نے کوشش چھوڑ دی اور پھر اس نے مشکل سے سانس لیتے ہوئے قسم کھائی اور ایسا گیا کہ پھر نظر نہ آیا۔ اسکے بعد کئی مرتبہ میں نے اس سفر کے دوران میں نیچے کی طرف دیکھا لیکن اب اُسے مجھ میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ دراصل بیوقوف تھا۔ اگر اس نے شروع میں مجھ سے اپنا بے لطف مذاق اتنی دیر تک اور اتنی سرگرمی سے نہ کیا ہوتا تو میں اسکے خیالات کو کسی اور طرف موڑ دیتا اور اسکو اس لاابالی پن اور احمقانہ بد اخلاقی سے بچا دیتا۔

میں نے خود ہی ڈیوٹی چار بجے صبح لگوائی تھی کیونکہ گرمیوں میں دریائے مسیسپی پر طلوعِ آفتاب کا منظر کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ بڑا دلکش نظارہ ہوتا ہے پہلی بات تو یہ کہ خاموشی بڑی دلربا ہوتی ہے کیونکہ ہر جگہ سکوت چھایا ہوتا ہے۔ پھر تنہائی کہ دل اسے کہاں اور دنیا کے شور و شر سے دُور یہ سماں بڑا رُوح افزا ہوتا ہے دن کی روشنی آہستہ آہستہ بڑھتی رہتی ہے۔ تاریک جنگل ہلکے بھورے رنگ کے معلوم ہونے لگتے ہیں اور دور کا سیکڑوں پانی آہستہ آہستہ نظر آنے لگتا ہے پانی شیشے کی طرح چمکتا ہے اور اس پر سفید کہرے کے چھوٹے چھوٹے ہالے جا بجا دکھائی دیتے ہیں۔ ہوا ساکت ہوتی ہے۔ پتہ تک نہیں ہلتا خاموشی بہت گہری

اور سکون پرور ہوتی ہے۔ کہیں کہیں کسی چڑیا کی چہچہاہٹ سنائی دیتی ہے۔ پھر روشنی نمودار ہوتی ہے اور
چڑیوں کا چہچہانا خوشی کا ترانہ بن جاتا ہے لیکن کوئی چڑیا دکھائی نہیں دیتی۔ ایسا لگتا ہے جیسے پرسکون
ماحول خود گا رہا ہو۔ جب روشنی کچھ زیادہ ہوتی ہے تو آپکے سامنے ایک ایسی خوبصورت اور ناقابل
بیان تصویر آتی ہے جس کا آپ تصور بھی نہیں کر سکتے۔ آس پاس گہرے ہرے رنگ کی کائی نظر آتی ہے۔
آپکے سامنے پتیوں کا ہلکا ہلکا سایہ ہوتا ہے۔ کچھ دور ایک ابھری ہوئی راس ہے جو قریب ایک
میل یا اس سے زیادہ فاصلے پر ہے وہ موسم بہار کے نرم نرم ہلکے ہرے رنگ کے پتوں سے ڈھکی ہوتی
ہے۔ اسکے آگے جو دوسری راس ہے اس کا رنگ تو نظر ہی نہیں آتا اور سب سے آگے جو راس ہے
اور جو میلوں دور ہے وہ افق کے نیچے دبی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور پانی کی سطح پر محض ایک ہلکی بھاپ
کی چادر سی معلوم ہوتی ہے ایسا لگتا ہے جیسے وہ آسمان سے جا ملے ہر طرف سے ڈھکے ہوتا ہے جالی
ہے۔ دریا کی یہ وسیع سطح ایک بڑے آئینے کی طرح ہے۔ اس میں آپ کو گھنی پتیوں، ٹیڑھے میڑھے
کناروں اور پیچھے ہٹتی ہوئی راسوں کی تصویریں نظر آئیں گی مثال یہ سب بہت خوبصورت ہے، بیحد
دلکش اور عالیشان ہے جب آفتاب اوپر چڑھتا ہے اور چاروں طرف گلابی رنگ، سنہری غبار اور
ارغوانی دھند کھیل جاتی ہے تو دریائے مسیسپی دنیا کا بہترین نظارہ پیش کرتا ہے۔ اگر آپ اسے
دیکھیں تو مان جائیں گے کہ واقعی آپ نے ایک ایسی چیز دیکھی جو یاد رکھنے کے قابل ہے۔

ہم علی الصبح کینٹکی کے دیہاتی علاقے کے موڑ پر پہونچے۔ بہت دن ہوئے یہاں ایک عجیب
اور المناک حادثہ پیش آیا تھا۔ کپتان پو کے پاس ایک چھوٹی اور سخت پہیے والی کشتی تھی۔ برسوں
سے وہ اور اس کی بیوی بچے اس میں رہتے تھے۔ ایک رات وہ کشتی ایک بہتے ہوئے پیڑ سے ٹکرا گئی۔
جو کینٹکی کے موڑ کے بیچ میں تھا اور اتنی تیزی سے ڈوبنے لگی کہ اسے بڑا تعجب ہوا۔ جب کپتان آیا تو اس
وقت تک پانی کیبن کے فرش کے کافی اوپر پہونچ گیا تھا۔ لہذا اس نے اپنی بیوی کے کمرے کو اوپر سے
کلہاڑی مار کر کاٹ دیا۔ وہ اوپری برتھ (سونے کی جگہ) پر سو رہی تھی۔ کمرے کی چھت بہت ہی ہلکی
تھی پہلے وار میں ہی کشتی کے سڑے ہوئے تختے ٹوٹ کر گر پڑے اور اس ضرب سے اس کی بیوی کی کھوپڑی
پھٹ گئی۔

یہ موڑ اب پانی سے بھرا تھا۔ اسکی وجہ دریا کا ایک کٹاؤ ہے۔ اسی کٹاؤ کی وجہ سے والنٹ

کا موڑ بھی جہاں لوگ کثرت سے آتے جاتے ہیں ختم ہو گیا ہے اور یہ ایک ایسی الگ تھلگ جگہ بن گیا ہے جو گذرنے والے جہازوں کے راستے سے علیحدہ ہے۔

ہم سیلینا اور ایک اور شہر جس کے بارے میں ہم پہلے کبھی سن چکے تھے دیکھنے گئے۔ یہ نیا شہر ابھی حال ہی میں بسا تھا اور اسکا نام رکنسا تھا۔ یہ مقام ریلوے لائن کے پاس ہونے کی وجہ سے دھیرے دھیرے ایک شہر بن گیا۔ بٹل راک، دریائے مسیسپی اور شیکاس ریلوے اور دریا اسی مقام پر دریا سے ملتے ہیں۔ ہم نے ایک مسافر سے پوچھا کہ یہ کس قسم کا شہر ہے۔ کچھ سوچنے کے بعد اس نے کہا "اچھا ہے" اور پھر اس آدمی کی طرح جو کچھ مہلت کے بعد سوچ سمجھ کر ٹھیک جواب دینے کی کوشش کرتا ہے اس نے کہا "یہ جہنم ہے" یہ جواب اس جگہ کی صحیح تصویر تھا۔ یہاں لکڑی کے بد وضع مکانوں کی کئی قطاریں تھیں۔ قطاریں کیا بلکہ تھوڑے تھوڑے جھنڈ تھے۔ یہاں اسقدر بھیڑ جمع تھی اگر اس شہر والوں کو ٹھکانے کی ضرورت ہوتی تو وہاں کے لوگوں کے لئے یہ ذخیرہ تقریباً سو سال کے لئے کافی ہوتا اگر حال ہی میں یہاں مٹی کا اکٹھا ہونا بند ہو گیا تھا۔ سڑکوں پر جگہ جگہ ساکن پانی کے تالاب تھے اور ایک درجن بھدی قسم کی پہیے چلنے والی کشتیاں تیرتی نظر آتی تھیں۔ اگر پانی کم ہو جاتا تھا تو کشتیاں خود بخود ٹھہر جاتی تھیں اور لوگ اتر کر پیدل شہر میں کچھ سامان خریدنے یا سیر کرنے کو چلے جاتے تھے۔ پھر بھی یہ جگہ خوشحال ہے اس کے پیچھے کا علاقہ مالدار ہے۔ یہاں ساحل کے ساتھ ہی ایک لفٹ لگی ہوئی تھی شہر میں بنولے کے تیل کا ایک خوبصورت اور بڑا سا کارخانہ ہے میں نے اس قسم کا کارخانہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

آجکل کی نسبت میرے زمانے میں بنولے بڑے سستے بکتے تھے۔ لیکن آجکل ان کا نام چارہ یا خیرہ ڈھور ڈنگر کی خوراک ہے۔ اسلئے ان کو ذرا بھی ضائع نہیں کیا جاتا۔ بنولے کا تیل بے رنگ، بے ذائقہ ہوتا ہے اور نہ اس میں کسی قسم کی بو ہوتی ہے۔ امید کی جا رہی ہے کہ اگر اس تیل میں کچھ تبدیلیاں کر دی جائیں تو یہ تیل ہر قسم کے بڑھیا تیل کا مقابلہ کر سکے گا اور دوسرے تیلوں کے مقابلے میں بہت سستے داموں پر دستیاب ہو سکے گا۔ یہاں کے ہوشیار لوگ اس تیل کو اٹلی بھیجا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ تجارت اتنی بڑھ گئی کہ اٹلی کو مجبوراً اس کی درآمد پر ٹیکس لگانا پڑا تاکہ تیل کی مقامی صنعت کو مقابلے کی وجہ سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔

دریائے مسیسپی کے ساحل پر ہیلینا کی جائے وقوع بہت خوبصورت ہے۔ یہ جنوب کی پہاڑیوں کے سلسلے میں جو اس طرف دور تک چلا گیا ہے سب سے آخر میں ہے۔ اچھے موسم میں یہ بڑا خوبصورت شہر معلوم ہوتا ہے لیکن سیلاب کے پانی نے جو آہستہ آہستہ لگاتار آتا رہتا ہے اس شہر کو حال ہی میں بہت نقصان پہونچایا ہے۔ مکانوں کی گلیوں میں گندہ پانی بھر آیا تھا باہر عمارتوں پر اب بھی پانی کے گندے نشانات پائے جاتے ہیں جو انکی بنیادوں سے اوپر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ سیلاب کے دوران جو کشتیاں خشکی پر آکر رک گئی تھیں وہ وہاں ویسی ہی پڑی ہوئی تھیں۔ تختوں کا بنا ہوا ٹہلنے کا راستہ جو چار پانچ فٹ اونچے بانسوں پر بنا ہوا تھا ابھی تک ویسا ہی تھا۔ تختوں کے دوسرے راستے جو ہموار زمین پر بنے ہوئے تھے اب ڈھیلے اور شکستہ ہو گئے تھے دو آدمی ان راستوں پر کھٹ کھٹ کرتے چلے جا رہے تھے جنکے قدموں کی آواز سن کر ایک اندھا آدمی بھی یہ گمان کر سکتا تھا کہ غنیم کی پیدل فوج نے حملہ بول دیا ہے ہر جگہ کیچڑ کائی اور گہری تھی اور کئی جگہوں پر تو ملیریا کے جراثیم والے ساکن پانی کے تالاب دکھائی دیتے تھے۔ آگ کے قہر کے علاوہ سیلاب کا قہر ہی سب سے زیادہ تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔

اتوار کے روز دھوپ میں ہم اس جگہ بہت ہی لطف اندوز ہوئے پورے دو گھنٹے تک جبکہ کشتی سامان اتارتی رہی ہم لوگ کنارے پر آزادی سے گھومتے رہے۔ ساحل کے پیچھے کئی جگہ مجھے بہت سے گورے بھی نظر آئے مگر حبشی وہاں بہت بڑی تعداد میں تھے خاص کر حبشی عورتیں اور لڑکیاں۔ ان میں سے کوئی بھی ایسی نہ تھی جس نے نئے اور چمکیلے کپڑے نہ پہن رکھے ہوں۔ ان کے کپڑے نئے فیشن کے مطابق کٹے اور سلے ہوئے تھے دراصل ان کے خوبصورت کپڑوں اور وہاں کی کیچڑ اور گندے پانی کے گڑھوں میں ایک ایسا تضاد نظر آتا تھا جسے دیکھ کر تعجب بھی ہوتا تھا اور ہنسی بھی آتی تھی۔

آبادی کے لحاظ سے ہیلینا ارکنسا میں دوسرے نمبر کا شہر ہے جس کی آبادی پانچ ہزار ہے۔ اس کے چاروں طرف کی زمین بہت زرخیز ہے۔ یہاں کپاس کی اچھی تجارت ہوتی ہے اور یہاں چالیس سے ساٹھ ہزار کپاس کی گانٹھیں ہر سال باہر جاتی ہیں۔ یہاں عمدہ قسم کی لکڑی اور اناج کی بہت تجارت ہوتی ہے۔ یہاں ایک دھات گلانے کا کارخانہ تیل کا کارخانہ

مشینوں کی دکانیں اور مال گاڑی کے ڈبے بنانے کا کارخانہ ہے۔ مختصر یہ کہ یہاں دس لاکھ ڈالر کی رقم صنعتوں میں صرف کی گئی تھی۔ یہاں دو ریلوے لائنیں ہیں اور یہ ایک بڑے مالدار علاقے کا تجارتی مرکز ہے اور جیسا کہ نیو آرلینز ٹائمس ڈیموکریٹ اخبار نے لکھا ہے اس شہر کی تمام ذرائع سے کل آمدنی چالیس لاکھ ڈالر سالانہ ہے۔

اکتیسواں باب

ایک انگوٹھے کا نشان اور اس سے وابستہ واقعات

ہم ارکنسا میں واقع نیپولین شہر کے قریب تھے اور میں اپنے کام کے متعلق جو مجھے وہاں کرنا تھا سوچ رہا تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اُجلا اور روشن دن تھا مگر پھر بھی موسم ایسا نہیں تھا کہ ہم اسے بہت اچھا کہہ سکتے۔ دوسرے یہ کہ میرا پیغام ایسا نہیں تھا جو دوپہر کے وقت پہونچایا جاتا۔ میں جتنا اس بارے میں سوچ رہا تھا اتنا ہی متفکر ہو رہا تھا کبھی کسی خیال سے اور کبھی کسی سے۔ بلآخر اس سوال کی شدت کم ہونے لگی اور میں نے اپنے آپ سے پوچھا کہ کیا اس قسم کے پیغام پہونچانے کا کام دن میں نہیں کرنا چاہیئے جب ذرا سے آرام اور سہولت کی قربانی دے کر اگر یہ کام کر لیا جائے تو رات کو کوئی مصروفیت نہیں رہے گی اور پھر اس وقت مجھے دیکھنے والی متجسّس نگاہیں بھی نہ ہوں گی۔ سیدھے سادے سوال اور سیدھے سادے جواب بے حد الجھے ہوئے مسائل کا حل بن جاتے ہیں۔ میں اپنے دوستوں کو اپنی آرام گاہ میں لے گیا اور کہا کہ مجھے افسوس ہے کہ میں نے انھیں ناراض بھی کیا تھا اور نا امید بھی۔ لیکن بہت غور و خوض کے بعد یہی مناسب معلوم ہوا کہ ہم اپنا سامان ساحل پر چھوڑ دیں اور شہر نیپولین میں

رکیں۔ میرے دوستوں نے فوراً انکار کر دیا اور زور زور سے چلّا کر اپنی ناراضگی ظاہر کی۔
ان لوگوں نے بغاوت کی زبان استعمال کی۔ ان کی ایک ہی دلیل تھی جو اکثر لوگ دیا کرتے
ہیں اور شروع سے ہی ایسے معاملوں میں دیتے آئے ہیں "لیکن تم نے تو اس بات پر رضا
مندی ظاہر کی تھی کہ تم اس کشتی میں رہو گے" وغیرہ وغیرہ۔ گویا کہ ایک بار کسی غلط فیصلے
پر پہنچنے کے بعد آدمی کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اپنا ارادہ پورا کرنے کے لئے وہ دو غلط کام کرے۔

ان کا غصّہ دور کرنے کے لئے میں نے کئی دلیلیں دیں اور مجھے کچھ کامیابی بھی ہوئی نیز
میری ہمّت افزائی بھی ہوئی۔ پھر میں نے اپنی کوششیں تیز تر کر دیں اور انھیں یہ بتانے کے لئے
کہ وہ ناراض کرنے والا پیغام میں نے خود نہیں گھڑ لیا تھا اسلئے مجھ پر اس کا الزام نہیں آنا
چاہیئے' میں نے فوراً اس پیغام کی کل داستان بیان کرنا شروع کر دی جو اس طرح ہے :-

پچھلے سال کے اختتام پر میں کچھ مہینے میونخ میں رہا۔ نومبر میں میں فرالین ڈیلویز س
پینشن لاکرلسٹار سے Fraul-in Dablweiner's Pension La, Kerlstrasse
میں رہتا تھا لیکن میرے کام کرنے کی جگہ سے میرا مکان ایک میل دور تھا۔ میں ایک بیوہ کے
مکان میں رہتا تھا جو اپنے گھر میں مسافروں کو ٹھہرا کر جو پیسہ کماتی تھی اس سے اپنے کنبے کی گذر
اوقات کرتی تھی۔ وہ اور اس کے دونوں چھوٹے چھوٹے بچے صبح ہی میرے پاس آجاتے
اور میری درخواست پر مجھ سے جرمن... زبان میں بات چیت کرتے۔ ایک دن شہر میں ایک
جھگڑا ہوا اور اس سلسلے میں میرا گذر ایک ایسے مکان کے پاس سے ہوا جہاں گورنمنٹ لاشوں
کو رکھ کر ان کی تھوڑی بہت دیر حفاظت کرتی تھی اور جبتک ڈاکٹر یہ طے نہیں کر دیتے تھے کہ
مریض واقعی مر گیا ہے اور بیہوش نہیں ہے اُسے وہیں رکھا جاتا تھا یہ ایک کشادہ کمرہ تھا
جو بہت ہولناک تھا۔ اسوقت وہاں قریب چھتیس لاشیں پڑی تھیں جو کچھ ترچھے رکھے ہوئے
تختوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ یہ تین قطاروں میں تھیں۔ سب لاشیں موم کی طرح سفید تھیں۔
انکے چہرے سخت ہو چکے تھے۔ یہ سب سفید کفن میں ملبوس تھیں۔ بڑے کمرے کے دونوں
طرف گہرے گہرے چھوٹے طاقچے تھے جن میں محرابی کھڑکیاں تھیں۔ ان طاقچوں میں
بہت سے پتّے ایسے پڑے تھے جنکے چہرے سنگ مرمر کی طرح سفید تھے اور جو تازہ پھولوں

میں قریب قریب بالکل ڈھکے تھے صرف انکے چہرے اور ایک دوسرے پر رکھے دونوں ہاتھ دکھائی دیتے تھے۔ انکا باقی جسم پھولوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ان پچاس خاموش انسانوں میں سے چھوٹے بڑے ہر ایک کی انگلی میں ایک انگوٹھی تھی اور انگوٹھی سے ایک تار چھت تک جاتا تھا اور وہاں سے مڑ کر پہرے کے کمرے کی ایک گھنٹی سے بندھا ہوا تھا جہاں دن رات ایک چوکیدار ہمیشہ چوکنا بیٹھا رہتا تھا جو کہ جوان پیلے چہرے والے مرنیوں میں سے ہر ایک کی حفاظت تیار رہتا تھا اگر ان بظاہر مردہ لوگوں میں سے کسی میں جان پڑ جاتی تو ان تاروں کے کھنچنے سے گھنٹی بجتی تھی میں اس وقت خود کو موت کا ایک سنتری تصور کیا جو وہاں اکیلا بیٹھا اونگھ رہا ہو اور ایک اداس اندھیری اور طوفانی رات میں بڑی سرد مہری سے پہرہ دے رہا ہو۔ ایک ہی لمحہ میں میرا جسم خوف سے تھر تھر کانپنے لگا خاص کر جب میں نے پکارنے کی ایک خوفناک آواز سنی اسی لئے میں اسکے متعلق معلومات کی میں نے پوچھا اگر پہرہ دار مر جائے تو کسی مردے میں جان آجائے اور وہ اپنے آخری لمحات کو آرام دہ بنانے کے لئے جو چاہے کر گزرے تو کیا ہوا۔؟ لیکن مجھے اس بات کے دریافت کرنے پر بھلا برا کہا گیا کہ میں اپنی بیوقوفی سے اپنے بیکار کے تجسس کو تشفی دینے کی کوشش کر رہا تھا خاص کر ایسی جگہ میں جو اسقدر سنجیدہ اور غم آلود تھی۔ لہٰذا میں ندامت کے ساتھ گھر لوٹ آیا۔

دوسرے روز اس بیوہ سے میں نے اپنی اس بات چیت کا ذکر کیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ” میرے ساتھ آؤ۔ میرا وہاں ایک کرایہ دار ہے۔ وہ تمہیں سب باتیں جو تم جاننا چاہتے ہو بتا دیگا۔ وہ وہاں پہرہ دار رہ چکا ہے۔

اس کا وہ کرایہ دار زندہ تھا مگر بظاہر مردہ سا لگتا تھا۔ وہ چارپائی پر پڑا تھا اور اس کا سر اونچے تکیوں پر رکھا ہوا تھا۔ اسکے چہرے پر مُردنی چھائی تھی اور اس کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ اس کا ہاتھ جو اس کے سینے پر رکھا تھا اتنا دُبلا تھا کہ کسی شکاری پرند کے ناخنوں کا پنجہ معلوم ہوتا تھا کیونکہ اسمیں صرف ہڈیاں ہی رہ گئیں تھیں اور اسوجہ سے انگلیاں لمبی لمبی سی دکھائی دیتی تھیں۔ بیوہ عورت نے میرا تعارف اس مریض سے کرایا۔ اس کی آنکھیں دھیرے دھیرے کھلیں۔ یوں کہنا چاہیئے کہ وے اپنی اندھیری گپھاؤں میں دھیرے دھیرے چمکیں جنہیں دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ اس کے کالے چہرے پر غصے کی کالی کالی جھریاں پڑ گئیں تھیں۔ اس نے اپنا دبلا ہاتھ اٹھایا اور ہمیں چلے جانے کا اشارہ کیا۔ لیکن بیوہ وہاں

اڑی رہی جبتک اس نے اسے یہ بات نہ سمجھا دی کہ میں ایک اجنبی تھا اور امریکہ کا باشندہ تھا۔ تبھی اس آدمی کا چہرہ فوراً بدل گیا چمک اٹھا اور پھر وہ مجھ سے بات چیت کرنے کا مشتاق معلوم ہونے لگا۔ میں اور وہ اکیلے میں کچھ دیر تک بات چیت کرتے رہے۔

میں نے ٹوٹی پھوٹی جرمن زبان میں بات چیت کرنی شروع کی مگر اس نے بہت اچھی بامحاورہ انگریزی میں اس کا جواب دیا۔ اسکے بعد ہم لوگوں نے جرمن نہیں بولی۔

یہ تپ دق کا مریض اور میں اچھے خاصے دوست بن گئے۔ میں روزانہ اس سے ملنے جایا کرتا تھا اور ہم ہر موضوع پر بات کرتے تھے۔ صرف بیوی اور بچوں کی باتیں چھوڑ کر وہ ہر قسم کی بات پسند کرتا تھا۔ اگر دوران گفتگو میں کہیں کسی بیوی یا بچوں کا ذکر چھیڑ دیتا تو اس کا اثر اس مریض پر عجیب و غریب ہوتا تھا۔ ایک لمحے تک اس بڈھے کی آنکھوں سے رحم و محبت کا جذبہ ٹپکتا لیکن پھر دوسرے ہی لمحہ وہ جذبہ دھیما پڑ جاتا اور اس کی آنکھیں پہلے کی طرح خوفناک ہو جاتیں تیسری بات یہ ہوتی کہ وہ بولنا بند کر دیتا اور پھر دن بھر نہیں بولتا تھا اور تمام دن گم صم سا اپنے ہی خیالات میں غرق پڑا رہتا۔ بلکہ ایسا لگتا تھا کہ جو کچھ میں کہتا تھا اسے وہ سنتا ہی نہیں تھا یہانتک کہ میرا رخصتی سلام بھی قبول نہ کرتا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میری روانگی کا اسے علم ہی نہ ہوتا ہو۔

جب میں اس شخص کے پاس جس کا نام کارل لٹز تھا روزانہ جاتا رہا اور دو مہینوں تک اس کے بہت قریب آ گیا تو ایک دن اس نے مجھ سے کہا "میں تم کو اپنی کہانی سناؤں گا"

'ایک مرنے والے کا اعتراف'

اس نے کہا "میں نے ابتک کسی کو اپنی کہانی نہیں سنائی۔ لیکن آج میں تمھیں سنا رہا ہوں۔ میں قریب المرگ ہوں۔ کل رات میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ مجھے تمھیں جلد از جلد اپنی کہانی سنانی چاہیئے۔ تم کہتے ہو کہ تم جلد از جلد امریکہ واپس جاؤ گے۔ ایک تو یہ بات اور دوسرے ایک عجیب تجربہ جو کل رات مجھے ہوا ان دونوں واقعات نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں تمہیں اپنی داستان زندگی سناؤں کیونکہ تم ارکنسا میں واقع نیپولین شہر میں جاؤ گے۔ میری خاطر تم وہاں قیام بھی کرنا اور میرا ایک کام بھی کر دینا۔ یہ کام تم میری کہانی سننے کے بعد خوشی خوشی کرو گے۔

جہانتک ہوسکے گا میں کہانی کو مختصر کروں گا کیونکہ یہ اتنی لمبی ہے کہ اسے مختصر کرنا ہی پڑے گا۔ تم یہ تو جانتے ہی ہو کہ میں امریکہ کیسے پہونچ گیا اور میں کیسے اس جنوب کے بیابان علاقے میں آباد ہوا۔ لیکن تمھیں نہیں معلوم ہے کہ میری ایک بیوی بھی تھی۔ اوہ۔ میری بیوی کتنی نوجوان، خوبصورت، محبت کرنیوالی اور کتنی نیک سیرت، پاکیزہ اور شریف تھی۔ ہماری ایک بچی بھی تھی جو ہو بہو اپنی ماں کی ننھی تصویر تھی میرا چھوٹا سا گھرانا سب سے پرسکون گھرانوں میں سے تھا۔

جنگ عظیم کے اختتام کے زمانہ میں اس رات طبیعت کی گرانی کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے بہت سستی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ سستی شراب کے خمار جیسی تھی۔ نہ میرے ہاتھ پیر کام کر رہے تھے اور نہ زبان کھل رہی تھی۔ اور ہوا میں کلوروفارم کی مہک آ رہی تھی۔ میں نے کمرے میں دو آدمیوں کو دیکھا۔ وہ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا "میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ اگر اس نے شور کیا تو میں ...... اور جہاں تک بچے کا تعلق ہے......"

دوسرے آدمی نے بیچ میں بات کاٹ کر دھیمی اور کچھ روتی سی آواز میں کہا "تم نے یہ کہا تھا کہ ہم ان کا منہ بند کردینگے اور پھر ان کو لوٹ لینگے۔ ان کو ماریں گے نہیں۔ ورنہ میں تمہارے ساتھ نہیں آتا۔"

پہلا "تم یہ کتے کی طرح رونا بند کرو۔ جب یہ لوگ جاگ گئے تو ہمیں اپنا منصوبہ بدلنا پڑا انکو بچانے کے لئے جتنا ہوسکا تم نے کیا۔ اب تمھیں بدلے ہوئے حالات سے مطمئن ہو جانا چاہیئے آؤ سامان ڈھونڈنے میں میری مدد کرو۔"

دونوں آدمیوں کے چہروں پر نقابیں پڑی تھیں اور وہ موٹے بھدے اور کالے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ان کے پاس ایک لالٹین تھی جسکی روشنی میں میں نے دیکھا کہ جو ڈاکو شریف تھا اسکے سیدھے ہاتھ میں انگوٹھا نہیں تھا۔ ذرا دیر تک وہ میرے فلاش جھونپڑے کی تلاشی لیتے رہے تب بڑے ڈاکو نے دھیرے سے کہا "یہ تو وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ یہی آدمی بتائے گا کہ اس کی دولت کہاں چھپی رکھی ہے۔ اس کے منہ سے کپڑا نکال دو اور اس کو ٹھیک ہو جانے دو۔"

دوسرے نے کہا" بشرطیکہ اُسے ڈنڈے نہ مارے جائیں"
پہلا" اگر وہ خاموش رہا تو اُسے ڈنڈے نہیں پڑیں گے"

وہ پھر میرے پاس آئے۔ اسی وقت باہر ایک آواز سنائی دی۔ یہ آدمیوں کی آواز تھی اور گھوڑوں کی ٹاپوں اور کھروں کی بھی۔ ڈاکوؤں نے سانس روک کر سنا۔ آوازیں اب آہستہ آہستہ قریب تر آرہی تھیں۔ تب ایک شور سنائی دیا" ارے یہی مکان ہے روشنی دکھاؤ ہمیں پانی چاہیئے" بدمعاش ڈاکوؤں نے کاناپھوسی کرتے ہوئے کہا۔

" یہ کپتان جی (؟) کی آواز ہے" اور پھر دونوں ڈاکو پچھلے دروازے سے بھاگ گئے اور بھاگتے وقت انھوں نے اپنی لالٹین بجھادی۔

اجنبی لوگوں نے کئی بار زور زور سے پکارا اور پھر وہ آگے بڑھ گئے۔ تقریب ایک درجن گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں تھیں۔ پھر میں نے کچھ نہیں سنا۔

میں نے بہت کوشش کی مگر میں خود کو بندش سے چھڑا نہ سکا۔ گلے میں پھانس اتنی زبردست تھی کہ میں بول نہیں سکتا تھا۔ میں آواز بھی نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے بہت دیر تک اپنی بیوی اور بچّی کی آوازیں سننے کی کوشش کی لیکن کمرے کے دوسرے کونے سے جہاں ان کے بستر تھے کوئی آواز نہیں آئی۔ یہ خاموشی بہت ہولناک ہوتی گئی اور اس سے خطرہ بھی برابر بڑھ رہا تھا۔ کیا تم اس طرح کی مصیبت ایک گھنٹہ برداشت کرسکتے ہو۔ اگر نہیں تو تمہیں میری حالت پر رحم آئے گا۔ میں نے ایسی مصیبت تین گھنٹے برداشت کی اور یہ تین گھنٹے تین زمانوں کے برابر تھے۔ جب گھڑی گھنٹہ بجاتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس گھنٹے کی آواز اور پچھلے گھنٹے کی آواز کے درمیان برسوں کا فاصلہ حائل ہے۔ اس وقت میں اپنے بند کھولنے کے لئے جدوجہد کر رہا تھا۔ آخر کار صبح کے قریب مجھے کامیابی ہوگئی اور میں بند سے آزاد ہوگیا۔ میں اٹھا اور میں نے اپنے اکڑے ہوئے بازو پھیلائے۔ اب مجھے سب واقعات اچھی طرح سمجھ میں آنے لگے۔ ڈاکوؤں نے روپے کی تلاش میں میرا سب سامان فرش پر پھینک دیا تھا۔ پہلی چیز جس پر میری نگاہ پڑی وہ ایک دستاویز تھی جس پر ڈاکو کی نظر پڑی تھی اور پھر بیکار سمجھ کر اسے پھینک دیا گیا تھا۔ اس پر خون کے

نشان تھے۔ میں لڑکھڑاتا ہوا کمرے کے دوسرے سرے تک گیا۔ آہ بیچاری معصوم جانیں۔ انھیں تو اس نے ختم کر دیا تھا یا یوں کہیئے کہ انکی مصیبتیں ختم ہو چکی تھیں اور میری شروع ہوئی تھیں۔
آپ سوچتے ہوں گے۔ میں نے انصاف کے لئے کسی عدالت میں چارہ جوئی کی ہو گی نہیں۔ اس سے کیا فائدہ ہوتا۔ ؟ اگر ایک غریب پیاسے انسان کی جگہ بادشاہ وقت کو پانی پلا دیا جائے تو اس سے اس غریب کو کیا فائدہ۔ ارے نہیں۔ نہیں۔ میں قانون کی دخل اندازی بالکل نہیں چاہتا تھا۔ کوئی قانون یا پھانسی کی سزا میرے نقصان کی تلافی نہیں کر سکتی تھی۔ قانون کو چاہیئے تھا کہ یہ معاملہ مجھی پر چھوڑ دے اور بیفکر ہو جائے۔ میں قرض دار کو خود تلاش کر لوں گا اور اس سے اپنا قرض چکاؤں گا۔ آپ پوچھیں گے تم اس کام کو کیسے کرو گے اور تمھیں کسطرح یقین ہے کہ تم اس کام کو کر لو گے جبکہ تم نے ڈاکوؤں کے چہرے دیکھے اور نہ انکی اصلی آوازیں سنیں اور نہ آپ کو کوئی قیاس ہے کہ وہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ مگر پھر بھی مجھے یقین تھا اور مکمل یقین تھا، خود اعتمادی تھی۔

میرے پاس ایک پتہ تھا۔ مگر آپ اس پتے کی قدر نہیں کریں گے نہ اس پتے سے جاسوسوں کو کوئی فائدہ ہو سکتا ہے کیونکہ ان کو اس پتے کو استعمال کرنا نہیں آئے گا۔ اب میں آپ کو بتاتا ہوں۔ فی الحال قصے کی سب تفصیلات بالترتیب سنتے چلئے۔ ایک بات ایسی ہے جس سے مجھے یہ فیصلہ کرنے میں کہ مجھے کیا قدم اٹھانا چاہیئے مدد ملی۔ یہ دونوں ڈاکو آوارہ لوگوں کے بھیس میں سپاہی ہی تھے اور فوجی ملازمت میں نئے نہیں تھے، کافی پرانے معلوم ہوتے تھے۔ سپاہیوں جیسے انداز اور چال ڈھال ایک دن اور ایک مہینے کیا ایک سال میں بھی نہیں آ سکتے میں نے یہی سوچا اور کسی سے کچھ نہ کہا۔ ان ڈاکوؤں میں سے ایک نے کہا تھا "کپتان جی (G) کی آواز یعنی اس ڈاکو نے کہا جسکی جان مجھے لینی تھی۔ دو ہی میل کی دوری پر فوج کی ٹکڑیاں پڑاؤ ڈالے پڑی تھیں اور وہاں دو کمپنیاں امریکن پیدل سپاہیوں کی تھیں۔ جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ کپتان بلیکلی جو سی (C) کمپنی کے انچارج تھے اس رات کو میرے مکان سے مع ایک محافظ کے گذرے تھے تو میں نے کہا تو کچھ نہیں مگر یہ ارادہ کر لیا کہ میں اس کمپنی میں اپنے دشمن کو تلاش کروں گا۔ میں بات چیت کے دوران میں اکثر بڑے زوردار الفاظ میں اور بار بار کہا کرتا تھا کہ

ڈاکو اکثر آوارہ لوگوں کا بھیس بنائے رہتے ہیں اور وہ کیمپ کے آدمی ہی ہوتے ہیں اور ان لوگوں کی تلاش مشکل ہو جاتی ہے تو یہ سن کر لوگ میری باتوں پہ ہی شک کرتے اور کسی پر نہیں۔

اپنے اکیلے گھر میں راتوں رات صبر کیا نہ کام کرتے ہوئے کئی طرح کے مختلف کپڑے فراہم کر کے میں نے اپنا بھیس بدلا۔ قریب کے دیہات سے میں نے دھوپ کا چشمہ خریدا۔ آہستہ آہستہ جب فوجی پڑاؤ ہٹ گیا اور کمپنی ح نشو میل آتر میں چلی جہاں نیپولین نام کا شہر آباد ہے تو میں نے اپنی بیٹی میں اپنا تھوڑا سا پیسہ چھپایا اور رات میں گھر سے چل دیا۔ جب کمپنی C نیپولین پہونچی تو میں پہلے ہی وہاں پہونچ چکا تھا اب میرا اپنا پیشہ تھا تقدیر کا حال بتانا۔ میں سب کے ساتھ ایک جیسا برتاؤ کرنے کی وجہ سے بہت مقبولِ عام ہو گیا اور کمپنی کے سپاہیوں سے جن کی قسمت کا حال میں بتایا کرتا تھا میرے دوستانہ تعلقات بڑھنے لگے لیکن میں زیادہ تر توجہ کمپنی سی (C) پر دیتا تھا۔ ان لوگوں کی زیادہ خدمت کرنے کی وجہ سے میں ان کا بہت بڑا محسن بن گیا تھا ان پر احسان کرنے کے لئے میں کوئی بھی خطرہ مول لینے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ میں خوشی سے انکے مذاق کا تختۂ مشق بن جاتا تھا۔ اس سے میرے مقبول ہونے میں کوئی کمی باقی نہیں رہ گئی اور میں ہر دلعزیز بن گیا۔

کچھ مدت کے بعد ہی مجھے ایک پرائیویٹ سپاہی ملا جس کا ایک انگوٹھا نہیں تھا۔ مجھے اسوقت کتنی خوشی ہوئی ہوگی اور جب میں نے دیکھا کہ وہ کمپنی سے علیحدہ ہو کر میرے پاس آیا تھا اور اس کا ایک انگوٹھا بھی نہیں تھا تو مجھے کوئی شک و شبہ نہ رہا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں ٹھیک راستے پر تھا۔ اس آدمی کا نام کروگر تھا اور وہ جرمن تھا۔ اس کمپنی میں نو جرمن تھے۔ میں نے پھر دیکھنا شروع کیا کہ اس کا سب سے قریبی دوست کون تھا لیکن اس کا کوئی خاص دوست نہیں معلوم ہوتا تھا۔ البتہ میں خود اس کا قریبی دوست تھا۔ میں نے اس سے دوستی بڑھانا شروع کر دیا۔ کبھی کبھی میرے دل میں جذبۂ انتقام اتنا زور مارتا تھا کہ میں یہ خواہش کرنے لگتا کہ اس آدمی کے سامنے نہ زانو ہو کر اس کی خوشامد کر کے پوچھوں کہ وہ آدمی کون تھا جس نے میری بیوی اور بچی کو قتل کیا تھا۔ لیکن میں نے اپنی زبان کو لگام دی۔ میں اپنے موقع کا انتظار کرنے لگا اور لوگوں کی قسمت بتلانے کا کام کرتا رہا۔

میرا سامان بہت معمولی تھا تھوڑی سی سرخ پالش اور ذرا سا سفید کاغذ۔ میں اپنے گاہکوں کے انگوٹھوں کے نشان کاغذ پر لیا کرتا تھا۔ رات میں ان نشانوں کو غور سے پڑھتا تھا اور دوسرے دن انکی قسمت کا حال انھیں بتاتا تھا۔ اس فضول سے کام کے پیچھے میرا مقصد کیا تھا؟ مقصد یہ تھا۔ جب میں نوجوان تھا تو میری واقفیت ایک بڈھے فرانسیسی سے ہوئی جو تیس ۳۰ سال تک ایک جیل کا رکھوالا رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ آدمی کی ایک چیز کبھی نہیں بدلتی وہ پالنے سے قبر تک یعنی جنم سے موت تک ایک سی رہتی ہے اور وہ ہے اس کے انگوٹھے کے گول حصّے کے نشانات اور یہ نشانات دنیا کے کسی آدمی کے ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ان دنوں وہ ہر نئے مجرم کے انگوٹھے کا فوٹو لیتا تھا اور اس کی تصویر روگز گیلری (یعنی بد معاشوں کی گیلری) میں ٹانگ دیتا تھا تاکہ آئندہ کام آئے۔ وہ ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا کہ چہرے کی تصویریں بیکار ہوتی ہیں۔ بھیس بدلنے والے انھیں بیکار بنا دیتے ہیں۔ صرف انگوٹھے کا نشان ہی ایک ایسی چیز ہے جس میں دھوکا نہیں ہو سکتا۔ تم اس کو بھیس بدل کر تبدیل نہیں کر سکتے اور وہ اپنی اس رائے کو میرے دوستوں پر ثابت بھی کر دیا کرتا تھا اور ہمیشہ اسے کامیابی ملتی تھی۔

غرضیکہ میں تقدیر بتانے کا کام کرتا رہا۔ ہر روز رات کو میں کمرہ بند کر کے بیٹھتا اور دن میں لئے ہوئے لوگوں کے انگوٹھوں کے نشانات کو خوردبین کی مدد سے پڑھتا۔ ذرا غور فرمائیے کہ کس اشتیاق کے ساتھ میں ان اُلجھی ہوئی سُرخ چکّر دار لکیروں پر غور کیا کرتا تھا اور انھیں اس دستاویز پر پڑے ہوئے اُس انجان قاتل کے داہنے ہاتھ کے انگوٹھے اور انگلیوں کے نشانات سے ملایا کرتا تھا۔ یہ نشانات سرخ رنگ کی بجائے میری عزیز ترین بیوی اور بچّے کے خون سے لگے تھے اور بارہا نا اُمید ہو کر مجھے یہ الفاظ دہرانے پڑتے تھے کہ کیا دستاویز والے نشانات کبھی کسی نشان سے نہیں ملیں گے۔

لیکن آخر کار میرا انعام مجھے مل گیا۔ وہ نشان سی (C) کمپنی کے ۴۳ ویں سپاہی کے انگوٹھے کا نشان تھا جس کو تلاش کرنے کے لئے میں یہ سب مشق کرتا رہا تھا۔ یہ ایک سپاہی تھا اور اس کا نام تھا فرینز اینڈلر۔ ایک گھنٹہ پہلے تک مجھے قاتل کا نام معلوم نہیں ہوا تھا

اور نہ مجھے اس کی آواز نہ شکل نہ چہرہ اور نہ قومیت ہی معلوم تھی۔ لیکن اب مجھے سب باتیں معلوم ہو گئیں تھیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ میں ٹھیک راستے پر تھا۔ اس فرانسیسی نے جو تجربے مجھے کرائے تھے وہ ایک سند کا کام کر رہے تھے۔ پھر اس کی تصدیق میرے ہاتھ میں تھی۔ میرے پاس کروجر کے بائیں انگوٹھے کا نشان موجود تھا۔ صبح کے وقت جب وہ ڈیوٹی پر نہیں تھا تو میں اُسے علیحدہ لے گیا جہاں ہمیں کوئی دیکھ نہ سکے اور نہ ہماری بات سُن سکے۔ وہاں میں نے زوردار لہجہ میں کہا۔

"تمہاری تقدیر کا ایک پہلو اتنا خراب ہے کہ میں نے سوچا کہ میں سب کے سامنے اُسے تم سے نہ کہوں۔ تم نے ایک دوسرے آدمی سے جس کی تقدیر کا حال رات میں پڑھ رہا تھا اور جو سپاہی ہے اور جس کا نام ایڈلر ہے ملکر ایک عورت اور ایک بچے کو قتل کیا ہے تمھارا پیچھا کیا جارہا ہے۔ پانچ دن کے اندر تم دونوں قتل کر دیئے جاؤ گے۔"

یہ سنتے ہی وہ زانو کے بل جھک گیا۔ ڈر کے مارے اس کی عقل جواب دے گئی اور دیوانے کی طرح پانچ منٹ تک وہ کچھ الفاظ بار بار اور کچھ رک رک کر دہراتا رہا جس نے مجھے اپنے کیبن میں اس خطرناک رات کی یاد دلائی جبکہ میری بیوی اور بچوں کو قتل کیا گیا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں نے یہ کام نہیں کیا۔ میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے یہ کام نہیں کیا بلکہ میں نے اُسے ...... ایڈلر کو ایسا کرنے سے باز رکھا۔ خدا اس کا گواہ ہے یہ کام اس نے اکیلے ہی کیا۔

بس یہی بات میں جاننا چاہتا تھا۔ میں نے اس بیوقوف سے پیچھا چھڑانا چاہا لیکن وہ مجھے چمٹ گیا اور خوشامد کرنے لگا کہ میں اُسے قاتل کے ہاتھ سے بچا دوں۔ اس نے کہا۔

"میرے پاس کچھ رقم ہے، دس ہزار ڈالر کی جو کہیں پوشیدہ ہے۔ یہ پیسہ میں نے لوٹ اور چوری سے کمایا ہے۔ مجھے بچاؤ۔ بتاؤ میں کیا کروں۔ تم وہ سب پیسہ لے لو۔ کوڑی کوڑی تک۔ اس رقم میں سے دو تہائی میرے چچیرے بھائی ایڈلر کی ہے لیکن تم سب لے سکتے ہو۔ جب پہلے پہل ہم یہاں آئے تھے تو ہم نے اُسے چھپا دیا تھا۔ لیکن میں نے

اسے ایک نئی جگہ چھپادیا ہے اور یہ بات میں نے اسے نہیں بتائی ہے اور نہ بتلاؤں گا۔ میں اسکو لے کر کہیں بھاگ جانا چاہتا تھا۔ یہ ساری رقم سونے کی شکل میں ہے اور اسے لیکر بھاگنے میں دقت ہوتی لیکن ایک عورت دریا پر اسی لئے دو روز پہلے سے گئی ہے کہ وہ میرے لئے بھاگنے کا کوئی راستہ نکالے اور وہی اس سونے کو میرے پیچھے پیچھے لیکر آئے گی۔ اگر مجھے اتنا موقع نہ ملسکا کہ میں اس سونے کے چھپانے کی جگہ بتلاسکوں تو میں اپنی چاندی کی گھڑی اسکے ہاتھ میں دیدونگا یا اُسے بھجوادوں گا اور وہ سمجھ جائے گی کہ اُسے کیا کرنا ہے۔ اس گھڑی کے کیس کے پیچھے کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے جس میں سب لکھا ہوا ہے کہ وہ سونا کہاں چھپایا گیا ہے۔ لیجئے یہ گھڑی حاضر ہے اب مجھے بتائیے کہ میں کیا کروں ؟"

وہ اپنی گھڑی مجھے دینے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ کاغذ نکال کر مجھے سب سمجھا رہا تھا کہ اسی وقت ایڈلر وہاں آگیا۔ وہ قریب دس بارہ گز کے فاصلے پر تھا۔ میں نے کروجر سے کہا " اپنی گھڑی رکھو۔ مجھے نہیں چاہیئے۔ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہونچے گا۔ جاؤ اب مجھے ایڈلر کی قسمت کا حال بتانا ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں میں تمھیں بتلادوں گا کہ قاتل ہے کیسے بچیں۔ اس اثنا میں تمہارے انگوٹھے کے نشانات میں پھر دیکھوں گا۔ اس بارے میں ایڈلر سے کچھ مت کہنا اور کسی سے بھی کچھ مت کہنا۔

وہ بیچارہ ڈر اور احسان کے جذبات سے متاثر ہوکر چلا گیا۔ میں نے ایڈلر کی تقدیر کی بہت سی باتیں بتلائیں۔ میں قصداً دیر لگا تا رہا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ رات کو جب وہ ڈیوٹی پر ہوگا تب اسکے پاس میں آؤں گا اور جو ضروری باتیں رہ گئیں ہیں وہ اور بتلاؤں گا کیونکہ وہ باتیں المناک ہیں اسلئے وہ ایسی جگہ پر ملے جہاں کوئی ہماری باتیں سن نہ سکے۔ اتفاق سے اس رات کو اس کی ڈیوٹی شہر کے باہر تھی شہر کے باہر ایک پہرہ رکھا جاتا تھا جسکا مقصد محض امن وامان رکھنا تھا اسکی اور کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہاں کوئی دشمن نہیں تھا۔

رات کے وقت میں گھر سے چلا۔ میں نے اپنے ساتھ کچھ ضروری ہتھیار لئے اور اس سنسان جگہ کی طرف چلا۔ یا جہاں ایڈلر پہرہ پر جانے والا تھا۔ رات اتنی اندھیری تھی کہ میں ایک دھندلی سی شکل سے ٹکرا گیا۔ مجھے اپنی غلطی اس وقت معلوم ہوئی جب اس کے منہ سے مدافعت کے لئے

الفاظ نکلے۔ سنتری نے مجھے سلام کیا اور میں نے جواب دیا۔ ہم دونوں ... ایک ہی وقت پر وہاں پہونچے تھے۔ میں نے جاتے ہی کہا "میں ہوں قسمت کا حال بتانیوالا" تب میں اس بدمعاش کی بغل میں پہونچ گیا اور بغیر ایک لفظ کہے اس کی بغل میں خنجر بھونک دیا اور "جاہول" کا نعرہ لگاتے ہوئے ہنسا۔ یہی دراصل اس کی قسمت کا المناک پہلو تھا۔ جیسے ہی وہ اپنے گھوڑے پر سے گر کر مجھ پر جھپٹا۔ میرا نیلا چشمہ اس کے ہاتھ میں آگیا۔ اس کا گھوڑا اسے گھسیٹتے ہوئے بھاگا کیونکہ اس کے پیر رکاب میں تھے۔

میں جنگل میں بھاگ گیا اور بچکر نکل آیا۔ میرا چشمہ جس سے مجھ پر الزام عائد ہوسکتا تھا اسی مُردے کے ہاتھ میں رہ گیا۔

اس واقعہ کو پندرہ یا سولہ سال ہو گئے ہیں۔ اسوقت سے ابتک میں بلاارادہ دنیا میں گھومتا پھرتا رہا ہوں۔ کبھی کچھ کام کر لیتا ہوں۔ کبھی بیکار رہتا ہوں۔ کبھی میرے پاس پیسہ ہوتا ہے، کبھی نہیں ہوتا۔ لیکن میں زندگی سے ہمیشہ اکتایا رہا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ یہ زندگی جلد ختم ہوجائے کیونکہ میری زندگی کا مقصد اسی رات کے کام سے پورا ہوگیا تھا۔ مصیبت کے ان تمام برسوں میں میرے لئے خوشی، تسلی اور اطمینان کا باعث یہی رہا ہے کہ "میں نے اُسے مار ڈالا ہے"۔

چار سال ہوئے میری صحت گرنے لگی میں 'میونخ' میں بے ارادہ گھوم رہا تھا چونکہ میرے پاس پیسہ نہیں رہا تھا اس لئے میں نے کچھ کام تلاش کیا اور وہ مجھے مل گیا ایک سال تک میں اپنا فرض بخوبی انجام دیتا رہا اور پھر اس مردہ گھر میں مجھے پہرے پر لگا دیا گیا جہاں تم نے حال ہی میں آنا شروع کیا ہے۔ یہ جگہ میری طبیعت کے مطابق تھی اسلئے میں اسے پسند کرتا تھا۔ میں مُردوں کے ساتھ رہنا پسند کرتا تھا انکے ساتھ مجھے تنہائی میں رہنا اچھا لگتا تھا۔ میں انکی اکڑی ہوئی لاشوں کے درمیان گھومتا اور انکے سخت جبڑوں کی طرف گھنٹوں دیکھنا پسند کرتا تھا۔ کبھی کبھی میں روشنی کو دھیما کر دیتا تھا۔ اس سے بھی ایک خاص نظارہ دیکھنے کو ... کو ملتا تھا۔ جیسا کہ تم سمجھتے ہوگے۔ اس طرح تخیل میں نئی نئی چیزیں آتی ہیں اور مُردوں کو دھیرے دھیرے گلتے دیکھ کر بڑی عبرت حاصل ہوتی ہے اور عجیب وغریب دل کو متاثر کرنیوالے خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ دو سال پہلے مجھے یہاں آئے ہوئے صرف ایک ہی سال

ہوا تھا۔ میں پہرے کے کمرے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ بڑی طوفانی رات تھی میرے ہاتھ پیر سُن ہو رہے
تھے اور مجھے بڑی سردی لگ رہی تھی۔ اونگھتے اونگھتے بیہوشی سی ہونے لگی۔ ہوا کا آہیں بھرنا۔
کھڑکیوں کا زور سے بند ہونا جنکی آواز میرے کانوں کو ناگوار لگتی تھی۔ اسی وقت ایک مُردے
کی گھنٹی یکایک بڑی تیزی سے بجی جس کو سُنکر میری رگوں میں ڈر کی وجہ سے خون منجمد ہونے لگا۔
اس ڈر نے مجھے شَل کر دیا کیونکہ میں نے پہلی بار ایسی آواز سُنی تھی۔

میں نے حواس کو مجتمع کیا اور لاش کے کمرے کی طرف دوڑ کر گیا۔ مریضوں کی باہری قطار
سے میں تھوڑی ہی دُوری پر تھا کہ میں نے دیکھا کہ ایک لاش جو کفن میں ملبوس تھی اٹھ کر بیٹھ
گئی ہے اور اپنے سر کو ادھر سے ادھر آہستہ آہستہ ہلا رہی ہے۔ یہ بڑا ہولناک نظارہ تھا اس کا
منہ میری طرف تھا۔ میں نے دوڑ کر اس کے منہ کی طرف دیکھا۔ خدا کی پناہ یہ تو ایڈلر تھا۔

کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ میرے دل میں پہلے پہل کیا خیال آیا ہوگا۔ اگر میں اُسے بتانے
لگوں تو اس طرح کہا جائے گا "ایسا لگتا ہے کہ تم ایک بار میرے وار سے بچ گئے مگر اس بار
نتیجہ دوسرا ہی ہوگا۔" ظاہر ہے کہ یہ شخص اس وقت مصیبتوں میں مبتلا تھا۔ ذرا سوچئے کہ
اس خاموش ماحول میں جاگ اٹھنے اور پھر ان لاشوں کے ڈھیر کو دیکھنے سے کیسا لگتا ہوگا
مگر جب اس نے مجھے یعنی ایک زندہ انسان کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو اس کی آنکھوں میں
احسان کے جذبات چھلک نکلے۔ اسکے سفید چہرے پر جس میں صرف جلد ہڈیاں رہ گئیں تھیں
آنکھیں چمکنے لگیں۔ اور جب اس نے میرے ہاتھ میں زندگی بحال کرنے والی (یعنی برانڈی کی)
شیشی دیکھی تو اسکے شکریہ کا جذبہ کتنا بڑھ گیا ہوگا ذرا اس کا اندازہ کیجئے اور جب میں نے
دوا کی شیشی اپنے پیچھے کر لی تو اس کے چہرہ پر خوف کے آثار کیسے نمودار ہوئے ہونگے ذرا اسکا تصور
کیجئے خاص کر اس وقت جب میں نے اس سے طنزیہ الفاظ میں کہا "فرینز ایڈلر بتاؤ کیا بات
ہے۔ ان مُردوں کو آواز دو۔ بیشک یہ تمہاری آواز سنیں گے اور تم پر رحم کریں گے۔ لیکن انکے علاوہ تم
پر رحم کرنے والا یہاں اور کوئی نہیں ہے۔

"" اس نے زندگی کی درخواست کی [illegible]
[illegible]

لئے ہاتھ ڈھلے مگر وہ بھی اسکے سینے پر ایک دوسرے پر بندھے ہوئے تھے۔" میں نے کہا فریمنز آئلینڈر چلاؤ۔ دور سڑک پر سونے والوں کو پکارو اور مدد کے لئے بلاؤ۔ چلاؤ۔ وقت ضائع مت کرو اور تمہارے پاس وقت ہے بھی نہیں۔ ارے۔ کیا تم چلا نہیں سکتے۔ بڑے افسوس کی بات ہے لیکن اس سے کچھ فائدہ بھی نہیں ہوگا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ پہلے بھی کسی کو اس سے فائدہ نہیں ہوا تھا۔ کیا یاد ہے۔؟ جب تم نے اور تمہارے چچیرے بھائی نے ایک بیکس عورت اور بچی کو ارکنسا میں ایک کوٹھری میں مار ڈالا تھا۔ وہ عورت میری بیوی تھی اور وہ بچی میری لڑکی۔ تمہیں یاد ہوگا کہ وہ بیچارے بھی مدد کے لئے چلائے ہوں گے لیکن اس سے انھیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ یاد ہے کیا۔؟ ارے۔ تمہارے دانت کٹکٹاتے ہیں۔ پھر چلاتے کیوں نہیں۔ اپنے ہاتھوں سے یہ بند ڈھیلے کر دو تب تم چلا سکو گے۔ ارے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے تو ہاتھ بھی بندھے ہیں۔ یہ بھی تمہاری مدد نہیں کر سکتے۔ کتنا تعجب ہے کہ برسوں بعد بھی چیزیں کس طرح دہرائی جاتی ہیں کیوں ہے نا ٹھیک؟ تمہیں یاد ہوگا کہ برسوں پہلے اس رات کو میرے ہاتھ بھی باندھ دیئے گئے تھے ٹھیک اس طرح جس طرح کہ اب تمہارے بندھے ہوئے ہیں۔ کیسی عجیب بات ہے؟ میں بھی کوشش کے باوجود آزاد نہ ہو سکا۔ تمہیں یہ بھی خیال نہ آیا کہ میرے پیر کھول دو۔ اور اسوقت میری بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ میں تمہارے ہاتھ پیر کھول دوں۔ ارے کسی کے قدموں کی آواز آرہی ہے وہ اسی طرف آرہا ہے سننا کتنا نزدیک آگیا۔ قدموں کی گنتی بھی کی جا سکتی ہے۔ ایک۔ دو۔ تین۔ لو وہ تو ٹھیک دروازے پر آگیا۔ اب میرے کام کرنے کا وقت ہے۔ چلاؤ۔ اے آدمی۔ چلاؤ۔ تمہیں اسوقت سے لیکر آخر تک ایک ہی موقع ہے۔ ارے تم نے اتنی دیر کر دی۔ اب موقع نکل گیا۔ نکل رہا ہے نکل گیا۔ سوچو۔ غور کرو۔ تم نے انسانی قدموں کی آواز آخری بار سُنی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ابھی جو مانوس آواز تم نے سنی ہے تم پھر کبھی اُسے نہ سُن سکو گے۔"

"میرے دوست! اس کشمکش میں اپنے ہوتے چہرے پر کرب کے آثار دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی۔ میرے ذہن میں اُسے تکلیف دینے کا ایک نیا طریقہ ابھرا۔ میں نے اُسے آزمایا جس نے اپنی باتوں میں کئی چھوٹے موٹے جھوٹ شامل کر دیئے تھے۔

اُس غریب کرد گر نے میری بیوی اور بچی کو بچانے کی کوشش کی اور احسان کے بدلے میں میں نے موقع ملنے پر اس کے ساتھ ایک بھلائی کی میں نے اُسے ترغیب دی کہ وہ تمہیں لوٹ لے اور اس کام میں ایک عورت کو شامل کرکے اُسے بھگانے میں مدد دی چنانچہ وہ حفاظت سے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔"

اب میرے شکار کی آنکھوں میں دھیمی دھیمی سی روشنی دکھائی دی۔ اس سے کچھ تعجب و نیز فتحیابی کا جذبہ ٹپکتا تھا حالانکہ اس کی تکلیف برابر جاری تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے پریشانی ہوئی اور میں نے کہا۔" کیا۔؟ وہ بھاگ نہیں سکا۔؟"

ایڈ لر نے سر ہلا کر کہا" نہیں"

میں نے پھر پوچھا" پھر کیا ہوا۔؟"

اب اس کفن پر لپٹے چہرے پر اطمینان کے آثار صاف صاف نظر آنے لگے۔ اس نے کچھ الفاظ دھیرے دھیرے منہ ہی منہ میں بڑبڑائے۔ مگر وہ بول نہ سکا۔ اس نے کچھ اشارہ کرنے کی کوشش کی مگر ہاتھوں کی رکاوٹ کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر سکا۔ ناکام ہو کر وہ ایک لمحہ رُکا پھر اپنا سر ترچھا کیا جس کا اشارہ اس لاش کی طرف تھا جو اس کے پاس پڑی تھی۔

میں نے پوچھا" کیا وہ مر گیا۔ کیا بچ نہیں سکا۔؟ پکڑا گیا؟ مار دیا گیا۔؟

اس نے سر ہلا کر منع کیا۔

" پھر کیا ہوا" میں نے پوچھا۔

اب ایڈ لر نے اپنے ہاتھوں سے کچھ اشارہ کرنے کی کوشش کی۔ میں نے غور سے دیکھا۔ لیکن اس کا مطلب سمجھ نہیں سکا۔ میں نے اسکے اوپر جھک کر غور سے دیکھنے کی کوشش کی۔ اس نے ایک انگوٹھا موڑ رکھا تھا اور اس سے اپنے سینے کو کھرچ رہا تھا۔

میں نے پوچھا" آہ تمہارا مطلب ہے اسکے چھُرا مار دیا گیا۔

اس نے سر ہلا کر کہا" ہاں" اور پھر بھوت جیسی ہنسی جس سے بدمعاشی ظاہر ہوتی تھی۔ اس سے میرے تھکے ہوئے دماغ میں ایک دم ایک خیال آیا اور اس نے چلا کر کہا۔

"کیا میں نے اسکو پھر امارا ۔؟ دھوکے سے بجائے تمھارے اُسے مار ڈالا حالانکہ میں نے اپنی دانست میں تم پر وار کیا تھا۔

اس مرنے والے نے پھر سر ہلا کر اقرار کیا۔ اسوقت اسے جو خوشی ہو رہی تھی اس کا اظہار جتنا اس سے ہو سکا اس نے کیا۔

"اُف کتنی تکلیف دہ بات ہے!! اس غریب انسان کو قتل کرنا جو میری بیوی اور بچی کا دوست تھا جب وہ بیچارے بیکس تھے اگر ہو سکتا تو وہ انھیں بچا لیتا۔

اُف ری مصیبت۔ مصیبت۔ کتنی بڑی غلطی۔!

"میں نے دیکھا کہ اسکے دبے ہوئے منہ سے ایک غضبناک خیز ہنسی نکلی جو مجھے کچھ کچھ سنائی دی میں نے اپنے چہرے سے اپنے ہاتھ ہٹائے اور دیکھا کہ میرا دشمن تختے پر سر رکھے آخری سانسیں لے رہا تھا۔

اس کا دم نکلنے میں کافی دیر ہو رہی تھی۔ اس میں غضب کی قوت تھی اور اسکا جسم بلا کا تندرست تھا اور وہ کافی عرصے سے زندہ رہا تھا۔ میں ایک کرسی اور ایک اخبار لے آیا اور اسکے پاس ہی بیٹھ کر اُسے پڑھنے لگا۔ کبھی کبھی میں ذرا ذرا سی برانڈی پی لیتا تھا سردی کی وجہ سے اس کی ضرورت تھی اور میں اس وجہ سے بھی بار بار پیتا تھا کیونکہ پہلے جب میں بوتل لایا تھا تو اس نے سوچا تھا کہ میں اُسے بھی دوں گا۔ میں نے زور سے اخبار پڑھنا شروع کیا۔ اس میں ان لوگوں کے من گھڑت حالات تھے جو قبر کے کونے سے نکل کر صرف چند خوراک شراب اور گرم پانی کے غسل کی وجہ سے زندہ ہو گئے تھے۔ ہاں ایڈلر واقعی بہت دیر میں مر رہا تھا۔ جس وقت اس نے پہلی بار گھنٹی بجائی تھی اسوقت سے ابتک تین گھنٹے ۲ منٹ گذر چکے تھے۔

لوگوں کو یقین ہے کہ جب سے یوریا میں مردہ گھر کھولا گیا تب سے ابتک کسی کفن پہنی ہوئی لاش نے گھنٹی نہیں بجائی۔ ایسا یقین کرتے ہیں کوئی نقصان نہیں ہے لوگوں کا یہ بھرم بنا رہنے دیجئے۔

اس مُردہ گھر کی سردی میری ہڈیوں میں سرایت کر رہی تھی۔ اس سے وہ بیماری جس میں میں مبتلا تھا زور پکڑ گئی کیونکہ اس سے پچھلی رات تک مجھے افاقہ ہو رہا تھا۔ ایڈلر نے میری بیوی اور بچی کو قتل کیا تین دن بعد میرا نام بھی مُردوں کی فہرست میں شامل ہو جائے گا۔ کوئی مضائقہ

نہیں۔ خدا کی قسم۔ اس یاد سے مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے کہ میں نے اُسے قبر سے نکلنے کی کوشش کرتے دیکھا اور ایک بار پھر اُسے اُسی میں اُترنے پر مجبور کر دیا۔

اس رات کے بعد میں ایک ہفتہ کے لئے بیمار پڑ گیا لیکن جیسے ہی میں پھر چلنے پھرنے کے قابل ہوا میں پھر مردہ گھر کے رجسٹر کو دیکھنے گیا۔ اس کمرے کا نمبر بھی دیکھا جس میں ایڈلر مرا تھا۔ یہ بڑا بدنصیب کمرہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ چونکہ وہ کروجر کا چچیرا بھائی تھا اسلئے کروجر کی موت کے بعد اس کا سارا مال اُسے مل گیا ہوگا۔ اگر ممکن ہو تو میں اسمیں سے کروجر کی گھڑی لینا چاہتا تھا۔ لیکن جب میں بیمار تھا تو ایڈلر کی تقریباً سب چیزیں فروخت کر دی گئی تھیں پھر بھی کچھ چیزیں جنمیں چند خطوط اور کچھ بیکار کی چیزیں شامل تھیں وہیں بکھری پڑی تھیں۔ ان خطوط سے مجھے کروجر کے ایک لڑکے کا نام معلوم ہوا۔ یہی لڑکا اس دنیا میں اس کا بچا ہوا عزیز تھا۔ وہ اسوقت تیس سال کا ہے اور ایک چمار کا کام کرتا ہے اور ۱۰۴ X نمبر کے مکان میں کوننگس ٹریسی منیین میں رہتا ہے۔ اس کی بیوی مر چکی ہے اور کئی چھوٹے بچے ہیں اسکو بغیر کچھ بتائے ہوئے میں اسکا دو تہائی خرچ برداشت کر رہا ہوں۔

رہی اس گھڑی کی بات۔ دیکھئے کیا کیا تعجب کی باتیں اس دنیا میں ہوتی ہیں۔ جرمنی میں ادہر اُدہر ایک سال تک میں نے اس گھڑی کا پتہ لگایا اور بہت پیسہ بھی خرچ کیا اور پریشانی بھی اٹھائی۔ آخرکار مجھے اس کا پتہ لگ گیا اور مجھے وہ گھڑی مل گئی۔ میں بہت خوش بھی ہوا لیکن جب میں نے اُسے کھولا تو اُس میں کچھ نہ ملا۔ کیوں؟ مجھے معلوم تھا کہ اسکے اندر ایک کاغذ کا پرزہ رکھا ہوا تھا وہ وہاں رہ تو سکتا نہیں ہے۔ اس لئے اس دس ہزار ڈالر کی رقم پانے کا خیال مجھے چھوڑنا پڑا لیکن مجھے اس بات کا افسوس بہت ہوا کیونکہ میں وہ رقم کروجر کے لڑکے کو دینا چاہتا تھا۔ کل رات کو جب کہ میں نے خواہش کی کہ اب مجھے زندہ رہنا نہیں ہے تو اسکی تیاری کرنے لگا۔ میں نے سب غیر ضروری کاغذ جلا دیئے۔ اس میں کچھ کاغذات ایڈلر کے بھی تھے جن کو پہلے میں نے غور سے نہیں پڑھا تھا۔ تبھی وہ پرزہ بھی کہیں سے نکل پڑا۔ میں نے اُسے فوراً پہچان لیا۔ نقل یہ ہے۔ میں اس کا ترجمہ کئے دیتا ہوں " اینٹوں کا اصطبل۔ شہر کے بیچوں بیچ۔ آرلینز اور

مارکیٹ کا کونا۔ کورٹ ہاؤس والا کونا۔ تیسرا پتھر۔ چوتھی قطار۔ وہاں نوٹس لگا دو یہ بتلانے کے لئے کہ کتنے آدمی آئیں گے۔)

لو یہ پرچہ اپنے سنبھال کر رکھو۔ کروجر نے سمجھایا تھا کہ وہ پتھر اٹھایا جا سکتا ہے اور یہ پتھر بنیاد کی شمالی دیوار میں ہے۔

چوتھی قطار اوپر سے ہے اور تیسرا پتھر پچھمت۔ دولت اس پتھر کے نیچے رکھی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ آخری جملہ ایک دھوکا ہے تاکہ اگر یہ کاغذ غلط ہاتھوں میں پڑ جائے تو اس کا مطلب ٹھیک نہ سمجھ میں آ سکے۔ ایسا شاید اس نے اپنی بری وجہ سے کیا ہوگا۔

اب میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اپنے ارادے کے بموجب جب تم دریائے پیس کے بہاؤ پر سفر کرو تو تم اس چھپے خزانے کا پتہ ضرور لگانا اور اس کو آدھم کروجر کو مینہم بھیج دینا۔ اسکا پتہ میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔ اس دن سے رہ مال ادا ہو جائے گا اور میں اپنی قبر میں زیادہ اطمینان کی نیند سو سکوں گا۔ مجھے اس خیال سے راحت ملے گی کہ جس آدمی نے میری بیوی بچی کو بچانے کی کوشش کی اس کے لڑکے کے واسطے جو کچھ ہو سکا میں نے کر دیا۔ اگرچہ دھوکے سے میں کروجر پر وار کر گیا تھا اور اسے مار ڈالا تھا تاہم میرے دل میں یہ خواہش تھی کہ میں اسکی حفاظت کروں اور اس کی کچھ خدمت انجام دوں۔

بتیسواں باب

دفینے کا تصفیہ

اور یوں جو کچھ کارل لڑکے نے مجھے سنایا تھا وہ میں نے اپنے دونوں دوستوں کو بتا دیا۔ بعد ازاں کافی دیر تک فضا میں گہری اور موثر خاموشی طاری رہی۔ بالآخر میرے دونوں دوستوں نے مسرت اور حیرت کے جذبے سے متاثر ہو کر اس کہانی کے عجیب و غریب پہلوؤں پر اچانک سوالات کی بھرمار شروع کر دی یہاں تک کہ انکے دم پھول گئے۔ جب ان کا جوش کچھ ٹھنڈا پڑا تو وہ پھر گہرے خیالات میں غرق ہو گئے مگر کبھی کبھی انمیں آپس میں جھڑپ ہونے لگتی۔ پھر دس منٹ تک ماحول پر مکمل سکوت طاری رہا۔ تب روجرس آہستہ سے بڑبڑایا:۔

"دس ہزار ڈالر" اور کچھ توقف کے بعد اس نے پھر کہا۔

"دس ہزار ڈالر۔ یہ تو ایک کثیر رقم ہے"

اسی وقت شاعر نے مجھ سے پوچھا "کیا تم اس خزانے کو بلا تاخیر اُسے (کروجرکے لڑکے کو) بھیجنا چاہتے ہو۔؟"

میں نے کہا "ہاں مگر یہ تو بڑا بے تکا سوال ہے"

اس پر شاعر نے تو کچھ نہ کہا۔ مگر تھوڑی ہی دیر بعد روجرس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا "کیا سارے کا سارا خزانہ؟ یعنی ...... میرا مطلب تھا کہ......"

میں نے جواب دیا "یقیناً۔ سارا خزانہ"

میں اور بھی کچھ کہنے والا تھا لیکن رک گیا کیونکہ میرے خیالات میں تلاطم برپا تھا۔ بعد ازاں تھامپسن نے کچھ کہا مگر ذہنی غیر حاضری کی وجہ سے میں اسکی بات نہ سن سکا،

اسلئے میں نہیں سمجھ پایا کہ اس نے کیا کہا۔ البتہ روجرس نے جو جواب دیا وہ میں نے سن لیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

"ہاں۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ اتنی رقم بہت کافی ہوگی کیونکہ میرے خیال سے وہ تو اس رقم کا بھی مستحق نہیں ہے۔"

شاعر نے فوراً کہا "اگر تم اس پر غور کرو تو تمھیں یہ رقم ضرورت سے زیادہ معلوم ہوگی ذرا خیال تو کرو۔ پانچ ہزار ڈالر۔ یہ رقم تو وہ تمام عمر میں بھی خرچ نہیں کر پائے گا۔ اسکے برعکس یہ دولت اُسے نقصان بھی پہونچا سکتی ہے بلکہ برباد بھی کر سکتی ہے۔ تمہیں یہ بھی سوچنا چاہیے۔ کچھ ہی مدت میں وہ اسے ضائع کر دے گا۔ ممکن ہے اپنی دکان بھی بند کر دے اور بہت اغلب ہے کہ وہ شراب نوشی میں مبتلا ہو جائے اور پھر اپنے اُن بچوں کے ساتھ جنکی ماں مر چکی ہے بُرا سلوک کرنے لگے اور بہت ممکن ہے کہ وہ طرح طرح کی برائیوں میں پھنس کر بدسے بدترین انسان بن جائے اور۔۔۔۔"

درمیان ہی میں روجرس جوش میں آکر بول اٹھا "ہاں یہ بالکل صحیح ہے۔ میں نے ایسا بارہا ہونے دیکھا ہے، سینکڑوں اور ہزاروں بار۔ اگر تمھیں کسی اس طرح کے آدمی کو برباد کرنا ہو تو اس کو دولت دیدو۔ بس آپکو اتنا ہی کرنا ہوگا کہ آپ اسکے ہاتھ پر رقم رکھ دیں جو اسکو پستی کی طرف لے جائے گی اور اسکی تمام خوبیوں تمام نیکیوں نیز اس کی تمام خودداری کو ختم کر دیگی۔ اگر ایسا نہ ہو تو آپ یہ سمجھ لیں کہ میں انسانی فطرت کو سمجھا ہو نہیں۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے مسٹر تھامپسن؟ اگر ہم اُسے کُل خزانے کا تہائی ہی دیدیں تو اسے وہ چھ مہینے سے زیادہ نہیں چلائے گا۔

اس پر مجھے طیش آیا اور درمیان ہی میں انکی بات کاٹ کر میں بول اٹھا "ارے صاحب۔ چھ مہینے کیا یہ کہیے کہ چھ ہفتے بھی نہیں چلائے گا تاوقتیکہ تین ہزار ڈالر کی یہ رقم کسی ایسی جگہ پر محفوظ نہ رکھ دی جائے جہاں وہ اسے ہاتھ نہ لگا سکے۔"

میری بات کی تائید کرتے ہوئے تھامپسن نے کہا "بیشک وہ سب خرچ کر ڈالے گا۔ میں نے ایسے آدمیوں کی زندگی کے متعلق کئی کتابیں تالیف کی ہیں۔ جیسے ہی دولت انکے ہاتھ میں آجاتی ہے، چاہے وہ دو ہزار ہوں یا تین ہزار انھیں اُسے اڑاتے دیر نہیں لگتی۔"

اس پر پیڈرو جوبیس نے بڑی سنجیدگی سے کہا "میں یہ جانتا ہوں کہ اس موچی کو ۲ ہزار ڈالر سے کیا مناسبت؟ اسوقت تو وہ منہیم میں اطمینان اور سکون کی زندگی بسر کر رہا ہے اپنے ساتھیوں کے ساتھ آرام سے رہتا ہے اور چونکہ محنت و مشقت سے روٹی کماتا ہے اسلئے اُسے بھوک بھی خوب لگتی ہوگی اور وہ بڑی رغبت سے کھانا کھاتا ہوگا۔ اسوقت وہ بڑی ایمانداری اور صدق دلی کے ساتھ اپنی ادنیٰ زندگی گذار رہا ہے اور دراصل وہ مبارک ہے۔ ہاں میں پھر کہتا ہوں کہ اُسے برکت حاصل ہے اور وہ اُن کروڑوں انسانوں سے اچھا ہے جو ریشمی لباس میں ملبوس ہو کر مصنوعی شان و شوکت بنائے رکھنے کی حماقت کرتے ہیں۔ ایسے آدمی کو اگر ایک بار بھی آپ دولت کا لالچ دیں اور پھر بھی پندرہ سو ڈالر کا تو بس سمجھ لیجئے کہ اس کا حشر کیا ہوگا"

بین نے چیخ کر کہا "پندرہ سو ڈالر ! ارے پانچ سو ڈالر کی رقم ہی اس کو اپنے اصولوں سے گرا دینے کے لئے کافی ہے۔ یہ اس کے مشاغل کو برباد کر دیگی اور اس کو شراب نوشی کی منحوس عادت [illegible] میں مبتلا کر دیگی اور پھر تو وہ شراب خانے سے نالیوں میں اور نالیوں سے خیرات گھر میں اور وہاں سے خدا جانے کہاں پہونچے"

کمرشاہ نے ہمیں بڑی سنجیدگی سے ٹوکا اور کہا "حضرات ہم ایسا جرم اپنے ذمے کیوں لیں۔ وہ جیسا ہے اور جہاں بھی ہے خوشحال ہے۔ احترام۔ سخاوت۔ بلند خیالی یا خیر سگالی غرضیکہ ہر نیک جذبہ ہمیں متنبہ کرتا ہے متحرک کرتا ہے نیز مجبور کرتا ہے کہ ہم اُسے اسی کے حال پر چھوڑ دیں۔ یہی سچی اور اصولی دوستی ہے۔ ٹھیک ہے کہ ہم دوسرے طریقے بھی اپنا سکتے تھے جو دکھاوٹی تو زیادہ ہوتے مگر وہ اتنے رحمدلانہ اور عقلمندانہ نہیں ہوتے جتنا کہ ہمارا یہ طریقہ لہٰذا ہمیں اپنا اسی فیصلے پر مستحکم رہنا چاہیئے"

اسکے بعد جو گفتگو ہوئی اس سے ظاہر تھا کہ ہم میں سے ہر آدمی نے یہ صاف صاف سمجھ لیا تھا کہ اس فیصلے سے ہمارے دلوں میں ایکدوسرے کے خلاف شکوک پیدا ہو گئے تھے۔ [illegible] بات بالکل واضح ہو گئی تھی کہ ہم اس بیچارے غریب موچی کو کچھ نہ کچھ بھیجنا چاہتے تھے اور اس مسئلہ پر کافی غور و خوض کے بعد یہ طے پایا کہ ہمیں اس کو کوئی سستا سا تحفہ بھیج دینا چاہیئے۔

اب جبکہ ہر شخص اس فیصلے سے مطمئن ہو چکا تھا ایک اور مصیبت پیدا ہو گئی۔ مجھے

ایسا معلوم ہوا کہ یہ دونوں آدمی اس رقم میں میرے برابر کے شریک ہونا چاہتے ہیں جبکہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر میں انھیں آپس میں تقسیم کرنے کو آدھی رقم بھی دیدوں تو وہ خود کو بہت خوش قسمت سمجھیں گے۔

روجرس نے کہا " اگر میں یہ ترکیب بتاتا تو کسی کو کچھ نہ ملتا۔ پہلے پہل میرے ہی ذہن میں یہ بات آئی ورنہ ساری رقم موچی کو چلی جاتی "

اس پر مسٹر تھامپسن نے کہا " جس لمحہ روجرس نے یہ ترکیب بتائی میں بھی یہی سوچ رہا تھا " اس پر میں نے برجستہ کہا کہ یہ خیال میرے ذہن میں بہت پہلے آگیا ہوتا۔ اور وہ بھی بنا کسی کی مدد کے۔ میرے سوچنے میں دیر ضرور ہو گئی مگر یہ بات یقینی ہے کہ سوچتا میں بھی یہی۔ بڑھتے بڑھتے یہ معاملہ جھگڑے کی صورت اختیار کر گیا یہاں تک کہ ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔

لیکن جیسے ہی میں نے خود کو سنبھالا میں فوراً بالائی عرشے پر چلا گیا اسوقت میرا مزاج بگڑا ہوا تھا۔ میں وہاں کپتان میک کورڈ سے ملا۔ اپنے جذبات کو قابو میں رکھتے ہوئے بڑے خوشگوار لہجے میں میں نے اُن سے کہا " میں آپ سے رخصت ہونے آیا ہوں، میں نیپولین کی بندرگاہ پر اُترنا چاہتا ہوں "

کپتان صاحب نے تعجب سے پوچھا " کہاں اترنا چاہتے ہو۔؟ "

میں نے بتا دیا۔

اس پر کپتان صاحب ہنسنے لگے مگر مجھے سنجیدہ دیکھکر ذرا رُکے اور پھر بولے

" کیا تم واقعی نیپولین جانا چاہتے ہو۔؟ "

میں نے کہا " یقیناً میں وہیں جانا چاہتا ہوں "

کپتان صاحب نے پائلٹ ہاؤس کی طرف نظر ڈالی اور پائلٹ سے کہا " یہ شخص نیپولین جانا چاہتا ہے "

پائلٹ نے حیرت سے پوچھا " کیا کہا۔ نیپولین۔؟ "

کپتان صاحب نے کہا " ہاں، وہ یہی کہہ رہا ہے "

پائلٹ بولا " ماشاء اللہ۔! "

اُسی وقت چچا میمفورڈ ڈیک کے قریب آپہونچے۔ کپتان صاحب نے انھیں بتایا
"چچا تمہارا ایک دوست نیپولین جانا چاہتا ہے"۔
انھوں نے حیرت سے پوچھا "اچھا۔ کیسے۔؟"
میں نے درمیان میں ہی ٹوک کر پوچھا "یہ کیا ماجرا ہے۔؟ کیا کوئی مسافر اپنی مرضی کے مطابق نیپولین کی بندرگاہ پر نہیں اتر سکتا۔؟"
کپتان صاحب بولے "کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ کیا آپ کو یہ نہیں معلوم کہ شہر نیپولین کا نام و وجود بھی نہیں ہے۔ اس کو تباہ ہوئے تو ایک عرصہ ہو گیا۔ دریائے ارکنسا نے اپنے سیلاب سے اُسے تاخت و تاراج کر دیا اور اُسے بہا کر دریا مسیسپی میں ڈال دیا"
میں نے حیرت سے پوچھا "کیا شہر کا ہر گوشہ سیلاب کی نذر ہو گیا۔ کیا بینک، گرجا گھر، جیل خانہ، اخبار کے دفاتر۔ عدالتیں، کلب، آگ بجھانے کا محکمہ، اصطبل، یہ سب چیزیں نیست و نابود ہو گئیں۔؟"
کپتان صاحب نے کہا "ہاں۔ صرف پندرہ منٹ یا کچھ ہی زیادہ وقفے میں اس شہر کی ہر شے سیلاب میں بہ گئی۔ شہر کا کوئی حصہ نہ بچا۔ صرف ایک اینٹوں کی چمنی اور ایک جھونپڑی کے کچھ بسماندہ حصّے کے سوا سیلاب نے کچھ نہیں چھوڑا۔ حتیٰ کہ روڑ، کنکر، پتھر، پیڑ، پودے سب اپنے ساتھ بہا لے گیا۔ اس وقت ہماری کشتی اسی جگہ پر چل رہی ہے جہاں کبھی نیپولین شہر کا مرکز تھا۔ دیکھیے سامنے وہ اینٹوں والی جو چمنی ہے اب یہی اس شہر کی واحد یادگار ہے۔ داہنی طرف کے یہ گھنے جنگل شہر سے ایک میل کے فاصلے پر ہوا کرتے تھے۔ اب دریا کے چڑھاؤ کی طرف نگاہ کیجیے۔ غالباً اب آپ اس علاقے کو پہچان لیں گے۔ کیوں؟ پہچانتے ہیں نا آپ؟"
میں نے کہا۔ ہاں۔ اب پہچان رہا ہوں۔ میں نے پہلے کبھی اتنی حیرت انگیز تبدیلی نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی سنی تھی۔ واقعی یہ سانحہ بہت ہی غیر متوقع اور حیرت انگیز ہے۔
اسی دوران میں روجرس اور تھامپسن بھی اپنے تھیلے اور چھتریوں سمیت وہاں آ گئے۔ انھوں نے کپتان صاحب کی بتائی ہوئی خبر خاموشی سے سُن لی تھی۔ تھامپسن نے آدھے ڈالر کا سکہ میرے ہاتھ پر رکھ کر بڑی آہستگی سے کہا "میری طرف سے اُس تحفہ

کے لئے" روجرس نے بھی ایسا ہی کیا۔

واقعی یہ بڑی حیرت کی بات تھی کہ بیس سال پہلے جس جگہ میں نے ایک بہت بڑا اور پُر رونق شہر دیکھا تھا جہاں ہر چیز میسر تھی آج وہاں دریائے مسیسپی اپنے غیر آباد ساحلوں کے مابین موجیں مار رہا تھا۔ یہ شہر ایک بڑے اہم علاقے کے ایک ضلع کا صدر مقام تھا۔ یہیں ریاستہائے متحدہ کا بڑا بحری ہسپتال تھا۔ یہ شہر لاتعداد لڑائیوں کے لئے اپنی تاریخی اہمیت رکھتا تھا۔ یہاں ہر روز کوئی نہ کوئی عدالتی جانچ ہوتی رہتی تھی۔ میں اسی جگہ وادیٔ مسیسپی کی سب سے باکمال اور حسین ترین لڑکی کا محرم راز رہ چکا تھا۔ یہیں پر ہمیں چوتھائی صدی قبل پینسلوانیا کی غمناک تباہی کی پہلی خبر ملی تھی۔ ہائے وہ شہر! جواب کہیں نظر نہیں آتا، جس کو دریا کی طغیانی کھا گئی اور جو مچھلیوں کی خوراک بن گیا اور جہاں اب ایک شکستہ چمنی اور ایک بوسیدہ جھونپڑی کے چند آثار کے سوا اب کچھ باقی نہیں بچا تھا۔

تینتیسواں باب

مشروبات اور اخلاقیات

جزیرہ نمبر ۷۴ کے متعلق جو قدیم شہر نپولین سے زیادہ دُور نہیں ہے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہاں دریائے مسیسپی کے لاابالی پن نے انسان کے بنائے ہوئے قوانین کا مضحکہ اڑایا ہے اور اسے حیرت زدہ کر دیا ہے جب ریاست ارکنسا کی حدود قائم ہوئیں تو یہاں کی حکومت کا دائرہ اختیار دریائے مسیسپی کے وسط تک تھا جو ظاہر ہے کہ ایک ناپائدار حد تھی ریاست مسیسپی کی سرحد بھی اس دریا تک پہونچتی تھی اور وہاں کی حکومت دریا کی

ایک شاخ پر اپنے اختیار کی دعویدار تھی۔ لہٰذا یہ حد بندی بھی نہایت ناپائیدار تھی۔ جزیرہ نمبر ۷۴
ریاست ارکنسا میں شامل تھا مگر کچھ عرصے بعد دریا کے کٹاؤ نے اس جزیرہ کو ریاست ارکنسا
سے الگ کر دیا۔ دوسری طرف یہ ریاست مسیسپی سے بھی الگ رہا۔ اسوقت جزیرہ کے ایک طرف
تو دریا ٹھاٹھیں مارتا ہوا بہتا تھا اور دوسری طرف اس کی ایک پتلی دھار بہا کرتی تھی۔ میرے
خیال سے مسئلہ کچھ اسی طرح کا تھا۔ بہرحال یہ بات صحیح ہو یا غلط۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ چار ہزار
ایکڑ زمین کا بیش قیمت جزیرہ دریا کی روانی سے کٹ کر الگ تھلگ سا ہو گیا ہے جو اب کسی ریاست
کی ملکیت نہیں ہے اور کسی بھی ریاست کے ماتحت نہ ہونے کی وجہ سے کسی کو لگان بھی ادا نہیں کرتا۔
اس تمام جزیرہ پر صرف ایک آدمی کا قبضہ ہے جو شہری حقوق کے لحاظ سے کسی ریاست کا باشندہ
نہیں ہے۔

جزیرہ نمبر ۹۲ ارکنسا کے قبضہ میں ہے جسکو دریا کے سیلاب نے ریاست مسیسپی میں
دھکیل دیا ہے۔ یہاں ایک آدمی نے وہسکی کا کاروبار کر رکھا ہے۔ جسکے لئے اُسے حکومت
مسی سپی سے لائیسنس لینے کی ضرورت نہیں پڑتی اور چونکہ یہ حکومت ارکنسا کے زیر نگرانی ہے
اسلئے وہاں سے بھی اُسے لائیسنس نہیں لینا پڑتا (اُن دنوں ارکنسا میں کسی لائیسنس کی ضرورت
نہیں پڑتی تھی) اور اس طرح وہ شخص ریاست مسیسپی کے محصول کو بچا کر بہت دولتمند بن گیا۔

ہم حسب معمول اُس سنسان علاقے میں دریا کے بہاؤ کی طرف چلے جا رہے تھے۔ وہاں
دخانی جہاز یا کوئی دوسری متحرک چیز شاذ و نادر ہی نظر آتی تھی۔ مناظر پہلے جیسے ہی تھے۔ وہی ویران
اور سنسان جنگل دُور تک دریا کے دونوں طرف پھیلے ہوئے تھے لیکن کہیں کہیں دریا کے تاریک
ساحل پر جہاں گھاس نہیں ہوتی ایک دو جھونپڑیاں نظر آجاتی ہیں جو کسی زمانے میں دریا سے
دو چار فرلانگ کی دوری پر ہوا کرتی تھیں اور جنکو ساحل کے کٹنے کی وجہ سے دھیرے دھیرے پیچھے
کی طرف دُور تک ہٹایا جا چکا تھا۔ مثال کے طور پر پلچر کے نشان پر ایسی جھونپڑیوں کو تین ماہ کے اندر
تین سو گز تک پیچھے ہٹایا جا چکا تھا (اس اطلاع کے مطابق جو ہم کو ملی تھی)۔ لیکن دریا کے
کٹاؤ نے جلد ہی آگے بڑھ کر ان کو چھو لیا اور اب ایک بار پھر انھیں پیچھے کی جانب ہٹایا جا رہا تھا۔
زمانہ قدیم میں نپیولین کے لوگ شہر گرین ولے کو وادئ مسی سپی کی ایک ادنیٰ جگہ سمجھا کرتے

تھے۔ مگر دیکھئے کیا تبدیلی ہوئی کہ شہر نیپولین کا تو نام و نشان تک مٹ گیا اور گرین وِلے میں رونق بڑھ گئی اور اب وہ بڑی سرعت کیساتھ اس وادی میں ترقی کر رہا ہے۔ یہاں کی آبادی بھی بڑھکر اب تقریباً تین ہزار ہو گئی ہے اور مجموعی طور پر یہاں ۲۵ ہزار ڈالر سالانہ کا روبار ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ ایک ترقی پذیر قصبہ بن گیا ہے۔

کشتی پر کالہون لینڈ کمپنی کے بارے میں بڑے زوروں سے گفتگو ہو رہی تھی کیونکہ اس کے عظیم کارناموں سے مفید نتائج نکلنے کی امید تھی۔ کرنل کالہون جو ایک مدبر سیاست داں کا پوتا تھا بوسٹن گیا اور وہاں اس نے ایک سنڈیکیٹ بنائی جس نے دریا کے کنارے ارکنسا میں واقع ضلع چیکوٹ میں روئی کی کاشت کے لئے تقریباً دس ہزار ایکڑ زمین کا علاقہ خریدا۔ اس کمپنی کا مقصد روپیہ کے لین دین سے منافع کمانا تھا۔ یہ کمپنی براہ راست مال خریدتی تھی اور اپنی نگرانی میں تیار شدہ مال کے بیچنے کا انتظام بھی کرتی تھی۔ یہ اپنے حبشی ملازمین کو ضروریاتِ زندگی بہت کم منافع یعنی آٹھ یا دس فیصدی نفع پر فراہم کرتی تھی نیز یہ ان کو آرام دہ مکانات وغیرہ بھی مہیا کرتی تھی تاکہ حبشی مزدوروں میں کچھ پیسہ بچانے اور مستقل مزاجی سے ایک ہی جگہ جم کر کام کرنے کی خواہش پیدا کر سکے۔ کمپنی کا مقصد یہ بھی تھا کہ اگر اس طرح اسے کچھ مالی فائدہ ہوا (جیسا کہ اُسے ہونے کی امید تھی) تو وہ گرین ولے میں ایک بینک بھی قائم کر دے جس سے لوگوں کو کم سے کم شرح سود پر یعنی صرف ۶ فیصدی پر جو لوگوں کے لئے ناقابل برداشت نہ ہو روپیہ قرض مل سکے۔

جیسا کہ مجھے کاشتکاروں اور جہازرانوں سے معلوم ہوا اس سے پیشتر یہ مصیبت رہتی تھی کہ زمینداروں کے پاس اپنی زمین ہونے ہوئے بھی انھیں سرمایہ کی کمی کے باعث اپنی زمین اور فصل دونوں کو کاروبار قائم رکھنے کی غرض سے رہن رکھنا پڑتا تھا۔ لہٰذا وہ دلال جو سرمایہ لگانے کا خطرہ مول لیتا زیادہ سود پر روپیہ قرض دیکر منافع خوری کیا کرتا۔ وہ دس فی صدی تک سود اور ڈھائی فیصدی دلالی لیا کرتا تھا اس کے علاوہ کاشتکار کو اپنی مطلوبہ اشیاء بھی اُسی دلال کی معرفت لینا پڑتی تھیں اور اس کا کمیشن اور منافع اُسے دینا پڑتا تھا۔ نیز جب وہ اپنی فصل کاٹ کر کسی دخانی کشتی میں لدواتا تو اس وقت بھی یہ دلال اس سے اپنا کمیشن

اور بیمہ وغیرہ کا خرچہ وصول کیا کرتا - اسطرح کل ملاکر ایک فصل میں دلال کا حصہ تقریباً پچیس فیصدی[1] تک پہونچ جاتا۔

اس علاقے میں روئی کی کاشت کرنے والے کا ایک فصل پر لگ بھگ منافع کا اوسط تخمینہ "حسب ذیل ہے" ایک آدمی اور ایک خچر سے دس ایکڑ روئی کی کاشت ہو سکتی ہے جس سے دس گانٹھ روئی ملتی ہے جو تقریباً پانچ سو ڈالر کی ہوتی ہے اور جس پر تین سو پچاس ڈالر صرف نکال کر ایکسو پچاس ڈالر یعنی پندرہ ڈالر فی ایکڑ منافع ہوتا ہے۔ اور اب تو بنولہ سے بھی لوگ فائدہ اٹھانے لگے ہیں اس سے پیشتر جب ذرائع نقل و حمل کی بہت کمی تھی تو اُسے کسی مصرف کا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اسوقت بھی سولہ سو پونڈ خام روئی میں سے چار سو پونڈ ہی صاف کی ہوئی روئی نکلتی ہے جسکی قیمت دس سینٹ فی پونڈ ہوتی ہے اور بقیہ بارہ سو پونڈ بنولے صرف بارہ یا تیرہ ڈالر فی ٹن کے حساب سے بکتے ہیں مگر ہو سکتا ہے کہ مستقبل قریب میں کپاس کی ڈنڈیاں بھی بیکار نہ جایا کریں۔ مسٹر ایٹکنس کا بیان ہے کہ روئی کی فی گانٹھ پر پندرہ سو پونڈ کپاس کی لکڑیاں بیکار ہو جاتی ہیں۔ ان لکڑیوں میں چونے اور پوٹاشیم کے نمک وافر مقدار میں شامل رہتے ہیں۔ اگر ان لکڑیوں کو پیس کر چارے یا بنولے کے دلیے میں (جانوروں کے لئے بہت مرغوب و مفید غذا ہے) ملا دیا جائے تو اس طرح جو مرکب تیار ہوگا اس میں وہ سب اجزاء فراہم ہو جائیں گے جو جانوروں کے گوشت ہڈی اور دودھ بڑھانے میں مددگار ہی نہیں بلکہ اشد ضروری ہیں۔ اس سے پیشتر ان ڈنڈیوں کو بالکل بے مصرف سمجھا جاتا تھا۔

یہ شکایت کی جاتی ہے کہ جنگ کے زمانے سے ہی کاشتکار اپنے حبشی ملازمین کے ساتھ بے رحمی کا سلوک کرتے آئے ہیں۔ وہ اُن سے خشک کاروباری تعلق کے علاوہ اور کوئی تعلق نہیں رکھتے، نہ اُن کے احساسات کی پاس داری کرتے ہیں اور نہ انکی ضروریات زندگی انھیں بہم

نوٹ ۱۔ جہاں عوام ۱۸ سے ۲۰ فیصدی شرح سود پر قرض لینے کو تیار ہوں اور سرمایہ نہ ہونیکے باعث فصل تیار ہونے سے پہلے ہی قرض لیکر بیچنے پر آمادہ ہو جائیں تاکہ انھیں ضروریات زندگی سو فیصدی منافع دیکر ہی مل سکیں وہاں گورنمنٹ انکی کیا مدد کر سکتی ہے۔ ایڈورڈ اٹکنسن

پہونچانے کے لئے اپنے پاس کوئی ایسا ذخیرہ رکھتے ہیں جس میں سے وقتِ ضرورت انھیں سامان مناسب قیمت پر فراہم کر سکیں اور اس طرح ان غریبوں کو قرض کے بار سے بچا سکیں تاکہ یہ لوگ خوشی خوشی اُن کے کھیتوں پر کام کرتے رہیں اور مستقل طور پر ایک جگہ کام کرنے میں ہی اپنی بھلائی سمجھیں۔

ذخیرہ اندوزی کا یہ کام خود غرض کنجوس یہودی مہاجن کرتے تھے جو بے پروا حبشی مزدوروں اور ان کی عورتوں کو ہر چیز اُدھار خریدنے کی ترغیب دیتے رہتے تھے خواہ خریدار کو اسکی ضرورت ہو یا نہ ہو اور منافع وہ اتنا زیادہ لیتے تھے کہ غریب مزدور پر قرض کا بار برابر بڑھتا ہی رہتا تھا لہٰذا فصل کا حصہ جو اُسے آخر میں ملنے والا ہوتا تھا اس میں برابر کمی ہوتی رہتی تھی حتیٰ کہ فصل تیار ہوتے ہوتے غریب حبشی کا کل حصہ یہودی کی جیب میں پہونچ جاتا اور بیچارے حبشی پر قرض پھر بھی سوار رہتا اسطرح حبشی مزدور اور کسان دونوں کو نقصان پہونچتا کیونکہ موقع ملنے پر حبشی تو کسی دخانی کشتی پر سوار ہو کر بھاگ جاتا اور کاشتکار کو اسکی جگہ دوسرا حبشی رکھنا پڑتا۔ چونکہ پہلے کی طرح وہ اس نئے حبشی کی ضروریاتِ زندگی کی بھی پروا نہیں کرتا اسلئے اگلی فصل میں بھی یہودی کو ہی فائدہ پہونچتا اور یہ دوسرا حبشی بھی موقع پاکر بھاگ جاتا۔

مگر اب یہ اُمید ہوتی جارہی ہے کہ کاٹن کمپنی ان مزدوروں کیساتھ ہمدردی کا برتاؤ کر کے اور انکے مفاد کی حفاظت کر کے یہ ثابت کر دیگی کہ کمپنی کے قوانین کاشتکار اور مزدور دونوں کے لئے مساوی طور پر نہایت مفید ہونگے لہٰذا قوی اُمید ہے کہ کمپنی کا طریقہ کار بہت جلد مقبول ہو جائے گا۔

اور جہاں ایسے حالات ہوں کہ ہر شخص اپنا ہی مفاد سوچتا ہو وہاں شراب خانے کا ملازم یعنی کلال بھی کیوں کسی سے پیچھے رہے۔ وہ ہوشیار اور تیز نظر ہے خود شراب سے پرہیز کرتا ہے مگر پیسہ کمانے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑتا۔ اگر زیادہ محصول لگے ہوتے تو غالباً وہ چوری چوری زیادہ پیسہ کما لیتا۔ اس کا کہنا ہے کہ مسیسپی اور لوزیانا کے گرد و نواح میں بسنے والے خود سبزی نہیں اُگائیں گے بلکہ دریا پر خریدنے آئیں گے۔ چنانچہ وہ لوگ گھاٹ پر آتے ہیں اور کلال سے سبزی خریدتے ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ ان کاشتکاروں کو روئی کی کاشت کے علاوہ اور کسی چیز کا

علم نہیں ہے۔

۔۔۔۔ اور سبزی اور پھل تو انھیں پیدا کرنا ہی نہیں آتا۔ آگے چل کر وہ کہتا ہے کہ سیاہ فام غلام محض ایک تربوز کے لئے دُور تک کی مسافت طے کرے گا (ہو سکتا ہے کہ وہ ہیلی فاکس تک جا پہونچے) جن تربوزوں کو کلال دریا کے بالائی حصّے سے پانچ پانچ سینٹ میں خرید لیتا ہے انھیں وہ جنوبی حصّے میں لیجا کر پچاس پچاس سینٹ میں بیچتا ہے۔ علاوہ ازیں کشتی کے سیاہ فاموں کے لئے وہ بڑے بڑے خوبصورت جام کیوں بناتا ہے؟ وہ یہ ہے کہ یہ حبشی لوگ بڑے بڑے بھرے ہوئے جام ہی پسند کرتے ہیں۔ انھیں پیالہ بھر کر ملنا چاہیئے انھیں اس سے کوئی واسطہ نہیں کہ آپ اس پیالے میں کیا ڈالتے ہیں۔ انھیں تو اپنا گلاس پورا بھرا ہوا ملنا چاہیئے یعنی مال کی مقدار پیسے کے حساب سے پوری ہونی چاہیئے۔ اگر آپ نصف ڈالر قیمت کی ایک پائنٹ برانڈی صرف پانچ سینٹ میں اُسے دیدیں تو کیا وہ اسے لیگا؟ بالکل نہیں۔ اس کے لئے یہ شراب مقدار میں بہت کم ہے لیکن اگر آپ برانڈی کے بجائے کوئی اور ریکارسی چیز ایک سرخ عرق میں گھول دیں (عرق سرخ رنگ کا ہی ہونا چاہیئے) تاکہ وہ خوبصورت لگے تو وہ پورا گلاس ختم کر کے ہی دم لیگا چاہے سرکس دیکھنے جانے کیلئے اسے دیر ہی کیوں نہ ہو جائے۔

ایک ہی کمپنی نے اس علاقے کے جہازوں کے تمام شراب خانوں کا ٹھیکہ لے لیا ہے اور وہ اپنے کارخانوں سے ہی ان میخانوں کے لئے خوشبودار تیز شراب مہیا کرتی ہے۔ اس نے ان شراب خانوں میں ماہوار تنخواہ پر ملازم رکھ چھوڑے ہیں۔ کیا یہاں بڑھیا شراب بھی دستیاب ہو جاتی ہے؟ ہاں ضرور ہو جاتی ہے لیکن صرف چند کشتیوں پر ہی جہاں مسافر بڑھیا شراب کے خواہشمند بھی ہوں اور اُسے خریدنے کی قدرت بھی رکھتے ہوں۔ مگر سب کشتیوں پر یہ نہیں ملتی۔ البتہ ہر کشتی پر جہاز رانوں اور انجن کے نگراں ملازمین کو تو ملتی ہی ہے۔ کیا ان شراب خانوں میں برانڈی بھی مل جاتی ہے۔؟ ہاں۔ مل جاتی ہے۔ میں نے خود کئی بار خریدی ہے اور کافی مقدار میں خریدی ہے۔ لیکن اگر آپ کو برانڈی چاہیئے تو اسکے لئے پہلے سے فرمائش کرنی ہوگی۔ اب پہلے جیسا رواج نہیں رہا۔ پہلے تو ہر شخص دخانی جہاز سے ہی سفر کرنا چاہتا تھا اور ہر شخص خوب پیتا اور پلاتا تھا لیکن اب زیادہ تر لوگ ریل سے سفر کرنا پسند کرتے ہیں اور باقی مسافر جو بحری سفر

کرتے ہیں پینے پلانے سے واسطہ نہیں رکھتے۔ علاوہ بریں پہلے شراب بیچنے والے کی اپنی دکان ہوتی تھی، وہ خوش گفتار۔ خوش مزاج، خوش مذاق اور خوش طبع ہوا کرتا تھا۔ کشتی پر اس کی حیثیت امرا جیسی ہوتی تھی۔ اسکے لئے ہر سفر میں دو ہزار ڈالر کما لینا معمولی بات تھی۔ جو باپ اپنے بیٹے کو ترکہ میں دخانی جہاز کے شراب خانے کا ٹھیکہ چھوڑتا تھا وہ گویا اسے ایک خزانہ چھوڑتا تھا مگر اب تو شراب خانے کے ٹھیکہ سے صرف طعام و قیام کا خرچ ہی نکلتا ہے زیادہ سے زیادہ ایک قمیص کی دھلائی اور وہ بھی سفر بھر میں صرف ایک مرتبہ حقیقت میں اب زمانہ بالکل بدل گیا ہے۔ کیا آپ اس سے واقف نہیں ہیں؟ ابنو سیسپی کے بالائی حصے میں اہم ترین راستوں پر بھی آپکو کسی جہاز پر شراب کی دکان نہیں ملے گی۔ اگرچہ یہ بات ایک مبالغہ معلوم ہوتی ہے لیکن ہے یہ ایک تحیر خیز حقیقت۔"

چونتیسواں باب

ناقابلِ یقین حکایتیں

جزیرہ اسٹیک پر ایک نظر ڈالی ہے۔ لوبنا ناشہر لیک پرووڈینس بھی میں نے دیکھا ہے۔ جنوب کی طرف جاتے ہوئے جنوبی ریاستوں کا یہ پہلا مشہور مقام ہے جہاں اس علاقے کی کچھ خصوصیات دکھائی دیتی ہیں۔ یہ شہر ہموار نشیبی میدان میں واقع ہے۔ یہاں چاروں طرف اسپین کی طرح بڑے بڑے پرانے کائی سے ڈھکے ہوئے درخت دکھائی دیتے ہیں۔ یہاں کا ماحول پُرسکون، اداس اور مقدس سا معلوم ہوتا ہے۔ یہ موثر تبصرہ چچا میمفورڈ کا ہے جو واقعی حقیقت سے بعید نہیں۔

کسی مسٹر ایچ نے اس علاقے کے متعلق چند تفصیلات مہیا کی ہیں۔ اگر یہ مسٹر ایچ ایک دخانی جہاز میں نائب کپتان نہ رہ چکے ہوتے تو میں ان کے بیانات پر یقین نہ کرتا مگر اب جو انھوں نے بتایا ہے اس کا یقین کرنا ہی پڑے گا۔ یہ صاحب ارکنسا کے باشندہ تھے اور انھوں نے ہمارے جہاز پر سفر کیا تھا۔ یہ ایک کشتی پر ملازمت کرنے وکسبرگ جا رہے تھے۔ انکی کشتی چھوٹا سن فلاور جہاز کہلاتی تھی۔ جہاز رانوں میں یہ حضرت زاہد خشک اور روحانیت کے علمبردار کے طور پر مشہور تھے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ مچھروں کی کثرت سے ارکنسا شہر کی ترقی میں نہ صرف رکاوٹ واقع ہوئی ہے بلکہ اسے ان مچھروں سے کافی نقصان بھی پہونچا ہے۔ سننے والے شاید اسے ہنس کر ٹال دیں یا اس بات کو کوئی اہمیت نہ دیں، لیکن اگر آپ اس بلا سے پیدا شدہ خراب اثرات کا معائنہ کریں تو آپ پر یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ اس پر غور و فکر نہ کیا جائے یا اس کو مذاق میں اڑا دیا جائے۔ یہ مچھر اپنے مہیب اور سرکش وجود سے لگاتار لوگوں کو خوفزدہ کرتے رہے ہیں حالانکہ یہ اپنی جگہ سچ ہے کہ یہ نحیف و نزار بے وجود سے ناتواں اور ڈرپوک ہوتے ہیں۔ غالباً آپکو ایسا محسوس ہو گا کہ مسٹر ایچ اپنے گھر کے مچھروں کے بارے میں بات کر رہے ہونگے نہیں۔ ایسا نہیں ہے البتہ یہ ضرور تھا کہ اگر وہ ارکنسا کے مچھروں سے تھوڑی سی نرمی برتتے تو اسکی تلافی کرنے کیلئے ایک پراوڈینس کے مچھروں کی اور زیادہ برائی کرتے جنھیں وہ لیک پراویڈینس کے عفریت کے نام سے موسوم کیا کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ مچھر اتنے خطرناک ہیں کہ ان میں سے صرف دو مچھر ... ایک کتے کو ڈرا کر دور بھگا سکتے تھے اور ایسے چار مچھر تو ایک آدمی تک کو مغلوب کر سکتے تھے اور اگر اسے بچانے کی تدبیر نہ کی جائے تو یہ اُسے جان سے مار ڈالیں گے بلکہ ذبح کر دیں گے۔ باتوں ہی باتوں میں بڑے مؤثر ڈھنگ سے انھوں نے بتایا کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ لیک پراویڈینس میں ان مچھروں کے خطرے کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی شخص اپنی زندگی کا معمولی بیمہ نہیں کراتا تھا بلکہ اس میں مچھروں کے خطرے کو بھی شامل کروا لیا کرتا تھا۔ مسٹر ایچ نے ان سرکش مچھروں کے بارے میں کئی عجیب و غریب باتیں بھی سنائیں مثلاً یہ کہ انھوں نے اُن مچھروں کو ووٹ ڈالنے کی جرأت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر یہ دیکھ کر کہ یہ ناقابل یقین بات ہماری سماعت پر بار ہو رہی تھی۔ انھوں نے اپنی بات میں ذرا سی ترمیم کرتے ہوئے کہا "شاید مجھے اس معاملے میں کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے لیکن یہ بات یقینی ہے

کہ میں نے مچھروں کو پولنگ اسٹیشن پر ضرور دیکھا تھا وہاں وہ لوگوں سے ووٹ طلب کر رہے تھے۔"
وہیں ایک دوسرا مسافر بھی تھا جو مسٹر ایچ کا دوست تھا۔ اس نے بھی ان مچھروں کے وبالِ
جان ہونے کی تائید کی اور پھر اس نے کچھ سنسنی خیز واقعات جو اسے مچھروں کے ساتھ پیش آئے
تھے غیر معمولی وضاحت کے ساتھ بیان کرنا شروع کر دیے۔ یہ داستانیں کافی لمبی تھیں اور
مسٹر ایچ اپنے دوست کو بار بار بیچ ہی میں روک روک کر بڑی سرد مہری اور بے رحمی سے کہتے تھے
"دوست، تم بہت مبالغہ کر رہے ہو۔ اپنے بیان کو پچاس فیصدی کم کر دو۔ تم اسے غیر معمولی اہمیت
دیکر طول دے رہے ہو۔ بیان مختصر اور درست ہونا چاہیئے نہ کہ فضول کی بکواس۔
یا پھر وہ اس طرح کہتے "ذرا معاف کرنا بھائی۔ اگر تمھیں اپنے بیان کو فرضی باتوں ہی
سے طول دینا ہے تو تمھیں دو اور نئی کشتیوں کی ضرورت پڑے گی۔ جو باقی کشتیوں کو کھینچ کر لا سکیں
یعنی تمھیں اپنی داستان میں کچھ مزید جھوٹ ملانا ہوگا تاکہ پچھلے جھوٹ کی تائید ہو سکے۔ تمھیں
چاہیئے کہ صرف ضروری باتوں کا ذکر کرو یعنی صرف حقیقت کا۔ آجکل کتابوں میں لوگ جس بات
کو تلاش کرتے ہیں وہ اور کیا ہے اگر وہ دبی ہوئی یا چھپی ہوئی سچائی نہیں ہے۔ کیوں دوستو کیا یہ
بات ٹھیک نہیں ہے۔" پھر مسٹر ایچ نے علیحدہ علیحدہ سب دوستوں کو یہ سمجھایا کہ اس قصہ گو
سے ہوشیار رہا جائے تاکہ وہ حد سے تجاوز نہ کرنے پائے اور یہ کہ اس احتیاط کو نظر انداز نہ
کیا جائے کیوں کہ وہ خود اپنے اس دوست کے ہاتھوں ایک تلخ تجربہ اٹھا چکے ہیں اور اسی
لئے وہ اب اپنے دوسرے دوستوں کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ دھوکہ نہ کھائیں۔ مسٹر ایچ
نے بتایا کہ ایک مرتبہ اُن کے اُسی دوست نے اُن سے ایک ایسا سفید جھوٹ بولا کہ جس سے
اس کا بایاں کان سوج کر کپا ہو گیا اور وہ اتنا بڑھ گیا کہ اس کے ادھر اُدھر اُسے کچھ دکھائی ہی نہ
دیتا تھا یہ کئی مہینے تک سو چار ہا اور لوگ دور دور سے اسکے اس پھیلے ہوئے کان کو دیکھنے
آتے تھے اور اُسے اپنے کان سے پنکھے کا کام لیتے ہوئے دیکھتے تھے۔

پینتیسواں باب

مصیبت کے دنوں میں وکسبرگ کی حالت

دریا کے بہاؤ پر سفر کرتے ہوئے ہم ایک اونچی پہاڑی پر بسے ہوئے وکسبرگ شہر سے ہو کر گذرا کرتے تھے۔ لیکن اب ہم اس کے قریب سے نہیں گذر سکتے کیونکہ دریا کے ایک کٹاؤ نے اسے اوسیولا، سینٹ جینیویو اور دوسرے شہروں کی مانند ایک دیہاتی قصبہ بنا دیا ہے۔ اب وکسبرگ کے سامنے دور تک کا ٹھہرا پانی اور ایک بڑا جزیرہ بن گیا ہے۔ وکسبرگ جانے کے لئے اب آپ کو دریا کے بہاؤ پر چلتے ہوئے اس جزیرے کے پیچھے سے گھوم کر واپس دریا کے چڑھاؤ پر جانا ہو گا اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب پانی چڑھاؤ پر ہو کیونکہ اتھلے پانی میں کشتی نہیں چل سکتی اور ایسی حالت میں آپکو شہر سے کچھ دور ساحل پر اترنا پڑے گا۔

وکسبرگ میں اب بھی ایسے آثار موجود ہیں جن سے وہاں کی جنگِ عظیم کی یاد تازہ ہو جاتی ہے مثلاً مٹی کے پشتے، توپ کے گولوں سے ٹوٹے ہوئے درخت، چٹانوں میں غاروں کی پناہ گاہیں جن میں ۱۸۶۳ء میں مئی سے ۴ جولائی تک چھ ہفتوں کی بمباری کے دوران میں شہریوں نے پناہ لی تھی وغیرہ وغیرہ۔ یہ جگہیں غیر مسلح افراد کے جن میں خاص طور سے عورتیں اور بچے شامل تھے بہت کام آتی تھیں۔ یہ افراد مستقل طور سے ان پناہوں میں نہیں رہتے تھے بلکہ خطرے کے دوران میں ان میں پناہ لینے کے لئے بھاگ آتے تھے۔ یہ پناہ گاہیں باہر سے محض سوراخ یا سرنگیں نظر آتی تھیں جو ایک پہاڑی میں بنی ہوئی تھیں۔ یہ سرنگیں جب مٹی کے سیدھے کھڑے ہوئے پشتوں کے بیچ میں سے ہو کر گذرتیں تو انگریزی کے حرف وی V کی مانند دو شاخہ جیسی لگتی تھیں۔

ان چھ ہفتوں کے دوران میں وکسبرگ میں زندگی کیسی رہی ہوگی۔ ذرا ٹھہریئے۔ یہاں

کچھ آثار موجود ہیں جن سے صحیح حالات کا علم ہو سکتا ہے۔

اس شہر کی آبادی تقریباً ستائیس ہزار مسلح افراد اور تین ہزار غیر مسلح افراد پر مشتمل تھی۔ یہ شہر دنیا سے بالکل الگ ہو کر رہ گیا تھا اور آگے پیچھے دونوں اطراف سے محصور تھا سامنے جنگی جہازوں سے اور پیچھے توپ خانہ اور مسلح سپاہیوں سے۔ اسلئے باہر سے خرید و فروخت اور آمدورفت بالکل منقطع تھی۔ نہ کسی مہمان کو رخصت کرنے کے لئے باہر جاتے اور نہ آنے والے مہمان کا استقبال کرنے کے لئے باہر جانے کی ضرورت تھی۔ دنیا سے الگ تھلگ ہو جانے کی وجہ سے یہاں صبح ناشتہ کے وقت لمبے چوڑے اخبار بھی پڑھنے کو نہیں ملتے تھے اور ان چیزوں کی عدم موجودگی سے طبیعت بہت پراگندہ اور بے چین رہتی تھی شہر ساحل سے ہٹ جانے کی وجہ سے اب دریا کے بہاؤ یا چڑھاؤ کی طرف سے آنیوالے دخانی جہازوں کو جو دور سے دھواں نکالتے ہوئے نظر آتے تھے دیکھنے کے لئے کون دوڑ کر جاتا اور ماکھیں شہر کی طرف دریا کے چڑھاؤ پر دھیرے دھیرے آتے ہوئے دیکھتا۔ اسلئے گھاٹ ویران اور سنسان پڑے رہتے۔ ریلوے اسٹیشن پر بھی کوئی ہجوم یا شور وغل نہ ہوتا اور نہ یہاں شور مچانیوالے قلی نظر آتے جو حیران و پریشان مسافروں کو تنگ کرتے یا ان سے حجت کرتے۔ ہر طرف سناٹا چھایا رہتا۔ اشیاء کے نرخ بڑھ گئے تھے۔ آٹا دو سو ڈالر فی بیرل[1] چینی تیس ڈالر فی بیرل۔ غلہ دس ڈالر فی بشل۔ گوشت پانچ ڈالر فی پونڈ اور رم شراب سو ڈالر فی گیلن کے حساب سے تھی اور اسی تناسب سے دوسری اشیاء بھی مہنگی ہو گئی تھیں لہذا اب نہ وہ شراب کے ٹھیلوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی تھی اور نہ گھوڑے گاڑیوں کی وہ دوڑ دھوپ۔ اب ان چیزوں کا کیا کام۔ پھیری والے دکاندار بھی نظر نہیں آتے تھے انھیں اب ان قلاش شہریوں سے کیا فائدہ ہوتا؟ علی الصبح تین بجے بالکل سناٹا ہوا کرتا۔ اتنا گہرا سناٹا کہ خاصی دوری سے بھی چوکیدار کے بھاری قدموں کی آواز صاف سنائی دیجاتی۔ اس ایک آواز کے علاوہ فضا میں مکمل سناٹا رہتا۔ پھر اچانک توپوں کی دھمک سے زمین ہل جاتی اور بموں کے شعلوں سے سرخ آڑی ترچھی لکیروں کا جال آسمان پر چھا جاتا پھر شہر پر گولیوں کی بوچھار ہونے لگتی اور سڑکوں پر جو اب تک سنسان خالی پڑی ہوتی تھیں سہمی ہوئی عورتیں اور بچے اپنی حفاظت کے لئے بھاگتے ہوئے نظر آتے کہ وہ اپنے گھروں اور بستروں

---

[1] بیرل۔ امریکہ کا ۲۹ جبر کا ایک وزن ٢ بشل۔ ۸ گیلن کا ایک ناپ۔

سے نکل نکل کر غاروں میں پناہ لینے کے لئے بھاگتے دکھائی دیتے تھے۔ فوجوں کے خشمناک اور طنز آمیز
مذاق سے کہ "چوہو! اپنے بلوں میں گھس جاؤ" وہ اور تیزی سے دوڑنے لگتے تھے۔

توپوں کی گرج فضا میں گونجتی۔ بم پھٹتے اور سروں کے اوپر سے سنسناتے ہوئے نکل جاتے۔
گولیوں کی بارش ہوتی اور گھنٹے، دو گھنٹے بلکہ چھ چھ گھنٹوں تک ہوتی رہتی۔ پھر جنگ بند ہوجاتی
اور خاموشی چھا جاتی۔ لیکن سڑکیں اب بھی خالی پڑی رہتیں اور خاموشی برابر طاری رہتی تھوڑی دیر
بعد ادھر ادھر غاروں سے لوگ سر نکالنا شروع کر دیتے اور بڑی احتیاط سے موقع کی نزاکت کا اندازہ لگاتے۔
ماحول میں اب بھی سناٹا چھایا رہتا۔ سر کے بعد دھڑ باہر آتے تھکن سے چور اور بیدم سی مخلوق ایک
جگہ اکٹھی ہو جاتی۔ لوگ اپنے اکڑے ہوئے ہاتھ پیروں کو پھیلاتے اور تازہ اور خوشگوار ہوا میں
گہرے گہرے سانس لیتے۔ اپنے غار کے پڑوسی سے خوش گپیاں کرتے اور ممکن ہوتا تو اپنے گھروں کو
فوراً واپس۔۔۔ بھاگ جاتے یا اگر بمباری بند دیکھتے تو شہر میں ادھر ادھر گھوم پھر کر حالات کا پتہ لگاتے
اور اگر جنگ کا ہنگامہ پھر برپا ہو جاتا تو فوراً غاروں کی طرف بھاگ جاتے۔

یہ پناہ گزین تعداد میں صرف تین ہزار تھے۔ یہ تعداد محض ایک گاؤں کی آبادی کے برابر تھی۔
تو کیا وہ ایک دوسرے سے ملنے کے لئے نہیں آتے ہونگے؟ دو ایک ہفتہ میں تو ایک دوسرے سے
خاصی جان پہچان ہو جاتی ہے تو کیا وہ ایک دوسرے کے اچھے برے مشاہدات میں دلچسپی نہ رکھتے
ہوں گے۔؟

یہ سب حالات ہمیں تاریخ سے ملتے ہیں۔ ان حالات سے کوئی بھی شخص دکسبرگ کی اس
وقت کی طرز زندگی کا آسانی سے تصور کر سکتا ہے اگر آپ نے اس طرح کی طرز زندگی کا کبھی احساس نہ
کیا ہو تو کیا آپ اس شخص کو جو آپ ہی کی طرح اس قسم کے احساس سے ماورا ہو یہ احساس کرا سکتے ہیں
اور شاید [illegible] جیسے دکسبرگ کا ایک باشندہ جسکو اس طرح کی زندگی گذارنے کا تجربہ ہو چکا
ہو کرا سکتا ہے۔ بظاہر یہ غیر ممکن معلوم ہوتا ہے۔ تاہم ایسی کئی وجوہات ہیں جنکی بنا پر یہ ناممکن
نہیں۔ جب کوئی آدمی پہلے پہل بحری سفر کرتا ہے تو اس کے اس مشاہدے میں ان گنت انوکھی چیزیں
آتی ہیں اور [illegible] انوکھی چیزیں [illegible] مشاہدات کے [illegible] میں اتنی نمایاں ہوتی ہیں کہ وہ اس
کی قوت تخیل اور قوت یادداشت پر [illegible] طور پر طاری ہو جاتی ہیں۔ اسلئے وہ شخص اسکے ملنے

جس نے کبھی بحری سفر کیا ہو ابھی زبان یا قلم سے اپنے اس بحری سفر کا ایسا خاکہ کھینچتا ہے کہ جس سے دوسرے کو یہ محسوس ہونے لگے گویا اس عجیب و غریب سفر میں وہ قصہ گو کے ساتھ رہا ہو۔ لیکن اگر وہ اپنے تجربے کو اسیوقت نہیں بناتا اور کچھ دن انتظار کرتا رہتا ہے اور اسی اثنا میں یکے بعد دیگرے ایسے دس سفر اور کرلیتا ہے تب کیا وہی بات رہے گی ؟ پھر اسکے قصے میں وہ جوش وہ رنگینی اور حیرت و استعجاب کچھ بھی باقی نہیں رہے گا اور اسکے لئے وہ تجربہ ایک معمول سا ہو کر رہ جائے گا اور اسکے پاس کہنے کے لئے کوئی ایسی بات نہ ہو گی جس سے وہ کسی بحری سفر سے ناواقف شخص کے دل میں جوش اور تحریک پیدا کر کے اسکے دوران خون کو تیز کر سکے۔

چند سال گذرے میں نے وکسبرگ کے ایک میاں بیوی سے جو وکسبرگ کے غیر مسلح شہری تھے بات چیت کی تھی۔ میں نے اُن سے اُن کی کہانی انہی کے انداز سے سُنی۔ انھوں نے جو کچھ بتایا وہ بیحد خشک اور بے مزہ تھا۔ اُس میں کوئی جوش و خروش تھا اور نہ کوئی دلچسپی۔ اگر انھوں نے صرف ایک ہفتہ اس قسم کی حیرت انگیز زندگی بسر کی ہوتی تو شاید وہ اپنے تجربات و احساسات کو بڑے جوش و خروش سے سُناتے۔ مگر انھوں نے تو ایسے چھ ہفتے گذارے تھے، جسکی وجہ سے اس واقعہ کی اہمیت قریب قریب ختم ہو گئی تھی۔ وہ گھروں سے باہر اور سرنگوں میں اس بمباری کے عادی ہو گئے تھے۔ لہٰذا بمباری انکے لئے ایک معمولی بات ہو کر رہ گئی تھی اسکے بعد انکی گفتگو میں کسی استعجاب یا دلکشی ہونیکا امکان نہیں تھا۔ جو کچھ اُس شخص نے بیان کیا وہ مندرجہ ذیل ہے۔

"ہمارا سارا وقت کا ہلی میں گذرا کرتا گویا ہمارے لئے ہر روز اتوار ہوا اور ہفتہ میں ساتوں دن اتوار ہوں کام کاج نہ ہونیکی وجہ سے ہمارا وقت بڑی مشکل سے گذرتا تھا۔ ساتوں اتوار یعنی سات سات چھٹیاں جنہیں کبھی کبھی دن یا رات میں چند گھنٹوں کے لئے آگ، گرج اور گولیوں کا بھیانک طوفان ہی مخل ہوتا۔ پہلے پہل تو ہم پناہ گاہوں میں تیزی سے دوڑ کر جاتے تھے مگر بعد کو یہ اضطراب کم ہو گیا۔ پہلی بار میں اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لیجانا بھول گیا، اور میری بیوی میرا کو انھیں اپنے ساتھ لانا پڑا۔ مگر جیسے ہی وہ غار میں بحفاظت داخل ہوئی، وہ بیہوش ہو گئی۔ دو یا تین ہفتے کے بعد ایک دن بمباری کے دوران میں جب وہ پناہ گاہ کی طرف بھاگ رہی تھی تو ایک بڑا بم اسکے قریب پھٹا اور اسکا جسم پوری طرح بم سے اڑنے والی مٹی سے ڈھک گیا۔ ایک گولی سے

اسکے سر کے پیچھے کے مصنوعی بالوں کی ٹوپی اُڑ گئی۔ لیکن دوبارہ اُٹھ کر بھاگنے سے پہلے وہ اپنے تھیلے
کو ڈھونڈھنے کے لئے رک گئی۔ آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ وہ ایسے حالات کی عادی بن گئی تھی ہم سب
اس طرح کے حالات کے عادی بن گئے تھے۔ اب بم ہمارے لئے معمولی بات تھے اور ہم ان کے بارے
میں بہت کچھ بتا سکتے تھے۔ اگر بمباری معمولی قسم کی ہوتی تو ہم کسی پناہ کے لئے نہیں بھاگتے تھے۔
لوگ ادہر ادہر گشت کرتے پھرتے۔ کبھی کوئی کہہ اٹھتا "وہ دیکھو۔ بم جا رہا ہے" اور اس کے
دھماکے کی آواز سے ہی لوگ بتا دیتے کہ وہ کس قسم کا بم ہے اور اگر اس سے کسی خطرے کی توقع نہ
ہوتی تو لوگ ...۔ پھر باتوں میں مصروف ہو جاتے۔ اگر کوئی بم ہمارے بالکل قریب گرتا تو
ہم خاموشی سے ساکت کھڑے رہتے۔ کچھ معمولی سی پریشانی تو ضرور ہوتی لیکن اسوقت ہلنا خطرے
سے خالی نہ ہوتا، مگر جب بم پھٹ چکتا تو لوگ پھر باتیں کرنا شروع کر دیتے اور اگر کوئی بم کی زد میں
نہ آتا تو بم پر معمولی سا تبصرہ ہونے لگتا جیسے "وہ تو آرا تھا" وغیرہ وغیرہ اور پھر لوگ اپنی راہ
چلنے لگتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہمیں سروں سے اوپر کی بلندی پر ہوا میں کوئی بم معلق نظر آتا۔
اس صورت میں ہر آدمی کہنے لگتا "دوستو! بم پھر نظر آ رہا ہے" اور لوگ پناہ گاہوں میں بھاگ
جاتے۔ بارہا میں عورتوں کے گروہوں کو گلی کوچوں میں آہستہ آہستہ چہل قدمی کرتے ہوئے
دیکھتا۔ وہ بالکل ہشاش بشاش نظر آتیں مگر ایک آنکھ ترچھی کر کے بموں کو ضرور دیکھتی رہتیں اور جب انھیں
یہ معلوم ہو پاتا کہ بم پھٹنے والا ہے تو وہ بالکل خاموش اور ساکت کھڑی ہو جاتیں اور یہ اطمینان کر لیتیں کہ
آیا بم پھٹے گا یا نہیں۔ پھر حالات کے مطابق یا تو وہ پھر سے چہل قدمی کرنے لگتیں یا پناہ گاہوں میں بھاگ
جاتیں۔ شہر کے گلی کوچوں میں یا تو کاغذ کے ٹکڑوں کی ردی پڑی ہوتی یا کوئی نہ کوئی کوڑا کرکٹ۔ مگر ہمارے شہر
کی گلیوں میں کوڑا کرکٹ تو نہیں تھا البتہ گولیوں کے خول اور لوہے کے ٹکڑے ضرور دکھائی دیتے۔ کبھی
کبھی کوئی شخص ان لوہے کے ٹکڑوں اور بنا پھٹے بموں کو اکٹھا کر کے اپنے گھر کے صحن میں بطور یادگار رکھ
لیتا کبھی کبھی یہ ڈھیر ایک ایک ٹن کا ہو جاتا۔ شہر بھر میں کوئی شیشہ نہیں بچا تھا۔ شیشے بمباری میں کیسے
ٹک سکتے ہیں۔ وہ تو چور چور ہو جاتے تھے۔ گھروں کی تمام کھڑکیاں شیشوں سے عاری تھیں اور مردہ گھر کی
کی آنکھوں کے گڑھوں کی مانند نظر آتی تھیں ثابت شیشے تو ایسے نایاب تھے جیسے انوکھی خبریں۔
ہم ہوا تھا رکو گرجا گھر میں جاتے لیکن شروع شروع میں وہاں زیادہ آدمی نہیں پہنچتے تھے۔

البتہ بعد کو آہستہ آہستہ حاضرین کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ میں نے کبھی کبھی کچھ وقفہ کے لئے عبادت بند ہوتے بھی دیکھی ہے اسوقت ہر آدمی اپنی جگہ خاموش بیٹھ جاتا اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی۔ بالکل موت کی سی خاموشی چھا جاتی جسکی وجہ یہ تھی کہ گرجا گھر کے اوپر چاروں طرف ہولناک بمباری ہوا کرتی تھی۔ مگر جبھی کوئی خبر دیتا کہ بمباری ختم ہوگئی ہے تبھی عبادت پھر شروع ہوجاتی۔ ارگن باجا اور گرجا گھر کی موسیقی بمباری کی آواز سے ملکر ایک عجیب سی مخلوط آواز بن جاتی تھی۔

گرجا گھر سے نکلتے ہوئے ایک صبح ہمیں ایک حادثہ پیش آیا۔ یہ واحد واقعہ تھا جو مجھے ایک اتوار کو پیش آیا میں اپنے ایک دوست سے جسکو میں نے عرصے سے نہیں دیکھا تھا گرمجوشی سے ہاتھ ملا کر یہ کہہ رہا تھا کہ "بمباری کے بعد آج رات میں میرے غار میں آجانا۔ ہمارے پاس پائنٹ اعلیٰ ترین شرا۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

میں لفظ شراب کہنے جا رہا تھا کہ اچانک ایک بم پھٹا جسکی وجہ سے میرا سلسلۂ کلام منقطع ہوگیا۔ بم کے ایک بھاری ٹکڑے نے میرے دوست کا بازو کاٹ دیا جو میرے ہاتھ میں لٹکتا رہ گیا۔ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ اسوقت کی کونسی ایسی یاد ہے جو میرے ذہن میں ہمیشہ محفوظ رہے گی۔؟ اور جو ضروری اور غیر ضروری ہر چیز کو پیچھے دھکیل دیگی۔؟ وہ ہے میرا ایک کمینہ خیال جو اسوقت میرے دل میں آیا اور وہ یہ تھا کہ چلو شراب بچ گئی" مگر آپ کو معلوم ہونا چاہیئے کہ میرا یہ خیال کمینہ ضرور تھا لیکن تھا قابلِ معافی کیونکہ اِن دِنوں شراب اتنی ہی نایاب تھی جیسے ہیرے اور جواہرات اور ہمارے پاس صرف ذراسی ہی رہ گئی تھی۔ اسکے بعد محاصرے کے دوران میں ہمیں کبھی شراب نصیب نہ ہوئی۔

کبھی کبھی غاروں میں بُری طرح بھیڑ ہوجاتی۔ ہوا کا گذر نہ ہونے کی وجہ سے وہاں ہمیشہ حبس رہتا۔ کبھی کبھی تو ایک ایک غار میں بیس بیس اور پچیس پچیس آدمی بھر جاتے اور اسکے اندر گھومنے پھرنے تک کو گنجائش نہ رہتی۔ اور ہوا اسقدر کثیف ہوجاتی کہ وہاں موم بتی تک جلانا مشکل ہوجاتا۔ ایک رات میں غار میں بچہ بھی پیدا ہو۔ ذرا سوچئے تو سہی یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے صندوق کے اندر بچہ پیدا ہوجائے۔

ہمارے غار میں دو بار سولہ سولہ تک آدمی اکٹھا ہوگئے اور بارہ بارہ اشخاص تو کئی بار اس میں رہے۔ اسلئے اسمیں کافی گھٹن ہوجاتی تھی۔ آٹھ آدمی تو ہمارے غار میں مستقل طور پر رہے۔ بھوک و مصیبت، خوف، درد، دکھ اور بیماری اور نہ جانے کن کن بلاؤں میں یہ لوگ مبتلا رہے۔ ان میں سے

کوئی بھی محاصرہ ختم ہونے پر وہ نہیں تھا جو وہ پہلے تھا۔ ہم تین آدمیوں کو چھوڑ کر باقی سب دو سال کے اندر ہی مر گئے۔ ایک رات ایک بم ہمارے غار کے بالکل قریب آ کر پھٹا اور اس نے غار کے راستے ہی کو مسدود کر دیا جسکی وجہ سے تھوڑی دیر تک بڑی بےچینی رہی کیونکہ ہمیں باہر نکلنے کا راستہ کھود کھود کر بنانا پڑا۔ ہم میں سے کچھ کا تو قریب قریب گلا ہی گھٹ رہا تھا۔ اسکے بعد ہم نے ہر غار کے دو دو راستے بنائے گو اس بات کا خیال۔۔ ہمیں بہت پہلے آنا چاہیئے تھا۔

کیا ہم نے خچر کا گوشت استعمال کیا۔؟ نہیں۔ ہمیں صرف آخر میں ایک یا دو روز خچر کا گوشت کھانا پڑا اور بےشک وہ لذیذ لگا۔ مگر وہ کیا بھوک میں تو کواڑ بھی پاپڑ ہوتے ہیں۔"

کیا ان چھ ہفتوں میں اس آدمی نے کوئی باقاعدہ ڈائری لکھی تھی۔؟ نہیں۔ اس نے جنگ کے صرف پہلے چھ دنوں میں ڈائری لکھی تھی۔ پہلے دن اس نے پورے بھرے ہوئے آٹھ صفحے، دوسرے روز پانچ صفحے، تیسرے دن صرف ایک صفحہ اور وہ بھی کھلا کھلا لکھا ہوا، چوتھے دن صرف تین یا چار سطور اور پانچویں اور چھٹے دن صرف ایک یا دو سطریں لکھی ہونگی اور ساتویں دن تو اس نے ڈائری لکھنا بالکل بند ہی کر دیا۔ کیونکہ وکسبرگ کا دہشت انگیز ماحول اب لوگوں کے لئے ایک معمول سا بن گیا تھا۔

وکس برگ کی تاریخ جنگ ایک عام پڑھنے والے کے لئے بہت سی دلچسپیاں رکھتی ہے جو دوسرے شہروں کی تاریخ میں نہیں ملتیں۔ اس کی تاریخ خوبصورت گوناگوں نظاروں اور حادثوں سے لبریز ہے دوسرے مشہور دریائی شہروں کے مقابلے میں وکسبرگ کا شہر زیادہ دنوں تک جنگ کی تلخی برداشت کرتا رہا ہے اور یہاں جنگ کا ہر نقشہ سامنے آیا ہے۔ یہاں بحری اور بری دونوں طرح کی لڑائیاں لڑی گئیں۔ محاصرہ بندی۔ سرنگوں کا بچھایا جانا، حملے، غنیموں کی پسپائی، بمباری، بیماری، گرفتاریاں، قحط غرضیکہ وہ کونسی بلا تھی جو یہاں نازل نہیں ہوئی۔ تمام قومی قبرستانوں میں یہیں کا قومی قبرستان سب سے زیادہ شاندار ہے جس کے دروازے پر یہ تحریر کھدی ہوئی تھی۔

"سولہ ہزار چھ سو شہید یہاں اپنی قبروں میں آرام کر رہے ہیں جو ۱۸۶۱ء سے ۱۸۶۵ء کے دوران میں اپنے وطن کی حفاظت کے لئے قربان ہوئے۔"

یہاں کے میدانوں کی جائے وقوع عمدہ ہے۔ بلندی پر ہونے کی وجہ سے یہاں سے دریا

اور خشکی کا نظارہ دُور تک کیا جا سکتا ہے۔ یہاں نفیس، خوبصورت، کشادہ اور اونچے اونچے میدان ہیں جن میں پر پیچ سڑکیں اور راستے ہیں۔ یہاں معتدل آب و ہوا کے پھولوں اور خوبصورت جھاڑیوں کی سجاوٹ قابل دید ہے۔ اس شہر کے ایک حصے میں جنگلی خود رو پودے اور درخت تھے جنکو انکے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ غالباً اسی لئے ان کا حسن و جمال یکتا تھا۔ یہاں کے قبرستان کی ہر چیز سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس میں وطن کی حکومت کو ضرور دلچسپی ہے کیونکہ گورنمنٹ کے کام میں ہمیشہ عمدگی، مضبوطی، کمال اور خوبصورتی ہوتی ہے۔ حکومت اپنے کاموں کو نہ صرف اچھی طرح انجام دیتی ہے بلکہ بعد ازاں انکی دیکھ بھال بھی کرتی رہتی ہے۔

پُر پیچ سڑکیں کہیں کہیں پہاڑیوں کی سیدھی دیواروں کو کاٹتی ہوئی اتنی لمبی چلی گئی ہیں کہ وہ ان ڈھکی سرنگیں سی معلوم ہوتی ہیں۔ ہم کار میں سوار ہو کر ایک دو میل گھومنے گئے اور وہاں ہم نے ایک عمارت دیکھی جو ایک پرانی یادگار ہے۔ یہ عمارت ٹھیک اُسی جگہ پر بنی ہوئی ہے جہاں جنرل پیمبرٹن کی کمان میں وکس برگ کی فوجوں نے جنرل گرانٹ کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ چونکہ یہ عمارت لوہے اور ۔۔۔۔۔ مضبوط مسالے کی بنی ہوئی ہے اسوجہ سے یہ جلد ٹوٹنے پھوٹنے سے محفوظ رہے گی۔ یہاں کی ایک دوسری پرانی عمارت جو اسی جگہ ہے سنگ مرمر کی بنی ہے مگر اسکی بنیاد اینٹوں پر بنائی گئی تھی جو اب ٹوٹ رہی ہے اور ایکدن یہ عمارت گر جانے گی۔ اس عمارت کے سامنے جنگل سے گھری پہاڑیوں اور گھاٹیوں کا خوبصورت علاقہ ہے۔ یہ جگہ خود بھی بدنما نہیں ہے۔ پھولوں کی خود رو بیلیں اس میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ سنگِ مرمر کی عمارت کے شکستہ اور گرے ہوئے حصے قومی قبرستان میں پہونچا دیئے گئے ہیں۔

شہر سے دو فرلانگ دور سڑک پر ایک بوڑھے سیاہ فام شخص نے ہمیں بڑے فخر کے ساتھ ایک بم دکھلایا جو پھٹا نہیں تھا اور جو محاصرہ کے دنوں میں اسکے گھر کے صحن میں گرا تھا اور اسوقت سے وہ وہیں پڑا ہوا تھا۔ پھر وہ کہنے لگا۔

"میں یہاں کھڑا تھا اور ایک کتا بھی اس جگہ کھڑا تھا۔ کتا بم پر جھپٹا وہ اس سے بھڑ جانا چاہتا تھا لیکن میں خاموش رہا اور میں نے اس سے کہا "جیمس تم یہیں بیٹھو۔ جہاں ہو وہیں چُپ چاپ پڑے رہو یہاں سے چلے جاؤ۔ یا پھر جیسا تو چاہے کر لیکن مجھے جنگل میں جانا

ہے کیوں کہ مجھے وہاں کام ہے ۔"

وکس برگ میں بڑے اہم کاروباری بازار اور خوشنما مکان ہیں۔ یہاں دریائے یازو اور سن فلاور کے ذریعہ تجارت ہوتی ہے۔ اسکے چاروں طرف ریلوں کا جال بچھا ہے جو کاشتکاری کے زرخیز علاقوں سے ہو کر گذرتی ہیں۔ ان ریلوں پر ہی اس شہر کی آئندہ خوشحالی کا انحصار ہے۔

بظاہر چھوٹے اور بڑے تمام ساحلی شہر والوں نے یہی طے کر لیا ہے کہ وہ اپنی آئندہ خوشحالی اور ترقی کے لئے صرف ریلوں کی آمد کا ہی انتظار کریں گے۔ وہ اسی اُمید پر اپنا کاروبار کر رہے ہیں اور آثار یہ ہیں کہ اگلے بیس سال میں اس وادی میں کچھ قابلِ ذکر تبدیلیاں ظہور پذیر ہونگی۔ یہاں کی آبادی اور دولت میں اضافہ ہوگا اور جیسا کہ اکثر ہوتا ہے خوشحالی اور دولت کے اضافہ کے ساتھ ساتھ لوگوں میں روشن خیالی اور فراخ دلی بھی بڑھے گی۔ مگر ماضی کی حالت دیکھتے ہوئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ ساحلی شہر کہیں کہیں دیگر وجوہات سے بھی اپنی ترقی کا راستہ مسدود کرلینگے جیسا کہ ماضی میں ہوا ہے۔ دخانی جہازوں کے عروج کے زمانے میں ان شہروں کی ترقی کے راستے میں گھاٹ کی چنگی حائل تھی جو بہت زیادہ بڑھا دی گئی تھی اور جس کی وجہ سے تھوڑے بہت سامان کی تجارت تو بالکل بند ہی ہو گئی تھی کیونکہ کشتیوں سے گھاٹ پر ٹھہرنے کے لئے اتنا زیادہ محصول وصول کیا جاتا تھا کہ وہ ایک دو مسافروں اور تھوڑے سے سامان کے لئے کسی بندرگاہ پر ٹھہرنے کی ہمت ہی نہیں کر سکتی تھیں۔ بجائے اسکے کہ یہ شہر اپنے یہاں تجارت کو فروغ دیں انھوں نے اُسے اور بھی گرا دیا۔ اگر محصول کی دریں کم ہوتیں تو زیادہ کشتیاں انکے گھاٹوں پر رکتیں لیکن ان کی محصولی کی غلط پالیسی سے محصول تو بڑھ گئے لیکن آنیوالی کشتیوں کی تعداد لازمی طور پر کم ہو گئی۔ یہ پالیسی نیو آرلینز سے سینٹ پال تک رائج ہو چکی تھی اور ابھی تک وہاں رائج ہے۔

مجھے دریائے یازو اور سن فلاور میں بہاؤ کے خلاف سفر کرنے کی بہت خواہش تھی۔ یہ علاقہ پہلے بھی بہت خوبصورت اور دلاویز تھا اور اب تو یہ اپنے اندر اور بھی دلکشی لئے ہوئے ہے چونکہ سیلاب کا پانی اب بھی وہاں بھرا دکھائی دیتا ہے اور منظر بڑا خوشنما معلوم ہوتا

ہے مگر چونکہ ہمیں اندیشہ تھا کہ واپسی پر ہمیں نیو آرلینز کی کشتی کا ایک دو دن انتظار کرنا پڑیگا اسلئے ہمیں اپنے پروگرام کو بدلنا پڑا۔

یہاں مجھے ایک کہانی یاد آگئی ہے جو میں نے ایک رات کشتی پر سفر کرتے ہوئے سُنی تھی محض اس خیال سے کہ یہ ایک اچھی کہانی ہے میں اسے بیان کئے دیتا ہوں اس خیال سے نہیں کہ یہ برمحل ہے۔ کیونکہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اس علاقے سے متعلق ہو۔ یہ کہانی مجھے ایک مسافر نے سنائی تھی جو ایک کالج کا پروفیسر تھا یہ کہانی متفرق بات چیت کے سلسلے میں آگئی۔ بات چیت پہلے گھوڑوں سے شروع ہوئی پھر فلکیات تک پہنچ گئی۔ اسکے بعد نصف صدی پہلے کے وکسبرگ میں مروج قمار بازی کی سزا کے خلاف قانون رواج پر تبصرہ ہونے لگا۔ پھر خوابوں اور ضعیف الاعتقادی سے وابستہ باتوں کا ذکر چھڑ گیا اور بالآخر آدھی رات کے بعد اس گفتگو کا اختتام آزادانہ تجارت اور اس کے تحفظ کے مسئلہ پر ہوا۔

چھتیسواں باب

پروفیسر کی کہانی

بہت دنوں کی بات ہے۔ اسوقت میں کالج پروفیسر نہیں تھا بلکہ ایک منکسر المزاج قسم کا سروے کرنیوالا نوجوان تھا۔ سروے کے لئے پوری دنیا پڑی تھی بشرطیکہ کوئی میری خدمات حاصل کرتا۔ مجھے کیلیفورنیا کی ایک بہت بڑی کان کے راستہ کی پیمائش کرنے کا ٹھیکہ ملا ہوا تھا۔ اور میں اس طرف بحری راستہ سے جارہا تھا۔ یہ سفر تین یا چار ہفتہ کا تھا۔ جہاز میں بہت سے مسافر تھے۔ لیکن مجھے ان سے کوئی سروکار نہ تھا۔ میرا تو عزیز ترین مشغلہ پڑھنا اور خیالات میں غرق رہنا تھا اسی وجہ

سے میں لوگوں سے گفتگو کرنے سے احتراز کیا کرتا تھا۔ اور اپنے شوق میں کوئی رکاوٹ نہیں چاہتا تھا۔
تین پیشہ ور جواری بھی اس جہاز پر سفر کر رہے تھے۔ جن کے طور طریقے درشت، مکروہ اور نفرت انگیز تھے۔
میں نے کبھی ان لوگوں سے بات نہیں کی۔ لیکن پھر بھی کبھی کبھی میں ان کی طرف دیکھ ہی لیتا تھا کیونکہ
وہ بالائی عرشے پر ایک شاندار کمرے میں دن رات جوا کھیلا کرتے تھے۔ جب میں چہل قدمی کیا کرتا۔
تو انکے کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے جس سے بدبو اور دھواں نکلا کرتا میری ان پر نظر پڑ جایا کرتی تھی۔
ان کی موجودگی منحوس اور قابل نفرت تھی۔ لیکن یہ سب مجھے برداشت کرنا ہی پڑتا تھا۔

عرشے پر ایک اور مسافر بھی تھا جو مجھے اکثر نظر آجاتا تھا۔ وہ مجھے دوست بنانے کا بے حد
خواہشمند تھا اور یہ یقینی تھا کہ اگر میں اس سے بے رخی برتتا تو اس کے جذبات کو ٹھیس لگتی۔ اور یہ
میں ہرگز نہیں کرنا چاہتا تھا۔ علاوہ ازیں اس کی دیہاتی سادگی اور خوش مزاجی میں بڑی کشش تھی۔
اس کا نام جون ہیکس تھا۔ جب پہلے پہل میں اس سے ملا تو مجھے اسکے لباس اور اس کی صورت سے
یہ اندازہ ہوا کہ وہ کسی مغربی ریاست غالباً اوہیو کے جنگلات کا کوئی کسان یا مویشی پالنے والا ہے۔
...... بعد میں جب اس نے مجھے اپنی کہانی سنائی تو مجھے پتہ چلا کہ وہ واقعی اوہیو کے علاقے کا ایک
مویشی پالنے والا ہی تھا پھر مجھے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ میرا قیاس بہت حد تک درست نکلا۔ لہٰذا اب میں اسکے
زیادہ قریب ہو کر اس سے بے تکلف طور سے ملا تاکہ اسکے متعلق اپنی مزید قیاس آرائی کی جانچ کر سکوں۔

ناشتے کے بعد یہ شخص روزانہ میرے پاس آجاتا اور میرے ساتھ ٹہلتا۔ اس دوران میں اسکی
سادہ لوحی کے باعث میں نے اسکے کاروبار، آئندہ منصوبوں، خاندان، رشتہ دار، سیاسی خیالات
غرضیکہ نئی اور پرانی ہر وہ بات جس کا اسکی ذات سے تعلق تھا معلوم کر لی، اور میرا خیال ہے کہ
اسی اثناء میں اس نے بھی میرے متعلق ہر بات یعنی میرے پیشے کی تفصیلات، میری قوم، میرے مقاصد
میرے آئندہ کے منصوبوں اور میری ذات سے متعلق سب باتیں معلوم کر لیں۔ وہ ایک شریف النفس
تھا اور جلد ہی ہر شخص کو متاثر کر لیتا تھا کیونکہ پہلے میں اپنے معاملات پر کسی سے بات ہی نہیں کرنا چاہتا
تھا لیکن اس کی شرافت سے متاثر ہو کر میں نے اپنا خیال بدل لیا۔ ایک بار میں نے مثلثی پیمائش کے
بارے میں کوئی بات کہی اسکے کانوں کو یہ نیا لفظ بہت پسند آیا اور اس نے بغیر مجھے ناراض کئے میرے
اصلی نام کے بجائے مجھے مثلث کہہ کر پکارنا شروع کر دیا۔

اُسے مویشی پالنے کا کتنا شوق تھا! ذرا گائے یا بیل کا نام لے دیکھئے فوراً اس کی آنکھ میں چمک آجاتی اور اس کی زبان چل نکلتی۔ اور وہ خوب بولنے لگتا۔ جتنی دیر میں ٹہلتا رہتا اور اسکی بات سنتا رہتا اتنی ہی دیر وہ برابر میرے ساتھ ٹہلتا رہتا اور مجھے اپنی باتیں سناتا رہتا۔ وہ جانوروں کی سب نسلوں سے واقف تھا۔ وہ بڑی محبت سے انکے نام لیتا اور میں بڑی بیدلی، خاموشی اور بدمزگی سے سب کچھ سنتا رہتا تاوقتیکہ جانوروں کی باتیں ختم نہ ہو جاتیں۔ لیکن جب میں اس کی گفتگو کو زیادہ برداشت نہ کر سکتا تو میں بڑی ہوشیاری سے گفتگو کے درمیان سائنس کا کوئی موضوع چھیڑ دیتا۔ اسوقت میری آنکھ میں چمک آجاتی اور اس کی آنکھ میں افسردگی۔ میری زبان گویا ہو جاتی اور اسکی گنگ۔ زندگی میرے لئے تو ایک خوشی ہوتی مگر اسکے لئے اُداسی۔ ...

ایک دن اس نے کچھ پس و پیش اور پست ہمتی سے مجھ سے کہا۔

"مثلث! کیا تم ایک منٹ کے لئے میرے کمرے میں آؤ گے۔؟ مجھے تم سے ایک مسئلہ پر کچھ گفتگو کرنی ہے"

میں فوراً ہی اسکے ساتھ اسکے کمرے میں چلا گیا۔ اندر آکر اس نے باہر جھانک کر دیکھا۔ اور کمرے میں اوپر نیچے بڑی ہوشیاری سے نظر ڈالی۔ پھر اس نے دروازہ بند کر کے تالا لگا دیا۔ ہم صوفے پر بیٹھ گئے۔ تب اس نے کہا۔

"میں تمہارے سامنے ایک تجویز رکھ رہا ہوں اگر تمہیں یہ تجویز پسند آجائے تو اس پر عمل کرنے سے مجھے اور تمہیں دونوں کو فائدہ ہوگا۔ تم کیلیفورنیا محض تفریح کرنے تو جا نہیں رہے ہو اور نہ میں۔ ہم لوگ وہاں کچھ نہ کچھ فائدے کی غرض سے جا رہے ہیں۔ کیوں ہے نا یہی بات۔؟ اگر ہم مناسب سمجھیں تو ایک دوسرے پر کچھ احسان کر سکتے ہیں۔ میں نے کئی سال بچا بچا کر کچھ دولت اکٹھی کی ہے اور وہ سب میرے پاس یہیں ہے۔ اتنا کہہ کر اس نے ایک پرانا صندوق کھولا اور کچھ سمٹے سمٹائے میلے کچیلے کپڑے نکال کر ایک طرف رکھ دیئے اور ایک چھوٹے مضبوط سے تھیلے کو کچھ دیر غور سے دیکھا۔ اور پھر اس کو صندوق میں رکھکر تالا لگا دیا۔ تب وہ آواز دھیمی کر کے بڑی احتیاط سے بولا" اس تھیلی میں سونے کے دس ہزار ڈالر سکے ہیں۔ میرا ادنیٰ سا خیال یہ ہے کہ جانوروں کے بارے میں جتنی جانکاری ہو سکتی ہے وہ میرے پاس ہے۔ لیکن مجھے زمین بھی

تو چاہیئے ۔ جیسا کہ تم جانتے ہو اور میں بھی جانتا ہوں کہ اس تمام علاقہ میں جسکی تمہیں پیمائش کرنی ہے۔ زمین کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہیں جن کو نکونے ٹکڑے کہتے ہیں۔ یہ پیمائش کنندہ کو مفت دیئے جاتے ہیں۔ تمہیں جو کام کرنا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ پیمائش اسطرح کرو کہ یہ نکونے ٹکڑے اچھی اور زرخیز زمین میں پڑیں ۔ وہ تم مجھے دیدینا تاکہ میں ان کھیتوں میں مویشی پال سکوں۔ اور خوب روپیہ کما سکوں اور اس کے عوض میں میں تمہارا حصّہ ڈالر کی شکل میں مستقل طور پر تمہیں دیتا رہوں گا اور ٹھیک ابھی سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

مجھے اسکی امیدوں پر پانی پھیرتے ہوئے برا محسوس ہوا۔ لیکن میں مجبور تھا۔ میں نے اُس کی بات کو سختی سے کاٹتے ہوئے کہا "میں اس قسم کا پیمائش کرنیوالا نہیں ہوں مسٹر ہبکس اس موضوع کو بدل دیجئے ۔"

وہ گھبرا گیا اور بُری طرح شرمسار ہو کر معافی مانگنے لگا۔ مجھے بھی غالباً اتنی ہی تکلیف ہوئی جتنی اسکو ہوئی ہوگی۔ کیونکہ ابھی تک اُسے مطلق شک و شبہ نہیں تھا کہ اسکی تجویز میں کوئی برائی ہے اسلئے میں نے جلدی سے اُسے تشفی دینے کی کوشش کی اور اسے جانوروں اور انکے ذبح کرنیکی مزیدار باتوں میں لگا لیا۔ اسوقت ہم ایکسپلکو میں مقیم تھے اور جب ہم نے عرشے پر چڑھ کر دیکھا تو خوش نصیبی سے اسوقت ملاح لوگ گوشت کو چھینکوں میں لٹکا کر عرشے پر ٹانگ رہے تھے۔ ہبکس کا غم فوراً دُور ہو گیا۔ اور وہ اپنی غلطی کو بھی بھول گیا۔ اس نے چلا کر کہا "یہ ذرا دیکھنا مشکل ہے۔ اوہیو میں لوگ اس تماشہ کو دیکھ کر کیا کہیں گے کیا وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے نہیں دیکھیں گے۔ ؟ بتلایئے نا۔ ؟"

عرشہ پر سب مسافر یہ تماشہ دیکھنے آ گئے یہاں تک کہ جواری جو جُوا کھیل رہے تھے وہ بھی جُوا چھوڑ کر یہ دیکھنے چلے آئے۔ ہبکس ان سب کو جانتا تھا۔ اور اپنے پسندیدہ موضوع سے پہلے ہی اُنکے کان کھا چکا تھا۔ جیسے ہی میں اپنی جگہ سے ہٹا ایک جواری نے پاس آکر ہبکس کو سلام کیا۔ تب دوسرا آیا اور پھر تیسرا۔ میں بھی رُک کر انتظار کرنے لگا۔ میں انھیں غور سے دیکھنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ چاروں آدمیوں میں بات چیت ہونے لگی اور وہ لوگ کچھ سنجیدہ نظر آنے لگے دھیرے دھیرے ہبکس وہاں سے پیچھے ہٹتا چلا گیا اور جواری اسکے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ وہ اس کے بالکل قریب چل رہے تھے ۔

مجھے بے چینی ہونے لگی۔ جب ہیکس مجھ سے دور جا رہا تھا تو میں نے اُسے غصے سے یہ کہتے سُنا "صاحبان ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں آپ لوگوں سے پھر کہہ رہا ہوں اور اس سے پیشتر پانچ چھ بار کہہ چکا ہوں کہ میں نے اس بات کو نہ کبھی اٹھایا ہے اور نہ کبھی اٹھاؤں گا۔ میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔"

اب مجھے کچھ تسلی ہوگئی۔ اور میں نے اپنے دل میں کہا کہ اسکی عقلِ سلیم اسکی حفاظت کرتی رہے گی۔

ایکپلکو سے سان فرانسسکو تک جانے میں ہمیں قریب پندرہ دن لگ گئے۔ اور اس دوران میں میں نے کئی بار جواریوں کو ہیکس سے بڑی سنجیدگی سے باتیں کرتے دیکھا۔ اور ایک مرتبہ تو میں نے بڑی نرمی سے ہیکس کو متنبہ بھی کیا کہ وہ ان جواریوں کے چکر میں نہ پڑے مگر اس نے بڑی بے پروائی سے ہنسکر یہ کہہ دیا "ہاں وہ میرے پیچھے تو بہت پڑے رہتے ہیں اور مجھے پھانسنے کی کوشش کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کیساتھ جوا کھیلوں۔ محض تفریح کے لئے۔ لیکن میں خوب سمجھتا ہوں کہ ان کا منشا کیا ہے۔ میرے دیہات کے لوگوں نے مویشیوں کے بارے میں اگر ایک بار مجھ سے بات کی ہوگی تو ان لوگوں نے جوے کے بارے میں مجھ سے ہزار بار کہا ہوگا۔

آہستہ آہستہ اب ہم سان فرانسسکو پہونچ رہے تھے بڑی بھیانک اندھیری رات تھی، تیز ہوا چل رہی تھی مگر سمندر میں طوفان نہیں تھا۔ میں عرشے میں اکیلا بیٹھا تھا۔ دس بجے کے قریب میں نیچے اترا اسی وقت جواریوں کے کمرے سے ایک آدمی نکلا اور اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ مجھے سخت صدمہ ہوا کیونکہ مجھے یقین تھا کہ وہ ہیکس ہی تھا۔ میں زینہ سے جلدی جلدی اترا۔ اور اس کو تلاش کیا۔ مگر وہ مجھے کہیں نہیں ملا۔ تب میں پھر عرشے پر لوٹ کر آیا۔ جہاں سے مجھے ہیکس کی ایک جھلک سی دکھائی دی مگر وہ فوراً ہی ان بدمعاشوں کے اڈے میں گھس گیا۔ کیا وہ بالآخر ان کے چکر میں پھنس ہی گیا۔؟ مجھے ایسا ہی اندیشہ تھا۔ مگر وہ نیچے کیوں گیا تھا؟ غالباً اپنی رقم کی تھیلی لینے گیا ہوگا۔ میرا ماتھا ٹھنکا اور وہیں دروازے کے قریب جاکر کھڑا ہوگیا۔ دروازہ ذرا سا کھلا تھا میں نے اندر جھانک کر دیکھا۔ جو کچھ مجھے دکھائی دیا اس سے مجھے اتنا دکھ ہوا۔ کہ ایک مرتبہ تو میری زبردست خواہش ہوئی کہ جانے اس کے کیا ہنادفت پڑھنے اور تخیل کے مزے لینے میں برباد کروں

بہتر یہ ہو گا کہ میں اپنی کل توجہ اپنے معصوم مویشی پالنے والے دوست کو بچانے میں لگا دوں۔ میرا دوست اسوقت خوب جوا کھیل رہا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ اُسے شراب بھی پلائی جا رہی تھی اور اسے نشہ بھی ہونا شروع ہو گیا تھا۔ وہ شراب کی تعریف کر رہا تھا۔ جسے وہ سیب کی شراب سمجھ رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا کہ اب چونکہ اسے اس شراب میں مزہ آ رہا ہے اس لئے اُسے یقین ہو چلا ہے کہ اس کو یہ چیز ضرور پینی چاہیئے چاہے یہ اسپرٹ ہی کیوں نہ ہو اور یہ کہ اتنی عمدہ چیز اسے پہلے کبھی پینے کو نہیں ملی تھی۔ اُسکے اسطرح بکنے پر بدمعاش لوگ یکے بعد دیگرے چھُپ چھُپ کر مسکرا رہے تھے۔ انھوں نے سب گلاس بھر رکھے تھے۔ بیکس تو واقعی گلاس کی ساری شراب پی کر اسے خالی کر دیتا جبکہ یہ بدمعاش صرف اس بات کا دکھاوا کرتے کہ انھوں نے بھی پی ڈالی ہے۔ مگر درحقیقت وہ گلاس کو چپکے سے پیچھے کھسکا کر شراب پھینک دیتے تھے۔

میں اس نظارے کو برداشت نہ کر سکا۔ اس لئے میں وہاں سے ہٹ کر عرشے پر آ گیا۔ اور سمندر کے نظارے اور ہوا کی سائیں سائیں کی آوازیں سننے میں محو ہو گیا مگر ہر پندرہ منٹ بعد مجھے میری بے چین طبیعت اسی طرف جانے پر مجبور کرتی تھی۔ اور ہر بار میں بیکس کو شراب پیتے دیکھتا تھا۔ وہ واقعی بڑے مزے مزے سے پی رہا تھا جبکہ دوسرے اپنی شراب برابر پھینکے جا رہے تھے۔ جتنی دماغی پریشانی مجھے اس رات کو ہوئی اتنی شاید کبھی نہ ہوئی ہو گی۔

اب میری صرف ایک اُمید باقی رہ گئی تھی اور وہ یہ کہ اگر ہم اپنی منزلِ مقصود پر جلد پہونچ جائیں تو ان کا کھیل ختم ہو سکتا ہے۔ اس لئے میں برابر خدا سے یہ دُعا مانگ رہا تھا کہ جہاز جلد منزل پر پہونچے۔ بالآخر ہمارا جہاز دندناتا ہوا گولڈن گیٹ میں داخل ہوا۔ میرا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ میں اس دروازے کے پاس جلدی سے پہونچا اور میں نے جھانک کر دیکھا۔ لیکن افسوس کہ اب میری امید بر آنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ بیکس کی آنکھوں پر شراب کا خمار سوار تھا اور وہ سرخ ہو رہی تھیں۔ اسکا ملائم سفید چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ اس کی آواز رقت آمیز اور بھرائی ہوئی تھی۔ اس کا جسم ایسے ہی ایسے ہچکولے کھا رہا تھا جیسے سمندر کی طغیانی میں جہاز۔ اس نے ابھی ابھی شراب کا ایک اور گلاس ختم تلچھٹ کے پی کر ختم کیا تھا۔ تاش بانٹے جا رہے تھے۔ اس نے پتے ہاتھ میں لئے اور ان کی طرف دیکھا اور اسکی بے رنگ آنکھوں میں ایکبار

پھر روشنی آگئی۔ جواریوں نے اسے تاڑ لیا اور اطمینان کا اظہار کیا۔ گو کہ ان کے چہروں سے اس بات کا پتہ لگانا مشکل تھا۔

"کتنے پتے چاہیئے۔؟"

بیکس نے کہا "ایک بھی نہیں"

ان میں سے ایک بدمعاش نے جس کا نام ہینک ڈلی تھا ایک پتا پھینک دیا۔ اور باقی تینوں جواریوں نے تین تین پتے پھینکے اور پھر داؤں لگنا شروع ہوا۔

اس سے پیشتر کے داؤں بہت معمولی تھے یعنی ایک یا دو ڈالر تک۔ لیکن اب بیکس نے دس دس ڈالر کے داؤں لگانا شروع کئے۔ ڈلی پہلے تو ہچکچایا مگر پھر اس نے سمجھا کہ داؤں بڑھانے میں ہی فائدہ ہے اور اس نے ایکدم دس ڈالر اور بڑھا کر داؤں لگا دیا۔ دوسرے دو بدمعاشوں نے اپنے پتے پھینک دیئے۔

بیکس نے بیس ڈالر بڑھا کر داؤں لگا دیا۔

ڈلی بولا "اچھا میں سمجھ گیا کہ کیا معاملہ ہے۔ میں سو ڈالر لگاتا ہوں۔" اور یہ کہکر مسکراتے ہوئے اس نے سو ڈالر نکال کر رکھ دیئے۔

بیکس نے نشے میں جھومتے ہوئے کہا "بس اتنا ہی؟"

ڈلی نے پوچھا "کیا کہا؟ کیا تمہارا مطلب ہے کہ تم اس سے بڑھ کر بھی داؤں لگا سکتے ہو؟"

بیکس نے کہا "ہاں خیال تو ایسا ہی ہے" اور اس نے ایک سو ڈالر اور نکال کر رکھ دیئے۔ ڈلی نے اپنے اوورکوٹ کی جیب سے کچھ رقم نکال کر کہا "کیا چھوٹا کھیل کھیلتے ہو اگر کھیلنا ہی ہے تو پانچ سو ڈالر لگاؤ۔"

بیوقوف مولیشیوں کے تجار نے کہا "اچھا پانچسو اور سہی" اور رقم جیب سے نکالی اور ڈالروں کی اس ڈھیر پر بوچھار کر دی۔ اب تینوں سازشیوں کے چہرے خوشی سے دمکنے لگے۔ اب پالیسی اور بہانوں سے کھیل بڑھانے کی بات ختم ہو چکی تھی اور کھیل شور و غل کے ساتھ ہونے لگا تھا۔ روپہلی سکوں کا انبار بلند سے بلند تر ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ وہاں ہزار ڈالر

ہو گئے۔
وِلی نے سکوں سے بھرا ہوا ایک تھیلا میز پر پٹک کر نرمی مگر طنز سے کہا: "یہ ہے پانچ ہزار ڈالر کا داؤں نے میرے دیہاتی دوست۔ اب بتاؤ تم کیا کہتے ہو؟" بیکس نے اپنے سنہری سکوں کے تھیلے کو الٹ کر انبار کو اور بلند کرتے ہوئے کہا "ہاں بتاؤ۔ تمہارے پاس کیا ہے؟"
وِلی نے اپنے پتے نیچے ڈالتے ہوئے کہا "چار بادشاہ ہیں بیوقوف۔" اور رقم کے ڈھیر کو دونوں ہاتھوں سے گھیر کر بیٹھ گیا۔
بیکس نے گرج کر کہا "یہ چار یکے ہیں گدھے۔" اور یہ کہہ کر اس نے ریوالور وِلی کے اوپر تان دیا اور گرجا "میں بھی ایک پیشہ ور جواری ہوں اور اے احمقو میں اس سفر میں برابر تمہاری گھات میں لگا ہوا تھا۔"
اسی وقت ایک زوردار کھڑکھڑاہٹ اور دھچکے کے ساتھ جہاز رکا۔ منزل آگئی اور جہاز لنگر انداز ہو گیا۔ اور اس طویل سفر کا اختتام ہو گیا۔
یہ دنیا بڑی عجیب و غریب ہے۔ اِن تین جواریوں میں سے ایک بیکس کا ہی دوست تھا۔ یہ فیصلہ کن تاش کا دور اسی نے بانٹا تھا ان دو بدمعاشوں سے اس کا یہ معاہدہ تھا کہ وہ بیکس کو چار بیمیں دیدے اور وِلی کو چار بادشاہ مگر افسوس اس نے ایسا نہیں کیا اور اپنے ساتھی بیکس کو چار یکے دیدیئے۔
ایک ہفتہ بعد میری اچانک بیکس سے ملاقات ہو گئی۔ اب وہ مانٹ گمری اسٹریٹ میں انتہائی شان و شوکت سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس نے بڑی خوش مزاجی سے مجھ سے بات چیت کی اور جب میں رخصت ہوا تو مجھ سے کہا "اچھا صاحب۔ اب میں آپ کو یہ بتلا دوں کہ مجھے ان تکونی زمینوں کی ضرورت نہیں ہے۔ دراصل مجھے مویشیوں کے متعلق بھی زیادہ علم نہیں ہے میں نے تو آپکے ساتھ جہاز میں سفر کرنے سے ایک ہفتہ پیشتر جرسی میں ہی انکے متعلق کچھ علم حاصل کیا تھا۔ میرا مویشی پالنے اور انکے متعلق شوق کا اظہار کرنے میں ایک مدار مضمر تھا اور میرے اسی دکھاوے نے بالآخر مجھے فائدہ پہونچایا۔ اب مجھے مویشیوں کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔"
دوسرے دن ہم بادلِ ناخواستہ گولڈ ڈسٹ جہاز سے رخصت ہوئے اور اس کے

افسران سے خدا حافظ کہا۔ اور یہ امید ظاہر کی کہ شاید کبھی پھر اس جہاز پر سفر کرنے اور ان سے ملاقات کا موقع ملے۔ مگر افسوس! تقدیر کو یہ موقع دوبارہ کہاں دینا تھا۔!

سینتیسواں باب

گولڈ ڈسٹ کی تباہی

تین ماہ بعد جب میں ۸ راگست کو گذشتہ بابوں میں سے کسی باب کو لکھ رہا تھا تو نیو یارک کے اخباروں میں یہ تار چھپا۔

ایک بھیانک تباہی۔

'دخانی جہاز گولڈ ڈسٹ میں دھماکے سے سترہ آدمی ہلاک'۔

نیش ولے۔ ۷ راگست۔ ہکمین سے جو مراسلہ ملا اس میں یہ خبر تھی۔

ہکمین سے روانہ ہونے کے فوراً بعد آج صبح تین بجے دخانی جہاز گولڈ ڈسٹ میں بوائلر پھٹ گئے۔ سینتالیس آدمی بھاپ سے زخمی اور سترہ لاپتہ ہیں۔ شہر سے کچھ دور دریا کے چڑھاؤ پر جہاز کو گرداب میں روک لیا گیا۔ کیبن کے مسافروں، افسروں نیز عملہ کے کچھ آدمیوں کو شہریوں کی سعی مسلسل سے ساحل پر پہونچایا گیا۔ پھر وہاں سے ہوٹلوں اور قیام گاہوں میں لیجایا گیا۔ ایک ساتھ چوبیس زخمیوں کو ہالکومب کے گودام میں پہونچا دیا گیا جہاں ان کی ہر طرح کی دیکھ بھال کی گئی اور بعد کو انھیں زیادہ آرام دہ جگہوں میں پہونچا دیا گیا۔

ناموں کی فہرست بعد میں شائع ہوئی جس سے یہ معلوم ہوا کہ سترہ آدمی جو ختم ہو گئے تھے ان میں کالال بھی شامل تھا اور سینتالیس زخمیوں میں کپتان، نائب کپتان، دوسرا نائب کپتان

اور دوسرے تیسرے درجے کے پادری بھی تھے نیز جہاز کے پائلٹ جناب ٹیم۔ ایس۔ گرے اور چند ملاحوں کے نام بھی زخمیوں کی فہرست میں شامل تھے۔

ایک غیر سرکاری تار کے جواب میں ہمیں یہ اطلاع ملی کہ جناب گرے صاحب کے سوا کسی بھی زخمی کی حالت تشویش ناک نہیں تھی بعد کی اطلاعات نے اس خبر کی تصدیق بھی کر دی۔ نیز یہ بھی پتہ چلا کہ گرے صاحب کی حالت بہتر ہونے لگی ہے اور ان کے بچنے کی امید ہو چلی ہے مگر بعد کی خبروں سے ان کی صحتیابی سے وابستہ امیدیں مایوسی میں بدل گئیں۔ بالآخر ان کے انتقال پر ملال کی خبر آ گئی۔ آہ۔ اُس انسان میں کتنی خوبیاں تھیں۔ وہ بہت خلیق اور ملنسار، بہادر اور جواں مرد تھا اور اس سے کہیں زیادہ بہتر انجام کا مستحق تھا۔

اڑتیسواں باب

خوبصورت مکانات

بحری راستے سے نیو اور لینز جانے کے لئے ہم سی سنائی کی ایک کشتی میں سوار ہو گئے یا یوں کہئے کہ کشتی پر سوار ہو گئے۔ دونوں محاورے درست ہیں۔ پہلا مشرق کے لوگوں کی بول چال کے مطابق اور دوسرا مغرب کے لوگوں کی طرزِ گفتگو کے مطابق۔

مسٹر ڈکنس نے اس رائے سے اتفاق نہیں کیا کہ مسیسپی کے اسٹیمر عظیم الشان ہوا کرتے تھے اور وہ دریا پر تیرتے ہوئے محل معلوم ہوتے تھے ایسے ہی ناموں سے ان جہازوں کو موسوم کیا جاتا تھا اور جس قدر وہ منزلت سے عوام انکو سراہتے تھے اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان ناموں میں کچھ مبالغہ بھی نہیں تھا۔

ہو سکتا ہے کہ مسٹر ڈکنس کا یہ نظریہ ناقابل تردید ہو، مگر عوام کا یہ نظریہ بھی تو ناقابل

تردید تھا۔ اگر مسٹر ڈکنس نے ان جہازوں کا شاہی تاج کے ہیرے جواہرات سے، تاج محل سے، میٹر ہارن یا ایسی ہی کسی دیگر گراں قدر اور عجوبۂ روزگار شے سے جو انھوں نے دیکھی ہوگی، موازنہ کیا ہوگا تو واقعی یہ اسٹیمر عالیشان نہیں ہو سکتے تھے اور مسٹر ڈکنس حق بجانب تھے مگر عوام نے تو ان جہازوں کا مقابلہ اپنی دیکھی بھالی چیزوں سے ہی کیا ہوگا اور اس طرح جانچنے اور رائے قائم کرنے میں عوام واقعی حق بجانب تھے کہ یہ جہاز عظیم الشان تھے اور انکی یہ رائے مبالغہ آمیز نہیں تھی اسلئے عوام کا کہنا اتنا ہی درست تھا جتنا کہ مسٹر ڈکنس کا۔ ساحل کی ہر شے سے یہ دخانی جہاز کہیں زیادہ خوبصورت تھے، اور اگر ان کا وادی کے اعلیٰ ترین رہائشی گھروں اور ہوٹلوں سے مقابلہ کیا جائے تو بیشک یہ اسٹیمر شاندار تھے اور واقعی محل معلوم ہوتے تھے۔ بیشک سینٹ لوئی اور نیو اورلینیز میں رہنے والے چند لوگوں کے لئے یہ اسٹیمر عظیم الشان نہیں ہونگے اور نہ ہی یہ محل جیسے لگتے ہوں گے لیکن ان بہت سے لوگوں کے لئے جو بیٹن روج سے سینٹ لوئی تک دریا کے دونوں ساحلوں پر آباد ہیں، یہ اسٹیمر واقعی محل تھے، کیونکہ یہ اُن کی تصوراتی شان و شوکت کی جیتی جاگتی اور اطمینان بخش تصویر تھے۔

اس علاقے میں دریا کے دونوں ساحلوں پر ہر شہر اور ہر گاؤں میں ایک عمدہ اور خوبصورت ترین رہائشی مکان ہوتا تھا جو وہاں کے سب مالدار اور مشہور آدمی کی رہائش گاہ ہوتی تھی۔ اسکی تصویر کھینچنا بڑا آسان ہے۔ اس مکان میں ایک وسیع گھاس کا صحن یا پختہ ہوتا تھا۔ اور فرش کے چاروں طرف ایک لکڑی کا احاطہ ہوتا تھا جس پر سفید رنگ و روغن کیا ہوتا تھا اور عموماً اس کی دیکھ بھال اور مرمت باقاعدہ ہوتی رہتی تھی۔ صدر دروازے سے اندر مکان کے دروازے تک اینٹوں کا پکا فرش ہوتا تھا۔ رہائشی مکان کافی وسیع، مربع نما دو منزلہ ہوتے تھے۔ ان پر بھی سفید رنگ و روغن ہوتا تھا۔ ان مکانوں میں بنی ہوئی برساتی کی شکل ہو بہو یونانی مندروں کی سی ہوتی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کورنتھیا (یونان) کے شہروں میں جو شاندار منقش کھمبے اور کارنس ہوتے تھے وہ سفید صنوبر کی لکڑی کے بنے ہوتے تھے اور ان پر پالش ہوتی تھی نیز انکے دروازوں پہ آہنی کھٹکے اور پیتل کی گھنڈیاں ہوتی تھیں۔ رنگ اور پالش اتر جانے کی وجہ سے وہ نقلی اور مصنوعی معلوم

ہوتے تھے جنھیں دیکھ کر افسوس ہوتا تھا۔ جبکہ یہاں سیبی کے کنارے مکانوں کا نقشہ کچھ اسطرح کا
تھا۔ مکان کا ہال قالین سے مبرا ہے۔ اس کا فرش لکڑی کے تختوں کا بنا ہے۔ ہال سے نکل کر ایک
پندرہ فٹ چوکور بیٹھک ہے۔ کسی کسی مکان میں ہی بیٹھک پانچ یا دس فٹ زیادہ بڑی ہوتی ہے
اسمیں رنگین چہ خانہ دار قالین بچھا ہے۔ درمیان میں مہاگنی کی بنی ہوئی ایک میز رکھی ہے جس پر ایک
لیمپ لوہے کے اسٹینڈ پر رکھا ہوا ہے اور اس پر سبز رنگ کے کاغذ کا ایک سرپوش ہے۔ یہ لیمپ
کپڑے کی جالی میں جسے گھر کی نوجوان لڑکیوں نے شوخ رنگ کے ڈوروں سے بُنا ہے رکھا رہتا ہے
اس جالی کو یہ لوگ لیمپ کی چٹائی یا زیبا نداز کہتے ہیں۔ میز کے ایک طرف مختلف کتابوں کا ڈھیر
ایک خاص انداز میں لگا ہوا ہے۔ یہ انداز اس گھر کے مکینوں کو ورثہ میں ملا ہے اور اس انداز میں
رتی برابر بھی فرق نہیں آتا ان کتابوں میں ایک کتاب ڈیٹو پر ہے جس پر پینسل کے نشانات کثرت سے
نظر آتے ہیں اور دوسری مخصوص کتابیں "فرینڈ شپس آف رنگ" اور "افیکشنس ریتھ" ہیں
جنکو اس حماقت سے رٹا گیا ہے کہ بار بار ہاتھ لگنے سے ان کی جلدوں کے رنگ بھی اڑ گئے ہیں۔
اسکے علاوہ دوسری کتابوں میں 'اوسین' اور 'ایلن زوا بنڈ بلیسا' ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں
'اِوان ہو' بھی ہو۔ ایک 'البم' ہے جس کی تصاویر کے نیچے عاشقانہ قسم کی طبع زاد شاعری کی بھرمار
ملتی ہے مثلاً اس میں اس عنوان کی نظمیں ملتی ہیں "تو نے توڑا اسکے دل کو جس نے تجھ سے محبت
کی" علاوہ ازیں یہاں سالزبری ملیبی کا گڈ ربہ جیسی دو تین دلچسپ اور متبرک کتابیں بھی رکھی
ہیں۔ مصنف گوڈے کی کتاب بیڈ لیک کا تازہ ترین شمارہ بھی رکھا ہوا ہے جسکے سرورق پر موم پر
بنی ہوئی کچھ عورتوں کی تصویریں ہیں جنکے نھا یک جیسے ہیں بلکیں اور لب ایک ہی ناپ کے ہیں۔
ہر عورت کا قد پانچ فٹ کا ہے۔ ان کے لباس سے ایک یا دو انچ کی پٹی لٹک رہی ہے یہ لباس
آدھے پیروں تک لٹکتا ہے۔ گھر میں ایک پالش شدہ اسٹو بھی ہے جو ہوا بستہ ہے اور جو ایک نئی اور
ہلاک ایجاد ہے جس نے فریم اور عمدہ قسم کی انگیٹھیوں کو پس پردہ ڈال دیا ہے۔ آتش دان کے
اوپر لکڑی کا ایک مچان ہے جسکے دونوں سروں پر ایک ایک ٹوکری رکھی ہے۔ ہر ٹوکری میں
موم یا سفید مٹی کے آڑو شفتالو اور دوسرے پھل ہیں۔ ان پھلوں میں اصلیت پیدا کرنے
کے لئے رنگ و روغن بھی کیا ہوا ہے مگر اصلیت کو ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے اسی

مچان کے درمیان لکڑی پر کھدی ہوئی ایک تصویر رکھی ہے۔ تصویر میں جنرل واشنگٹن ڈیلاویر سے گذر رہے ہیں۔ دروازے کے پاس دیوار پر گھر کی کسی نوجوان حسینہ نے اس تصویر کی ایک نقل بھی بنائی ہے جو گہرے اور ہلکے رنگ کی کشیدہ کاری کے ڈوروں سے بنائی گئی ہے۔ اگر جنرل واشنگٹن اپنی اس عمدہ تصویر کو دیکھ لیتے تو وہ یقیناً ڈیلاویر پار کرنے میں جھجک محسوس کرتے بشرطیکہ انھیں یہ علم ہو جاتا کہ اس سے یہ فائدہ اٹھایا جائے گا۔ یہاں پر ایک پیانو بھی رکھا ہے جو بظاہر ایک کیتلی معلوم ہوتا ہے یہ موسیقی میں ڈوبا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ قریب ہی ایک تپائی پر کچھ جلد والی اور کچھ بنا جلد کی کتابیں رکھی ہیں جنکے نام ہیں "برگ کی لڑائی" "برڈھالو" "ارکنسا کا سیاح" "اوران دی بو" "مارسیلز کا راگ" سینٹ ہیلینا کے ایک ویران اور سنسان جزیرے پر "آخری کڑی ٹوٹ گئی" "اس آخری رات کو جب تم ملے تھے تو اس نے گلاب کے پھولوں کا گجرا پہن رکھا تھا" "مجھے بھول جاؤ" "اس پیشانی پر رنج و غم اپنا سایہ کیوں ڈالیں" "وہ لمحات جنکی یاد ایام گذشتہ میں عزیز ترین تھی" "غیر حاضری کے ایام" "سمندر کی لہروں پر زندگی اور موجزن سمندر پہ مسکن" "سمندر پہ چڑیا" وغیرہ وغیرہ۔ نیز کتب دان پر بھی چند کتابیں بکھری پڑی ہیں جنھیں مغموم و اداس موسیقار یہاں چھوڑ گیا ہے۔ جن کے نام یہ ہیں "رو پہلی چاندنی میں تفریح" "سیاح کی رہنمائی کیجیے" وغیرہ وغیرہ۔ پیانو کے سہارے غمناک کیف میں ڈوبا ایک چھتارہ کھڑا ہے۔ اگر تم ایک بار اس پر مضراب لگا دو تو یہ چھتارا اپنے آپ ہسپانیہ کے رقص کی دھن نکال سکتا ہے۔ دیواروں پر جگہ جگہ فنِ مصوری کے عجیب و غریب نمونے بنے ہوئے ہیں جنمیں نیک آدمیوں کے اقوال لکھے ہوئے ہیں یہ کہیں کہیں رنگین ڈوروں سے کپڑے پر کڑھے ہیں اور کہیں خشک گھاس سے بنائے گئے ہیں۔ یہ قول موجودہ تجارت کے مقولے ہیں جنکا خیال "اللہ ہمارے گھروں میں برکت دے" کے مفہوم سے ملتا جلتا ہے۔ سیاہ آرائشی حاشیوں سے لیس فنِ مصوری کے دوسرے نمونے بھی ہیں جن کو جوان حسیناؤں نے ایک خاص انداز میں سیاہ اور سفید کھریا مٹی سے بنایا ہے۔ یہ قدرتی مناظر کے نمونے ہیں جن میں ایک جھیل اور اس میں تیرتی ہوئی ایک بادبانی کشتی، آسمان میں چند گھنے بادل جھیل کے کناروں پر کھڑے بابا آدم کے زمانے کے درخت اور ایک طرف کو جھکی

سنگِ موسیٰ کی عمودی چٹان اور کونے میں نمایاں طور پر کھڑے ایک مجرم کا نام وغیرہ شامل ہیں۔ پتھر کے نقوش میں ایک جگہ نیپولین کو کوہِ ایلپس طے کرتا ہوا دکھایا گیا ہے۔ ایک دوسری جگہ سینٹ ہیلنا میں اسکی قبر دکھائی گئی ہے لوہے کی مورتیوں میں بنکر کی پہاڑی پر ڑمیل کی لڑائی کی تصویر اور جالی رچ میں مصوریں کا محاصرین پر حملہ وغیرہ شامل ہیں۔ کچھ تانبے کی مورتیاں بھی ہیں جن میں حضرت موسیٰ کا پہاڑ پر بھٹکنا اور مُسرف لڑکے کی واپسی دکھائی گئی ہے سنہری چوکھٹے کے اندر بھی ایک تصویر ہے جس میں ایک کُنبے کے لوگوں کی تصویر ہے۔ اس تصویر میں باپ ریاست ہائے متحدہ کے آئین کی کتاب لئے ہوئے ہے اور ماں کے سہارے ایک چھتارہ کھڑا ہے جسکی گردن پر نیلے ربن لہرا رہے ہیں۔ نوجوان لڑکیاں بچّوں جیسے چپل اور کور لگے ہوئے پاجامے پہنے ہوئے ہیں ایک لڑکی کی گود میں ایک گھوڑے کا کھلونا ہے۔ دوسری لڑکی بلّی کو سوت کی گیند سے کھلا رہی ہے اور دونوں اپنی ماں کو دیکھ کر مسکرا رہی ہیں اور جواب میں ماں بھی مسکرا رہی ہے۔ یہ لوگ اس تصویر میں ہشاش بشاش اور سرخ چہرے والے اور بظاہر بہت چُست معلوم ہوتے ہیں۔ اس تصویر کے بالکل سامنے ایک ملمع کے چوکھٹے میں ایک اور تصویر ہے جمیں دادی اور دادا کی تصویریں ہیں۔ یہ تصویریں اسوقت کی ہیں جب ان کی عمر بائیس[۲۲] اور تیس[۳۰] برس کی تھی۔ انکے اعضا سخت ہیں۔ وہ قدامت پسند لگتے ہیں اور بڑے اونچے کالردار اور جھالردار آستینوں کے لباس میں ملبوس ہیں۔ گہری تاریکی کے پس منظر میں انکے چہرے بے رونق دکھائی دیتے ہیں۔ ایک فرانسیسی گھنٹے کے شیشے کے ڈھکن کے اندر سفید موم کے بنے ہوئے پھولوں کا گلدستہ رکھا ہوا ہے۔ ایک کونے میں متفرق چیزوں کا ایک مخروطی شکل کا انبار لگا ہے۔ طاقوں میں خاصکر اس زمانے کی نادر اشیار کو زیادہ سے زیادہ دلکش انداز میں نمایاں طور پر سجایا گیا ہے مثلاً ایک دھات کا خول ہے جس پر عیسائیوں کی مشہور و معروف دعا کندہ ہے۔ دوسرا خول جوانڈے کی شکل کا ہے اس میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک تین انچ لمبا باریک سوراخ ہے جس پر جنرل واشنگٹن کی تصویر کندہ ہے۔ گو وہ اچھی بنی ہوئی نہیں ہے۔ پہلے اس خول پر صرف واشنگٹن کے ذہن کی تصویر تھی اور مقصود نے اسی سے ان کی پوری تصویر بنائی ہوگی یہ دونوں خول اپنی شادی کے یادگاری تحفوں کے بطور اس خاندان

کے میاں بیوی نے نیو اورلینز اور فریچ مارکٹ سے جہاں وہ اپنی شادی کے فوراً بعد گئے ہونگے خریدے ہوں گے۔ یہاں کے نادرات میں کیلیفورنیا کے نادرات ہیں جیسے کہ سنگ مردہ جس میں ایک طرف سونے کا چھوٹا سا ابھار ہے، ایک پرانا طلائی سکوں کا لاکٹ ہے جسمیں خاندان کے پرانے لوگوں کے بالوں کا بُنا ہوا حلقہ ہے، سنگ چقماق سے بنے قبائلیوں کے تیر اور ایک بزرگ کے جو شمالی میدان کے پار چلے گئے تھے ہرن کے کھال کے دانے دار جوتے، مختلف رنگوں کی تین ٹوکریاں جنکے تاروں کے فریم میں شکر جیسی پھٹکری کے شش پہلو ٹکڑے پھنسا دئے گئے ہیں۔ انھیں گھر کی لڑکیوں نے بنایا ہے۔ ایسی کئی کئی ٹوکریاں اس خطے میں ہر گھر میں بآسانی ملسکتی ہیں۔ سوکھے ہوئے کیڑے مکوڑوں اور تتلیوں کو گتّے کی دفتی پر ایک پن سے ٹانک کر رکھنے کا یہاں عوام رواج ہے۔ گھر کے اندر ایک دھوکنی بھی ہے جسکا منہ ایک رنگیں کتّے کے کھلونے کا ہے۔ دھوکنی کو دبانے سے کتّے کا نچلا جبڑا نیچے گرجاتا ہے اور چوں چوں کی آواز نکلتی ہے۔ بنز قند کا بنا ہوا ایک خرگوش بھی رکھا ہے جسکے بازو اور منہ ایک دوسرے سے اتنے مدغم ہوگئے ہیں کہ وہ علیحدہ علیحدہ نظر نہیں آتے۔ صدارتی چناؤ میں استعمال ہونے والے جستی تمغے بھی رکھے ہیں۔ گتّے کا بنا ہوا ایک آرہ کش بھی ہے جسکو اسٹوو کی نلی کیساتھ لگا دیا گیا ہے اور جو اس اسٹوو کی گرمی سے متحرک ہوتا ہے۔ نپولین کا ایک چھوٹا سا موم کا پُتلا بھی ہے۔ علاوہ ازیں تانبے کے بہت سے پتھروں پر دھندلے دھندلے نقوش کندہ ہیں۔ جن میں بچے۔ انکے والدین۔ بھتیجے، چچیرے بھائی بہن خالائیں۔ دستور کے مطابق مختلف انداز میں دکھائے گئے ہیں۔ مکان کی پشت پر کوئی محراب دار برساتی نہیں ہے مصنوعی قدرتی مناظر دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ فوٹوگرافی کی دین ہے۔ ان تمام غیر واضح تصاویر کے گرد متعدد زنجیروں کا ایک حلقہ بنا دیا گیا ہے۔ فریموں کی وضعات کو نمایاں اور محفوظ کرنے کے لئے ان پر گہری سنہری اور سانولی رنگ کی دھاریاں اور دھبّے ڈال دئے گئے ہیں۔ ان تصویروں کو بہت صاف کیا گیا ہے اور انکو اچھی طرح دیواروں پر جمایا گیا ہے۔ ان تصویروں کے افراد اوار کے تنگ جاموں ... میں ملبوس ہونے کی وجہ سے بیچین سے نظر آتے ہیں۔ انکے کپڑوں کا فیشن دیکھ کر حاضرین کے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ان ملبوسات کا کبھی رواج تھا بھی یا نہیں۔ اکثر میاں بیوی عموماً تصویروں میں اکٹھے نظر آتے ہیں۔ خاوند بیٹھا

ہوا ہے اور بیوی اسکے کندھوں پر ہاتھ رکھے کھڑی ہے۔ امتدادِ وقت کے ساتھ ساتھ ان تصویروں کا رنگ بہت ہلکا پڑ گیا ہے پھر بھی تصویریں اپنی جگہ پر قائم ہیں اور ان میں فوٹوگرافر کا ہنر نمایاں ہے فوٹوگرافر نے اِن لوگوں کا فوٹو کھینچتے وقت ان سے ضرور کہا ہوگا کہ "مہربانی کرکے ذرا مسکرا دیتے"۔ متفرقات کی الماری جو مقدس ترین مانی جاتی ہے کے اوپر آبی رنگوں سے بنی ہوئی ایک ہنرمناک تصویر رکھی ہے۔ جس کو کچھ عرصہ ہوا انکی جوان بھابی نے اسوقت بنایا ہوگا جب وہ یہاں آئی ہوگی افسوس کہ اب وہ اس جہانِ فانی میں نہیں ہے۔ اسلئے اب تو اس تصویر کو دیکھ کر اس لڑکی پر رحم ہی آتا ہے کیونکہ اگر وہ اسوقت زندہ ہوتی تو اپنے کئے پر خود شرمسار ہوتی۔ کمرے میں گھوڑے کے بالوں سے بنی ہوئی کرسیاں اور صوفے ہیں جن پر بیٹھ کر آپ نیچے کو پھسلتے رہیں گے۔ کھڑکیوں پر روغنی پردے پڑے ہیں جن پر گوالنوں کی تصویروں اور قلعوں کے کھنڈرات کو شوخ رنگ کی پنسلوں سے بنایا گیا ہے۔ بھڑکیلے رنگوں والے مٹی کے تختوں سے لٹکتے ہوئے سنہرے رنگ کے پردے دروازوں اور کھڑکیوں کو ڈھکے ہوئے ہیں۔ خواب گاہ میں بوسیدہ قالین بچھے ہیں۔ بالوں سے بنے ہوئے پلنگ ہیں جنکے بیچ میں جھول ہیں کیونکہ انکو کسا نہیں گیا ہے۔ پیروں کے بستروں سے بدبو آرہی ہے کیونکہ اِنکو ہوا اور دھوپ میں نہیں رکھا گیا ہے۔ کرسیوں کی سیٹ بید کی ہے۔ جھولے والی کرسی کی سیٹ لکڑی کی ہے۔ اسکول کی سلیٹ کے سائز کا ایک آئینہ دیوار پر لگا ہوا ہے جس کا فریم عمدہ قسم کی لکڑی کا ہے۔ ایک لکھنے کی میز ہے جو انھیں آباو اجداد سے ورثہ میں ملی ہے۔ ایک صراحی اور ہاتھ دھونے کا ایک کونڈا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کا ہونا یقینی نہیں ہے۔ پیتل کا شمع دان اور چربی کی شمع اور گل گیر بھی رکھے ہیں۔ انکے علاوہ کمرے میں اور کچھ نہیں ہے۔ مکان میں غسلخانے نہیں ہیں اور جو ملاقاتی ایکبار مکان دیکھ جاتا ہے اسکے دوبارہ یہاں آنے کا امکان کم ہی ہوتا ہے۔

یہ ہے صاحب ثروت شہریوں کے مکانوں کا نقشہ جو نیو اورلینز کے گرد و نواح سے لے کر سینٹ لوئی تک ہر جگہ ملیں گے۔ جب ایسا کوئی صاحب ثروت آدمی کسی بڑی شاندار کشتی میں سوار ہوتا ہے تو گویا وہ ایک حیرت انگیز طلسمی دنیا میں آجاتا ہے۔ کشتی کی چمنیوں کا بالائی حصہ پروں کے پھیلے ہوئے تاج جیسا معلوم ہوتا ہے اور اکثر اس پر سرخ پالش لگی ہوتی ہے۔ پائلٹ ہاؤس ہری کیبن ڈیک اور بوائلر ڈیک کی سیٹیں سب سفید لکڑی کی بنی ہیں اور عجیب د

عنوب بچی کاری کے کام سے آراستہ ہیں۔ کرینوں[1] کے سروں پر شاہ بلوط کی لکڑی کی سنہری مٹھیں لگی ہوئی ہیں اور گھنٹے کے اوپر ہرن کے سنہرے سینگوں سے آرائش کی گئی ہے۔ چھت کے بالائی خول پر نہایت شوخ رنگ کی تصویریں ہیں جو کسی نہ کسی چیز کا علامیہ ہیں۔ وسیع اور کشادہ ہوا ئلرڈیک پر نیلے رنگ کی پالش ہو رہی ہے اور وہاں بونڈ سرکی آرام کرسیاں پڑی ہیں۔ اس ڈیک کے اندر ایک سفید کیبن دور تک چلی گئی ہے جسکے کمرے کے دروازوں پر چینی کی گھنڈیاں اور رنگ وروغن کئے ہوئے پردے پڑے رہتے ہیں۔ لکڑی کے خمدار نقش ونگار، جن پر ملمع ہو رہا ہے اوپر سے نیچے تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر چھوٹے راستے پر بھی بڑے بڑے جھاڑ فانوس روشن ہیں۔ ہر فانوس کے اندر روشنی کے نظارے سے موسم بہار کی رم جھم کرتی پھوار کا لطف آتا ہے۔ روشن دانوں کے رنگین شیشوں سے ہر جگہ کمرے میں خوبصورت قوس قزح کے رنگوں کی پرچھائیاں پڑتی ہیں۔ تمام راستہ دُور تک تاباں اور درخشاں سرنگ معلوم ہوتی ہے یہ ایک حیرت انگیز اور روح افزا منظر ہے۔ عورتوں کے کمروں میں ہلکے گلابی اور سفید ولٹن کے غالیچے بچھے ہیں جو بیحد ملائم ہیں۔ اس پر بنائے ہوئے خوبصورت اور دلکش پھول غالیچہ کے حسن کو دوبالا کر رہے ہیں۔ اس جگہ پر ایک عروسی کمرہ بھی ہے۔ جس شہوانی جذبے کے تحت اُسے بنوایا گیا ہے وہ ابھی بدستور قائم ہے اور اس میں کوئی تبدیلی ظہور پذیر نہیں ہوئی ہے۔ اس کمرے میں جو مصنوعی غذائیں دیجاتی تھیں وہ ان لوگوں کو ضرورت سے زیادہ مرغوب تھیں جو صرف[2] "ماشاء اللہ" اور "مرحبا" کہنا ہی جانتے تھے۔ ہر شاندار کمرے میں دو آرام دہ اور صاف برتھیں تھیں اور غالباً ایک آئینہ اور ایک مختصر سی خواب گاہ بھی تھی۔ کبھی کبھی بہار، صراحی اور سلفچی بھی پائی جاتی تھیں نیز تولیہ کا ایک ٹکڑا بھی ہے جس کو دیکھ کر جاننے والا اندازہ لگا کہ یہ مچھر دانی میں سے کاٹا گیا ہے۔ لیکن یہ چیزیں ہر کشتی میں نہیں ہوتیں۔ لمبی آستینوں کی قمیص پہنے ہوئے مسافر ہاتھ منہ دھونے اور گرد و غبار سے جسم پاک کرنے کے لئے حجام کی دکان پر آتے ہیں۔ یہاں عوامی تولئے صابن اور کنگھے بھی رکھے رہتے ہیں۔

اب ذرا اس دخانی کشتی کا تصور کیجئے جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے آپ کو یہ نہایت

---

[1] بوجھ اٹھانے والی مشینیں۔ [2] سونے کی سیٹیں۔

خوبصورت، دلکش اور حسب توقع آرام دہ معلوم ہوگی اور اسی کشتی پر دھول کی ایک محنت نہ جلاود تو وہ قدیم زمانے کی سنسنائی کی کشتی بن جائے گی جسکا ذکر میں کچھ پہلے کر چکا ہوں۔ مگر نئی اور پرانی کشتیوں کا امتیاز محض ظاہری شکل و صورت کا نہیں ہے۔ اندر کافی تبدیلی ہوئی ہے۔ آجکل کی دخانی کشتی میں مینجر کے کمرے کے علاوہ ہر کمرے میں قابل افسران تعینات رہتے ہیں یہ بات پہلے نہیں تھی۔

اگر سنسنائی والی کشتی کو اچھی طرح صاف کر کے اس پر دوبارہ رنگ و روغن کر دیا جائے تو پھر وہ پرانے سیلابی زمانے کی ایک قابل تعریف کشتی بن جائے گی کیونکہ اسوقت سے ابتک مغربی ممالک میں تو دخانی کشتیوں کے فن تعمیر میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہے اور نہ دخانی جہاز کے فرنیچر اور آرائش کے سامان میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے۔

انتالیسواں باب

صنعت کار اور بے ایمان

کس برگ کے نواحی علاقے میں پہلے دریائے مسیسپی سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا چلتا تھا اس وجہ سے اسکا تمام راستہ ٹیڑھا میڑھا تھا لیکن اب اس کا راستہ مقابلتاً سیدھا ہو گیا ہے اور اس کی لمبائی ستر میل سے گھٹ کر سینتیس میل رہ گئی ہے۔ اسی تبدیلی سے وکسبرگ کا نواحی شہر ڈیلٹا واقع ہوئی آناب دیہاتی علاقے میں جا پڑا ہے اور اب اُسکی وہ اہمیت ختم ہو گئی ہے جو دریائی شہر ہونے کی وجہ سے تھی۔ اس کے ساحل سے دریا ہٹ گیا ہے اور وہاں ریت کا ٹیلہ بن گیا ہے جس پر گھنے درخت اُگ آئے ہیں اور رفتہ رفتہ وہاں ایک گھنا جنگل

بن رہا ہے جو کبھی اس پس پشت پڑے ہوئے شہر کو بالکل ڈھک لیگا۔

ہم ٹھیک وقت پر گرانڈ گلف اور روڈنے سے جو جنگ کیوجہ سے مشہور ہیں گذر کر نیچز پہونچ گئے جو آخری پہاڑی شہر ہے اور خاصی خوبصورت جگہ ہے کیونکہ بیٹن روج جو ابھی نہیں گذرا تھا پہاڑی شہر نہیں ہے یہ صرف ایک اونچے ٹیلے پر واقع ہے۔ پہاڑی کے دامن میں بسے ہوئے مشہور نیچز شہر کی ظاہری حالت میں گذشتہ بیس برسوں میں کوئی اہم تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور اگر قدیم غیر ملکی سیاحوں کے بیانات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ گذشتہ ساٹھ برسوں میں یہاں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ کیونکہ اب بھی یہ ایک ادنیٰ کم آباد اور بد وضع سا شہر ہے۔ یہاں کے مکین اوباش اور غنڈے ہوا کرتے تھے اور قدیم بار بانی اور دخانی کشتی کے ابتدائی زمانے میں دریا کے کنارے رہتے تھے۔ یہ گنوار لوگ شراب بہت پیتے تھے اور بدمست ہو کر بدمستی کرتے مُکّے بازی اور قتل وغارت تک سے بھی گریز نہیں کرتے تھے۔ لیکن پہاڑی کے اوپر والے نیچز کا حصہ بہت خوبصورت ہے اور یہ ہمیشہ خوبصورت رہا ہے۔ مسز ٹرولوپ نے (جو ۱۸۲۷ء میں یہاں تشریف لائی تھیں) اس شہر کے دلکش ہونے کا اعتراف کیا تھا۔ وہ کہتی ہیں۔

"اس بے انتہا لمبے پہاڑی سلسلے کے درمیان ایک یا دو جگہ بلف ہیں۔ بلف ان خالی جگہوں کو کہتے ہیں جو پہاڑی سلسلے کے درمیان جگہ جگہ واقع ہیں۔ انھیں جگہوں میں سے ایک جگہ نیچز بھی ہے جو بڑی خوبصورت ہے اور ایک اونچی پہاڑی پر بسی ہوئی ہے۔ ایک طرف تو چمکیلی چڑھی پہاڑی ہے اور دوسری طرف کالے جنگلوں کی دھندلی سی قطار ہے جو ہر طرف پھیلی ہوئی ہے یہ نظارہ بڑا خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں پاپا کے گھنے درخت۔ کھجور اور نارنگی کے باغات اور بھینی بھینی خوشبو والے بہت سے پھول جو وہاں اگتے ہیں ان سب چیزوں کے یکجا ہونے کے طفیل نیچز ایسا خوبصورت لگتا ہے جیسے کسی ریگستان میں نخلستان۔ شمال میں نیچز ہی وہ جگہ ہے جہاں نارنگیاں کھلے میدانوں میں پک سکتی ہیں کیونکہ یہاں یہ درخت بغیر کسی حفاظت کے سردی کو برداشت کر سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس دلفریب جگہ کو چھوڑ کر دیگر سارے چھوٹے چھوٹے قصبے اور دیہات جن سے ہم گذرتے تھے، انتہائی کریہ المنظر اور بد صورت تھے۔

نیچز میں بھی نزدیک اور دور کے دیگر دریائی شہروں کی طرح ریلوں کا جال بچھا ہوا ہے اور یہ جال بڑھتا ہی جا رہا ہے اور دور افتادہ متموّل شہروں کو جو اس کی خوشحالی میں مددگار ہیں ۔ اسکے ذریعہ ملایا جا رہا ہے۔ نیو آرلئینز اور وکسبرگ کی مانند نیچز کا اپنا برف کا کارخانہ ہے جہاں تیس ٹن برف روزانہ بنتی ہے میرے زمانے میں برف ایک ایسا قیمتی زیور تھی جسے صرف امیر لوگ ہی پہن سکتے تھے مگر اب اسے ہر کس و ناکس خرید سکتا ہے ۔ میں نیو آرلئینز میں ایک برف کا کارخانہ دیکھنے گیا۔ میں یہ جاننا چاہتا کہ اگر قطبین کو گھسیٹ کر منطقہ حارہ کے قریب کر دیا جائے تو کیسا لگے گا۔ مگر یہاں کوئی خاص بات نہیں تھی ۔ یہ محض ایک کشادہ مکان تھا جس میں ایک طرف کچھ دخانی مشینیں رکھی تھیں اور دوسری طرف کچھ چینی مٹی کے موٹے موٹے پائپ اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے تھے ۔ نہیں ۔ یہ پائپ چینی مٹی کے نہیں تھے یہ مٹی کے نظر آتے تھے مگر دراصل لوہے کے تھے ۔ انکے اوپر امونیا گیس گذاری جاتی تھی جسکی وجہ سے ان کے اوپر ہاتھ کی موٹائی کے برابر برف کی ٹھوس اور دودھ جیسی سفید تہہ جم گئی تھی ۔ بظاہر اسے پگھل جانا چاہیئے تھا کیونکہ یہاں گرمی رہتی ہے اس فضا میں کبھی گرم کپڑے پہننے کی ضرورت نہیں پڑتی مگر یہ اسلئے نہیں پگھلتی کہ ان پائپوں کا اندرونی حصہ انتہائی سرد تھا۔

یہاں ٹین کے اَن گنت بکس فرش میں گڑے ہوئے تھے ۔ یہ ایک فٹ لمبے چوڑے اور دو فٹ گہرے اور اوپر کی طرف سے کھلے ہوئے تھے ۔ ان میں شفاف پانی بھرا رہتا تھا ہر بکس کے گرد نمک اور کچھ دیگر ضروری اشیاء کا مرکب کچا کچ بھرا رہتا تھا۔ کسی نہ کسی طریقہ سے امونیا گیس وغیرہ کو پانی پر گذارا جاتا تھا۔ یہ طریقہ عمل میری سمجھ میں نہیں آیا اور یہ میرے لئے ہمیشہ ایک راز ہی رہیگا۔

جب پانی جمنے لگتا تو لوگ ان کو ایک یا دو بار ڈنڈے سے ہلا دیتے تھے۔ میرے خیال سے ایسا یہ اسلئے کیا جاتا تھا کہ پانی میں سے ہوا کے بلبلے نکل جائیں۔ دوسرے لوگ ان بکسوں کو جن میں پانی سخت جم جاتا تھا مسلسل باہر نکال کر رکھتے تھے۔ پھر وہ ان بکسوں کو اُبلتے ہوئے پانی کی ایک بڑی ناند میں ڈبوتے تھے تاکہ برف کے ڈھیلے پگھل کر بکسوں سے علیحدہ ہو جائیں اور پھر برف کو باہر نکال کر گاڑیوں پر لاد دیتے تھے تاکہ اُسے بازار میں لیجا کر فروخت کیا جا سکے ۔ یہ بڑے بڑے شش پہلو ٹکڑے ٹھوس سخت اور بلور کی طرح شفاف ہوتے تھے ۔ ان میں سے کچھ کے اندر تازہ پھول

کے گلدستے اور گرم آب و ہوا کے تازے چمکدار پھول بھی جما دیئے جاتے تھے۔ کسی میں تو ریشمی لباس میں سجی ہوئی فرانسیسی گڑیاں یا دیگر دلکش چیزیں بھی جمادی جاتی تھیں۔ ان برف کے ٹکڑوں کو قابوں میں لگا کر کھانے کی میز کے درمیان میں رکھا جاتا تھا تاکہ گرم ہوا ٹھنڈی ہو جائے اور ساتھ ہی ساتھ کمرے کی زینت بھی بڑھ جائے کیونکہ برف کی ان سلوں کے اندر جمی ہوئی چیزیں ایسے دکھائی دیتی تھیں جیسے کسی شیشے میں رکھی ہوں۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ فیکٹری چھ سات ڈالر فی ٹن کے حساب سے اپنی برف کو ایک گاڑی کے ذریعہ نیو آرلینز کے چھوٹے سے چھوٹے گھرانے تک کو اسکی حسب ضرورت برف مہیا کرتی تھی اور اس طرح اچھا خاصا منافع کماتی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ برف کے کارخانوں کے لئے شمالی علاقوں میں تجارت کا اچھا میدان ہے کیونکہ ہمیں وہاں اسطرح برف نہیں ملتی۔ اگر کوئی شخص ساڑھے تین سو پونڈ سے کم برف لینا چاہے تو اسے نہیں ملتی۔

نیچز کے سوت کے کارخانے میں جو 'روسیلی یارن مل' کہلاتا ہے چھ ہزار تکلے اور ایکسو ساٹھ کرگھے ہیں اور یہاں سو کاریگر کام کرتے ہیں۔ نیچز کاٹن مل کمپنی نے اب سے چار سال پیشتر پچاس فٹ چوڑی اور ایکسو ساٹھ فٹ لمبی دو منزلہ عمارت میں کام شروع کیا تھا۔ اسوقت یہاں چار ہزار تکلے اور ایکسو اٹھائیس کرگھے تھے۔ اس میں ایک لاکھ پانچ ہزار ڈالر کا سرمایہ جو سب شہریوں نے چندہ سے جمع کیا تھا لگا ہوا تھا۔ اسکے دو سال بعد ہی سرمایہ داروں نے اپنے سرمایہ کو سوا دو لاکھ ڈالر تک بڑھا دیا۔ کارخانے میں تیسری منزل کا اضافہ ہو گیا اور کارخانے کی لمبائی ۳۱۴ فٹ ہو گئی۔ زیادہ مال برآمد کرنے کی وجہ سے کارخانے میں مزید مشینیں لگا دی گئیں۔ سوت بنانے کے لئے مشینوں کی تعداد دس ہزار تین تک پہونچ گئی اور تین سو کرگھے بیک وقت کام کرنے لگے کمپنی میں اب ڈھائی سو کاریگر کام کرتے ہیں جن میں سے زیادہ تر نیچز کے باشندے ہیں کارخانے میں ہر سال روئی کی پچاس ہزار گانٹھیں تیار ہوتی ہیں اور اعلیٰ درجے کی قمیصوں، چادروں اور زین کی قسم کا کپڑا بنتا ہے ہر سال پچاس لاکھ گز کپڑا یہاں سے بن کر نکلتا ہے۔ یہ کمپنی ایک محدود کارپوریشن ہے اس کے ایک شیئر کی قیمت پانچ ہزار ڈالر ہے لیکن اس کے شیئر مارکیٹ میں نہیں ملتے۔

دریائے مسیسپی میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں وہ غیر معمولی اور نہایت عجیب و غریب ہیں۔

لیکن ایسی تبدیلیوں کی توقع پہلے سے کیجاتی تھی مگر مجھے امید نہیں تھی کہ میں اپنی زندگی میں نیچز اور دریا کے کنارے آباد شہروں کو صنعتی ادارے اور ریلوں کے مرکز بننے دیکھ سکونگا۔

اب جبکہ میں صنعت کاروں کا ذکر کرنے لگا ہوں تو مجھے ان سے متعلق ایک بات یاد آرہی ہے۔ جس کو میں نے سن سنائی کشتی میں سفر کرتے ہوئے سنا تھا۔ یا یوں کہیئے کہ میں نے سُن لیا تھا۔ ایکدن میں سوتے سوتے چونک اٹھا۔ کچھ بے ربط سی باتیں میرے کانوں میں آرہی تھیں۔ میں جھنجھلا کر اٹھا۔ اور میں نے دو آدمیوں کو آپس میں باتیں کرتے ہوئے سُنا ۔ غالباً طغیانی کے موضوع پر باتیں ہورہی تھیں۔ میں نے کھُلے دریچے سے باہر دیکھا۔ دو آدمی ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے ۔ اور صبح کا ناشتہ کر رہے تھے، گو ناشتہ کا وقت نکل چکا تھا۔ وہاں اور کوئی نہیں تھا۔ دو چار جملوں کے بعد انھوں نے طغیانی کے موضوع کو ختم کردیا۔ غالباً یہ بات انھوں نے تکلف کی دیوار کو ڈھانے اور آپس میں جان پہچان بڑھانے کی غرض سے کی ہوگی ۔ پھر وہ کاروباری باتوں میں مشغول ہوگئے۔ جس سے جلد ہی یہ ظاہر ہوگیا کہ یہ لوگ تجارتوں کے ایجنٹ تھے ۔ ان میں سے ایک سن سنائی اور دوسرا نیو آرلئنز کا شہری تھا یہ آدمی بڑے چالاک، پھرتیلے اور باتونی تھے۔ ڈالر ان کا خدا تھا اور اس کو حاصل کرنا ان کا مذہب۔

سن سنائی کے شہری نے بظاہر مکھن جیسی ٹکیا سے کچھ مکھن چاقو کے پھل پر اٹھا کر دکھلاتے ہوئے کہا۔ دیکھیئے صاحب یہ ہمارے یہاں کا بنا ہوا ہے۔ اسکو غور سے دیکھیئے سونگھیئے اور چکھ کر اطمینان کر لیجئے یا آپ جسطرح چاہیں اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ جتنا وقت درکار ہو لگایئے مگر کماحقہ تجربہ کیجئے۔ پھر بتایئے کہ اسکے بارے میں آپکا کیا خیال ہے؟ کیا یہ مکھن نہیں ہے۔؟ لیکن غور سے دیکھنے سے یہ مکھن نہیں معلوم ہوگا۔ یہ تو نقلی مکھن ہے۔ جی ہاں جناب جو میں کہہ رہا ہوں صحیح کہہ رہا ہوں۔ یہ نقلی ہے۔ بخدا آپ اس میں اور مکھن میں امتیاز نہیں کر سکتے۔ اور کوئی ماہر بھی نہیں کرسکتا۔ اس کو ہم بناتے ہیں اور مغربی علاقہ میں قریب قریب تمام کشتیوں کو سپلائی کرتے ہیں۔ ان کشتیوں میں مشکل ہی سے آپکو ایک پونڈ مکھن ملے گا۔ ہم آہستہ آہستہ اسی لفظ مکھن کو مقبول کر رہے ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ اس پروپگنڈے کے بل پر ہم نے کاروبار کو بڑی جلدی بڑھالیا ہے۔ ہم جلد ہی اس علاقہ

ہیں مکھن کا تمام کاروبار اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ اور وہاں ہوٹلوں میں مکھن سپلائی کرنے کا کام بھی سنبھال لیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ بہت جلد وہ دن آجائے گا۔ جب مسی سپی اور اوہائیو کی وادی کے اندر کسی ہوٹل میں جو بڑے بڑے شہروں کے باہر ہیں آپکو ایک اونس بھی اصلی مکھن کھانے کو نہیں مل سکے گا۔ کیونکہ ہم آجکل ہزاروں ٹن نقلی مکھن بنا رہے ہیں جس کو ہم کوڑیوں کے دام بیچ سکتے ہیں۔ تاکہ ہر شخص اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ اصلی مکھن تو اس چیز کے مقابلے میں ٹک ہی نہیں سکتا اصلی مکھن کا اس مکھن سے مقابلے کا سوال ہی نہیں ہے۔ ایسا احتمال بھی نہیں ہو سکتا۔ اصلی مکھن کے دن تو گئے۔ اب وہ مکھن کہیں دکھائی نہ دیگا۔ اس نقلی مکھن میں بہت کمائی ہے۔ آپ ہمارے اس کارو بار کے نفع کا اندازہ نہیں لگا سکتے ہیں سن سنائی سے پنجز کے درمیان ہر شہر میں رکتا ہوا آیا ہوں اور ہر شہر سے اس مکھن کے لئے بڑے بڑے آرڈر میں اپنے کارخانے میں بھیج چکا ہوں۔ اس طرح سے بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ سن سنائی کا ایجنٹ قریب دس منٹ تک اور بولتا رہا۔

تبھی نیو آرلینس کے شہری نے بانسری جیسی تیز آواز میں کہنا شروع کیا " اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ کی یہ چیز ایک اعلیٰ درجہ کی نقل ہے لیکن یہ کوئی انوکھی چیز نہیں ہے۔ ایسی اور بھی چیزیں ہیں۔ مثلاً آجکل کچھ لوگ زیتون کا تیل بنولوں سے بناتے ہیں۔ اور وہ ایسی عمدہ نقل کرتے ہیں کہ اصلی اور نقلی میں بالکل فرق معلوم نہیں ہوتا۔"

سن سنائی کے شہری نے جواب دیا " ہاں یہ ایک حقیقت ہے۔ یہ کاروبار کبھی نقطۂ عروج پر تھا۔ یہاں کے لوگ ریاستہائے متحدہ کے کسٹم کی مہر لگوا دیتے تھے تاکہ اس کے اصلی ہونے میں شبہ نہ رہے۔ اور فرانس اور اٹلی کو زیتون کا یہ مصنوعی تیل برآمد کیا کرتے تھے۔ اس میں اندھی کمائی تھی۔ لیکن فرانس اور اٹلی نے اس کاروبار کو یکسر ختم کر دیا۔ بیشک ان کا ایسا کرنا بعید از قیاس نہ تھا۔ انھوں نے امریکہ کے اس مصنوعی تیل پر اسقدر محصول بڑھا دیا کہ بنولہ سے بنے ہوئے اس روغنِ زیتون کے کاروبار میں کوئی منافع نہ رہا لہٰذا اس کو بند کر دیا گیا۔ اور یہ کاروبار ختم ہی ہو گیا۔"

"اچھا کیا ایسا ہوا؟ تم ذرا ٹھہرو۔" پھر وہ اپنے کمرے میں گیا اور دو بڑی بوتلوں کو لے کر واپس آیا اور انکے کارک کھول کر بولا۔

"ان کو دیکھئے، سونگھئے اور چکھئے اور ان کی چٹوں کا معائنہ کیجئے ان میں سے ایک یورپ سے منگایا ہوا ہے۔ اور دوسری بوتل کا تیل وہ ہے جو کبھی اس ملک سے باہر گیا ہی نہیں ان میں کوئی فرق بتائیے دراصل آپ ان میں کوئی امتیاز کر ہی نہیں سکتے۔ آپ تو کیا کوئی بھی نہیں کر سکتا۔ لوگ اگر چاہیں تو اپنے صرفہ پر جہازوں کے ذریعہ اپنے تیل کو یورپ برآمد کر سکتے ہیں۔ یا دیاں سے در آمد کر سکتے ہیں اور یہ ان کا حق ہے۔ لیکن ہماری فرم کو ایک ایسا گر معلوم ہے جو اس سے چھ گنا زیادہ سود مند ہے۔ ہم الف سے یے تک تمام لوازمات اپنی ہی فیکٹری نیو آرلینز میں تیار کرتے ہیں۔ یعنی لیبل، بوتلیں، تیل ہر چیز نہیں۔ لیبل نہیں بنائے جاتے بلکہ --- ہم ان کو باہر سے خریدتے ہیں۔ کیونکہ یہ ہم کو وہاں سے بہت کم داموں پر ملجاتے ہیں۔ آپکو معلوم ہونا چاہیئے کہ ایک گیلن بنولہ کے تیل میں بہت ذرا سا عنصر ہوتا ہے جو تیل میں بنولہ کے تیل کی خوشبو اور ذائقہ پیدا کر دیتا ہے اگر آپ اس چیز کو تیل سے الگ کر دیں تو پھر اس تیل کو جس قسم کے تیل میں تبدیل کرنا چاہیں بہ آسانی تبدیل ہو جائیگا اور پھر اصلی اور نقلی کی کوئی تمیز نہیں کر سکے گا۔ خیر ہم جانتے ہیں کہ تیل کے اس عنصر کو اس سے کیسے الگ کرتے ہیں۔ اور یہ کام صرف ہماری ہی فرم کر سکتی ہے۔ ہم اس تیل کو ہو بہو زیتون میں تبدیل کر دیتے ہیں اور ہماری اس چالاکی کو کوئی بھی نہیں پکڑ سکتا۔ اسطرح ہم بھی ایک شاندار کاروبار کر رہے ہیں۔ جس کو میں اپنے اس سفر کی آرڈر بک دکھا کر ثابت کر سکتا ہوں۔ یہ تو ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں سب کی روٹی پر مکھن دکھائی دے۔ مگر ہم بھی خلیج میکسیکو سے کناڈا تک ہر شخص کی سبزی میں روغن بنولہ ڈالنے میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔ اور یہ بات بالکل یقینی ہے۔"

سن سنائی کے ایجنٹ کا چہرہ فرط مسرت اور تحسین کے جذبات سے چمک اٹھا دونوں بے ایمانوں نے ایکدوسرے کو اپنے پتے کے کارڈ دیئے اور اٹھ کر چل دیئے چلتے چلتے سن سنائی کے ایجنٹ نے پوچھا "لیکن آپ کو کسٹم ہاؤس کی مہر کی بھی ضرورت پڑتی ہوگی؟ اس کا کیا انتظام کرتے

میں اُس کے جواب کو نہیں سُن پایا۔

ہم اس وقت ہڈسن کی بندرگاہ سے گذر رہے جو جنگ کے دو نہایت ہولناک واقعات کا منظر رہ چکا تھا۔ یہاں ایک رات کی لڑائی جو مورخہ ۱۴ اپریل ۱۸۶۳ء کو فاراگوٹ کے بحری بیڑے اور ریاستہائے متحدہ کے توپ خانے کے مابین ہوئی۔ اس کے دو ماہ بعد آٹھ گھنٹے تک شدید اور غیر معمولی جوش و خروش کیساتھ لڑائی ہوئی جو بالآخر بڑی خونریزی کے بعد یونین فوج کی پسپائی پر ختم ہوئی۔

چالیسواں باب

قلعے اور تہذیب

بیٹن روج یوں پھولوں سے لدا ہوا تھا جیسے دُلہن۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ ایسا لگتا تھا جیسے شیشے کے گھر کو پھولوں اور پتوں سے آراستہ کیا گیا ہو۔ کیونکہ اب ہم بالکل جنوب میں پہونچ چکے تھے۔ یہاں کوئی تبدیلی نہیں تھی' ہر چیز بجنسہٖ ویسی کی ویسی تھی۔ اجلاس گھر کے احاطہ میں ایستادہ منگولیا کے درخت گھنے پتوں اور سفید براق پھولوں سے لدے ہوئے تھے اور ان کی بھینی بھینی خوشبو فضا میں رچی ہوئی تھی۔ ان کی خوشبو تو بہت بھینی ضرور ہوتی ہے مگر اس کو دُور سے سونگھنا چاہیئے۔ کیونکہ یہ بہت تیز ہوتی ہے۔ یہ پھول خواب گاہ کے گلدستوں کے لئے موزوں نہیں ہیں کیونکہ ان سے سونے والے آدمی کے دَم گھٹ جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ یقیناً ہم جنوبی علاقہ میں پہونچ چکے تھے۔ کیونکہ یہاں سے گنّے کی کاشت کا علاقہ شروع ہوتا تھا اور کھیت اور لمبے چوڑے ہرے بھرے میدان جیسے گنّوں کے کارخانے اور حبشیوں کے مکان

جو ایک ہی بلاک میں میدان کے وسط میں بنے ہوئے نظر آنے لگے تھے۔ ہمارے سروں پر گرم تپتا ہوا سورج چمک رہا تھا۔ فضا میں گرمی اور تپش تھی یہیں سے پائلٹ کی جنت شروع ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں سے نیو آرلینز تک دریا بہت کشادہ اور وسیع ہو جاتا ہے۔ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ اور اسکے راستے میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ مثلاً بہتے ہوئے درخت، تہہ آب عمودی چٹانیں یا غرق آب شکستہ جہاز نہیں ہیں۔

یہاں ایک قلعہ (اجلاس گھر) بنوانے میں غالباً سر والٹر اسکاٹ کا ہاتھ ہے اگر وہ دو پشت پیشتر قرونِ وسطیٰ کی رزمیہ داستانوں سے لوگوں کے دلوں میں جوش و ولولہ پیدا نہ کرتا تو یہ چھوٹا سا نمائشی قلعہ یہاں ہرگز نہ بنتا۔ ابھی تک جنوبی باشندے اسکاٹ کی کتابوں کے تخریبی اثر سے پوری طرح آزاد نہیں ہوئے تھے۔ اس کتاب کے خیالی سورماؤں ان کے عجیب و غریب کارناموں اور ان کی رومانی جوانی کی یہاں کے باشندے اب بھی مدح سرائی کرتے ہیں حالانکہ اس انیسویں صدی میں روئی کے کارخانوں، ریلوں اور تجربانی اور عملی زندگی کا زمانہ ہے۔ اسکاٹ کی لفاظی اور مبالغہ آمیزی کا اثر آجتک یہاں کی زبان میں پایا جاتا ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ یہ سفیدی شدہ برجیوں اور میناروں والا قلعہ جس کا سالہ اندر باہر ہر طرف سے نمائشی ہے اور جس میں لگی ہوئی ہر چیز نقلی ہے، ایسی با وقار جگہ پر بنایا گیا ہے جو پہلے ہر طرح سے خوبصورت اور قابل تعظیم تھی۔ لیکن یہ دیکھ کر اور بھی زیادہ رنج ہوتا ہے کہ اس زمانے میں بھی اس بیکار اور نمائشی عمارت کی مرمت کی جا رہی ہے اور اس کو قائم رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے جب کہ ڈائنامائٹ سے اس بوسیدہ عمارت کو جس کو لوگوں کے جذبات سے فائدہ اٹھا کر تعمیر کیا گیا تھا اڑا دینا چاہیئے اور اسکی مرمت پر صرف ہونے والی تمام رقم کو کسی اچھے تعمیری کام میں لگانا چاہیئے۔

بیٹن روج کو ان نمائشی قلعوں کی تعمیر کا کوئی محفوظ حق حاصل نہیں ہے نہ اس کا ان پر کوئی اجارہ ہے۔ ٹینیسی میں واقع کولمبیا کے "مستورات کے ارادہ" سے نکلوائے ایک اشتہار میں یہ مضمون درج ہے:۔

"ادارہ کی عمارت اپنے خوبصورت طرز تعمیر اور دلکش نمونہ کے لئے عرصہ دراز سے

مشہور ہے سیاحوں کو اس سے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ یہ عمارت ایسی لگتی ہے جیسے قصّے کہانیوں والے قدیم زمانے کے قلعہ جات جو میناروں، بُرجیوں والی دیواروں اور عشقِ پیچاں کی بیل سے لدی برساتیوں سے آراستہ ہوتے تھے۔

اس زمانے میں اس نمائشی قلعے کے اندر ایک مدرسہ کا ہونا اتنا ہی رومان انگیز تھا جتنا کہ ایک ہوٹل کا۔

یہ نمائشی قلعہ بذاتِ خود بیشک بیضرر ہے اور اچھا خاصا ہے۔ مگر اس صدی میں جبکہ سیدھی سادی اور مستحکم چیزوں کو اتنا پسند کیا جاتا ہے جتنا کہ پہلے کبھی نہیں کیا جاتا تھا ایسے قلعے جو قرونِ وسطیٰ کی تخیلی مصنوعی اور رومانی باتوں کی یاد دہراتے ہوں، واقعی ایک غلط اور ضرر رساں چیز ہیں۔

ذیل کا بیان کنٹکی کے عورتوں کے ایک کالج کے پراسپکٹس سے ماخوذ ہے۔ کالج کا نام "فیمیل کالج" خاصا بھلا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر لفظ فیمیل اس لئے استعمال کیا گیا ہے کہ یہ مختصر ہے تو غلطی کی گئی ہے کیونکہ اس سے بھی مختصر نام "ویمن کالج" ہو سکتا تھا۔ اور میرے خیال سے یہ بہتر بھی ہوتا کیونکہ ظاہر ہے کہ یہ مختصر بھی ہے اور اسکے معنی وہی ہیں جو "فیمیل کالج" کے ہوتے ہیں۔ بشرطیکہ یہ دونوں نام ہم معنی کے ساتھ ساتھ بامعنی بھی ہوں۔

"اس کالج کا صدر جنوب میں پیدا ہوا اور وہیں اس نے پرورش پائی اور تعلیم و تربیت حاصل کی جسکی وجہ سے اسکے جذبات بھی جنوبی لوگوں کے سے ہیں۔ یہاں کے استاد بھی جنوبی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں صرف ان لوگوں کو چھوڑ کر جو یورپ میں پیدا ہوئے باقی سب استاد بھی جنوب ہی میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں انکی تربیت ہوئی ہے۔ اور یہ جنوبی تہذیب و تمدن ہی کو براعظم کی سب سے اونچی تہذیب[1] گردانتے ہیں۔ اسلئے یہاں نوجوان لڑکیوں کو جنوبی نقطۂ نظر سے

---

[1] ناکس وے ٹینی سی ۱۹ اکتوبر آج صبح دس بجکر چند منٹ ایک فساد میں جنرل جوزف لے۔ میبری کا تھامس اوکنر اور جوزف میبری جونیر گولی سے مارے گئے یہ حادثہ کل سہ پہر کے بعد اسلئے پیش آیا تھا کہ جنرل میبری نے جنرل اوکنر کو قتل کرنے کی دھمکی دی تھی۔ یہ بات سیلے کے میدان میں ہوئی۔ اس بات پر اوکنر نے

نوٹ (بقیہ صفحہ ۳۲۶ پر ملاحظہ کیجئے)

نازک خیالی، اخلاق، نسوانیت، مذہب اور شائستگی کے طور وطریقہ سکھائے جاتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے جنوب میں اعلیٰ درجہ کا ایک کالج نسواں کھولا ہے جسکے لئے ہم جنوب کے لوگوں کی معاونت وسرپرستی چاہتے ہیں۔

یہاں کا چوکیدار بھی کتنا دلیر ہے۔ اس کی آواز بارود کی سرنگوں کے پھٹنے کی آواز جیسی پُر ہیبت ہے غالباً وہ قلعے کے ان رسے ہی بولتا ہے۔

بیٹن روج سے نیواورلینز تک تمام راستے پہ دریا کے دونوں طرف گنّوں کے کھیت ہیں۔

نوٹ (گذشتہ سے پیوستہ) میبری سے کہا۔ کہ تنازعہ کے لئے یہ جگہ موزوں نہیں ہے۔ تب میبری نے اوکنز سے کہا کہ وہ اسے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میبری مسلح اور اوکنز غیر مسلح تھا۔ اس جھگڑے کی بنیاد ایک خانگی جائداد تھی۔ جو اوکنز سے میبری کو منتقل ہوئی تھی۔ بعد سہ پہر میبری نے اوکنز کو یہ پیغام بھیجا کہ وہ اسے دیکھتے ہی مارڈالے گا۔ آج صبح میجر اوکنز میکینکس نیشنل بینک کے دروازہ پر کھڑا تھا۔ جہاں وہ صدر کے عہدہ پہ مامور تھا۔ جنرل میبری ایک دوسرے آدمی کو ساتھ لیکر گے اسٹریٹ ہوتے ہوئے بینک کے پیچھے کی طرف آگئے۔ اوکنز بینک میں جاکر شکاری بندوق اٹھالایا اور جنرل میبری کو نشانہ بناکر بندوق داغدی میبری گرکر ختم ہوگیا گولی اسکے بائیں جانب لگی تھی۔ جیسے ہی وہ گرا اوکنز نے ایک اور فائر کیا۔ جس نے میبری کی ران کو نشانہ بنایا۔ اسکے بعد اوکنز پھر بینک میں گھس گیا۔ اور دوسری بندوق اٹھالایا۔ اسی اثنا میں جنرل میبری کا لڑکا جونئر اسے میبری گلی میں سے بھاگتا ہوا آیا۔ جب وہ صرف چالیس فٹ دُور رہ گیا تب اوکنز کو نظر آیا۔ مگر اسی وقت میبری جونیر نے پستول چلادیا۔ گولی اوکنز کے سینہ کے دائیں جانب لگی اور جسم سے ہوکر کولی تک پہونچ گئی۔ میبری جونیر کے اس اچانک حملے کے جواب میں اوکنز نے گھوم کر پھر بندوق چلائی۔ اور کارتوس نے جوان میبری کا دایاں سینہ زخمی کردیا اور وہ بیس گولیاں کھا کے گرکر مرگیا۔ اس کے فوراً بعد اوکنز بھی مزید گولی کھائے بغیر گرگیا۔ میبری نے ایکبار سنبھلنے کی کوشش کی مگر اس نے پھر گرکر دم توڑدیا۔ اس سارے حادثے کو مشکل سے دو منٹ لگے ہوں گے۔ گولی کھانے کے بعد تینوں میں سے کوئی بھی آواز تک نہ نکال سکا۔ جنرل میبری کے جسم سے تقریباً تیس گولیاں نکلیں۔ قریب کھڑے ایک آدمی کی ران ایک چھرّے سے بری طرح زخمی ہوئی اور دوسرے کا بازو مجروح ہوگیا۔ دیگر

نوٹ:۔ (بقیہ صفحہ ۳۲۷ پر ملاحظہ کیجئے)

جو تین تین میل کی دُوری تک مسلسل پھیلے ہوئے ہیں اور سائپرس کے درختوں کے جنگل کی دُھندلی قطار تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اب دریا کے ساحل سُنسان نظر نہیں آتے بلکہ دونوں کناروں پر تمام راستے میں ہزاروں مکان بن گئے ہیں۔ جو دُور تک اس قدر قریب قریب بنے ہوئے ہیں کہ دونوں ساحلوں کے مکانوں کی قطاروں کے درمیان بہتا ہوا چوڑا دریا ایک کشادہ سڑک سا معلوم ہوتا ہے یہ علاقہ ایک پُرفضا اور بارونق جگہ ہے۔ کہیں کہیں ستونوں پر کھڑے ہوئے تعلقہ داروں کے برساتی والے محل درختوں سے گھرے نظر آتے ہیں۔ اس خوبصورت منظر کی تصدیق ان غیر ملکی سیّاحوں کے بیانات سے ہوتی ہے جو قریب پچاس سال پیشتر یہاں آئے تھے ان میں سے دو ایک اقتباسات حسب ذیل ہیں:۔

نوٹ (گذشتہ سے پیوستہ) چار آدمیوں کے کپڑے گولیوں سے پھٹ گئے۔ اس واقعہ نے لوگوں میں ہیجان پیدا کر دیا اور گے اسٹریٹ ہزاروں آدمیوں کے ہجوم سے بھر گئی۔ جزل ہیبری اور اس کا لڑکا جنھوں نے ایک باپ اور بیٹے موسس لبسی اور ڈان لبسی کو کچھ ہفتے قبل قتل کر دیا تھا۔ کچھ دن پیشتر ہی جیل سے رہا ہوئے تھے گذشتہ کرسمس کے موقع پر ول ہیبری کو ڈان لبسی نے قتل کر دیا تھا۔ میجر تھامس او کنز میکینکس نیشنل بینک کا صدر تھا اور ریاست کا امیر ترین آدمی تھا۔

بحوالہ ایسوسی ایٹڈ پریس ٹیلیگرام۔

گذشتہ ماہ ایکدن ممرو لے ٹینی سی نسواں کالج کے پروفیسر شارپے کو جو خاموش طبع اور شریف النفس تھے یہ بتایا گیا کہ اسکے بہنوئی کیپٹن برٹن نے اسکو قتل کرنے کی دھمکی دی ہے۔ برٹن پہلے ہی ایک آدمی کو قتل کر چکا تھا۔ اور دوسرے کے چاقو مار چکا تھا۔ پروفیسر دونالی بندوق لیکر اپنے بہنوئی کی تلاش میں نکلا اور اُسے ایک قہوہ خانے میں تلاش کر لیا اور بندوق سے اس کی کھوپڑی کے پرخچے اڑا دیئے۔ اخبار میمفس او الانشے لکھتا ہے۔ پروفیسر کی اس کاروائی کی معاشرے کے عموماً سبھی لوگوں نے تائید کی اور کہا کہ پروفیسر نے ٹھیک کیا۔ کیونکہ اگر قانون عوام کے جذبات پر قابو نہیں پا سکتا تو کسی کی جان کی کیسے حفاظت کر سکتا ہے اور اس لئے اگر اس نے اپنی حفاظت خود کر لی تو اچھا کیا۔

تقریباً اسی اثناء میں شمالی کرولینا میں دو نو جوان آدمیوں میں ایک لڑکی کے لئے جھگڑا

نوٹ:۔ (بقیہ صفحہ ۳۲۸ پر ملاحظہ کیجئے)

بیگم ٹرولوپ کا بیان ہے ۔

"نیو آرلینس سے کئی میل اوپر دریا کے چڑھاؤ کی طرف سا سز، دور تک، کشادہ نظر آتے ہیں اور ان کی ہیئت میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی ۔ لیکن خوبصورت کھجوروں کے درختوں کی بھرمار، شاہ بلوط کے بلند اور نارنگیوں کے دلفریب درخت ہر جگہ دکھائی دیتے ہیں جنھیں دیکھ کر ہم کچھ ہی دن میں اکتا گئے ۔

کیپٹن بیسل ہال ۔

وہ خطۂ سرزمین جو لوئی آنا کے نشیبی علاقے میں دریائے مسی سپی سے ملحق ہے وہ سب گنے کے کاشتکاروں سے آباد ہے جن کے خوبصورت مکانات، خوشنما چوک آراستہ باغات اور ان گنت غلاموں کے دیہات جو بہت صاف ستھرے ہیں یہ سب مل کر دریا کے منظر کو نہایت دلفریب اور پرفضا بنا رہے ہیں ۔

نوٹ (گزشتہ سے پیوستہ) ہوا اور آپس میں تو تو میں میں ہونے لگی ۔ دوستوں نے آپس میں مصالحت کرانے کی کوشش کی ۔ لیکن انکی کوششیں ناکام ہو گئیں ۲۴ تاریخ میں دونوں آدمیوں کی شاہراہ پر مڈبھیڑ ہو گئی ان میں سے ایک کے ہاتھ میں بھاری ڈنڈا اور دوسرے کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی ۔ ڈنڈے والا آدمی اپنی زندگی کو بچانے کے لئے بڑی بے جگری سے لڑا ۔ لیکن شروع سے ہی اُسے مایوس ہونا پڑا ۔ غنیم کے ایک ہی زوردار وار سے ڈنڈا اسکے ہاتھ سے چھوٹ کر لہراتا ہوا دور جا پڑا ۔ اور دوسرے ہی لمحہ وہ ہمیشہ کی نیند سو گیا ۔

قریب قریب اسی وقت ورجینیا کے "اونچے گھرانوں کے نوجوان کلرک جو شرلاٹ ویلے کے لوہے کے ایک کارخانے میں کام کرتے تھے" آپس میں ہنسی مذاق کرتے کرتے لڑ پڑے ۔ پیٹر ڈک نے چارلس روڈ کی آنکھوں میں مرچیں جھونک دیں ۔ روڈ نے اس سے معافی کا مطالبہ کیا ۔ لیکن ڈک نے اس مطالبہ کو ماننے سے انکار کر دیا ۔ اور یہ طے پایا کہ بناڈیوں لڑے فیصلہ ہونا ناممکن ہے ۔ لیکن ایک دشواری پیش آئی ۔ فریقین کے پاس پستول نہیں تھے اور اتنی رات گئے ان کو حاصل کرنا بہت مشکل تھا ۔ اسلئے ان میں سے ایک نے تجویز کیا کہ آئیے قصاب کی چھریوں سے ہی دو دو ہاتھ ہو جائیں ۔ دوسرے نے

نوٹ :۔ (بقیہ صفحہ ۳۲۹ پر دیکھئے)

تمام سیاح اس دلکش منظر کو ایک سے الفاظ میں بیان کرتے ہیں انکے پچاس سال پرانے بیانات کو بھی بدلنے کی مطلق ضرورت نہیں یہ علاقہ اب بھی ویسا ہی خوبصورت لگتا ہے جیسا پچاس سال پہلے۔ فرق صرف اتنا ہو گیا ہے کہ اب مکانات پہلے سے زیادہ آراستہ ہو گئے ہیں لیکن اب حبشیوں کے کمروں کی سفیدی اتر چکی ہے۔ اور بہت سے عالیشان مکان جو کبھی بہت سفید چمکتے ہوئے نظر آتے تھے، اب بغیر مرمت کے ویران نظر آتے ہیں کیونکہ ان کا رنگ روغن اتر چکا ہے۔ یہ جنگ کی تباہی کا اثر ہے۔ اکیس سال پہلے ساحل کے ساتھ ساتھ ہر چیز بہت خوبصورت جگمگاتی ہوئی اور قطعہ در قطعہ آراستہ و پیراستہ تھی۔ ہو بہو ۱۸۲۷ء کی طرح جیسی کہ ان سیاحوں نے اپنے بیان میں تحریر کی تھی۔

نوٹ (گذشتہ سے پیوستہ) یہ بات فوراً مان لی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روڈ کے پیٹ میں زخم کاری لگا اور وہ تلملا کر فرش پر گر پڑا۔ معلوم نہیں وہ زخم مہلک ثابت ہوا یا نہیں اور یہ بھی خبر نہیں ملی کہ آیا ڈک گرفتار بھی ہوا یا نہیں۔ البتہ اس نے اس واقعہ پر اظہار افسوس کیا تھا اور ہمیں فلاڈلفیا اسٹاف کے پریس نامہ نگار نے بتایا ہے کہ اس معاملے کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی۔

پبلک جرنل سے ماخوذ

ان معصوم سیاحوں کو...... یہاں کے لوگوں نے پر فریب اور لغو باتوں سے دھوکا دیا اور جب انھوں نے ان کی باتوں کو سچ مان کر اپنی کتابوں میں تحریر کر دیا تو پھر اس کا بہت مذاق اُڑایا انھوں نے بیگم ٹرولوپ کو بتایا کہ مگرمچھ یا گھڑیال جس نام سے بھی وہ انھیں موسوم کرتی ہوں بہت خطرناک جانور ہیں۔ اور بیان سچ ثابت کرنے کے لئے ایک سنسنی خیز واقعہ کا ذکر بھی کیا کہ کسطرح یہ بدنام جانور ساحل کے پاس ایک چھوٹے کیبن میں گھس کر ایک عورت کو اسکے پانچ بچوں سمیت نگل گیا۔ گھڑیال اگر غیر معمولی بڑا بھی ہوتا تو بھی ایک عورت ہی اس کی خوراک کے لئے کافی ہوتی۔ لیکن نہیں جھوٹ بولنے والوں نے عورت کے ساتھ ساتھ اسکے پانچوں بچوں کو بھی اس گھڑیال کے پیٹ میں ٹھونس دیا۔ آپ کے تصور میں یہ بات نہیں آسکتی کہ اس صحت مند نسل کے دل لگی باز اتنے ذکی الحس ہوں گے۔ مگر تھے وہ ایسے ہی۔ آج کے دور میں یہ سمجھنا بہت مشکل ہے اور اس کو ثابت کرنا تو ناممکن ہے۔ کہ سنجیدہ، ایماندار، ذہین، شریف النفس، بہادر، سخی اور نیک نیت کیپٹن بیسل ہال کی کتاب کیسی مقبول ہوئی ہوگی۔ بیگم ٹرولوپ کا بیان غالباً ناظرین کو مسرور کر سکے اسلئے میں نے اس کتاب کے آخر میں ضمیمہ[1] میں درج کیا ہے۔

---

[1] ضمیمہ نمبر ۳ دیکھئے۔

اکتالیسواں باب

جنوب کا سب سے بڑا شہر

نیواورلینز کو جانے والے راستے ہمارے جانے پہچانے تھے۔ عام وضع میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ جب کوئی شخص ہوائی جہاز کے ذریعہ لندن شہر کے محراب دار پلوں کے اوپر چلنے والی ریلوے لائن کے اوپر اڑتا ہے تو وہ میلوں تک پھیلے ہوئے مکانوں کی اوپری خواب گاہوں کو ہی کھڑکی سے دیکھ سکتا ہے۔ لیکن مکانات کے نصف زیریں حصے اس کی اپنی سطح سے نیچے ہونے کی وجہ سے اسکو نظر نہیں آتے۔ بالکل اسی طرح نیو آرلینز کے علاقہ میں جب دریا میں طغیانی ہوتی ہے اور پانی دریا کے پشتوں کے بالائی کناروں سے ٹکرانے لگتا ہے تو سطح میدان ایسے نیچے معلوم ہونے لگتے ہیں جیسے کسی تاب کا پیندہ اور جب سیلاب زدہ کشتی ہچکولے کھاتی ہوئی چلتی ہے تو مسافروں کو نیواورلینز شہر کے مکانوں کی اوپری کھڑکیاں ہی دکھائی دیتی ہیں۔ سیلاب اور آبادی کے درمیان مٹی کے بلند تودوں کے علاوہ دور تک اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

شہر کے بالائی حصے میں پرانی اینٹوں کے بنے ہوئے گوداموں کا جھرمٹ پہلے جیسا ہی تھا تاہم ان گوداموں کے ساتھ الہٰ دین کے چراغ کے کرشمہ جیسی ایک واردات ہوگئی۔ ان گوداموں کا مالک حسب معمول ایک رات نمک کے ہزاروں بوروں کو جن کی قیمت دو[۲] ڈالر فی بورہ ہوتی چھوڑ کر سونے چلا گیا مگر جب وہ صبح جاگا تو اس کو یہ معلوم کر کے بڑا تعجب ہوا کہ اس کے نمک کا یہ انبار سونے کے انبار میں تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ ایسے کہ جنگ کی خبروں سے نمک کی قیمتیں کئی گنا بڑھ گئی تھیں۔

دریا کے وسیع چوبی گھاٹ بالکل پہلے جیسے ہی تھے۔ اور جہازوں کی تعداد بھی تقریباً

اتنی ہی ہوگی۔ لیکن دخانی کشتیوں کی پہلی جتنی قطار اب وہاں نہیں تھی۔ گو یہ کشتیاں بالکل ختم تو نہیں ہوئی تھیں لیکن اسمیں شک نہیں کہ ان میں بیشتر اب وہاں موجود نہیں تھیں۔

شہر بھی دیکھنے میں مختلف نظر نہیں آتا تھا۔ گو یہ وسعت اور آبادی میں پہلے سے بہت بڑھ چکا تھا۔ لیکن اس کی ہیئت بالکل نہیں بدلی تھی۔ گلیوں میں دھول اور ردی کی گندگی کا انبار اب بھی پہلے جیسا ہی تھا۔ گلیوں کی نالیوں جیسی گہری نالیاں ٹھہرے ہوئے پانی اور گرد و غبار سے تقریباً نصف بھری رہتی تھیں گنے کی کاشت اور سور پالنے والے علاقہ میں سڑک کی دونوں جانب پٹریوں پر چھوٹے، بڑے اور لمبے لمبے پیپے اور بکس پڑے تھے۔ تجارتی کاروبار کی عمارتیں جنکی بناوٹ سے انتہائی سادگی ٹپکتی تھی پہلے کی طرح ہی گرد آلود تھیں۔

کینال اسٹریٹ پہلے سے زیادہ خوبصورت، دلکش اور بارونق تھی۔ اسکے کنارے لوگوں کے غول گھومتے پھرتے تھے۔ اور سڑکوں پر موٹر کاریں قطار در قطار دوڑتی پھرتی تھیں اور شام کے وقت دو منزلہ عمارتوں کے کشادہ برآمدوں میں جدید ترین فیشن کے لباس میں ملبوس عورتوں اور مردوں کی بھیڑ سے یہ جگہ اور بھی حسین لگنے لگتی تھی۔

کینال اسٹریٹ پر عمارتیں کسی خاص خوبصورت ڈھنگ سے نہیں بنائی گئی ہیں۔ علاوہ قبرستانوں کے یہاں کی عمارتوں میں کوئی خاص طرز تعمیر نہیں دکھائی دیتا۔ یہ .... واقعی عجیب بات ہے کہ ڈھائی لاکھ کی آبادی والے اتنے دولتمند اور ترقی پذیر شہر کی عمارتوں میں کوئی خاص طرز تعمیر ہو۔ مگر ہے یہ حقیقت۔ یہیں پر ریاستہائے متحدہ کا گہرے نائٹ سے تعمیر شدہ ایک عظیم الشان چنگی گھر ہے۔ جسکی تعمیر میں بہت پیسہ صرف ہوا ہوگا۔ اور جو واقعی عالیشان معلوم ہوتا ہے۔

لیکن خوبصورتی اور سجاوٹ میں یہ ذخیرۂ گیس کی عمارت سے بھی بدتر ہے۔ یہ تو ایک جیل سا لگتا ہے لیکن یہ جنگ سے قبل کی تعمیر ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امریکہ میں فن عمارت سازی جنگ کے فوراً بعد ظہور میں آئی۔ میرے خیال میں نیو اورلینز ایک خوش قسمت شہر ہے اور ایک وجہ سے بدقسمت بھی۔ کیونکہ پچھلے چند برسوں میں اس شہر میں جنگ کی زیادہ سرگرمیاں دکھائی نہیں دیں۔ اور ایسا ہونا بھی قرین قیاس ہے۔ اگر یہاں جنگ کی سرگرمیاں ہوتی ہوتیں اور شہر اس کی آگ سے جل گیا ہوتا تو فن تعمیر میں نمایاں ترقی نظر آتی۔ بوسٹن اور شکاگو میں یہ ترقی نمایاں ہے ہی لڑائی سے پہلے بوسٹن کا جلا ہوا شہر فن تعمیر کے لحاظ سے بہت معمولی تھا لیکن

آج دنیا کا کوئی تجارتی شہر خوبصورتی خوشنمائی اور سجاوٹ میں اس شہر سے بڑھ کر نہیں ہے۔ بلکہ اسکے مقابلہ کا بھی نہیں ہے۔

نیو آرلینز میں بھی ترقی شروع ہوگئی ہے مگر ابھی حال ہی میں۔ مکمل ہوجانے پر یہاں کے کاٹن ایکسچینج کی عمارت بڑی شاندار اور خوبصورت ہوگی۔ یہ مضبوط، وسیع اور فن تعمیر کی خوبصورتی کا ایک ارفع نمونہ ہوگی اسمیں کہیں بھی کوئی بدصورتی یا بدنمائی یا کوئی دقیانوسی پن نہیں ہے۔ اہل شہر کے لئے اس کی افادیت اس پر لگے ہوئے سرمایہ سے کہیں زیادہ ہوگی کیونکہ اس کے بعد اس نمونے کی بہت سی عمارتیں شہر میں بننے لگیں گی۔ اب تک اگر کوئی کمی تھی تو وہ یہ تھی کہ نئے طرز کی ایک بھی عمارت ایسی نہ بنی تھی جو لوگوں کی نگاہ میں جچ جاتی اور جو آئندہ کے لئے بطور نمونہ کام دیتی۔

شہر ترقی پسند لوگوں سے آباد ہے جو روشن خیال دانشمند اور دوراندیش ہیں۔ مگر یہاں عمارتوں اور شہریوں کے رجحان طبع میں وہی تضاد ملتا ہے جو خواب اور بیداری میں ہوتا ہے۔ صرف پرانی عمارتوں کے علاوہ یہاں ہر چیز ترقی پذیر ہے۔ پہلے نالیوں میں کیچڑ اور گدلا پانی رکا رہتا تھا۔ جو بیماریوں کے پھیلنے کا باعث ہوتا تھا لیکن آجکل ان نالیوں کے گدلے پانی کو بذریعہ مشین دن میں دو تین بار نکال دیا جاتا ہے۔ بہت سی نالیوں میں تو اب پانی رکتا ہی نہیں بلکہ مسلسل بہتا رہتا ہے۔ علاوہ ازیں صفائی کے دوسرے طریقوں میں بھی نمایاں اصلاح ہوئی ہے اب صحت و صفائی کے لحاظ سے نیو آرلینز ریاستہائے متحدہ کا سب سے عمدہ، صاف ستھرا اور صحت افزا شہر مانا جاتا ہے (زرد بخار کی وبا تو اب یہاں بہت ہی کم ہوگئی ہے) یہاں کارخانوں میں شہر کے ہر آدمی کیلئے کافی برف مل جاتی ہے۔ یہ شہر تجارت کی بہت بڑی منڈی ہے۔ یہاں ایک بڑا دریا، سمندر اور ریلوں کا مرکز ہے۔ جسوقت ہم اس شہر کو دیکھنے گئے تھے یہاں برقی روشنی کا جتنا عمدہ انتظام تھا اتنا شاید ریاستہائے متحدہ کے کسی شہر میں نہ ہوگا۔ نیو یارک کے مقابلہ میں یہاں روشنی کی بتیاں نہ صرف تعداد میں بھی زیادہ ہیں بلکہ بہتر قسم کی بھی ہیں۔ یہاں نہ صرف کینال اسٹریٹ اور پاس کی دوسری مخصوص سڑکوں پر ہی روشنی کا انتظام ہے بلکہ دریا کے ساحل پر پانچ میل تک برابر ایسی روشنی رہتی ہے جس میں رات

کے وقت دوپہر کا سماں رہتا ہے۔ اب شہر میں اچھے اچھے کلب بھی ہو گئے ہیں ۔ جن میں کچھ کی حال ہی میں تنظیم ہوئی ہے۔ ویسٹ اینڈ اور اسپینش فورٹ میں جدید فیشن کی تفریح گاہیں بن گئی ہیں۔ ٹیلیفون بھی ہر جگہ لگ گیا ہے۔ اخبار نویسی میں بھی بہت بڑی ترقی ہوئی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ پہلے یہاں کے اخبارات میں ادبی لحاظ سے کوئی نمایاں خصوصیت نہیں ہوتی تھی۔ مگر اب وہ بات نہیں رہی ہے۔ اب ان پر فراغدلی سے خرچ کیا جاتا ہے۔ خبروں کی فراہمی میں چاہے کتنا ہی خرچ ہو کیا جاتا ہے۔ اداریہ اب پہلے کی طرح فرسودہ پٹا پٹایا نہیں ہوتا بلکہ ادبی مذاق سے پُر ہوتا ہے مثال کے طور پر نیو اورلینز کے فنِ صحافت کی ایک جھلک ۲۶ راگست ۱۸۸۲ء کے ٹائمس ڈیموکریٹ کے شمارہ سے ملتی ہے جسمیں سینٹ پال اور نیو اورلینز کے درمیان دو ہزار میل لمبی وادیٔ مسی سپی کے مختلف شہروں کی سالانہ تجارتی رپورٹ شائع ہوئی تھی۔ اخبار کا یہ شمارہ چالیس صفحات پر مشتمل تھا۔ جس کے ہر صفحہ میں سات کالم تھے اور اس طرح کل دو سو اسّی کالم تھے۔ ہر کالم میں ایک ہزار پانچسو الفاظ تھے۔ اس طرح کل ملا کر چار لاکھ تیس ہزار الفاظ ہوئے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کتاب میں جتنے الفاظ ہیں ان کے تین گنے سے کچھ ہی کم تھے۔ اگر صحافت کی اس ترقی کا مقابلہ فنِ تعمیر کی پس ماندگی سے کیا جائے تو واقعی بڑا افسوس ہوگا۔

اب تک میں نے نیو آرلینز کی صرف سرکاری عمارتوں کا ذکر کیا ہے۔ یہاں کے رہائشی مکانات پہلے جیسے ہوتے ہوئے بھی بے عیب ہیں۔ یہ لکڑی کے بنے ہوئے ہیں اور آرام دہ ہیں۔ مالداروں کے مکانات کشادہ ہوتے ہیں۔ اور ان پر سنگ مرمر جیسی سفید پالش ہوتی ہے۔ ان میں چوڑے برآمدے یا دوہرے برآمدے ہوتے ہیں۔ انکے کھمبوں پر نقاشی ہوتی ہے یہ بڑے کشادہ احاطوں میں چاروں طرف سے چمکدار ہرے بھرے رنگ برنگ کے پھولوں سے گھرے ہوتے ہیں۔ اور گلاب کے پھولوں کے گجروں سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ایسے خوبصورت قدرتی مناظر کے درمیان آنکھوں کو فرحت دینے والے آرام دہ اور دلکش مکانات شاید ہی اور کہیں ہوں۔

یہاں کی پانی کی ٹنکی تک قابل اطمینان ہوتی ہے۔ یہ ایک بڑے پیپے جیسی ہوتی ہے۔ جیسے برا رنگ دیا گیا ہو۔ کبھی کبھی یہ دو منزلہ اونچی ہوتی ہے اور لکڑی کے ستونوں پر ایستادہ مکان کے کونے سے ملحق ہوتی ہے ان ٹنکیوں کو دیکھتے ہی ایسا لگتا ہے گویا رہائشی مکان اور شراب کا کارخانہ ایک ہی جگہ ہیں۔ جو بہت عجیب سا لگتا ہے۔ لیکن یہ بات نہیں ہے۔ ٹنکیاں یہاں اسلئے بنائی جاتی ہیں کہ یہاں کنویں نہیں ہیں اور عوام برسات کے پانی پر گذر کرتے ہیں۔
دوسری چیز یہاں کے مکانوں میں یہ ہے کہ نہ اُن میں تہہ خانے کی سہولیت ہے اور نہ قبروں[1] ہی کی چونکہ شہر کی توسیع نئی زمین حاصل کر کے لی جارہی ہے اس لئے لوگ ان دونوں چیزوں کے بغیر گذر کرتے ہیں۔ آج کل شاید ہی کوئی باشندہ ان کی کمی کا شکوہ کرتا ہو اور پہلے تو کسی نے کیا ہی نہ ہوگا۔

---

[1] میرا خیال ہے کہ یہودی اپنے مُردوں کو سرکار سے اجازت لیکر ہی قبروں میں دفن کر سکتے ہیں اپنی مرضی سے نہیں۔ علاوہ محتاجوں کے اور کوئی بھی سرکاری خرچ سے دفن نہیں کیا جاتا تھا۔ یہ قبریں تین چار فٹ ہی گہری ہوتی ہیں۔

بیالیسواں باب

حفظانِ صحت اور جذبات

لوگ اپنے مُردوں کو زمین کے اُوپر بنے ہوئے محراب دار مقبروں میں دفن کرتے ہیں۔ یہ مقبرے کہیں تو بالکل مکان کی طرح ہیں اور کہیں مندروں کی طرح بنائے گئے ہیں۔ یہ سنگِ مرمر سے بنائے جاتے ہیں۔ اور فنِ تعمیر کے اعتبار سے بہت خوبصورت اور شاندار ہوتے ہیں۔ یہ عموماً قبرستانوں کی پگڈنڈیوں اور سڑکوں کے بالمقابل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ایسے ہزاروں مقبروں کے درمیان سے جو ہر طرف نظر آتے ہیں گذرے اور ان کے سائبانوں کی دو رُخی ڈھلوان چھتوں کو دیکھے تو اس کی سمجھ میں آجائے گا کہ مُردوں کے شہر کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ یہاں آپ کو بہت سے خوبصورت قبرستان ملیں گے جنکی دیکھ بھال بہت اچھی طرح کی جاتی ہے۔ جب کوئی دریا کے قریبی اونچے ساحل یا اس کی قریبی سڑکوں سے جہاں کاروباری ہجوم رہتا ہے کسی قبرستان کی طرف جاتا ہے۔ تولا محالا اس کو یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر یہ لوگ اپنی زندگی میں بھی اتنے ہی صاف ستھرے رہتے جتنے کہ یہ مرنے کے بعد ہیں تو ان کو بہت سے فائدے ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے مکانات و دکانیں بھی کاروباری دنیا کے لئے حیرت اور تحسین کے قابل ہوتیں بہت سے مقبروں کے دروازوں پر آویزاں پانی سے بھرے گلدانوں میں تازہ پھول نظر آتے ہیں جن کو کوئی غمزدہ باپ، ماں، بیٹا بیٹی، خاوند یا بیوی لاکر وہاں رکھتی ہوگی۔ اور انھیں روز بدلتی رہتی ہوگی۔ مرحوم کے عزیز اس کی یادگار کے طور پر کچھ نشانی یہاں رکھ کر اپنے غم کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ نشانی سستی یا بھدی ضرور ہوتی ہے مگر ہوتی پائدار ہے جس سے ان کے ناقابل بیان ماتم کا اظہار ہمیشہ ہوتا رہتا ہے۔ عموماً یہ کالے ریشمی فیتے یا چمڑے سے بنا یا ہوا گلاب کا پھول ہوتا ہے

یا پھر صلیب سی ہوتی ہے جس کی دونوں پیٹیوں کے جوڑوں پر ایک زرد گلاب کا مصنوعی پھول باندھ دیتے ہیں۔ اکثر یہ ماتمی نشان لوگ اپنے سینے پر اپنے ماتمی لباس کے اوپر پن سے لگایا کرتے ہیں۔ مقبروں پر رکھی ہوئی ایسی کسی نشانی کیلئے روز دیکھ بھال کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسے تو وہاں آویزاں کر دینا ہی کافی ہوتا ہے۔ یہ نشانی آپ کے ماتم کا اظہار کرتی رہے گی آپ سے زیادہ آپ کے غم کو اپنے دل میں رکھے گی۔ ہر موسم کی سختی کو برداشت کرلے گی اور بوائلر کے لوہے کی طرح پائدار رہے گی۔

دھوپ کے دنوں میں چھوٹے چھوٹے خوبصورت گرگٹ جو ٹانگوں والے اور رینگنے والے جانوروں میں سب سے خوبصورت ہوئے ہیں ان مقبروں کے سنگِ مرمر کے فرش پر رینگتے ہوئے مکھیاں پکڑتے رہتے ہیں ان کے بارے میں جو یہ کہاوت مشہور ہے کہ یہ جلد جلد اپنا رنگ بدلتے ہیں غلط ہے۔ یہ اپنا رنگ اسی وقت بدلتے ہیں جب کوئی آدمی وہاں پھول چڑھاتا ہے۔ لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں ہے کیونکہ کوئی بھی ذی حس رینگنے والا جانور اس طرح رنگ بدل سکتا ہے۔

اب میں رفتہ رفتہ قبرستانوں کے موضوع کو ختم کر رہا ہوں اب تک میں یہ کوشش کرتا رہا کہ اس موضوع کے جذباتی عنصر کو واضح کروں لیکن میں اس کی تکمیل نہیں کر سکتا میرا تو خیال یہ ہے کہ اس موضوع کے ساتھ کوئی خاص جذبات وابستہ بھی نہیں ہیں۔ یہ قبرستان کا موضوع بڑا بے ڈھب، بھیانک اور نفرت انگیز ہے ان قبرستانوں کا وجود زمانہ قدیم میں تو ضروری ہو سکتا تھا جب کہ کسی کو یہ نہیں معلوم تھا کہ مُردے کو مٹی میں دبا دینے سے قرب و جوار کی مٹی، کنوؤں کی تہ اور ہوا میں اتنے جراثیم بھر جاتے ہیں کہ ان کی وجہ سے متعدد لوگوں کو بیماریوں کا شکار ہو کر قبل از وقت مرنا پڑتا ہے۔ لیکن اس زمانے میں ایسے قبرستانوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ آجکل بچے تک اس بات کو جانتے ہیں کہ ایک درویش جب مر جاتا ہے اور ایسے مٹی میں دبا دیا جاتا ہے تو وہ سو سال تک بنی نوع انسان کیلئے قاتل کا کام کرتا ہے۔ یہ بڑا وحشتناک خیال ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کناڈا میں رکھے ہوئے سینٹ آینی کے تبرکات نے تو انیس سو سال میں بیسیوں مریضوں کو اچھا کر دیا ہے۔ لیکن یہاں یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت

ہے کہ سینٹ اینی کے مرنے اور دفنانے کے بعد ایک نسل تک ان ہی تبرکات سے کئی سو لوگ بیمار پڑ گئے ہوں گے۔ اس لئے اب انکے تبرکات نے اگر کوئی معجزے دکھلائے ہیں تو یہ محض پچھلے نقصانات کی تلافی ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ سینٹ اینی نے یہ معاوضہ بہت دیر میں ادا کیا لیکن چونکہ وہ ایک دولتمند بھی اسلئے یہ ٹھیک ہے۔ بہرحال انیس سو سال کے بعد ایک قرضے کی ادائیگی خواہ اس کی قانونی میعاد ختم ہی کیوں نہ ہو گئی ہو، بہتر ہے کہ وہ قرضہ بالکل ادا نہ کیا جائے۔ اور بہت سے نواب وغیرہ تو بالکل بھی ادا نہیں کرتے۔ اگر آپ کو سینٹ آینی جیسی ایک ہستی ایسی مل بھی جائے جو اس قرضے کو ادا کر دے تو آپکو ایسی ڈیڑھ سو دولتمند ہستیاں بھی مل جائیں گی جو بیرون میعاد قانون سے فائدہ اٹھا کر قرضہ بالکل ادا نہیں کرتیں اور اگر ادا کرتی بھی ہیں تو قرضے کے برابر نہیں چہ جائیکہ سود مفرد یا مرکب۔ غرض کہ ایک ولی بھی اسطرح قرضے کو بیباق نہیں چکا سکتا۔ وجہ یہ ہے کہ اس کی لاش تو لوگوں کو مارتی ہے جب کہ اس کے تبرکات کسی مردہ جسم میں جان نہیں ڈال سکتے اس طرح کا قرضہ کبھی ادا نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر ایف۔ جولیس بی موئینز نے پچاس سال ڈاکٹری کرنے کے بعد لکھا تھا۔

"وبائی امراض سے مرے ہوئے انسانی اجسام کے گلنے سڑنے سے فضا میں جراثیم پھیلتے ہیں جو پانی کو بھی خراب کر دیتے ہیں۔ یہ جراثیم نہ صرف لاش کے سڑنے سے پیدا ہوتے ہیں بلکہ اس مخصوص بیماری کے بھی ہوتے ہیں جس سے مرحوم کی موت واقع ہوئی تھی۔"

دفن کی ہوئی لاشوں سے جو ابخارات اٹھتے ہیں وہ زمین کی کنکریلی سطح سے آٹھ یا دس فٹ اوپر اٹھ کر زمین کے باہر آجاتے ہیں ٹھیک جیسے کوئلے کی گیس نیچے سے نکل کر باہر آتی ہے۔ ان بخارات کو فضا میں پھیلنے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔

نیو اورلینز میں ۱۸۵۳ء میں وبا کے دوران میں ڈاکٹر ای۔ ایچ بارٹن نے یہ رپورٹ دی کہ فورتھ ڈسٹرکٹ میں اموات کی تعداد فی ہزار چار سو باون تھی اور کسی جگہ مرنے والوں کی دوگنی تعداد سے بھی زیادہ تھی۔ اس ضلع میں تین بڑے بڑے قبرستان تھے جہاں گذشتہ سال میں تین ہزار سے زائد لاشیں دفنائی گئی تھیں دوسرے ضلعوں میں بھی آبادی کے قریب قبرستان ہونے کی وجہ سے بیماری کو پھیلنے میں مدد ملی۔

۱۸۲۸ء میں پروفیسر بیانکی نے یہ بات مثال دے کر سمجھائی تھی کہ کس طرح پلیگ

کی خوفناک وبا مقام موڈینا میں اس وجہ سے پھیلی کہ وہاں ان قبرستانوں کی کھدائی کی گئی تھی جہاں تین سو سال پہلے پلیگ سے مرے ہوئے مریض دفنائے گئے تھے۔ مسٹر کوپر کچھ پھیلنے والی بیماریوں کی وجوہات کو سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایسے ایام میں جب قبرستانوں کی کھدائی کی گئی تو وہاں فوراً وبا پھیل گئی کیونکہ قبرستان میں پلیگ سے مرے ہوئے لوگ دفن تھے۔

نارتھ امریکن ریویو نمبر ۳ جلد نمبر ۱۳۵ سے ماخوذ

شکاگو میڈیکل سوسائٹی سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر مارکس ڈبلیو پرڈی نے مُردوں کو بجائے دفنانے کے جلانے کی تلقین کی اور انھوں نے چند موازنوں کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ مردوں کو دفنانے سے معاشرے پر کتنا بار پڑتا ہے۔

ریاستہائے متحدہ میں مُردوں کی تکفین و تدفین میں ہر سال سرکار کا جتنا خرچہ ہوتا ہے وہ وہاں کے سرکاری اسکولوں پر کئے جانے والے خرچ کا سوایا ہوتا ہے۔ ۱۸۸۰ء میں اس ملک میں مُردوں کے دفنانے پر جو رقم خرچ ہوئی اس سے اسی سال کے ملک بھر کے تمام تجارتی نقصانات کی تلافی ہو سکتی تھی۔ اور ہر دیوالیہ کو اپنا کام دوبارہ شروع کرنے کے آٹھ ہزار چھ سو تیس ڈالر دئے جا سکتے تھے۔ ملک میں ہر سال مُردوں کو دفنانے پر جو رقم خرچ ہوتی ہے وہ ۱۸۸۰ء کی ملک بھر کی سونے اور چاندی کی کُل پیداوار سے بھی زیادہ ہے۔ تکفین و تدفین کے ان اخراجات میں وہ اخراجات شامل نہیں ہیں جو قبرستان کی زمینوں کو ٹھیک کرانے اور ان پر مقابر اور دیگر یادگاریں بنوانے پر کئے جاتے ہیں اور نہ ہی ان میں وہ نقصان شامل کیا گیا ہے جو قبرستان سے ملحق جائداد کی قیمت گھٹ جانے سے ہوتا ہے۔

متموّل لوگوں کیلئے تو مُردوں کے جلانے یا دفنانے سے اخراجات میں کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ وہ جلانے میں بھی رسومات اور نمائش میں اتنا خرچ کریں گے جتنا کہ ہندوؤں کے یہاں ستی کی رسم میں ہوتا تھا مگر غریبوں کے لئے دفنانے کے مقابلہ میں جلانا کہیں سستا[1]

---

[1] ایک مُردے کے جلانے میں کم سے کم چار یا پانچ ڈالر خرچ ہوتے ہیں۔

رہے گا۔ یہ طریقہ پھر بھی اتنا سستا ہوگا کہ غریب لوگ مالداروں کی نقل کرنے لگیں گے اور آہستہ آہستہ سب لوگ اس رواج کو اپنا لیں گے۔ اگر جلانے کی رسم اختیار کر لی جائے تو ہمیں دفنانے سے متعلقہ فرسودہ مسخرے پن کی لعنت سے تو نجات مل جائے گی لیکن اس رواج کو اپنانے سے وہ پرانے دقیانوسی مذاق جو جلانے کی رسم سے وابستہ ہیں اور دو ہزار سال پہلے کی ہیں پھر ابھر آئیں گے۔

میں ایک حبشی کو جانتا ہوں جو متفرق کام اور جفاکشی کر کے اپنی روزی کماتا ہے لیکن پھر بھی چار ڈالر سالانہ سے زیادہ نہیں کما پاتا۔ اور چونکہ اس کے ایک بیوی اور کئی چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اس لئے اس کو بغیر قرض لئے ہوئے بارہ مہینے گذارنے کے لئے نہایت کنجوسی سے کام لینا پڑتا ہے۔ اگر ایسے آدمی کو تکفین و تدفین کے لئے کبھی خرچ کرنا پڑ جائے تو وہ سخت مالی مشکلات میں مبتلا ہو جائے گا۔ بدقسمتی سے ایسا ہوا کہ جس زمانے میں میں اس کتاب کا پہلا باب لکھ رہا تھا تو اس کا ایک بچہ فوت ہو گیا۔ وہ بیچارہ ایک دوست کے ہمراہ تمام شہر میں مارا مارا پھرا کہ اسے کہیں سستا سا ایک تابوت مل جائے۔ بالآخر اس نے ایک بہت سادہ سا لکڑی کا تابوت خرید لیا جو سب سے سستا تھا اور جس پر کچھ میلے دھبے بھی پڑے ہوئے تھے۔ مگر یہ تابوت بھی اسے چھبیس ڈالر میں پڑا۔ اگر یہی صندوق کسی اور چیز کے لئے بنایا گیا ہوتا تو شاید اس کی قیمت مشکل سے چار ڈالر ہوتی۔ بدقسمت حبشی اور اس کی بیوی کو یہ خرچہ مہینوں تک تکلیف دیتا رہے گا۔

تینتالیسواں باب

تدفین کا سلیقہ

اسی دوران میں ایک دن گلی میں میری ایک پرانے شناسا سے جسکو میں نے چھ یا سات سال سے نہیں دیکھا تھا ملاقات ہوگئی۔ ہماری گفتگو کچھ اس قسم کی تھی:۔

میں نے کہا" پہلے تو تم بوڑھے اور مایوس سے دکھائی دیتے تھے۔ اب تم ویسے نہیں لگتے۔ تم نے یہ جوانی اور زندہ دلی کہاں سے حاصل کی ذرا مجھے وہاں کا پتہ تو بتاؤ"

اس بات پر وہ خوش ہوکر ہنسا اور اُسنے اپنا چمکدار ہیٹ اتار کر اس کے چندوے کے کنارے پر لگا ہوا پیلے کاغذ کا ایک لیبل مجھے دکھایا۔ اس لیبل پر کچھ حروف چھپے ہوئے تھے وہ الفاظ یہ تھے"جے۔ بی۔ انڈرٹیکر" جب میں اُسے پڑھ رہا تھا تو وہ برابر ہنسے جا رہا تھا۔ بعد ازاں اس نے ہیٹ پھر پہن لیا اور اسے بے پروائی سے ہوا کے رخ کے خلاف دوسری طرف کو ذرا سا جھکا لیا پھر زور سے بولا۔

"بات یہ ہے کہ جب آپ پہلے مجھ سے ملے تھے تو اسوقت میں بیمہ ایجنٹ کا کام کرتا تھا اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ میں کچھ پریشانی میں تھا۔ میرا کام ٹھیک نہیں چل رہا تھا لیکن بعد ازاں ایک جگہ بڑی خوفناک آگ لگی اور میرا کام چل پڑا۔ دس روز تک یعنی جبتک کہ لوگ خوفزدہ رہے میرا کام خوب چلتا رہا۔ اسکے بعد جب تک آگ لگنے کا دوسرا حادثہ نہ ہوا بیمہ کا کام مندا رہا مشکل یہ ہے کہ اس جیسے شہر میں آگ ذرا کم ہی لگتی ہے۔ اور ایک بیمہ ایجنٹ کو لگاتار کئی ہفتوں تک کام نہیں ملتا اور وہ اسوجہ سے نا امید ہو جاتا لیکن میں شرط لگا کر کہہ سکتا ہوں کہ جو کام میں اب کر رہا ہوں اس سے بہتر کوئی کام نہیں یہ کام ہے تابوت مہیا کرنیکا

مرنے کے لئے لوگوں کو کسی کی تقلید کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نہیں جناب وہ تو مرتے ہی رہتے ہیں
اور تابوت بردار کا کاروبار کبھی مندا نہیں ہوتا۔ میں نے یہ کام صرف دو تین پرانے تابوتوں اور
ایک کرائے کی تابوت بردار گاڑی سے شروع کیا تھا۔ اور آج دیکھیئے میرا کاروبار۔ میں نے اس کام
میں جو ترقی کی ہے وہ ہر شخص کرنا چاہے وہ کوئی ہو۔ پانچ سال پیشتر میں ایک کھپریل کی برساتی میں
رہتا تھا۔ اور اب دیکھیئے میں ایک شاندار مکان میں رہتا ہوں جسکی چھت سنگ مرمر کی ہے اور
جس میں جدید قسم کی ہر آسائش کی چیز مہیا ہے۔"

"کیا تابوت کے کاروبار میں اتنا منافع ہے۔؟ کیا ایک تابوت پر اتنا زیادہ نفع ملتا ہے؟"
"جانیئے صاحب آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔" اور اسکے بعد اس نے بڑے رازدارانہ انداز
میں میری طرف آنکھ سے اشارہ کیا۔ آواز ذرا ہلکی کی اور میرے بازو پر اپنا ہاتھ رکھکر بڑے مؤثر
انداز میں کہا۔" دیکھو دنیا میں ایک ہی چیز ایسی ہے جسکو خریدنے میں کوئی آدمی دام کم کرنے
کی کوشش نہیں کرتا۔ اگر کسی چیز کو خریدتے وقت خریدار یہ نہ کہے کہ ذرا میں اس کو اور جگہ بھی
دیکھ لوں اور اگر دوسری جگہ مجھے اس سے بہتر نہیں ملے گی تو میں اسی کو آکر خرید لوں گا۔ تو ایسی
چیز تابوت ہی ہو سکتی ہے۔ اگر دنیا میں کوئی ایسی چیز ہو سکتی ہے جسے لوگ گراں . . . ترین
ہونے پر بھی خریدنا پسند کریں گے تو وہ تابوت ہی ہے مثلاً اگر کوئی اپنے کسی عزیز کی لاش کیلئے تابوت
خریدنے جائیگا وہ یہ ہرگز نہیں کہے کہ اگر مجھے صنوبر کی لکڑی کا تابوت ملجاتے تو میں اخروٹ کی
لکڑی کا نہیں خریدونگا یا اگر اخروٹ کا ملے تو مہاگنی کا نہیں خریدوں گا۔ یا مہاگنی کا مل جائے تو سٹیل کا
تابوت جسمیں چاندی کی تختی اور کانسی کے دستے لگے ہوں نہیں خریدوں گا' (تابوت تو آدمی مہنگے
سے مہنگا ہی خریدنا پسند کرے گا) اور دنیا میں یہی ایک چیز ایسی ہے جسکی قیمت وصول کرنے کے لئے
خریدار کے پیچھے مارا مارا پھرنا نہیں پڑتا۔ واہ کیا اچھا پیشہ ہے تابوت مہیا کرنیوالے! یہ بات
بالکل یقینی ہے کہ عیسائی ملکوں میں اس سے زیادہ شاندار کام اور کوئی نہیں۔"

"اچھا ذرا تصور کیجئے کہ اگر کوئی مالدار آدمی تابوت خریدنے آتا ہے تو وہ فوراً آپ کا
بڑھیا سے بڑھیا تابوت لے گا۔ قیمت چاہے آپ کتنی ہی کیوں نہ مانگیں۔ وہ منع نہیں کریگا۔
اور آپ جو کچھ بھی اسکے ہاتھ فروخت کرنا چاہیں گے وہ اُسی کو خریدے گا۔ اور اگر خریدار عورت

ہے تو آپ کو اور بھی فائدہ ہوگا۔ مثلاً مسز ہو فلاہرتی آتی ہیں۔ بیچاری بیوہ آنسو پونچھ رہی ہے اور کراہ رہی ہے۔ اسکا رومال ایک آنکھ پر رکھا ہے۔ اور آنکھوں میں آنسو لئے وہ تابوتوں پر نظر ڈالتی ہے اور کہتی ہے۔

"اس تابوت کا آپ کیا لیں گے۔؟"

"انچالیس ڈالر محترمہ۔" میں جواب دیتا ہوں۔

"قیمت تو بہت زیادہ ہے لیکن میرے خاوند پٹ کے لئے تو ایسا ہی تابوت چاہیئے جیسا شریف آدمیوں کے واسطے ہونا چاہیئے کیونکہ وہ بہت شریف آدمی تھا چاہے اس کے لئے مجھے تھوڑی اور زیادہ محنت ہی کیوں نہ کرنی پڑے میں اسے ہی خریدونگی۔"

اور میں کہتا ہوں" ہاں محترمہ یہ تابوت اچھا بھی ہے اور سے آپکو یقین بھی دلاتا ہوں کہ یہ سستا بھی ہے لیکن اس زندگی میں ہمیں اپنی چادر کے مطابق پیر پھیلانے چاہئیں جیسی کہ کہاوت ہے۔" اور جیسے وہ جانے لگتی ہے میں ایک آہ بھرتا ہوں اور سرسری طور پر کہتا ہوں "یہ والا سفید ساٹن کے استر والا ہے اور سب خوبصورت ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ اس کی قیمت آپکو زیادہ معلوم ہوگی یعنی بینسٹھ ڈالر۔ لیکن کچھ مضائقہ نہیں آپ مت لیجئے میں نے تو یہ دام محترمہ او شانیسی کو بتائے تھے۔

"کیا آپ کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس عورت یعنی مسز او شانیسی نے یہ تابوت اپنے خاوند کیلئے جو شرابی اور بدمعاش تھا خریدا تھا تاکہ اس کی روح مقام کفارہ تک پہنچ جائے؟"

"ہاں۔ محترمہ۔"

"تب تو میرے خاوند پٹ کی روح اس تابوت میں بند ہو کر جنت کو جائے گی اور دیکھئے چاہے مجھے ایک آدھ ڈالر اور بھی دینا پڑے اگر آپ کے پاس اس سے بھی بہتر تابوت ہو تو وہ دیجئے۔"

"اور چونکہ میں گھوڑا گاڑی کا بھی انتظام کرتا ہوں اس لئے مجھے یہ بھی یاد ہے کہ مسز او شانیسی نے صرف گھوڑوں کا کرایہ چون ڈالر دیا اور اپنے خاوند ڈینس کے دفنانے میں اتنی فراخدلی سے خرچ کیا کہ اسکے خاوند کا جنازہ اس شان سے نکلا جیسے کہ وہ کوئی بڑا نواب

یا قابل ہو۔ مسز لو فلاہرٹی بڑی خود اعتمادی کے ساتھ مسز اوشاہنسی سے زیادہ خرچ کرنے کو تیار ہو جاتی ہیں اور وہ اپنے خاوند کی میت کے لئے چار گھوڑے اور ایک چھ پہیہ گاڑی بھی کرایہ پر لے لیتی ہیں۔ ایسی باتیں پہلے بھی ہوتی تھیں۔ مگر آجکل تو خصوصاً اس شہر میں ایسے واقعات عام ہیں۔ آئرش لوگ میت کو لے جانے کے لئے کئی کئی گھوڑے لیتے تھے اور جنازوں پر اتنی فضول خرچی کر ڈالتے تھے کہ بعد کو ننگے اور بھوکے رہ کر دو دو سال اس کا خمیازہ بھگتتے تھے۔ اس لئے پادری لوگ معاشرے کی اصلاح کے لئے میدان میں اترے اور انھوں نے اس رواج کو ختم کر ڈالا۔ اب پادری ان لوگوں کو دو گھوڑوں سے زیادہ لانے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ کبھی کبھی تو ایک ہی گھوڑے کی اجازت دیتا ہے۔"

میں نے پوچھا "اچھا اگر آپ عام دنوں میں اتنے خوش و خرم رہتے ہیں تو وبائی دنوں میں آپ کی مسرت کا کیا ٹھکانہ ہوتا ہوگا۔؟"

"اس نے سر ہلا کر کہا" نہیں جناب۔ آپ غلط سوچ رہے ہیں۔ ہم تابوت بردار وبا نہیں چاہتے کیونکہ اس سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ فائدہ بالکل نہیں ہوتا۔ بلکہ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عام دنوں کے مقابلہ میں وبائی دنوں میں کوئی خاص زیادہ منافع نہیں ہوتا۔ کیا آپ میری بات سمجھے۔"

"نہیں۔"

"ذرا سوچیے۔"

"میری سمجھ میں تو آتا نہیں۔ آپ ہی بتائیے کہ کیا بات ہے۔؟"

"اس میں دو باتیں ہیں۔"

"اچھا وہ دو باتیں کون کون سی ہیں۔"

"مسالہ لگا کر لاش کو محفوظ رکھنا۔"

"دوسری چیز کون سی ہے۔"

"برف۔"

"اور یہ کیسے۔؟"

" دیکھئے عام دنوں میں جب کوئی انسان مرتا ہے تو ہمیں اس کو ایک دو یا ہو سکتا ہے کہ تین دنوں کے لئے برف میں دبانا پڑتا ہے۔ تاکہ اس کی میت میں شریک ہونے کے لئے اسکے دوست احباب جمع ہو سکیں۔ اور اس حالت میں برف کی بہت زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ پگھلتی بہت جلدی ہے۔ اسوقت ہماری برف جو اہرات کے مول بکتی ہے اور ہماری خدمات کی اجرتیں اتنی زیادہ ہوتی ہیں جتنی جنگ کے زمانے میں سپاہیوں کی۔ لیکن کیا آپ نہیں جانتے کہ جب وبا پھیلتی ہے تو مریض کا دم نکلتے ہی لوگ اسے قبرستان پہونچانے کی کوشش کرتے ہیں اسلئے وبا کے دنوں میں ہمارا برف کا بازار ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور یہی حشر ہوتا ہے ہمارے کاروبار کالاش کو محفوظ کرنے کے سلسلے میں۔ ذرا اس خاندان کا خیال کیجئے جنہیں یہ توفیق حاصل ہے کہ وہ مسالہ کا صرفہ برداشت کرسکیں وہاں تو آپ کا کام بڑا آسان ہے۔ آپ مسالہ لگوانے کے انہیں بیسیوں طریقہ بتا سکتے ہیں حالانکہ ہوتے ایک ہی طریقے ہیں اور طرّہ یہ کہ جب آپ انھیں سب سے سستا طریقہ بتائیں گے تو وہ سب مہنگا ہی پسند کریں گے غم میں ایسا کرنا انسانی فطرت میں ہے جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ عقل کو دخل نہیں ہوتا۔ اسوقت غم کی چوٹ کی وجہ سے انسان پیسے کی فکر نہیں کرتا وہ تو صرف اتنا چاہتا ہے کہ مرحوم کی لاش لافانی ہو جائے۔ اور اسکے لئے اسے چاہے کچھ بھی خرچ کرنا پڑے آپ کو صرف اتنا ہی کرنا ہوتا ہے کہ آپ منہ مانگا دام مانگ کر چپ کھڑے رہیں وہ لوگ بلا پس و پیش آپ کو پیسہ دیدیں گے۔ ارے صاحب اور کیا بتاؤں اگر آپ کسی مردے کے لئے مسالہ وغیرہ مہیا نہیں کرسکتے تو بعد میں اپنا سامان لے کر وہاں پہنچ جایئے۔ اور دو گھنٹے کے اندر ہی آپ کے چھ سوڈالر سیدھے ہو جائیں گے۔ اس مردے سے آپ اور کیا کما سکتے تھے۔ ہمارا کاروبار تو آپ ایسا سمجھیں جیسے قحط کے زمانے میں چوہوں کو جاڑا کے مول بیچنا۔ لیکن کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ وبائی دنوں میں لوگ میت کو مسالہ لگوانے کے منتظر نہیں رہتے۔ نہیں جناب مطلق نہیں اور اسطرح ہمارے کاروبار کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ اس پر بلائے آسمانی نازل ہو جاتی ہے۔ اچھا بھائی اب چلتے ہیں۔ اگر آپ کو کبھی ضرورت پڑے تو ضرور یاد فرمائیں میرا مطلب یہ ہے کہ جب کبھی آپ ادھر سے گذریں تو ضرور تشریف لاویں۔"

۔یہاں میں نے کوئی مبالغہ نہیں کیا ہے۔ اگر خود اس نے فرط مسرت میں کچھ بڑھا چڑھا کر کہا ہو تو وہ دوسری بات ہے۔

مُردوں کو دفنانے کے سلسلے میں مذکورہ بالا واقعات کا حوالہ دینے کے بعد میں اس موضوع کو .... یہیں چھوڑتا ہوں۔ رہی میری ذاتی رائے تو میں خود تو یہی اُمید کرتا ہوں کہ میری لاش جلائی جائیگی۔ جب ایکبار میں نے اپنے متعلق یہ بات ایک پادری سے کہی تھی تو اس نے اپنے خیال انچے بھلے سے مؤثر انداز میں یہ جواب دیا تھا۔

"اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو اپنی میت کے انجام کے بارے میں اتنا فکر مند نہیں ہوتا۔"

غالباً وہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ میرے گھر کے افراد میری اس وصیت کے خلاف تھے۔

چالیسواں باب

شہر کے نظارے

نیو اورلینز شہر کا وہ حصہ جو پرانا فرانسیسی شہر کہلاتا ہے اور جہاں کبھی زیادہ تر اسپین کے لوگ آباد تھے شہر کے اس حصے سے کوئی مشابہت نہیں رکھتا جو مخصوص امریکی طرز کا ہے۔ ان دونوں حصوں کے درمیان ایک اینٹوں کا بجٹہ ہے۔ شہر کے امریکی حصہ میں مکانات مختلف سلسلوں میں بنے ہوئے ہیں بہ سادہ مگر شاندار لگتے ہیں۔ سب مکانات ایک ہی نمونے کے بنے ہوئے ہیں۔ صرف کہیں کہیں جدت سے کام لیا گیا ہے جسکی وجہ سے ان کی خوبصورتی میں اضافہ ہو گیا ہے۔ سب مکانوں پہ باہر سے پلاسٹر کیا گیا ہے اور قریب قریب سب

میں لوہے کے جنگلوں والے برآمدے ہیں یہ مکانات کئی کئی منزل اونچے ہیں۔ ان کی خوبصورتی میں ایک خاص اضافہ ان گہرے اور رنگ برنگے دھبوں سے ہوا ہے جو موسم کی تبدیلیوں کے ساتھ دیواروں کے پلاسٹر پر پڑ جاتے ہیں اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ گہرے ہوتے جاتے ہیں یہ چیز یہاں کے قدرتی ماحول کے عین مطابق ہے کیونکہ دھبتے دیواروں پر ایسے ہی خوشنما لگتے ہیں جیسے شام کے وقت آسمان میں بکھرے ہوئے بادلوں پر غروب آفتاب کی لالی۔ اس دلکش منظر کی نہ تو ٹھیک نقل ہی اتاری جا سکتی اور نہ یہ امریکہ میں کہیں اور دیکھنے کو ملے گا۔

یہاں لوہے کے بنگلے بھی ایک مخصوص نمونے کے ہیں۔ یہ ہلکے اور خوبصورت ہوتے ہیں اور ان کے بیچ میں گول صفر یا اور کوئی نقش بنا ہوتا ہے۔ سٹیل میں نقش لگا کر بنانے کا یہ پیچیدہ کام واقعی حیرت انگیز ہے۔ زمانہ قدیم میں کاریگر لوگ ہاتھ سے بنایا کرتے تھے اب ایسے جنگلے بہت کم دکھائی دیتے ہیں اسلئے نسبتاً ان کی قدر و قیمت زیادہ ہے اب تو وہ نادرات میں سے ہو گئے ہیں۔

ہمارے ساتھیوں کو نیواورلینز شہر کے اس پرانے حصے میں جنوبی علاقہ کے ایک قابل آدمی یعنی "گرانڈ لیسی میس" کے مصنف کے ساتھ گھومنے کا موقع مل گیا۔ اس مصنف نے جنوب کے علاقے کے عوام کے طرز معاشرت اور ان کی تواریخ و تمدن کا بڑا خوبصورت نقشہ کھینچا تھا۔ حقیقت میں میرا تجربہ یہ ہے کہ جس شخص کی نگاہ خوبصورتی کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے تربیت یافتہ نہ ہو اور جس میں قوت متخیلہ بھی خاصی نہ ہو وہ اس مصنف کی کتابوں کو پڑھ کر جتنا فائدہ اٹھا سکتا ہے اتنا ان مناظر کو خود دیکھ کر نہیں اٹھا سکتا۔

اگر مسٹر کیبل آپ کے ہمراہ ہوں اور وہ آپ کو ہر بات بتاتے سمجھاتے اور اس کی توضیح کرتے چلیں تو آپ کو اس پرانے علاقے میں رک رک کر چلنے میں مزہ آئیگا۔ کیونکہ اس طرح سے جو چیزیں آپ کو نہیں دکھائی دیتیں یا سمجھ میں نہیں آتیں ان کی واضح تصاویر آپکے سامنے آتی چلی جاتی ہے۔ لیکن اتنی وضاحت کے باوجود بھی یہ خاکے آپ کے ذہن میں مستقل اور واضح نہیں رہتے۔ آپ ان کے نمایاں خد و خال تو دیکھ لیتے ہیں لیکن ان کی باریکیوں

پر یا تو آپ کی نظر جاتی ہی نہیں یا آپ ان کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ آپکی حالت بالکل ویسی ہی ہوتی ہے جیسی کہ اس کوتاہ اندیش اور ناواقف اجنبی مسافر کی جو آلپس کے پہاڑوں کے افق تک پھیلے ہوئے وسیع سلسلے کو ایک روشن خیال رہبر کے ساتھ جو اس علاقہ کا باشندہ ہے طے کرنے کے لئے گامزن ہو۔

ہم پہلانے سینٹ لوئی کا ہوٹل دیکھنے گئے یہاں اب اس عمارت میں میونسپلٹی کے دفتر ہیں اس عمارت میں بظاہر کوئی خصوصیت دکھائی نہیں دیتی۔ لیکن جو بات نیویارک کی اکیڈمی آف میوزک کی عمارت کے بارے میں کہی جاتی ہے وہی بات یہاں اس عمارت پر صادق آتی ہے کہ اگر صفائی کیلئے یہاں کبھی جھاڑو یا بیلچہ استعمال کیا گیا تھا تو اس کا ہمیں کوئی ثبوت نہیں ملتا یہ ایک عجیب بات ہے کہ اکیڈمی آف میوزک کے گرجا گھر کے احاطے میں کرم کلہ گھاس یا دوسرے پودے نہیں اُگ پاتے لیکن بنا کسی شک وشبہ کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ پودوں کے نہ اُگنے کی وجہ یہ ہے کہ بیچوں بیچ آڑ ہونے کی وجہ سے یہاں روشنی نہیں پہنچ پاتی اور دوسری وجہ یہ ہے کہ سوائے گرجا کے بغلی راستوں کے احاطے میں اور کسی جگہ پودوں کی نشوونما بھی ممکن نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ نقیب لوگ اپنے کاجوں میں لگانے والے پھول اسی احاطے میں اگاتے ہیں اس بات کی دلالت کرتی ہے کہ اگر اس عمارت کے اندر کھیتی کی دیکھ بھال کرنیوالا کوئی ماہر ہو تو یہاں کیا نہیں پیدا ہو سکتا۔

ہم مقدس گرجا اور اس کے سامنے کا چوک بھی دیکھنے گئے۔ گرجا میں مذہبی قسم کی دُھندلی بے رونق روشنی تھی جبکہ چوک میں دنیاوی قسم کی چہل پہل۔ یہ جگہ نارنگی کے پیڑوں اور پھولوں سے لدی جھاڑیوں کی وجہ سے خوشنما معلوم ہوتی تھی۔ ہم دھوپ میں ویران مکانوں کے بیچ میں سے گذر کر ایک لق ودق سنسان اور ویران میدان میں پہونچے۔ جہاں کچھ بنگلے بنے ہوئے ہیں۔ یہاں قصبہ کے فالتو پانی کو نکالنے کے لئے مشین لگی ہوئی ہے۔ گھاس کے میدانوں میں بچے کھیل رہے تھے۔ اور گایئں چر رہی تھیں بعد ازاں ہم ایک پرانے قبرستان سے گذرے جہاں ہمیں یہ بتایا گیا کہ ایک بحری قزاق کی ہڈیاں دفن نہیں۔ ہم نے ساتھیوں کی بات پر یقین کر لیا۔۔۔ لیکن اس کو دیکھنے نہیں گئے۔ یہ ایک خونخوار ڈاکو تھا جس نے بہت کشت وخون کیا

تھا۔ جبتک وہ گوشۂ تنہائی میں بے داغ زندگی گذارتا رہا تب تک اس کا نام اور اس کے پرانے پیشے کی شہرت دُور دُور تک پھیلی رہی اور امیر اور غریب سب اس کی تعظیم و احترام کرتے تھے لیکن جب وہ ملک کی سیاست میں داخل ہو گیا اور ایک چھوٹا ایلڈرمین بن گیا تو لوگوں نے اس کو پریشان کیا اور اس کو اس عہدہ سے ہٹا دیا۔ گو بعد میں وہ اس کے لئے روئے۔ جب وہ مرا تو انھوں نے اسکی قبر پر ایک مقبرہ بنوا دیا۔ اور آہستہ آہستہ اس نے اپنی کھوئی ہوئی شہرت حاصل کر لی لیکن یہ شہرت اسکے ڈاکو ہونے کی وجہ سے تھی نہ کہ ایلڈرمین ہونے کی وجہ سے۔ آجکل فراخدل اور رومان دار لوگ اسے اسلئے یاد کرتے ہیں کہ وہ کیا تھا یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ بعد میں کیا ہو گیا تھا۔

وہاں سے ہم گاڑی میں بیٹھ کر کئی میل اور آگے گئے۔ ہم نے ایک دلدل کو پار کیا اور ایک لوہے کے خولوں سے بنی ایک آہنی سڑک پر آ پہونچے جسکے ایک جانب ایک نہر بہہ رہی تھی اور دوسری جانب گھنا جنگل تھا۔ ہمارے راستے میں اِدھر اُدھر دکھائی دینے والی چیزوں میں سے ایک توسر کا درخت تھا جو کہیں کہیں کہیں کچھ دلدلی پر پایا جاتا تھا۔ جس کی پتلی پتلی اُلجھی ہوئی گھنی شاخیں تھیں اور جسکے تنے پر کائی جمی تھی اور جس کی چوٹی سیدھی آسمان کو چھوتی ہوئی نظر آتی تھی اور جو وہاں ہی ایک عجیب و غریب چیز معلوم ہوتی تھی جیسی کہ جاپانی تصویروں میں سیب کے درخت۔ کبھی کبھی نہر میں تیرتا ہوا کوئی گھڑیال دکھائی دیتا۔ یا کبھی نہر کے کنارے کھڑا ہوا کوئی چمکدار چہرہ والا حبشی نظر آجاتا تھا جسکے بُت جیسے قامت کی پرچھائیں صاف پانی میں صاف دکھائی دیتی تھی۔ اور جو شاید مچھلی کے پھنسنے کا انتظار کرتا ہوتا تھا۔

رفتہ رفتہ ہم ویسٹ اینڈ پہونچ گئے۔ یہاں پر بہت سے ہوٹل ہیں جو عموماً گرمیوں میں تفریح گاہ کا کام دیتے ہیں انکے چاروں جانب کشادہ برآمدے ہیں اور نیلے پانی کی وسیع جھیل اونچا ریٹرین کی لہریں ان ہوٹلوں کی دہلیز تک پہونچ جاتی ہیں۔ نیچے کی منزل کے برآمدے میں جسکے فرش کے نیچے سے پانی بہتا تھا ہم نے کھانا کھایا۔ اس کھانے میں خصوصی چیز پومپینو مچھلی تھی جو کسی معمولی گناہ کی طرح لذیذ ہوتی ہے۔

ویسٹ اینڈ میں ہزاروں لوگ ریل اور موٹروں سے آتے ہیں۔ اور اسپینی قلعہ میں روز

شام کو جمع ہوتے ہیں۔ جہاں وہ کھانا کھاتے ہیں بینڈ باجا سنتے ہیں اور کھلی ہوا اور بجلی کی روشنی میں ٹہلتے ہیں۔ ناؤ میں بیٹھ کر جھیل کی سیر کرتے ہیں اور دیگر مختلف طریقوں سے تفریح کرتے ہیں۔

پوچینو مچھلی کھانے کا اتفاق ہمیں کئی جگہوں پر کئی روز ہوا۔ خاص طور سے ایک دعوت میں جو ہدیان کے اعزاز میں شہر کے ایک کلب میں دی گئی تھی یہاں یہ مچھلی لذیذ ترین بنائی گئی تھی۔ جس سے یہ یقین ہو گیا کہ اس مچھلی کی شہرت واقعی جائز ہے۔ اس مچھلی کے علاوہ سرخ جھینگا مچھلیوں کا انبار ایک پلیٹ میں لگا ہوا تھا یہ مچھلیاں انگوٹھے کے برابر بڑی ہوتی ہیں جو بہت ہلکی خوش ذائقہ اور اشتہا بڑھانے والی ہوتی ہیں۔ عمدہ پکی ہوئی وہائٹ بیٹ (ایک مچھلی) عمدہ قسم کی شرمپ (ایک مچھلی) اور ایک بہت ہی عمدہ قسم کا مائم کیک تھے۔ اس کھانے میں دوسری چیزیں دہی بھی جو ڈینیکو اور یکجا تمام تیلیس کے ہوٹلوں میں مل سکتی ہیں۔ یہ سب چیزیں جن کا میں نے ذکر کیا ہے میرے خیال میں اتنی عمدہ اور کہیں نہیں مل سکتیں جتنی کہ نیو اورلینز میں۔

مغربی اور جنوبی علاقوں میں ابھی حال ہی میں ایک نیا ادارہ قائم ہوا ہے جسکا نام بردم برگیڈ ہے۔ اس کی زیادہ تر نوجوان عورتیں ہیں جو سپیل فوج کی ٹریننگ لیتی ہیں۔ اور ڈرل کرتے وقت اپنے ہاتھوں میں بجائے بندوق کے جھاڑو رکھتی ہیں۔ دیکھنے میں یہ منظر بہت خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ جب وہ ڈرامہ کے اسٹیج پر آکر یہ ڈرل کرتی ہیں تو رنگ برنگ کی روشنیوں میں یہ منظر اور بھی دلکش معلوم ہوتا ہے۔ میں نے ان لڑکیوں کو بڑی خوبصورتی، عزم اور قابل تحسین اہتمام سے اس ڈرل کی پیچیدہ مشق کو کرتے دیکھا ہے میں نے دیکھا ہے کہ وہ جھاڑو سے صفائی کرنے کے علاوہ ہر وہ کام کر سکتی ہیں جو کیا جا سکتا ہے میں نے ان کو جھاڑو دیتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ حالانکہ وہ یہ کام بھی سیکھ سکتی تھیں۔ جو کچھ انھوں نے ابتک سیکھ لیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر انھیں کبھی جھاڑو دینے کا کام سیکھنا پڑا تو وہ اس میں بھی ایسا کمال دکھائیں گی کہ وہ میکلو جنگ جاؤ پٹاؤ لس یا اسکے قریب کی کسی دوسری سڑکوں تک کو صاف کر ڈالیں گی اور چند ہی منٹوں میں تمام چوراہے بالکل صاف ستھرے نظر آنے لگیں گے۔ مگر یہ لڑکیاں خود اتنی صاف ستھری نظر نہیں آئیں گی۔ لہذا انجام کار کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔

ان کی یہ ڈرل واشنگٹن کے توپ خانے کی عمارت میں ہوئی تھی۔ اس عمارت میں ہم نے لڑائی کی بہت سی دلچسپ نشانیاں دیکھیں۔ ہم نے ایک روغنی تصویر بھی دیکھی جس میں اسٹون وال جیکسن کی جنرل لی سے آخری ملاقات دکھائی گئی ہے دونوں آدمی گھوڑے پر سوار ہیں جیکسن ابھی سوار ہوا ہے اور لی صاحب کو سلام کر رہا ہے۔ یہ تصویر بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس تصویر میں جو خاکے دیئے گئے ہیں وہ بڑے مستند ہیں۔ لیکن دوسری تاریخی تصاویر کی طرح یہ بھی بیکار ہے اگر اس پر لیبل لگا کر یہ نہ بتایا جائے کہ انہیں کیا دکھایا گیا ہے۔ اس لیبل میں ذیل کی کوئی عبارت لکھی جا سکتی ہے۔

لی اور جیکسن کی پہلی ملاقات

لی اور جیکسن کی آخری ملاقات

جیکسن اپنا تعارف لی سے کر رہے ہیں۔

جیکسن صاحب لی کا کھانے کا دعوت نامہ منظور کر رہے ہیں۔

جیکسن صاحب لی کے کھانے کا دعوت نامہ قبول کرنے سے شکریہ کے ساتھ معذوری کا اظہار کر رہے ہیں۔

جیکسن زبردست شکست کھا کر معافی مانگ رہے ہیں۔

جیکسن ایک بڑی فتح کی اطلاع دے رہا ہے۔

جیکسن صاحب لی صاحب سے ایک مقابلہ کے کھیل کیلئے درخواست کر رہے ہیں مگر در حقیقت یہ تصویر ایک ہی کہانی بتاتی ہے اور وہی کافی ہے۔ یہ بڑے سیدھے سادے اور مطمئن کر دینے والے انداز سے صرف یہی کہتی ہے۔ "جیکسن اور لی ایک ساتھ کھڑے ہیں۔"

اگر آرٹسٹ یہ دکھا سکتا کہ یہ لی اور جیکسن کی آخری ملاقات کی تصویر ہے تو وہ ضرور دکھاتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا کیونکہ کوئی ایسا طریقہ نہیں تھا جس سے وہ یہ دکھا سکتا۔ ایک تاریخی تصویر میں چاہے کتنے اچھے اشارات و کنایات دکھائے گئے ہوں لیکن اگر اس پر لیبل نہیں لگا ہے تو اس سے کوئی فائدہ نہیں۔ ایک لیبل مصوری کی ایک ٹن محنت کے برابر کام کرتا ہے۔ روم میں نیک اور ہمدرد لوگ مقدس دیوی بیٹرس سینسی کے بت کے سامنے

جو اُس کی قربانی کے دن سے ایک دن پہلے کا ہے' روتے ہیں کیونکہ اس بت کے نیچے لگے ہوئے لیبل سے اس واقعہ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور ان کا دل بھر آتا ہے اس مثال سے ہمیں لیبل کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے ۔ اگر انھیں لیبل پڑھ کر یہ نہ معلوم ہوا ہوتا کہ اس تصویر میں مصوّر کیا دکھانا چاہتا تھا تو وہ محض قیاس آرائیاں کرتے اور تصویر سے انکے دل پر اتنا اثر نہ ہوتا۔ وہ یہ سوچتے کہ یہ تصویر کسی لڑکی کی ہے جو' تپ کاہی' میں مبتلا ہے' یا یہ کہ" اس تصویر میں ایک لڑکی دکھائی گئی جس کا سر ایک تھیلے سے ڈھانپ دیا گیا ہے ۔

جنوبی علاقہ کا لب و لہجہ اور ان کا حروف کو گرا کر بولنے کا طریقہ جسے میں قریب قریب بھول سا گیا تھا میرے کانوں کو اتنا ہی خوشگوار لگا جتنا پہلے لگتا تھا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے جنوب کا باشندہ بولتا نہیں گاتا ہے۔ کم از کم مجھے تو ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ میں جنوب میں پیدا ہوا تھا۔ جنوب کا پڑھا لکھا باشندہ انگریزی حرفِ آر (r) کو صرف اگر وہ کسی لفظ کے شروع میں واقع ہے تو بولتے ہیں ورنہ اس کو گرا دیتے ہیں وہ "آمز' کو' آنز' ، موڈرن' کو' ڈِیز' ، گورنز' کو' گونز' ، اور اسی طرح دیگر الفاظ میں بھی حرف "آر' (r) کو گرا دیتے ہیں جیسے' ریفو' ، روا' وغیرہ وغیرہ۔ ایسے چھپے ہوئے الفاظ ہماری آنکھوں کو چاہے اچھے نہ لگیں مگر کانوں کو ضرور اچھے لگتے ہیں۔ حرف' آر' کا حذف جنوبی بول چال میں کیسے ہوا اور یہ اُن کے الفاظ سے کیسے غائب ہو گیا ؟ یہ رواج نہ تو شمالی علاقے سے آیا ہے اور نہ انگلینڈ سے وراثت میں ملا ہے۔ کیونکہ ان کے اور بھی تلفظ ان ملکوں سے مختلف ہیں۔ مثلاً یہ لوگ اُن الفاظ میں جو' ک' (K) کی آواز سے شروع ہوتے ہیں' کے' (K) کے بعد وائی (Y) کا اضافہ کر دیتے ہیں جیسے وہ کارٹر (Carter) کو کیا ہٹر' کارڈس (Cards) کو' کیا ہڈس' یا' کارس' کو کیا ہس' کہتے ہیں۔ ان کا دوسرا خوشگوار رواج جو عرصہ دراز سے شمال میں متروک ہو رہا ہے یعنی' سر' (Sir) کا کثرت سے استعمال کرنے کا رواج یہاں جنوب میں یہ رواج بہت ہے ۔ شمال کے لوگ اثبات میں مختصر اور روکھا سا' ہاں' (Yes) یا انکار کے لئے' نہیں' (NO) کہہ دیتے ہیں جبکہ جنوب کے لوگ موء دبانہ طریقہ سے' ہاں جناب' (Yes Sub) اور' نہیں جناب'

(No, Suh) کہتے ہیں۔

لیکن جنوب کے لوگ کچھ الفاظ ایسے بھی بولتے ہیں جو بے محل و بے محاورہ ہوتے ہیں جیسے
'as' کے بجائے 'like' بولنا یا جہاں ضرورت نہیں ہوتی وہاں 'at' لگا
دینا وغیرہ۔ میں نے ایک پڑھے لکھے آدمی کو یہ فقرہ کہتے سنا 'Like the flag officer did'
اس کا باورچی یا بیرا اگر یہ جملہ کہتا تو وہ یوں ہوتا "Like the flag officer done"
یہاں اکثر آپ شرفاء کو یہ کہتے سنیں گے۔ "Where have you been at ?"
اسی طرح کا ایک بگڑا
ہوا فقرہ اور بھی ہے جو میں نے یہاں ایک بوسیدہ لباس میں ملبوس عرب کو بولتے ہوئے سنا۔
وہ یہ ہے I was a-askin Tom. what you was a-sellin it;
(I was asking Tom where you was selling at ?) یہاں تو تعلیم
یافتہ لوگ بھی بے پروائی سے 'Shall' کے بجائے 'Will' بولتے ہیں۔ اور بعض ایسے
تو اس طرح بولتے ہیں۔ 'I didnt' go to do it' شمال کے لوگ لفظ 'guess' کا
جو استعمال کرتے ہیں وہ انگلینڈ سے لیا گیا ہے جہاں اس کا استعمال بہت عام تھا اور اب
انگریز لوگ طنزاً یہ کہتے ہیں کہ یہ لفظ امریکہ سے ہی آیا ہے مگر یہ لفظ جنوب میں بہت کم
استعمال ہوتا ہے۔ یہاں لوگ اس کے بجائے 'reckan' استعمال کرتے ہیں۔ انکی
زبان میں 'doesnt' کا استعمال نہیں ہوتا بلکہ اس کے بجائے وہ 'dont' کہتے
ہیں۔ گنوار لوگ بجائے 'gone' کے 'went' کا استعمال کرتے ہیں۔ اور یہ اتنا ہی برا
لگتا ہے جتنا کہ شمال میں لوگوں کا 'hadnt' aught' کا استعمال کرنا۔ اس فقرہ سے
مجھے یاد آتا ہے کہ کچھ دن ہوئے شمال میں میرے پڑوس میں ایک صاحب نے ایک عجیب قسم
فقرہ بولا۔ وہ یہ تھا۔ ! 'He hadnt aught to have went' یہ سب فرق
کیسے ہو گیا۔؟

کیا دو زبانوں کے امتزاج سے زبان کی ترقی نہیں ہوتی۔؟ آجکل امریکہ میں جو زبان
بن رہی ہے وہ دو زبانوں سے ملکر پیدا ہوئی ہے جن میں ایک شمال کی بول چال کی زبان ہے

اور دوسری جنوب کی۔ آج ہی میں نے ایک معلمہ کو بولتے سنا! 'Where is John gone ?' اب یہ فقرہ اتنا عام ہوگیا ہے کہ ہر جگہ عام فہم ہے۔ اگر وہ معلمہ بجائے 'Where' کے 'Whether' استعمال کرتی تو میرا خیال ہے کہ یہ تصنّع ہوتا۔

یہاں ہم نے ایک بہت دلکش لفظ سنا۔ ایک ایسا لفظ جسے سننے کے لئے نیو اور لینز تک کا سفر بھی مہنگا نہیں ہوگا۔ یہ لفظ دو الفاظ سے ملکر بنا ہے اور بڑا اسٹیک اور بڑ معنی ہے۔ یہ ہے Lagniaffe جسکو یہاں کے لوگ Lannyyap بولتے ہیں۔ مجھے لوگوں نے بتایا کہ یہ لفظ اسپینی زبان سے آیا ہے۔ ہم نے یہ لفظ پہلے ہی وہاں اخبار 'پکییٹون' کے متفرقات کے کالم میں دیکھا تھا اور دوسرے دن تقریباً بیس آدمیوں کو اسے استعمال کرتے سنا اسلئے تیسرے دن ہمیں یہ دریافت کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ آخر اس لفظ کے معنی کیا ہیں اور چوتھے روز سے ہم خود اسے بآسانی استعمال کرنے لگے۔ اس لفظ کے ایک محدود معنی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ استعمال کرتے کرتے لوگوں نے اسکے معنی کچھ وسیع کر دیئے ہیں۔ اسکے معنی یوں سمجھئے جیسے نان بائی ایک درجن روٹی لینے والوں کو ایک زیادہ یعنی تیرھویں بھی دیدے۔ یا یوں سمجھئے کہ فروخت کو بڑھاوا دینے کے لئے کچھ مفت دیدینا (جسے لبھاؤ کہتے ہیں)۔ یہ رواج پہلے پہل اس شہر کے اس حصے میں شروع ہوا تھا جہاں بیشتر اسپینی لوگ آباد تھے۔ جب کوئی بچہ یا کوئی ملازم بلکہ رئیس بلدیہ یا گورنر تک جیسا کہ میں نے سنا ہے کسی دکان سے کچھ خریدتا تو دکاندار سے یہ کہتا "مجھے کچھ لبھاؤ کے طور پر دو" اور دکاندار فوراً کچھ نہ کچھ دیدیتا۔ کبھی کسی بچے کو ملیٹھی کا ٹکڑا دیدیتا تو کسی ملازم کو سستی سی سگریٹ یا گورنر صاحب کو تھوڑا اسا دھاگا دیکر خوش کر دیتا (گو مجھے ٹھیک پتہ نہیں کہ گورنر صاحب کو کیا دیتا ہوگا)، بہر حال کچھ نہ کچھ دیتا ضرور ہوگا۔

نیو آرلینز میں اگر کہیں آپ کو شراب پینے کے لئے بلایا جائے جیسا کہ اکثر ہوتا رہتا ہے اور آپ یہ دریافت کر بیٹھیں "بس اور نہیں میں نے بہت پی لی ہے"۔ تو آپ کا میزبان کہے گا "بس ایک دور اور۔ اسے لبھاؤ سمجھئے" اور جب کوئی البیلا نوجوان اپنی معشوقہ سے بات چیت کے دوران میں تحسین و ستائش کے الفاظ کا ڈھیر لگا دے اور مبالغہ ذرا زیادہ ہو جائے جو اسکی

محبوبہ کو پسند نہ آئے اور وہ اپنی محبوبہ کے چہرے کو دیکھ کر سمجھ جائے کہ اگر آخری لفظ جس سے اس نے تحسین و ستائش میں مبالغہ کیا نہ کہا جاتا تو بہتر ہوتا تو وہ اس طرح معذرت خواہی کرتا ہے کہ "معاف کیجئے میرا منشاء..... مبالغہ کرکے آپ کو ناراض کرنے کا نہیں تھا" مگر ان الفاظ کو بہت مختصراً یوں کہتا ہے "یہ تو محض لیحاظ کے طور پر کہا گیا" اسی طرح اگر ہوٹل میں کوئی ویٹر جو آپ کو قہوہ پیش کر رہا ہے ٹھوکر کھا کر ذرا سا قہوہ آپ کی پیٹھ پر گرا دے تو وہ فوراً معذرت چاہتے ہوئے کہتا ہے "جناب اسے لیحاظ میں سمجھئے اور وہ آپ کو قہوہ کا دوسرا پیالہ مفت لا دے گا۔

پینتالیسواں باب

جنوبی علاقے کے کھیل

شمالی امریکہ میں لوگوں کی بات چیت میں مہینے میں ایکبار بلکہ کبھی کبھی ہفتے میں ایک بار آپ کو جنگ کا تذکرہ سننے کو ملے گا لیکن اس موضوع پر عام بحث مدتوں سے کہیں نہیں ہوتی۔ اس کی کئی وجوہات ہیں ۔ اگر کہیں چھ آدمیوں کی ڈنر پارٹی ہو تو وہاں چھ میں سے چار یا ممکن ہے پانچ آدمی ایسے ہونگے جنھوں نے میدان جنگ دیکھا بھی نہ ہوگا اسلئے جہاں چھ آدمیوں کی پارٹی میں چار پانچ آدمی جنگ سے ناواقف ہوں وہاں گفتگو کا موضوع جنگ نہیں ہوسکتا اور اگر اس موضوع کو کوئی چھیڑ بھی دیگا تو یہ زیادہ دیر نہیں چلے گا' اور اگر آپ اس پارٹی میں چھ عورتیں اور شامل کردیجئے تو جنگ سے ناواقف ایسے افراد کی تعداد میں اضافہ ہوجائے گا جنھوں نے جنگ کی خونریزیاں برائے نام دیکھیں ہونگیں اور جو کچھ دیکھا

ہوگا اسکا تذکرہ برسوں پہلے اتنا ہو چکا ہوگا کہ اگر اب بھی ان کے سامنے جنگ کا ذکر چھیڑ دیا جائے تو وہ اس سے جلد اکتا جائیں گے۔

مگر جنوبی علاقے میں صورت حال اسکے بالکل برعکس ہے یہاں تو جس آدمی سے بھی آپ ملیں گے اسی کو جنگ کا تجربہ ہوگا اور جس عورت سے بھی ملیں گے وہ جنگ کی چشم دید گواہ ہوگی، اسلئے یہاں جنگ بات چیت کا خاص موضوع ہوتا ہے ---------

--------- اور یہاں جنگ میں لوگوں کی دلچسپی نمایاں اور مستقل ہے۔ بلکہ دوسرے موضوعات میں ان کی دلچسپی محض عارضی ہوگی۔ جہاں کہیں لوگ نشست بیٹھے ہوں وہاں جنگ کا ذکر چھیڑ دیجئے اور پھر آپ دیکھیں گے کہ لوگوں کی گفتگو برابر جاری رہے گی جبکہ اور کسی موضوع پر آپ کو یہ کامیابی نہیں ہوگی۔ یہاں جنوب میں تو جنگ کے ایام کو بطور سن عیسوی کے استعمال کرتے ہیں (واقعات کو زمانی حدود کو سن عیسوی سے متعین کرنے کی بجائے (جیسا کہ دنیا میں برتا ہوتا ہے) یہاں زمانہ جنگ سے ان کی عمر شمار کی جاتی ہے)۔ یہاں تمام دن آپ یہی سنتے رہیں گے کہ فلاں واقعات جنگ کے بعد ہوئے، فلاں دوران جنگ میں فلاں جنگ سے پیشتر، فلاں جنگ کے فوراً بعد یا جنگ کے دو، پانچ یا دس سال پیشتر یا بعد ہوئے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ہر فرد و بشر پر اس خوفناک جنگ کا کتنا مہلک اثر ہوا ہے۔ ایک ناتجربہ کار اجنبی کو اس سانحہ عظیم کی تباہی کا لوگوں سے ملنے جلنے سے جو اندازہ ہو سکتا ہے وہ آتشدان کے پاس بیٹھ کر جنگ کے متعلق کتابیں پڑھنے سے نہیں ہو سکتا۔

ایک روز شام کو ایک کلب میں ایک آدمی مجھ سے مخاطب ہوا اس نے الگ لیجا کر مجھ سے کہا "آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ ہم لوگ ہمیشہ جنگ کے بارے میں باتیں کرتے رہتے ہیں یہ اسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہمارے پاس اور کوئی موضوع نہیں ہے بلکہ یہ کہ اور کسی موضوع میں ہمارا اشتیاق اتنا بلا نہیں ہے جتنا جنگ کی باتوں میں یا ایک وجہ اور بھی ہے۔ لڑائی کے دوران میں ہم میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی طرح سے زندگی کے مختلف تجربے ہوئے ہیں اور اسلئے آپ اگر کوئی بھی بات کرینگے تو سننے والے کو آپکی بات سے متعلق ایام جنگ کا ہی کوئی تجربہ یاد آجائیگا اور وہ اسکے متعلق آپ سے بات کرنا شروع کر دیگا اور پھر گفتگو کا موضوع وہی جنگ بن جائے گا آپ چاہے کتنی ہی کوشش سے دوسرے موضوع پر سامعین کو متوجہ کرنے کی کریں اور

ہم بھی آپ کی اس کوشش میں آپ کی مدد کرنے لگیں تو بھی نتیجہ وہی ہوگا کہ موضوع چاہے کچھ بھی ہو اس سے ہر آدمی کے دل میں جنگ کی یادیں تازہ ہو جائیں گی جو اُسے اور کچھ سننے سے روک دیں گی اور پھر اس کا گفتگو جاری رکھنا محال ہو جائے گا کیونکہ جب آپ کے دل میں ایک زبردست جذبہ اُبھر آتا ہے اور آپ اس کا اظہار کرنا چاہتے ہیں تو آپ بے ربط معاملات پر گفتگو نہیں کر سکتے۔"

ہمارے قریب ہی ایک شاعر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے فوراً چاند کے بارے میں بولنا شروع کیا۔ جو شخص مجھ سے بات کر رہا تھا اس نے مجھے تنہائی میں لیجا کر کہا" حالانکہ چاند اور جنگ میں دُور کی بھی مناسبت نہیں ہے مگر آپ دیکھیں گے کہ چاند کا نام سنکر بھی یہاں کسی نہ کسی کے دل میں جنگ کی یاد اُبھرے گی اور دس منٹ کے اندر ہی چاند کا موضوع پسِ پشت ہو کر ختم ہو جائے گا۔

ہاں تو شاعر یہ کہہ رہا تھا کہ اس نے کوئی ایسی چیز دیکھی جسے دیکھ کر اُسے بہت تعجب ہوا۔ اس کا یہ خیال تھا کہ جنوب میں خطِ استوا پر چاند کی روشنی بہ نسبت شمال کے زیادہ تیز اور چمکیلی ہوگی مگر کئی سال گذرے جب وہ نیو آرلینز آیا تو اس نے دیکھا کہ چاند.........

تبھی کمرے کے دوسرے کونے سے کسی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

" ذرا ٹھہرئیے ہر چیز میں تبدیلی آگئی ہے خواہ اس کا نتیجہ اچھا ہو یا برا لیکن ایک بات پر آپ غور کریں گے کہ یہاں کچھ لوگ پیدائشی ترش رو ہیں جو ہر وقت بڑبڑاتے رہتے ہیں اور ہر تبدیلی میں انھیں کوئی نہ کوئی برائی ہی نظر آتی ہے ایک بوڑھی حبشی عورت بھی اسی مزاج کی تھی۔ نیو یارک کے ایک نوجوان باشندے نے کہیں اس کے سامنے کہہ دیا" یہاں چاند کتنا خوبصورت لگتا ہے۔" اس پر اس عورت نے ایک آہ بھری اور کہا" جیتے رہو لیکن۔ کاش تم اس چاند کو لڑائی سے پیشتر دیکھتے"

اب پہلے والا چاند کا موضوع تو پس پشت پڑ گیا تھا۔ البتہ شاعر نے اسے پھر تازہ کرنے کی کوشش کی اور اسے ایک نئے طریقہ سے پیش کیا۔

اس پر لوگوں میں کچھ بحث شروع ہو گئی تنازعہ اس بات پر تھا کہ آیا شمالی اور جنوبی علاقے کی چاند کی روشنی میں واقعی کوئی فرق ہوتا ہے یا یہ فرق صرف وہمی اور خیالی ہے۔ اس بحث سے لوگ ایک دوسرے ہی موضوع پر آ گئے اور وہ تھا اندھیرا دور کرنے کے مصنوعی طریقے۔ بعد ازاں کسی نے اس بات کا تذکرہ شروع کر دیا کہ جب فراگٹ صاحب نے پورٹ ہڈسن پر ایک اندھیری رات میں حملہ کیا تو وہ اپنے ساتھ جنگ میں کام آنے والی لالٹینیں نہیں لے گئے کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ متحدہ افواج کے بندوقچیوں کو روشنی سے گولی چلانے میں مدد ملے۔ اسلئے انھوں نے اپنے جہازوں کے عرشوں پر سفید روغن کرا دیا جسکی وجہ سے جہازوں پر ایک ہلکی دھیمی مگر بہت کار آمد روشنی مہیا ہو گئی جسکی مدد سے اسکے اپنے آدمی اندھیرے میں بھی راستہ ٹٹول کر با آسانی اپنے جہازوں تک پہونچ جاتے تھے اس طرح اب لڑائی کا موضوع پورے طور پر اس مجلس میں شروع ہو چکا تھا گو ابھی دس منٹ بھی نہیں ہو پائے تھے۔

مگر مجھے اس سے کوئی پریشانی نہیں ہوئی کیونکہ ایسے لوگوں سے جنھوں نے جنگ خود دیکھی تھی جنگ کے متعلق قصے سننا بڑا دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔

جبکہ ایک شاعر کی زبان سے جس نے کبھی چاند کا سفر نہ کیا ہو چاند کا ذکر کبھی دلچسپ نہیں ہو سکتا۔

سنیچر کے روز سہ پہر کو ہم نیو اور لینز کے ایک دنگل میں گئے۔ میں نے اس سے بیشتر کبھی مرغوں کی لڑائی نہیں دیکھی تھی۔ وہاں ہر عمر کے اور ہر قوم کے لڑکے اور آدمی تھے جو مختلف زبانیں بولتے تھے۔ لیکن ایک خاص بات تھی اور وہ یہ کہ یہاں ناشائستہ لوگ نہیں تھے۔ مرغوں کی لڑائی شروع ہونے سے پہلے کسی قسم کا شور و غل نہیں ہوتا تھا اسلئے ایک اجنبی کو آپ یہ دھوکا دے سکتے تھے کہ لوگ یہاں عبادت کیلئے جمع ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب مرغوں کی لڑائی شروع ہو جاتی تو اتنا زیادہ شور ہوتا تھا کہ آپ اس اجنبی سے یہ کہہ سکتے تھے کہ یہ احیائے مذہب کی تحریک ہے لیکن اس کے لئے آپ کو اس کی آنکھوں پر پٹی باندھنی پڑتی۔ یہ شور واقعی عجیب و غریب ہوتا تھا۔ دنگل کے گھیرے کے اندر ایک گوری نسل کا آدمی اور ایک حبشی موجود تھے۔ باقی تماشبین اس گھیرے کے باہر تھے۔ مرغوں کو تھیلوں میں بند کر کے لایا گیا اور جیسے ہی لڑائی شروع کرنے کا

لمحہ قریب آیا اور آواز لگائی گئی کہ لڑائی شروع کی جائے تو مرغوں کو باہر نکالا گیا۔ دونوں مرغ بازوں نے اپنے اپنے مرغے کی پیٹھ تھپتھپائی اور اُسے پچکارا، پھر انھیں ایک دوسرے کی طرف دھکا دیکر لڑنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ بڑے کالے مرغ نے چھوٹتے ہی چھوٹے بھورے مرغ پر حملہ کیا اور اپنے پنجے سے اسکے سر پر ضرب لگائی تب بھورے مرغ نے بڑے جوش سے جوابی حملہ کیا اور ہر طرف سے شور و غل ہوا کہ وہ دونوں جلد ہی گر کر مر جائیں گے کیونکہ دونوں اندھے ہو چکے تھے اور لہو لہان ہو رہے تھے اور اتنے تھک چکے تھے کہ بار بار گر پڑتے تھے، لیکن نہ وہ لڑنا بند کرتے تھے اور نہ مرتے تھے۔ حبشی اور گورا آدمی دونوں اپنے اپنے مرغوں کو ہر چند سیکنڈ کے بعد اٹھا کر انھیں پونچھتے اور ان پر ٹھنڈے پانی کی ہلکی ہلکی پھوار ڈالتے اور انکے سروں کو اپنے منہ کے اندر رکھ کر ان میں دم پھونکتے شاید انھیں تازہ دم کرنے کے لئے یا اور کسی وجہ سے جو مجھے نہیں معلوم۔ تب انھوں نے انھیں پھر چھوڑ دیا اور یہ قریب المرگ پرندے لڑکھڑاتے ہوئے اندھوں کی طرف راستہ ٹٹولتے ہوئے اور پر پھڑپھڑاتے ہوئے پھر ایک دوسرے پر پل پڑے انھوں نے ایک دوسرے کو ڈھونڈھ کر دو ایک چونچیں ماریں اور تھک کر پھر گر گئے۔

میں نے لڑائی کا انجام نہیں دیکھا۔ جب تک ہو سکا میں اُس نظارے کو دیکھتا رہا لیکن منظر بڑا ہی قابلِ رحم تھا اور میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھ سے نہیں دیکھا جاتا اور پھر ہم وہاں سے چلد یئے۔ بعد میں ہم نے سُنا کہ کالا مرغ کٹہرے کے اندر رہی آخر دم تک لڑتے لڑتے مر گیا۔

بظاہر ان لوگوں کے لئے جو اس کھیل سے واقفیت رکھتے ہیں مرغ بازی باعثِ تفریح ہے۔ میں نے لوگوں کو کسی کھیل میں اتنی دلچسپی لیتے نہیں دیکھا جتنا اس اجتماع کو اس تماشے میں دلچسپی لیتے دیکھا۔ جتنا مزہ دس سال کے بچوں کو آرہا تھا اتنا ہی سفید بالوں والے بڈھوں کو۔ خوشی میں سرشار ہو کر وہ خود کو بھی بھولے ہوئے تھے۔ مرغوں کا لڑانا ایک وحشیانہ تفریح ہے۔ اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ پھر بھی یہ کھیل یہاں بہت عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور لومڑی کے شکار سے کم ظالمانہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ مرغے خود لڑنا پسند کرتے ہیں وہ خود بھی لڑنے میں مزہ لیتے ہیں اور دوسروں کو بھی تفریح مہیا کرتے ہیں جبکہ لومڑی کے

نگار میں یہ بات نہیں ہوتی۔

میں نے ایک روز خچروں کی دوڑ میں شرکت کی (فرانسیسی لوگ اسے دوڑ میں مدد دینا کہتے ہیں) میرا خیال ہے کہ کسی خچر کو دوڑنے میں اتنا مزہ نہیں آیا ہوگا جتنا مجھے دیکھنے میں آیا اس سے بیشتر جانوروں کی دوڑ میں مجھے اتنا مزہ کبھی نہیں آیا۔ دوڑ کا عالیشان میدان نیو اورلینز کے "حسن اور شجاعت" سے بھرا ہوا تھا۔ یہ فقرہ میرا اپنا نہیں ہے یہ جنوب کے کسی نامہ نگار نے استعمال کیا ہے۔ دو نسلوں سے وہ اس فقرہ کو برابر استعمال کر رہا ہے کبھی وہ اسے دن میں بیس بار استعمال کرتا ہے اور کبھی بیس ہزار بار بلکہ حسب ضرورت دس لاکھ بار بھی استعمال کرتا ہے۔ وہ اس فقرے کو اس کثرت سے استعمال کرنے پر مجبور ہے بشرطیکہ اُسے اتنی ہی بار شریف اور قابلِ تعلیم لوگوں سے بات چیت کرنے کا موقع ملے۔ اس کے پاس اس فقرے سے اچھا اور کوئی فقرہ شاید ہے ہی نہیں۔ وہ اسے استعمال کرتے کبھی نہیں تھکتا۔ اس کے کانوں کو یہ فقرہ بہت اچھا لگتا ہے یہ زمانۂ قدیم کا غنڈہ پن اور اُوپری چمک دمک دکھانے والا فقرہ ہے جو اس ناشائستہ نامہ نگار کو جو چلبلی بھڑکیلی چیزوں کو پسند کرتا ہے، بہت پسند آیا ہے۔ اگر وہ اوّلین عہد میں فلسطین میں ہوتا تو شاید وہ یہ نہ کہتا کہ وہاں "بہت سے لوگ" جمع تھے بلکہ وہ یوں کہتا "گیلیلی کا حُسن اور شجاعت" جمع تھے۔ اور گیلیلی سے مراد شمالی فلسطین کے ان لوگوں سے ہوتی جو حضرت عیسیٰ کا مشہور وعظ سننے گئے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ جنوب کے مرد اور عورتیں ابتک اس فقرے سے کافی اُکتا گئے ہوں گے اور اس میں تبدیلی کی توقع رکھتے ہوں لیکن مستقبل قریب میں اس تبدیلی کی کوئی امید نہیں ہے۔

نیو اورلینز اخبار کا ایڈیٹر اپنے اداریہ میں بہت زوردار الفاظ استعمال کرتا ہے اس کا طرز تحریر بامحاورہ، اور بندش الفاظ چست اور غیر مبہم ہے نہ فالتو الفاظ استعمال کرتا ہے اور نہ بناوٹی قسم کے جوشیلے الفاظ کی بھرمار کرتا ہے یہ خوبی دوسرے نامہ نگاروں میں نہیں ملتی۔ ضمیمہ میں ہم نے ایک اچھے خط کا حوالہ دیا ہے جو ایک تربیت یافتہ شخص نے لکھا ہے لیکن معمولی نامہ نگار اس طرح نہیں لکھتا۔

مثلاً گذشتہ اپریل ٹائمس ڈیموکریٹ نے دلدل کی مصیبت میں پھنسے لوگوں کو بچانے

سے کے لئے دریا کے چڑھاؤ پر ایک کشتی بھیجی۔ اسٹیمر کسی گاؤں کے پاس کنارے پر رُکا اور کپتان نے گاؤں کی چند عورتوں کو بھی کشتی میں آنے کی دعوت دی۔ وہ کشتی پر سوار ہو گئیں۔ پھنسی ہوئی کشتی دھکے کے ساتھ دریا کی شاخ سے باہر نکلی۔ اور بس! ٹائمس ڈیموکریٹ کا ایڈیٹر اس واقع کو اسیطرح تحریر کرتا باقی رہ گئے اعداد و شمار ان کے ذکر سے کیا حاصل ہوتا۔ وہ صرف یہ کر سکتا تھا کہ ایک فہرست بنا دیتا تاکہ جگہ بھی کچھ کم گھیرے اور بات بھی جلدی سمجھ میں آسکے مگر اسی واقعہ کو ایک دوسرے مدیر نے کسی بندش و مزاحمت کی پروا نہ کرکے کسی قدر لفاظی سے بیان کیا ہے۔

" سینچر کے روز علی الصبح وہاں کے حُسن نے ہماری کوٹھری کو پُرنور کیا۔ اس بیش قیمت وزن پر ناز کرتے ہوئے ہماری چھوٹی ٹیکن عاشقانہ شجاعت کی علمبردار کشتی دلدل سے باہر نکل کر آہستہ آہستہ آگے کو پھسلنے لگی۔"

صرف یہ بات کہنے کو کہ عورتیں کشتی میں سوار ہو گئیں اور کشتی دلدل سے نکل کر چلنے لگی اس مُدیر نے فضول اتنے الفاظ استعمال کئے۔ ظاہر ہے کہ اس میں کم سے کم دس اچھے الفاظ ضائع کئے گئے ہیں اور اس طرح سے بیان کی بندش اور چستی بھی مجروح ہوتی ہے۔

جنوب کے نامہ نگار کے لئے عورتوں کے بارے میں کہنا بڑا پریشان کن ہے۔ وہ اپنے دِل پر قادر نہیں رہ سکتا۔ اس کا دماغی توازن بگڑ جاتا ہے اور وہ صحیح راستہ سے بھٹکنے لگتا ہے۔ جبتک عورت اس کے سامنے نہیں آتی وہ باشعار صاف گو اور اطمینان بخش باتیں کرتا ہے۔ مگر جونہی عورت اسکے سامنے آتی ہے وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ اس کا دماغ لڑکھڑا جاتا ہے اور اس کی گفتگو مصنوعی اور احمقانہ ہو جاتی ہے۔ مذکورہ بالا اقتباس کے مطالعہ سے آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ مدیر سر والٹر اسکاٹ کا ہی ایک شاگرد ہے اور اُسے یہ بھی نہیں پتہ کہ قلم کیسے پکڑتے ہیں، لکھنا تو در کنار۔ مگر اسکے برخلاف وہ اپنے ایک لمبے خط میں اس بات کا زبردست ثبوت پیش کرتا ہے کہ وہ ناواقف نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کیسے واقعات نگاری کی جاتی ہے مگر وہ صحیح واقعہ نگاری اسی وقت کر سکتا ہے جبکہ عورتیں اپنی معمولی معمولی سی باتوں کو لیکر اس کو گھیرے ہوئے نہ ہوں۔ مثلاً اس کے طرز تحریر کی ایک مثال حسب ذیل ہے:

" چار بجے منحوس بادل جنوب مشرق میں جمع ہونے لگے اور خلیج سے ایک طوفان اٹھا جو

ہر لمحہ تیزی پکڑتا گیا۔ اس وقت گھاٹ سے روانہ ہونا محفوظ نہ تھا اور اسی لئے دیر ہو گئی تھی۔ ہوا کے تھپیڑوں سے شاہ بلوط کے درختوں کی کائی سے لدی ہوئی شاخیں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ اسوقت جبکہ بڑے بڑے دریا اور جھیلوں میں طوفان کی وجہ سے ہیجان بپا تھا اور بہت تیز لہریں اُٹھ رہی تھیں دلدلوں میں جہاں پانی نسبتاً بہت کم تھا کوئی ہیجان نہیں تھا وہاں پانی میں چھوٹی چھوٹی موجیں مستقل مزاجی سے اٹھتی تھیں اور طوفان زدہ دریاؤں کا مذاق اڑاتی تھیں۔ جب طوفان کچھ تھا تو ہم گھر لوٹے۔ اسوقت بھی آسمان کالے کالے بادلوں سے گھرا ہوا تھا اور تیز ہوا چل رہی تھی۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا اور کشتی پر شاید ہی کوئی مسافر ہو جو گھر لوٹنا نہ چاہتا ہو"

اس طرز بیان میں وہ خامیاں نہیں ہیں جنکا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ یہ اچھا بیان ہے اور اس میں بندش الفاظ کی چستی نمایاں ہے مگر مصنف کو یہ ترغیب ضرور تھی کہ وہ مبالغہ کرے اور طرز بیان کو مصنوعی بنادے۔

آیئے اب خچر کی بات پر لوٹ آئیں۔ جب سے میں خچروں کی دوڑ دیکھ کر آیا ہوں میں برابر اس کے نتیجوں کا منتظر رہا ہوں اور اب مجھے دوڑ کے متعلق پوری رپورٹ مل گئی ہے اور جس نظریہ کا میں نے آپ سے ابھی ذکر کیا اس کی تصدیق اس رپورٹ سے ہوتی ہے یعنی یہ کہ جنوب کے نامہ نگاروں کیلئے عورت کا ذکر بڑا پریشان کن ہے خصوصاً عورتوں کے ساتھ جن لوازمات کا ذکر والٹر اسکاٹ نے کیا ہے مثلاً فوجی مصاحب یا سرداز بہادری کے کارنامے حسن کی تحسین وغیرہ وغیرہ کا بیان کرنا۔ اسلئے جبتک عورتوں کا ذکر نہ آئے واقعہ نگاری اپنی جگہ ٹھیک ہے اور اس میں کوئی مبالغہ اور تصنع نہیں ہوتا لیکن جیسے ہی عورتوں کا ذکر شروع ہو جاتا ہے تو طرز بیان میں کچھ دیوانگی سی آجاتی ہے۔ مثال حسب ذیل ہے:۔

"کل عورتوں کے مجمع میں کھڑے ہونے سے خوبصورتی کے جھاگوں کا جو سمندر امڈا ویسا کبھی کبھی ہی دیکھنے کو نصیب ہوتا ہے۔ نیو اورلینز کی عورتیں ہمیشہ خوبصورت اور دلکش ہوتی ہیں لیکن اتنی خوبصورت وہ کبھی نظر نہیں آئیں جتنی سال کے ان دنوں میں جب وہ موسم بہار کے خوبصورت لباسوں میں ملبوس ہوتی ہیں اور انکی شگفتہ جوانی سے ماحول معطر ہو جاتا

ہے انکے تقدس کی کیفیت بیان سے باہر ہے۔ سائبان کے اندر جہاں وہ کھڑی تھیں اُنکی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اُن تک پہونچنا ناممکن تھا۔ اسلئے یہ دیکھ کر کہ اُنکے قدموں تک رسائی ناممکن ہے بہت سے لوگ دُور ہی سے اُنکے حسن کا نظارہ کرتے رہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ پیری نے بہشت کے دروازے سے بہشت کا نظارہ کیا تھا۔ انھیں تعجب ہوتا تھا کہ ایسا کونسا بیش قیمت بدلان ہوگا جس کی برکت سے وہ اُن حسینوں کے قریب پہونچ جائیں اور ان کا مقدس دیدار قریب سے حاصل کر سکیں۔ اُن کے عاشقوں یعنی فوجی مصاحبوں اور سرداروں کے سفید لباس سے ڈھکے سینوں یا کندھوں پر ان کے امتیازی نشانات تھے جو چمک رہے تھے اگر یہ لوگ بھدے خچّروں پر نہ آئے ہوتے تو یہ ایسے عالیشان معلوم ہوتے جیسے قدیم سنہرے زمانے میں مشہور و معروف بادشاہ آرتھر کے مصاحب۔

پہلی دوڑ میں تیرہ خچّر شامل ہوئے تھے۔ انمیں سب طرح کے خچّر تھے یہ مختلف رنگوں، مختلف چالوں، مختلف خاصیتوں اور مختلف اشکال کے جانور تھے۔ کچھ خوبصورت معلوم ہوتے تھے تو کچھ بدصورت، کچھ چمکدار جلد والے تو کچھ کے بال کھڑے اور کھُرکھُرے، کچھ خوش و خرم اور چست نظر آتے تھے تو کچھ اُداس اور مَن کے میلے، کچھ یہ سمجھ رہے تھے کہ وہ جنگ میں لڑنے جا رہے تھے جبکہ کچھ کے چہروں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ انھیں صرف تفریح کے لئے اکٹھا کیا گیا تھا۔ باقی جانور غالباً یہ سمجھ رہے تھے کہ انھیں غالباً کسی مذہبی رسم ادا کرنے کے لئے لایا گیا تھا اور اس لئے ہر خچّر اپنے ہی خیال میں مست نظر آرہا تھا اور اسی کے مطابق عمل کر رہا تھا۔ اِسی لئے سب خچّروں کے حرکات و سکنات ایک سے نہیں تھے بلکہ ان میں گوناگوں اختلافات تھے اور یہ سب ناظرین کی تفریح کا باعث تھا۔

ان خچّروں کے سوار فیشن پرست معاشرہ کے نوجوان لوگ تھے۔ ناظرین غالباً یہ سوال کریں گے کہ نیو اورلئنز شہر کی شریف گھرانے کی عورتیں ایسے ادنیٰ کھیل تماشوں اور رنگ رلیوں میں (جیسے خچّروں کی دوڑ) کیوں شریک ہوتی تھیں تو اس کا جواب دیا جا چکا ہے۔ اُن کی یہ موج اور ترنگ فیشن پرستی کی وجہ سے تھی۔ لہٰذا اس تماشے سے متعلق سب باتوں کا ایک ہی جواب تھا یعنی 'فیشن کی بلا' سب لوگ فیشن کے متوالے تھے۔

خچروں کی دوڑ ایک اچھی تفریح ہے اور سبکو دل سے پسند ہے۔ ہر سال اس موقع کو بہت اہمیت دی جاتی ہے اور اس بہانے ہر سال کچھ خوبصورت تیز رَو خچر دیکھنے کو ملتے ہیں ایک مرتبہ ایک خچر کو دوڑ میں محض اس وجہ سے شامل نہیں کیا گیا کیونکہ وہ بہت ہی تیز دوڑنے والا تھا دوسرے خچر اتنے تیز رو نہیں تھے اگر اُس خچر کو دوڑ میں شامل کیا جاتا تو یہ پہلے سے ہی معلوم ہو جاتا کہ کون اوّل نمبر پر رہے گا اور اس لئے دوڑ دیکھنے والوں کا اشتیاق کم ہو جاتا کیونکہ پھر تو صرف ایک خچر کی دوڑ رہ جاتی۔ مقابلہ کا لطف ہی جاتا رہتا اور مختلف خچروں کی گوناگوں چالیں دیکھنے کا موقع ہی نہ ملتا۔ لیکن ہوتا یہ تھا کہ لوگ کسی نہ کسی بہانے سے اُسی خچر کو اس کا نام اور بھیس بدل کر لے آتے تھے اور اس کو مقابلے میں شامل کرا دیتے تھے۔

خچروں پر سوار ہونے والوں کی پوشاک چابک سواروں کی طرح چمکیلے رنگ کی ریشمی ساٹن یا مخمل کی ہوتی ہے۔

دوڑ میں شامل ہونے والے تیرہ خچر چند ایک جھوٹے اسٹارٹ کے بعد بیک وقت بھاگ کھڑے ہوئے۔ انھوں نے غضبناک تیزی سے بھاگنا شروع کر دیا۔ ہر خچر اور ہر سوار کا اپنا انوکھا خیال تھا کہ دوڑ کیسے جیتی جائے اور کس حالت میں کونسی ڈگر دوڑنے کے لئے اچھی رہے گی۔ کتنی بار حد کو پار کیا جائے اور کب دوسرے خچر کو کامیابی سے ٹکر ماری جائے اور کب ٹکر سے بچنا چاہیئے اس طرح کے مختلف خیالات سے جو غالباً ہر سوار اور ہر خچر کے جُدا جُدا ہوں گے ان کے دلوں میں ایک بڑی الجھن اور پراگندگی پیدا ہوتی ہوگی جو ناظرین کے لئے تو ضرور باعث تفریح ہوتی ہوگی لیکن اس کا انجام المناک اور مضحکہ خیز ہوتا تھا۔

دوڑ کا ریکارڈ۔

ایک میل کی دوڑ

وقت ۔ ۲۰۲۲ بجے

تیرہ میں سے آٹھ خچر پیچھے رہ گئے۔

میں نے جس خچر پر شرط لگائی وہ اس شرط پر جیت سکتا تھا کہ خچروں کے رُخ الٹی طرف موڑ دئے جاتے۔

دوسری دوڑ میں تفریح اچھی رہی۔
اور بعد میں ہارے ہوئے خچروں کو دلاسا دینے کے لئے جو دوڑ ہوئی وہ بھی تفریح کا باعث تھی۔ لیکن پہلی دوڑ سب سے بہتر تھی۔
لیکن میرا خیال ہے کہ ان سب سے زیادہ دلچسپ دوڑ ہوتی ہے دخانی کشتیوں کی۔ گو اس سے دوسرے درجے پر مجھے خچروں کی دوڑ ہی پسند آئی۔
ذرا تصوّر کیجئے دو گرم و سرخ دخانی کشتیوں کو جو ایکدوسرے سے دوڑ میں سبقت لیجانا چاہتی ہیں اور بالکل ایک دوسرے سے سٹی ہوئی چل رہی ہیں اور جان توڑ کوشش میں ہیں کہ کیسے ایک دوسرے سے آگے نکل جائیں۔ زیادہ نہیں تو ذرا سی ہی ایک دوسرے سے بڑھ جائیں ہر کشتی کانپ رہی ہے ہل رہی ہے۔ آگے پیچھے ہر حصّے سے کھڑ کھڑانے (یا کراہنے) کی آواز آرہی ہے۔ نلکیوں میں سے سفید دھواں نکل رہا ہے چمنیوں میں سے کالا دھواں نکل رہا ہے۔ چنگاریاں نکل رہی ہیں۔ دونوں کشتیاں ندی کا پانی کاٹتے ہوئے ہس ہس کرتے ہوئے جھاگ کو برابر کاٹ رہی ہے۔ یہ ہے دلچسپ نظارہ جسے دیکھ کر ہر آدمی کا دل خوشی سے اچھلنے لگتا ہے اسکے مقابلے میں گھوڑ دوڑ کافی پرانی اور دیکھی بھالی چیز ہو چکی ہے نیز اس میں لوگوں کی اتنی دلچسپی بھی نہیں رہی۔ اگر گھوڑ دوڑ میں تھکا دینے والے جھوٹے اسٹارٹ نہ دیئے جائیں تو وہ بھی کافی دلچسپ ہو سکتی ہے علاوہ ازیں ایک اچھی بات یہ ہے کہ اس میں شاذونادر ہی کوئی حادثہ ہوتا ہے جب میں گھوڑ دوڑ کا شوقین تھا اور اس میں شرکت کیا کرتا تھا تب میں نے کوئی حادثہ نہیں دیکھا البتہ کبھی کسی کا ہاتھ پیر ٹوٹ گیا ہو تو وہ دوسری بات ہے اتنی بڑی تفریح کے پیش نظر تو یہ بڑی معمولی بات ہے۔

چھیالیسواں باب

جادو اور جادوگر

نیو آرلینز کا سب سے اہم واقعہ جس کا ذکر ہم یہاں بہت دیر سے کر رہے ہیں، یہاں کا ایک سالانہ تیوہار ہے جسے مارڈی گراس کی تقریب کہتے ہیں چھبیس سال پہلے میں نے اسی جگہ ایک جلوس دیکھا تھا۔ اس کا نام تھا "کامس کے پُراسرار ملاح" اس جلوس میں فوجی صاحب اور سردار پیرس کے بنے ہوئے ریشمیں اور سنہرے شاندار لباس جو صرف اسی رات کے استعمال کے لئے خریدے اور بنوائے گئے تھے پہنے ہوئے تھے اور ان کے پیچھے طرح طرح کی عجیب وغریب شکلیں مثلاً دیو یا بونے یا دوسرے مضحکہ خیز پارٹ ادا کرنے والے ایکٹر تھے۔ یہ بڑا عجیب اور حیرت انگیز تماشہ تھا۔ جلوس بڑی متانت اور خاموشی کے ساتھ کچھ سلگتی اور کچھ ٹمٹماتی ہوئی مشعلیں لئے شہر کی شاہراہ پر نکل رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آجکل اس فن میں مزید ترقی ہو گئی ہے اور اب ایسے تماشے گوناگوں اقسام کے اور نسبتاً زیادہ شاندار ہوتے ہیں اور ان پر پیسہ بھی بہت خرچ ہوتا ہے۔ یہاں ایک بڑا معزز شخص ہے جس کا نام ریکس ہے مگر جہاں تک مجھے یاد ہے نہ تو اس عظیم ہستی کو جسے بادشاہ سمجھا جاتا ہے اور نہ اس کے ماتحتوں کو جو کثیر تعداد میں ہیں باہر کے لوگ جانتے ہیں، یہ لوگ شرفاء شمار ہوتے ہیں اور ان کی بڑی قدر و منزلت ہے۔ دراصل اس جماعت کا رُکن ہونا ہی یہاں قابل فخر مانا جاتا ہے اسلئے ان کا پُراسرار ڈھنگ سے زندگی گذارنا اس وجہ سے نہیں ہے کہ یہ لوگ پولیس کی گرفت سے بچتے پھرتے ہوں بلکہ اس لئے کہ انکو پُراسرار رومانی زندگی میں ہی مزا آتا ہے۔

مارڈی گراس کی تقریب یہاں فرانسیسی اور اسپینی زمانۂ حکومت کی یادگار ہے لیکن میرا

خیال ہے کہ اس واقعے کا اب مذہب سے دھیرے کا واسطہ بھی نہیں رہ گیا ہے۔ سروالٹر نے جن درویشی ٹوپی پہننے والوں اور ہاتھ میں تسبیح رکھنے والے خدا پرستوں کا ذکر کیا ہے وہ محض تخیل کی بنا پر کیا ہے اور چونکہ ذکر دلچسپ ہے اسلئے اُسے لوگ آیندہ بھی پڑھتے رہیں گے۔ دراصل سراسکاٹ نے زمانۂ قدیم کے لوگوں کے کاروبار کے ذکر کے ساتھ ساتھ دیو اور جن جیسی عجیب وغریب ہیبت ناک چیزوں یا پرستان کی دلکش پریوں جیسی چیزوں کو منسلک کر کے اپنے ناولوں کو بہت دلچسپ بنا دیا ہے اور ان چیزوں کا مطالعہ اُن ناشائستہ لوگوں کے مذہبی کارناموں یا انکی احمقانہ اختراعات سے کہیں زیادہ دلچسپ ہے۔ دراصل اسکاٹ کی تصانیف سے لوگوں کو یہ نصیحت نیز تنبیہہ ملتی ہے کہ مذہب اور چیز ہے اور سلیقے کی زندگی اور عقلمندانہ دنیاوی رویہ اور چیز۔

مارڈی گراس کی نمائشی تقریب ابتک صرف نیو آرلینز میں ہی ہوتی تھی لیکن اب یہ سینٹ لوئی، میمفس اور بالٹیمور میں بھی شروع ہو گئی ہے۔ غالباً یہ نمائش اپنی انتہا کو پہونچ گئی ہے لیکن شمالی علاقے میں جہاں لوگ عملی زندگی پر زیادہ زور دیتے ہیں یہ چیز نہیں پہونچ سکتی اور اگر وہاں پہونچ بھی جائے تو زیادہ عرصے تک نہیں سکتی ٹھیک جسطرح کہ یہ لندن میں زیادہ نہیں چل سکتی کیونکہ یہ ایک رومانی چیز ہے جس کی عملی زندگی سے مطابقت نہیں۔ اگر یہ محض تفریح طبع کے لئے ہوتی تو دوسری بات تھی۔ مگر یہ تو خالصتاً رومانی چیز ہے۔ اگر اس تماشے میں سے بادشاہوں۔ فوجی مصاحبوں اور ان کے لمبے چوڑے خطابات کو نکال دیا جائے تو جنوب میں بھی یہ تقریب ختم ہو جائے گی کیونکہ اس تقریب کی بنیاد عیاشی اور رومانی زندگی پر ہے شمالی علاقے میں یا لندن میں اس کی یہی بنیادی خصوصیت اسے لے ڈوبے گی۔ پک اور پنچ اور اخبارات اس رسم پر نکتہ چینی شروع کر دیں گے اور اتنی بے رحمی سے اس کا مذاق اڑائینگے کہ یہ تماشہ ایک ہی بار شروع ہو کر ختم ہو جائے گا۔

فرانسیسی انقلاب اور نپولین بونا پارٹ کے جرائم سے دنیا کو دو فائدے ضرور پہونچے ہیں ایک تو یہ کہ مذہب کی زنجیروں سے اور مذہبی حکومت کی غلامی سے لوگ آزاد ہو گئے اور ایک ادنیٰ غلاموں کی قوم آزاد لوگوں کی قوم بن گئی اور دوسرا یہ کہ بونا پارٹ نے یہ رواج قائم کر دیا کہ انسان کی قدر و منزلت اس کی برتر نسل سے نہیں بلکہ ذاتی قابلیت کی بنا پر ہونی

چاہیئے اس سے بادشاہوں کے نسلی اور خاندانی وقار کو اتنا دھکا لگا کہ انکی دیرینہ شان و شوکت ختم ہوگئی۔ یورپ میں جہاں پہلے وہ دیوتاؤں کی طرح پوجے جاتے تھے اب وہ محض معمولی انسان ہو کر رہ گئے۔ دیوتاؤں والا درجہ اب نہ انھیں حاصل ہے اور نہ آئندہ حاصل ہونے کی کوئی اُمید ہے۔ اب تو برائے نام صدر ریاست رہ گئے ہیں بلکہ وہ بھی معمولی انسانوں کی طرح اپنے قول و فعل کے لئے دوسروں کے روبرو جواب دہ ہیں۔ ان تبدیلیوں نے اس عارضی نقصان کی تلافی کر دی جو فرانسیسی انقلاب اور بونا پارٹ کی ذات خاص کی وجہ سے ہوا تھا۔ بلکہ اس انقلاب اور خود نپولین نے آزادیٔ انسانیت اور معاشرہ کی ترقی کے لئے جو کام کیا اس کے لئے دنیا فرانسیسی انقلاب اور نپولین دونوں کی مرہونِ منّت ہے اور احسان مند رہے گی۔

مگر بعد ازاں سر والٹر اسکاٹ کے ناولوں کا دور آیا۔ اسکی جادو بیانی کا بالکل مختلف اثر ہوا اس نے ترقی کی لہر کو روکا ہی نہیں بلکہ اس کو الٹا کر دیا۔ اس کے ناولوں نے لوگوں کی توجہ پھر سے خوابوں اور بھوت پریتوں کی دنیا کی طرف موڑ دی۔ لوگ فرسودہ اور ناپاک قسم کی مذہبی رسومات متروک اور ناقص انتظام حکومت، احمق پن، جھوٹی شیخی اور شان و شوکت، جھوٹی ٹیپ ٹاپ جھوٹی اور احمقانہ بہادری اور دقیانوسی خیالات کی طرف پھر مائل ہونے لگے یہ ساری خصوصیات اس سوسائٹی کی تھیں جو مدتوں پہلے ختم ہو چکی تھی۔ دراصل اتنا مہلک، بے انتہا اور عرصۂ دراز تک قائم رہنے والا نقصان اور کسی مصنف نے نہیں پہنچایا جتنا سر والٹر اسکاٹ نے۔ تاہم دنیا کے بیشتر لوگ سر والٹر کی تصانیف کے خراب اثر سے نجات حاصل کر چکے ہیں پھر بھی ابھی بہت لوگ ضعیف الاعتقادی کے شکار ہیں اور ہمارے جنوبی علاقے میں تو اسکاٹ کے ناولوں کا تباہ کن اثر اب بھی پایا جاتا ہے گو یہ اب اتنا تو نہیں ہے جتنا پہلے تھا مگر یہ پوری طرح ختم بھی نہیں ہوا۔ اس وجہ سے یہاں کی انیسویں صدی کی صحت مند اور عمدہ قسم کی تہذیب میں آپ کو والٹر اسکاٹ کی قرونِ وسطیٰ کی پُر تصنّع اور مجہول تہذیب کی جھلکیاں بھی ملیں گی۔ عمدہ عناصر یعنی عملی زندگی، عقلِ سلیم، ترقی پسند خیالات و اعمال وغیرہ کے ساتھ ساتھ قدیم رواج جیسے ڈوئیل (دو شخصوں کی لڑائی) مبالغہ آمیز گفتگو، گئے گذرے زمانے کی مُردہ رُومانیت جسے اب از رہ

عنایت دفن کر دینا چاہیئے کا امتزاج بھی دکھائی دے گا۔ لیکن اگر والٹر اسکاٹ کے ناولوں
کی یہ لعنت نہ ہوتی تو جنوبی علاقہ آج نسبتاً زیادہ جدید اور ترقی پسند ہوتا۔ اس صورت میں
یہ جدید اور قدیم کا امتزاج نہ ہوتا اور اسوقت تک اس علاقے میں کہیں زیادہ ترقی ہو چکی
ہوتی یہ والٹر اسکاٹ کے ناولوں کی ہی لعنت ہے کہ جنوبی علاقے کا باشندہ جنگ شروع
ہونے سے پیشتر ہی جنگ کے خواب دیکھنے لگا اور خود کو ایک میجر، کرنل، جنرل یا جج تصور
کرنے لگا اور اسی لعنت کی وجہ سے وہ جھوٹی شان وشوکت کا دلدادہ بن گیا کیونکہ اسکاٹ
کے ناولوں نے لوگوں کے دلوں میں امتیاز عہدہ اور امتیاز قوم پیدا کر دیا تھا اور لوگ
عہدے اور قومیت کی عزت اور اس پر فخر کرنے لگے اور غلامی کا رواج زور پکڑنے لگا۔
جنگ سے بیشتر لوگوں کی جو ذہنیت بن گئی تھی اس کے لیے زیادہ تر ذمہ داری سر والٹر
اسکاٹ پر آتی ہے۔ ایک مصنف پر جواب اس جہانِ فانی میں نہیں ہے اتنی شدید نکتہ چینی شاید
ضرورت سے زیادہ ہو لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس کے ناولوں کی لعنت نہ ہوتی تو جنوب
کے لوگ کبھی جنگ میں شریک نہ ہوتے۔ اس مجنونانہ دعوے کی صداقت کئی دلیلوں سے ثابت
کی جا سکتی ہے۔ مثلاً امریکی انقلاب کے وقت یہاں کا باشندہ خانہ جنگی کے دوران میں بھی غلام رکھتا
تھا مگر پہلے کے باشندے اور اب کے باشندے میں وہی فرق ہے جو ایک انگریز اور ایک
فرانسیسی میں ہوتا ہے ایک ہی علاقے کے باشندوں میں یہ تبدیلی کیسے آ گئی۔ اس کی ذمہ داری
جتنی سر والٹر اسکاٹ کے ناولوں پر ہے اتنی کسی اور شخص یا چیز پر نہیں ایک یا دو مثالوں
سے یہ واضح ہو جائے گا کہ اسکاٹ کے ناولوں کا اثر جنوبی علاقے کے باشندوں پر اتنا گہرا کیوں ہوا اور اتنے
عرصے تک کیوں قائم رہا۔ اگر آپ چالیس یا پچاس سال پہلے کا کوئی شمالی یا جنوبی
ریاستوں کا ادبی رسالہ دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ اس میں لفاظی کی بھرمار
ہے۔ زبان میں بہت سے خوش آئند الفاظ اور صنائع بدائع استعمال کئے گئے ہیں، خوش بیانی
اور فصاحت، رومان انگیزی اور جذباتیت کی بھرمار ہے۔ یہ سب محض سر والٹر اسکاٹ
کے طرز بیان کی نقل کی بدولت تھا۔ درحقیقت اس کے طرز بیان میں جو ایک معصومانہ
مضحکہ خیزی تھی اسی کا مہلک اثر امریکہ کے ادب پر پڑا پہلے یہ اثر شمالی اور جنوبی دونوں

حصّوں میں یکساں تھا بلکہ دونوں حصّوں میں اس طرح کے طرزِ تحریر میں ایک دوسرے سے مسابقت لیجانے کا جذبہ اُبھر آیا تھا جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ آبادی کے تناسب سے جنوبی علاقے میں شمالی علاقے کی نسبت مشہور ادیبوں کی تعداد کم نہیں رہی۔

لیکن بعد کو دونوں علاقوں کے ادب میں نمایاں فرق نظر آنے لگا اور اب دونوں علاقوں میں مسابقت کا وہ جذبہ نہیں ہے۔ شمال نے وہ پرانا نامبالغہ آمیز اور آراستہ پیراستہ طرزِ بیان ترک کر دیا جبکہ جنوب کے لوگ ابھی تک اسی طرزِ تحریر سے چمٹے ہوئے ہیں۔ نتیجۃً جنوب کے ادب کی اب بازار میں وہ قدر نہیں ہے اور اسی وجہ سے اس کی خریداری بہت کم اور ایک محدود دائرہ میں رہ گئی ہے۔ حالانکہ جنوبی علاقے میں ادبی مذاق میں کوئی کمی نہیں آئی ہے لیکن بدلتے ہوئے حالات میں وہاں کے ادب کی کوئی زیادہ مانگ نہیں رہی۔ ایسا لگتا ہے جیسے مصنّف زمانۂ قدیم کے لئے ہی لکھ رہے ہوں اور زمانہ حال کے حالات و جذبات کا کوئی خیال نہ رکھتے ہوں۔ وہ متروک الفاظ و محاورات و تراکیب استعمال کرتے ہیں اور پرانی فرسودہ زبان میں لکھتے ہیں۔ لیکن جس وقت جنوب کا کوئی قابل مصنّف جدید انگریزی میں لکھتا ہے تو اس کی تصنیف کی قدر کم نہیں ہوتی بلکہ بڑی تیزی سے اس کی تعریف و تحسین شروع ہو جاتی ہے۔ اس کی شہرت نہ صرف امریکہ اور انگلینڈ میں پھیل جاتی ہے بلکہ جرمنی میں بھی جہاں مشہور انگریزی کتابوں کی اشاعت جلد جلد ہوتی رہتی ہے اس کی تصنیف شائع ہو جاتی ہے اور اس کی ویسی ہی مقبولیت ہوتی ہے جیسی کہ جنوب کے دو مشہور مصنّف مسٹر کیبل اور چارلیس کی کتابوں کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں مصنّفوں نے پرانے جنوبی طرزِ بیان کو چھوڑ کر نیا طرزِ بیان اختیار کیا ہے۔ مگر یہاں اس جدید روش کے مصنّف صرف تین یا چار ہی ہیں جبکہ ایسے نام اب تک کم از کم ایک درجن ہو جانے چاہئے تھے۔ سر والٹر کے ناولوں کے اثر کے ختم ہوتے ہی جدید قسم کے مصنّف پیدا ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔

اب ہم ایک عجیب و غریب مثال سے یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ محض ایک زبردست تصنیف کس طرح لوگوں پر صحت بخش یا مضر اثر ڈال سکتی ہے۔ مثال کے طور پر ڈان کوئکزوٹ

اداآدمی ہوکے اثرات کا ملاحظہ کیجئے۔ پہلی تصنیف نے تو لوگوں کے دماغوں میں یہ بات بٹھائی کہ احمقانہ قسم کی بہادری کے لئے دنیا میں کہیں تعریف کی گنجائش نہیں ہو سکتی جبکہ دوسری تصنیف نے اس کے برعکس اثر ڈالا۔ جہاں تک ہمارے جنوبی علاقے کا تعلق ہے بدقسمتی سے سروانٹیز کی عمدہ تصنیف کا اثر بالکل معدوم ہو چکا ہے کیونکہ سر والٹر اسکاٹ کے تباہ کن ناولوں نے اس اچھے اثر کو بالکل زائل کردیا۔

سینتالیسواں باب

چچا ریمس اور مسٹر کیبل

مسٹر جول چینڈلر ہیرس جو چچا ریمس کے نام سے مشہور رہیں' اٹلانٹا سے بروز اتوار صبح سات بجے تشریف لانے والے تھے اسلئے ہم لوگ ان کا استقبال کرنے گئے۔ ہوٹل کے دروازے پر ہی لوگوں کی بھیڑ میں ہم نے انھیں پہچان لیا کیونکہ انکے خطوط سے نیز ان کے بارے میں جو اطلاع ہمیں ایک معتبر ذریعہ سے ملی تھی اسکی مدد سے ہمیں انھیں پہچاننے میں کوئی دقت نہیں ہوئی انکے بارے میں یہ بتایا جا چکا تھا کہ وہ چھوٹے قد کے ہیں' ان کے بال سرخ ہیں اور انکی جلد پر ہلکے بھورے رنگ کے دھبے یا جھائیاں پڑی ہوئی ہیں۔ اس بھیڑ میں ایک وہ ہی ایسے شخص تھے جنکی شخصیت میں یہ سب باتیں ملتی تھیں۔ یہ بھی بتایا جا چکا تھا کہ وہ بہت شرمیلے ہیں اور اس میں کوئی شبہ بھی نہیں تھا گو بظاہر وہ شرمیلے یا جھینپو نہیں معلوم ہوتے تھے لیکن دراصل تھے ضرور۔ ان سے بے تکلفی سے ملاقات ہوتے رہنے کے کئی روز بعد بھی آپ کو یہ دیکھ کر تعجب ہوتا کہ چچا ریمس میں

جھینپو پن اب بھی اتنا ہی ہے جتنا پہلے تھا لیکن جن لوگوں نے چچا ہمیس کی کتاب پڑھی ہو گی وہ جانتے ہوں گے کہ چچا ہمیس کا اخلاق واقعی بہت عمدہ اور قابل تحسین تھا اور وہ یہ بھی جان گئے ہونگے کہ ان میں فہم و فراست بھی بہت تھی۔ میں اپنے ان پڑوسی کا خاکہ بڑی آزادی سے کھینچ رہا ہوں۔ حالانکہ میں یہ باتیں سب کو بتا رہا ہوں مگر منشا یہ باتیں چچا ہمیس کے خاص دوستوں کو بتانے کا ہے اور دوستوں کو ہر طرح کی باتیں بتائی جا سکتی ہیں۔

کچھ بچے جو اس عالی مرتبہ ہستی کو ایک نظر دیکھنے کے لئے بڑے اشتیاق سے مسٹر کیمبل کے مکان کے گرد جمع ہوئے تھے، بہت مایوس ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ چچا ہمیس قوم کے بچوں کے لئے بڑے اچھے رہنما ہوں گے اور وہ انھیں دلچسپ باتیں سنائیں گے۔ مگر جوں ہی بچوں کی نظر چچا ہمیس پر پڑی وہ بول پڑے "ارے یہ تو سفید فام ہے"۔

انھیں غالباً یہ خیال ہو گا کہ چچا ہمیس دیکھنے میں بھی اتنے ہی دلکش ہوں گے اور اسی وجہ سے انھیں واقعی صدمہ پہونچا۔ اسلئے ہم انھیں تسلی دینے کیلئے ہم چچا ہمیس کی کتاب لے آئے تاکہ بچے ٹار بیبی کی کہانی کو خود چچا کی زبانی سن سکیں یا جو کچھ بھی اشتیاق انھیں چچا کو دیکھنے یا سننے کا اب بھی باقی ہو وہ پورا ہو سکے۔ تب راز کھلا کہ چچا صاحب نے لوگوں کو کبھی کچھ پڑھکر نہیں سنایا تھا۔ پڑھ کر سنانے میں وہ اب بھی جھجھک رہے تھے اس لئے مسٹر کیمبل اور خود میں نے بچوں کو خوش کرنے کے لئے اپنی کتابوں سے کچھ پڑھ پڑھ کر سنایا اور چچا کو یہ دکھانے کی کوشش کی کہ کتنی چالاکی سے ہم نے انکی مشکل آسان کر دی مگر ہماری یہ عقل کی بات بھی کام نہ آئی اور چچا کی جھینپ اس سے بھی دور نہ ہوئی اس لئے لامحالا ہم لوگوں نے برر ربیٹ کی کہانی خود پڑھ کر بچوں کو سنائی۔

البتہ چچا ہمیس یعنی مسٹر ہیرس کے لئے دوسری زبانوں کے مقابلے میں حبشی زبان پڑھنا زیادہ آسان رہا ہو گا کیونکہ ملک بھر میں وہی ایک ایسے شخص تھے جنھیں اس زبان میں لکھنے پڑھنے میں مہارت حاصل تھی۔ اسی طرح مسٹر کیمبل بھی ملک میں واحد شخص ہیں جن کو فرانسیسی بول چال کی زبانوں میں مہارت حاصل ہے اور وہ انکو بالکل صحیح پڑھ سکتے ہیں اسوقت واقعی بڑا مزہ آیا جب انھوں نے فرانسیسی میں جین آپو کیولن اور انا ریری ٹ اور اس کا مشہور گیت "

پڑھا جس میں یہ دکھایا گیا تھا کہ لیوسہانا یونین سے اتفاق کرنے کو منع کر رہا ہے اور ساتھ ہی اس نے کچھ عمدہ اقتباسات جو جرمن زبان کے تھے اور جو ایک جرمن ناول سے جو ابھی مسودہ کی شکل میں ہی تھا، پڑھ کر سنائے۔

دوران گفتگو میں یہ معلوم ہوا کہ دو مختلف موقعوں پر مسٹر کیمبل کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ جب انھوں نے اپنی کتابوں میں ایسے فرانسیسی ناموں کا ذکر کیا جن کا پڑھنا ناممکن سا تھا اور جنکا فرانسیسی ہونا مشتبہ تھا البتہ یہ نام نیو اورلینز کے کچھ تیز فہم قدیم باشندوں نے استعمال کئے تھے۔ یہ نام یا تو مسٹر کیمبل نے خود کو ایجاد کر لئے تھے یا انھیں اس نے بہت قدیم اور متروک شدہ کتابوں سے لے لیا ہوگا گو مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ کتابیں کونسی تھیں۔ بہرحال ان زندہ لوگوں کو جن کے نام واقعی یہی تھے اس بات سے بیحد صدمہ ہوا کہ ان کے اور ان کے تلفظ کے بارے میں یوں کھلے عام نکتہ چینی کی گئی ہے۔

مسٹر وارنر اور مجھے بھی اس طرح کا ایک تلخ تجربہ ہوا جب ہم لوگوں نے "دی گلڈیڈ ایج" نام کی کتاب لکھی۔ اس کتاب میں سیلرس نام کا ایک کیریکٹر ہے۔ مجھے یاد نہیں کہ شروع میں اس کا پہلا نام کیا تھا مگر کچھ بھی ہو مسٹر وارنر کو وہ نام پسند نہیں تھا اور وہ اس میں اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم کسی ایسے انسان کا تصور کر سکتے ہو جسکا نام ایشل سیلرس ہو۔ میں نے کہا "شراب پئے بغیر تو اس کا تصور مشکل ہے۔" وہ بولے "ایک مرتبہ میں مغرب کے کسی ملک میں سیر کر رہا تھا تو وہاں میری کسی سے اچانک ملاقات ہوگئی اور میں نے اس سے مصافحہ بھی کیا۔ اس شخص کا یہی ناقابل تصور نام تھا یعنی "ایشل سیلرس"۔ پھر وہ بولے "بیس سال پہلے کی بات ہے کہ اس شخص کا نام کہیں دور سنا گیا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اب وہ شخص کہیں دور دراز کے ملک کو چلا گیا اور اگر نہیں بھی گیا ہے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ غالباً وہ ہماری یہ کتاب نہیں دیکھ پائے گا۔ اس لئے ہم اسی نام کو استعمال کریں گے کیونکہ جو نام آپ بتا رہے ہیں وہ عام طور پر مستعمل ہے اور اسی لئے اس کے استعمال کرنے میں خطرہ ہے۔ ہو سکتا ہے 'سیلرس' نام کے ہزاروں شخص ہوں اور ہمارے اس نام کو استعمال کرتے ہی ہزاروں آدمی ہمارے پیچھے پڑ جائیں اور ہم سے شکایت کریں، مگر ایشل سیلرس ایک محفوظ نام ہے اور چٹان کی طرح مستقل بھی۔

اسلئے ہم نے ایسکل سیلز نام منتخب کرلیا۔ مگر ابھی کتاب کو شائع ہوئے ایک ہفتہ ہی ہوا تھا کہ ایک رُعب دار خوبصورت سا گورا آدمی جو کسی امیر خاندان سے تعلق رکھتا تھا ہمارے پاس آیا اور شکایت کی کہ ہم نے اسے بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے ہم پر عزت ہتک کا دعویٰ کرنے کے لئے کاغذات تیار کر رکھے تھے جو اسکی جیب میں پڑے تھے۔ مختصر یہ کہ ہم نے اس سے تصفیہ کرلیا اور اسکی شکایت دور کرنے کے لئے پہلی اشاعت کی ایک کروڑ[1] جلدیں ضبط کرکے کتاب کی دوسری اشاعت میں اُس کے نام کی جگہ بیریا سیلرسؔ نام رکھدیا۔

---

[1] یہ گنتی یادداشت سے لکھی گئی ہے اور غلط معلوم ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تعداد اس سے زیادہ ہوگی۔

اڑتالیسواں باب

شکر اور محصول ڈاک

ایک دن گلی میں میری ایک ایسے آدمی سے ملاقات ہو گئی جس سے ملنے کی مجھے سب سے زیادہ تمنا تھی۔ یہ تھے مسٹر ہوریس بکسبی جو کبھی میرے ماتحت پائلٹ رہ چکے تھے بلکہ یوں کہئے کہ وہ میرے افسر تھے۔ اب وہ ایک بڑی کشتی "سٹی آف بیٹن روج" کے جو دخانی کشتیوں میں جدید ترین ماڈل کی سب سے تیز رفتار کشتی ہے کپتان ہیں۔ مسٹر بکسبی کی شخصیت بالکل نہیں بدلی تھی۔ پہلے کی طرح ان کا بدن چھریرا' بال مضبوط اور گھونگریالے رفتار میں لچک طبیعت میں مستعدی' آنکھوں میں وہی عزم جسکی ہاتھ تعمیل کرتے ہیں' کھڑے ہونے کا وہی فوجی انداز' کمر کی چوڑائی جیوں کی تیوں' نہ ایک انچ زیادہ نہ ایک انچ کم' وزن میں ایک آونس کا بھی فرق نہیں اور سر کے بال بھی جیوں کے تیوں تھے۔ یہ بڑی حیرت کی بات ہے کہ اکیس سال پہلے جس آدمی کو ہم نے پینتیس سال کا دیکھا تھا آج بھی وہ پینتیس سال کا ہی لگتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میں نے اس سے پیشتر کبھی ایسا مشاہدہ نہیں کیا تھا۔ البتہ اس کی آنکھوں کے گوشوں کے گرد کچھ جھریاں ضرور پڑ گئی تھیں لیکن وہ نہ ہونے کے برابر تھیں۔ کیونکہ وہ زیادہ نمایاں نہیں تھیں۔

مسٹر بکسبی کی کشتی یہاں حال ہی میں لنگر انداز ہوئی تھی سینٹ لوئی واپس جانے کے لئے میں کئی دن سے اس کشتی کا منتظر تھا۔ اسی دوران میں کپتان اور میں کچھ معزز مرد اور عورتوں کے ساتھ جو میجر وڈ کے مہمان تھے ایک پارٹی میں شامل ہوئے۔ یہ پارٹی ایک تیز رو کشتی میں بیٹھ کر دریا کے بہاؤ پر سیر کرنے چلی۔ ہم لوگ چودہ میل کا سفر طے کر کے سابق گورنر

مسٹر دار ماؤتھ کے گنّے کے فارم پر گئے۔ شہر سے نکلتے ہی ہم نے بہت سی بوسیدہ بیکار اور دقیانوسی قسم کی کشتیاں ساحل پر دُور تک کھڑی دیکھیں اس سے پیشتر میں نے انھیں یہاں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ غالباً میرے یہاں کے پچھلے سفر کے بعد ہی یہ کشتیاں بنی ہوں گی اور خراب بھی ہو گئیں ہوں گی۔ اس بات سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مسی سپی کی کشتیاں کتنی کمزور اور ناپائدار ہوتی تھیں۔

راستہ میں شہر سے چھ میل جنوب کی طرف ہم نے ایک عظیم مسمار شدہ پختہ چمنی دیکھی جو مگنولیا اور ہرے بھرے شاہ بلوط کے درختوں کے درمیان سے اوپر نکلی ہوئی صاف دکھائی دیتی تھی۔ یہ ایک یادگار تھی۔ جس کو قوم کے قدر دانوں نے نیو اورلینز کی جنگ کی جس میں جنرل جیکسن نے انگریزوں پر ۸ جنوری ۱۸۱۵ء میں فتح پائی تھی شاندار یاد کو تازہ رکھنے کے لئے بنوایا تھا۔ دراصل جنگ تو پہلے ہی ختم ہو چکی تھی اور دونوں قوموں کے مابین امن بھی قائم ہو چکا تھا لیکن نیو اورلینز میں لڑائی بند ہونے کی خبر وقت پر نہیں پہونچ سکی تھی۔ اگر اس زمانے میں بحری تار ہوتا تو یہاں اسقدر خونریزی کیوں ہوتی اور اتنی جانیں ضائع کیوں جاتیں۔ علاوہ ازیں ایک اور بھلا اچھی بات یہ ہوتی کہ جنرل جیکسن کبھی صدر نہ بنتے۔ ہم نے ۱۸۱۲ء کی جنگ کے نقصانات کی تلافی تو کسی نہ کسی طرح سے کر لی تھی لیکن مسٹر جیکسن کی صدارت میں جو نقصانات ہوئے ان کی تلافی ہم آج تک نہیں کر سکے۔

دار ماؤتھ کا فارم بہت وسیع رقبہ میں پھیلا ہوا تھا۔ اور اسی طرح ان کی مہمان نوازی کا دائرہ بھی بہت وسیع تھا۔ یہاں ہم نے پہلی بار اسٹیم سے چلنے والے ہلوں کو کھیتوں میں کام کرتے دیکھا۔ ہلوں کو کھینچنے والا انجن اپنے پہیوں پر چلتا ہوا ایک مقررہ جگہ جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور وہیں سے لوہے کے رسّوں کے ذریعہ ایک بڑے ہل کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ یہ ہل دو یا تین سو گز تک کھیت کے آر پار گنّے کی قطاروں کے بیچ زمین کو کھودتا ہوا چلتا ہے جس سے کھیت میں ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ گہری نالیاں سی بن جاتی ہیں۔ یہ جُتا ہوا کھیت ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہڈسن ندی کے اسٹیمر کو الٹا کر کے رکھ دیا ہو اور اس کے سینے کی گہری نالیاں صاف نمایاں ہوں۔ جب حبشی مزدور ہل کے ایک سرے پر بیٹھتا ہے تو وہ سر ازمین کی طرف

جھک جاتا ہے اور دوسرا اوپر ہوا میں اٹھ جاتا ہے۔ اب یہ ہل سمندر کے جہاز کی طرح ہچکولے کھاتا ہوا چلتا ہے۔ اس پر جم کر بیٹھے رہنا ہر ماہر سے ہر کس کے بس کی بات نہیں ہے۔

اس فارم میں دو ہزار چھ سو ایکڑ زمین ہے۔ چھ سو پچاس ایکڑ میں گنّے کی کاشت ہوتی ہے باقی جگہ میں پانچ ہزار نارنگی کے درختوں کا ایک باغ ہے۔ گنّے کی کاشت سائنس کے جدید اور پیچیدہ طریقوں سے ہوتی ہے۔ ان طریقوں کو مفصّل بیان کرنا میرے امکان سے باہر ہے گذشتہ سال یہاں گنّے کی کاشت میں چالیس ہزار ڈالر کا نقصان ہو گیا تھا جس کی تفصیل مجھے یاد نہیں۔ مگر امید ہے کہ امسال کی فصل میں ہزار بارہ سو ٹن شکر پیدا ہو گی۔ جس سے پچھلے سال کے نقصان کی تلافی ہو جائیگی۔ ان تکلیف دہ اور گراں قدر سائنسی طریقوں سے شکر کی پیداوار ڈیڑھ اور دو ٹن فی ایکڑ تک پہونچ گئی ہے۔ جو میرے زمانے کی پیداوار کا چار گنا ہے۔

اس فارم میں پانی کے نکاس کے لئے جو نالیاں اور کھائیاں ہیں وہ چھوٹے چھوٹے کیکڑوں سے جنھیں "سارنگی باز" بھی کہتے ہیں بھری رہتی ہیں۔ آپ ذرا سے شور سے انھیں چونکا دیجئے تو یہ اِدھر اُدھر بھاگتے دکھائی دیں گے۔ یہ کیکڑے ایک بلا ہیں اور بہت نقصان کرتے ہیں۔ یہ دریا کے کنارے پشتوں میں رہتے ہیں اور ان کو کھوکھلا کر ڈالتے ہیں۔

اس گنّے کے کارخانے میں ہزاروں ناندیں، حوض، تالاب، فلٹر، پمپ، پائپ اور دوسری مشینیں ہیں۔ شکر بنانے کا طریقہ بھی بڑا دلچسپ ہے۔ پہلے گنّے کو مشین میں دبا کر اس کا رس نکالتے ہیں تب اسکو بڑے کڑھاؤ میں چھانتے ہیں تاکہ رس میں سے کھوئی کے ریشہ نکل جائیں۔ پھر رس کو ہڈیوں کے فلٹر سے چھان کر الکحل کو رس سے جدا کر دیتے ہیں ازاں بعد اس رس کو دوسرے حوضوں میں مزید صفائی کے لئے ڈالتے ہیں جس سے شیرہ الگ ہو جاتا ہے۔ پھر چینی کو جمانے اور دولے دار بنانے کیلئے پائپ سے گذارتے ہیں پھر اسے خلاء نکالنے والے کڑھاؤ میں ڈال کر چینی کے خلاء کو دور کرتے ہیں اب یہ چینی بازار جانے کے لئے تیار ہو گئی میں نے یہ تفصیلات صرف یادداشت سے لکھی ہیں۔ دیکھنے میں یہ ترکیب بڑی ہی آسان معلوم ہوتی ہے لیکن اس دھوکہ میں مت رہیئے۔ شکر بنانا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں ہے اور

اسکو بالکل ٹھیک بنا لینا تو قریب قریب ناممکن ہے۔ جو شکر آپ استعمال کرتے ہیں اگر آپ کئی سال تک برابر اس کی جانچ کرتے ۔۔۔ رہیں اور اپنا تجربہ لکھتے رہیں تو آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ بیس شکر سازوں میں سے دو بھی ایسے نہیں ہوں گے جو بغیر ریت ملائے شکر تیار کرتے ہوں۔

ہم دریا کے دہانے پر جا کر کپتان ایڈس کا مشہور پل دیکھ سکتے تھے۔ اس جگہ دریا کے ساحلوں کو پختہ بنا کر اس کی چوڑائی کو محدود کر دیا گیا ہے جسکی وجہ سے اسکی گہرائی بڑھ کر چھبیس فٹ ہو گئی ہے۔ لیکن لوگوں کی رائے میں ہمارا وہاں جانا بیکار تھا کیونکہ اسوقت پانی چڑھا ہوا تھا اور ہر چیز تہ آب ہونے کی وجہ سے ہم اس پل کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔

نیز ہم اس قدیم اور عجیب و غریب شہر کو بھی دیکھ سکتے تھے جسے پائلٹوں کا شہر کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہر پانی میں کھڑے ہوئے ستونوں پر بسایا گیا ہے۔ اور یہاں تقریباً کل آمدورفت ہلکی کشتیوں اور ڈونگوں سے ہوتی ہیں یہاں تک کہ لوگ شادی یا میت کی رسم میں شریک ہونے کے لئے بھی ڈونگوں اور کشتیوں کے ذریعہ جاتے ہیں۔ یہاں چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں کشتی کھینا جانتی ہیں اور یہ پتوار کو اتنی صفائی اور ہوشیاری سے چلاتے ہیں جیسے خشکی پر رہنے والے بچے اپنی پاؤں گاڑی کو۔

ہم اور بھی کئی کام یہاں کر سکتے تھے۔ لیکن چونکہ ہمارے پاس وقت کم تھا اسلئے ہم واپس لوٹ آئے۔ ہلکی خوشگوار ہوائیں اور پانی کی چمکتی ہوئی سطح پر کشتی میں سفر کرنا بڑا پر لطف تھا۔ ہمارا سفر واقعی بڑی اطمینان بخش رومانی اور جذباتی کیفیت میں گذرتا بشرطیکہ ایک یاوہ گو مسافر ہمارے مزہ میں خلل انداز نہ ہوتا۔ یہ شخص برابر کچھ نہ کچھ بکتا ہی رہا۔ کبھی دریا کے مناظر کے بارے میں اور کبھی ہمارے مہمانوں کے بارے میں۔ اس کی رائے زنی ہمیشہ احمقانہ اور کبھی بڑی بیہودہ ہوتی تھی۔ وہ بات بات پر ہنستا تھا اس کی ہنسی بڑی ناگوار کانوں کو ایذا پہونچانے والی کرخت قسم کی تھی جیسی اس قسم کے لوگوں کی عام طور سے ہوتی ہے۔ یعنی بناوٹی ہنسی جو خود ہنسنے والے کو بھی ایذا پہونچائے اور جس سے کسی اور کو بھی کوئی خوشی نہ ہو۔ وہ کسی جذباتی قسم کی بات پر بھی ہنس پڑتا تھا

اور کسی پرسوز گیت پڑھی۔ یہ کہہ کہکر" ہم پھر گھر آ گئے" ہم پردیس سے گھر لوٹ آئے' وہ بڑے زور سے ہنسنے کی کوشش کرتا۔ اور پھر کہتا یہ سب بکواس ہے میں کسی چیز کی پروا نہیں کرتا۔ ایسے ناسازگار ماحول میں رومانیت اور جذبات بہت دیر تک نہیں چل سکتے اور یہی ہوا۔ لہٰذا باتیں اور گیت جلد ہی ختم ہو گئے۔ اس سے اس باتونی آدمی کو اتنی خوشی ہوئی کہ اس نے چیخ چیخ کر اپنا گلا خراب کر لیا۔

بعد ازاں ہماری پارٹی کے مرد جہاز کے بالائی عرشہ پر سگریٹ پینے اور گپ شپ کرنے چلے گئے۔ وہاں کچھ پرانے ملاح بھی تھے جن سے میں نے اپنے پرانے دوستوں کے متعلق پوچھا کہ میری عدم موجودگی میں ان پر کیا بیتی۔ مجھے معلوم ہوا کہ میرا ایک پائلٹ دوست جس کے ساتھ میں جہاز رانی کیا کرتا تھا۔ آجکل روحوں پر عمل کر رہا ہے اور پندرہ سال سے زائد عرصہ سے وہ ہر ہفتہ ایک مرحوم رشتہ دار کی روح سے خط و کتابت کر رہا ہے۔ مرحوم رشتہ دار کی روح ہر ہفتہ نیو یارک کے ایک مانچسٹر نامی عامل کے توسط سے میرے دوست کو ایک خط بھیجا کرتی تھی۔ خط پر محصول ڈاک فاصلے کے حساب سے لگایا جاتا تھا۔ یعنی جنت کے مقامی ڈاک خانے سے نیو یارک تک پندرہ ڈالر اور نیو یارک سے سینٹ لوئی تک تین سینٹ۔ میں مسٹر مانچسٹر کو خوب اچھی طرح جانتا تھا۔ دس سال پہلے ایک مرتبہ اپنے دوستوں کے ساتھ میں ان سے ملا بھی تھا۔ میرے ایک دوست نے اپنے مرحوم چچا کے متعلق کچھ باتیں دریافت کیں۔ اس کے چچا ایک غیر معمولی حادثہ کا شکار ہو گئے تھے ان کو مرے ہوئے قریب چھ سال ہو چکے تھے وہ ایک طوفان میں پھنس گئے تھے جو انھیں اڑا کر تین میل دور لے گیا اور پھر طوفان سے اکھڑے ہوئے درخت کی ٹکر سے ان کی موت ہو گئی۔ اس درخت کا تنا چار فٹ موٹا تھا اور اونچائی پینسٹھ فٹ تھی۔ اسی لئے وہ اس کی ضرب برداشت نہ کر سکے۔ مسٹر مانچسٹر سے جب ہماری ملاقات ہوئی تو میرے دوست نے انھیں کے توسط سے اپنے مرحوم چچا کی روح سے کئی سوال کئے اور روح نے مسٹر مانچسٹر کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پنسل سے ان سوالوں کے جواب کاغذ پر لکھ دیئے۔ ذیل میں وہ سوالات لکھے جاتے ہیں جو روح

سے پوچھے گئے تھے اور وہ بے ڈھنگی بکواس بھی جو ان کے جوابات کی شکل میں عمل کے ذریعہ فراہم کی گئی۔ مسٹر مانچسٹر معمول بنے تھے اور وہ یہ ظاہر کر رہے تھے کہ جوابات خود رُوح لکھ رہی ہے میرا خیال ہے کہ مسٹر مانچسٹر دنیا کے سب سے بڑے دھوکے باز تھے اور اگر میرا خیال غلط ہو تو میں ان سے معذرت خواہ ہوں۔

سوال۔ آپ اس وقت کہاں ہیں۔؟

جواب۔ عالم ارواح میں۔

س۔ کیا آپ وہاں خوش و خرّم ہیں۔؟

ج۔ جی ہاں۔ بہت زیادہ۔ پوری طور سے۔

س۔ وہاں آپ کے دل بہلانے کے کیا مشاغل ہیں۔؟

ج دوستوں اور دوسری روحوں سے بات چیت کرنا۔

س۔ آپ کا اور کیا مشغلہ ہے۔؟

ج۔ کچھ نہیں۔ ہمیں کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہیں۔

س۔ آپ کس موضوع پر بات کیا کرتے ہیں۔؟

ج۔ اس پر کہ ہم کتنے خوش ہیں اتنا معلوم ہمارے ان دوستوں کا جو ابھی دنیا میں ہیں کیا حال ہوگا؟؟ اور ان کی بہبودی کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔؟ وغیرہ وغیرہ کے بارے میں۔

س۔ جب آپ کے سارے دوست عالم ارواح میں پہونچ جائیں گے تب آپ کس موضوع پر بات کیا کریں گے۔ کیا صرف یہی کریں گے کہ ہم کتنے خوش ہیں۔؟

۔ (کوئی جواب نہیں آیا) یہ بتایا گیا کہ روحیں فضول باتوں کا جواب نہیں دیتیں۔

س۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ روحیں خود تو تا بدنادانی کی باتیں کرتی رہیں اور اس کو وہ اپنی عین خوشی سمجھیں لیکن کوئی دنیا والا اگر ان سے کوئی فضول سوال کر بیٹھے تو وہ بڑی تنگ مزاجی دکھائیں اور خاموش ہو جائیں۔

(کوئی جواب نہیں)

س۔ کیا آپ دنیا میں واپس آنا چاہیں گے۔؟

ج۔ نہیں۔

س۔ کیا آپ اس بات کو قسم کھاکر کہہ سکتے ہیں۔؟

ج۔ ہاں۔

س۔ آپ وہاں کیا کھاتے ہیں۔؟

ج۔ ہم کچھ نہیں کھاتے۔

س۔ آپ کیا پیتے ہیں ؟

ج۔ ہم کچھ نہیں پیتے۔

س۔ کیا آپ سگریٹ پیتے ہیں۔؟

ج نہیں۔

س۔ آپ پڑھتے کیا ہیں۔؟

ج۔ ہم کچھ نہیں پڑھتے۔

س۔ کیا سب نیک آدمی آپ کے یہاں پہونچتے ہیں۔؟

ج۔ ہاں۔

س۔ آپکو میرا موجودہ طرز زندگی معلوم ہی ہے۔ کیا آپ میرے لئے کوئی مزید جرم تجویز کریں گے جسے کرنے سے میرا عالم ارواح کو چھوڑکر کیسی دوسری جگہ جانا یقینی ہوجائے۔؟

ج۔ کوئی جواب نہیں۔

س۔ آپ نے کب انتقال فرمایا۔؟

ج۔ میں مرا نہیں۔ میری روح قبل از وقت یہاں آگئی۔

س۔ بہت بہتر تب یہ بتائیے کہ آپ کی روح کس وقت یہاں سے چلی تھی۔؟ آپ عالم ارواح میں کب سے رہ رہے ہیں۔

ج۔ یہاں وقت کا کوئی حساب نہیں رکھا جاتا۔

س۔ آپ اپنے موجودہ ماحول میں وقت اور تاریخوں کا چاہے کوئی حساب نہ رکھتے ہوں اور اس کی آپ کو ضرورت بھی نہ ہو۔ لیکن دنیاوی زندگی میں تو آپ کے ساتھ یہ بات نہ تھی اسوقت تو آپ کو تاریخوں سے کام تھا۔ ان میں سے ایک ہی تاریخ تو میں آپ سے دریافت کررہا ہوں۔ آپ کسی مخصوص سال کے کسی مخصوص دن کو یہاں سے روانہ ہوئے تھے کیا یہ درست نہیں ہے۔؟

ج۔ ہاں۔

س۔ تب اس مہینے کے دن کا نام بتائیے۔؟

(اس موقع پر مسٹر مانچسٹر کے ہاتھ میں لگی پینسل کچھ بے ڈھنگے طریقہ سے ہلنے لگی اور معمول کا سر اور جسم ایسے ہلنے لگے گویا انھیں شدید درد ہو اور کچھ دیر تک وہ یونہی ہلتے رہے آخر میں معمول نے خود یہ سمجھا دیا کہ روحیں اکثر تاریخیں بھول جایا کرتی ہیں کیونکہ ان کے لئے تاریخوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

س۔ تو کیا واقعی اس روح کو اپنی دنیا سے منتقل ہونے کی تاریخ یاد نہیں۔؟

ہاں (معمول نے یہی بات بتائی) (ہاتھوں میں پھر کچھ بے ڈھنگی سی حرکت ہوئی اور معمول کے جسم میں بھی کچھ احمقانہ جنبش ہوئی آخر میں یہ بتایا گیا روح کو سال بھی نہیں معلوم۔

س۔ یہ تو بڑی تعجب کی بات ہے اچھا میں ایک سوال اور پوچھتا ہوں اور وہ آخری سوال ہوگا۔ پیشتر اس کے کہ آپ ہم سے جدا ہوں اور ہوسکتا ہے ہمیں آئندہ ملنے کا موقع ہی نہ ملے کیونکہ اگر میں آپکی دنیا میں مجبوراً پہونچ بھی گیا تو شاید وہاں بھی آپ سے ملاقات کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ اسوقت تک آپ مجھے اور میرا نام قطعی طور پر بھول چکے ہونگے۔ آپ صرف یہ بتا دیجئے کہ آپ اپنی قدرتی موت سے مرے یا آپ کسی حادثہ کا شکار ہوئے تھے۔؟

(اسوقت معمول کی حالت دیکھنے سے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روح کو جواب دینے میں بڑا پس و پیش ہو رہا ہے اور بہت تکلیف بھی ہو رہی ہے) بہرحال یہ جواب ملا)

ج۔ قدرتی موت۔

اسی سوال پر بات چیت ختم ہو گئی۔ بعد میں میرے دوست نے معمول کو بتایا کہ جب اس کا رشتہ دار اس دنیا میں موجود تھا تو اس میں بڑی فہم و فراست تھی اور اس کی قوت یادداشت میں کسی قسم کا کوئی نقص نہیں تھا۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اس اپنی ملک میں جا کر ان خوبیوں کا شائبہ بھی اس میں باقی نہ رہا۔ کاش کہ اس میں وہ خوبیاں وہاں بھی بدستور رہتیں تاکہ وہ خود بھی خوش و خرم رہتا اور دوسری روحیں بھی حیرت سے اس کی تعریف و توصیف کرتیں۔

مسٹر ہانجسٹر کا کام تو پھر بھی چل ہی رہا ہے اس وقت بھی ان کے پاس کافی گاہک آتے تھے اور اب بھی ان کے بہت سے مرید ہیں۔ ان کے پاس عالم ارواح کے ہر حصے سے خبریں آتی ہیں جن کو وہ ریاستہائے متحدہ کے محکمہ ڈاک کے ذریعہ اصحابِ متعلقہ کو بھیجتے رہتے ہیں۔ ان اطلاعات میں بہت سی نصیحتیں ہوتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ نصیحتیں روحوں نے بھیجی ہیں جبکہ ان بیچاریوں کو معمولی باتوں کا علم بھی نہیں ہوتا مگر ایسی نصیحتوں پر لوگ مذہب اعتقاد کی بنا پر بڑے اشتیاق سے عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مسٹر ہانجسٹر کے ایک موکل کو روحوں سے یہ نصیحت ملی (ہو سکتا ہے کہ یہ مسٹر ہانجسٹر کی ہی اختراع ہو) کہ ریلوے کی گاڑی کے پہیہ کو بہتر بنانے کے لئے اور کیا اختراع ہونی چاہیئے۔ حالانکہ روحوں کے لئے ایسی باتیں بڑی حقیر اور نادانی کی معلوم ہوتی ہیں لیکن پھر بھی یہ اس نادان سے مشغلے سے بہتر ہے کہ ہر وقت یہی کہا جائے کہ ہم کتنے خوش ہیں

اُنچاسواں باب

پائلٹوں کی زندگیوں کے کچھ اہم واقعات

جب ہم ٹگ[1] بوٹ سے متعلق کچھ گپ شپ میں مشغول تھے تو مجھے معلوم ہوا کہ میرے پانچ پرانے ساتھیوں میں سے جنھوں نے دریا کی ملازمت چھوڑ دی تھی چار نے کاشت کاری کا پیشہ اختیار کر لیا تھا مگر اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انھیں کاشتکاری سے کوئی خاص لگاؤ تھا۔ اور وہ دوسرے پیشوں کے مقابلے میں اس میں زیادہ کامیاب ہو سکتے تھے۔ بلکہ کچھ اور ہی اسباب تھے جنکی بنا پر انھوں نے اس پیشہ کو ترجیح دی تھی۔ کچھ بھی ہو اس میں تو مطلق شبہ نہیں کہ انھیں یہ پیشہ اس وجہ سے بھی پسند آیا ہوگا کہ اس میں خاصی آزادی تھی اور وہ امن و سکون کی زندگی بسر کر سکتے تھے۔ وہاں دخانی کشتی کے پائلٹ ہاؤس کی سی پریشانی نہیں تھی کہ ہرا بھرا غیرا نتھو خیرا آ کر انھیں پریشان کر سکے۔ جب وہ دخانی کشتی میں کام کرتے تھے تو آئے دن دریاؤں میں خطرناک طوفان آتے آسمان پر کالے بادل چھا جانے اور بھیانک راتوں میں جب ان پر دہشت غالب ہوتی تو اسوقت انھیں ساحل کے قریب کسی کسان کے فارم پر ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو دیکھ کر بڑی تسلی ہوتی اور وہ سوچنے لگتے کہ کسان کے گھر میں کتنا آرام اور سکون ہوگا۔ ہوتے ہوتے انھیں کسان کی زندگی میں اتنی دلکشی نظر آنے لگی کہ وہ اس بات کے منتظر رہنے لگے کہ کب ریٹائر ہوں اور کب امن و سکون کی زندگی گزارنے کے لئے دیہات میں جا کر رہیں اور مزے سے کاشتکاری کریں۔

لیکن مجھے ایسی کوئی اطلاع نہیں ملی کہ ان لوگوں میں سے کوئی کامیاب ہوا ہو۔ برخلاف اسکے یہی اطلاع ملی کہ کھیت انھیں نہیں بلکہ وہ کھیتوں کو پال رہے ہیں۔ معلوم یہ ہوا کہ پائلٹ

---

[1] جہازوں کو کھینچنے والی کشتی۔

کِسان صرف چند مہینوں کے لئے فارم پر کام کرنے آجاتا ہے اور موسم خزاں تک جب تک کہ پالا نہیں پڑتا وہ کاشتکاری کے کام میں لگا رہتا ہے۔ لیکن جاڑا شروع ہوتے ہی وہ پھر کشتی پر ملازمت کرنے چلا جاتا ہے۔ اس وقت آپ اس کی صورت شکل سے اُسے پہچان لیں گے کہ یہ اپنے فارم سے آیا ہے۔ وہ گھر کے کاتے سوت کے بنے ہوئے کپڑے پہنے ہوئے اور الجھے ہوئے بالوں سے گھاس کے تنکے نکالتا نظر آتا ہے۔ موسم سرما میں وہ پھر پائلٹ ہاؤس میں آکر بیٹھتا ہے۔ دراصل کاشتکاری میں اُسے نقصان رہتا ہے۔ اور اسی کو پورا کرنے کی خاطر اُسے کشتی پر ملازمت کرنی پڑتی ہے۔ اس لئے کشتی کی ملازمت سے اس کا پیچھا پوری طرح نہیں چھوٹ پاتا اور ہر سال موسم سرما کی شدید سردی میں اُسے دریا پر ملازمت کرنی ہی پڑتی ہے۔

ان چار پائلٹوں میں سے ایک نے تو فارم خرید کر بھی کھیتی شروع نہیں کی۔ اس نے ایک اور چالاکی کی۔ اس نے سوچا "مجھے کھیتی کرنا تو آتا نہیں، فارم سے مجھے سوائے نقصان کے کسی چیز کی امید نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ فارم بالکل چوپٹ ہی ہو جائے۔" اس لئے اُس نے ایک ہوشیار کِسان کو اپنا فارم بٹائی پر دیدیا۔ اور اس سے یہ طے کیا کہ دو حصے پیداوار کے وہ خود لے اور ایک حصہ اُسے دیدے۔ لیکن ہوا کیا۔ سال کے آخر میں بیچارے پائلٹ کو کچھ نہیں ملا۔ چالاک کسان نے کہدیا کہ کھیت میں اتنی پیداوار کہاں ہوئی جو وہ پائلٹ کو بھی دے۔ مشکل سے اتنا ہی تو ہوا ہے کہ وہ اپنے دو حصے لے سکے۔

کچھ پائلٹوں نے جنگوں میں بخوبی جانثاری بھی کی، کچھ معرکے کے جن میں سے کچھ میں تو وہ بہت کامیاب ہوئے اور باقیوں میں ناکام۔ کپتان مانٹگومری جب پائلٹ تھے تو میں اکثر ان کے ساتھ رہتا تھا اور ان کی جگہ کشتی چلایا کرتا تھا۔ کپتان موصوف اس بڑی جنگ میں جو میمفس شہر کے سامنے ہی ہوئی تھی ریاستہائے متحدہ کی فوج کے کمانڈر تھے۔ بدقسمتی سے جب ان کا جہاز ڈوبنے لگا تو وہ دریا میں کود گئے اور تیرنے لگے۔ کسی نہ کسی طرح کوشش کر کے اپنے سپاہیوں کے درمیان سے نکل کر وہ ساحل کی طرف جھپٹے۔ انھوں نے بڑی ہمت سے کام لیا اور بڑی جوان مردی کے ساتھ کنارے پہ جا لگے اور اس طرح مرتے مرتے بچے۔ انہیں یہ خوبی تھی کہ وہ بڑے سلیم الطبع تھے اور کتنی ہی مصیبت کیوں نہ آئے گھبراتے نہیں تھے۔ ایک بار جب وہ

گریسینٹ سِٹی جہاز پر کپتان تھے تو میں اس کشتی کو نیو اورلینز کی بندرگاہ پر لا رہا تھا۔ مجھے ہر لمحہ کپتان صاحب سے جو ہر یکین ڈیک پر تھے ہدایات کی انتظار بھی۔ کہ "کشتی کنارے پر لگا دو" مگر یہ حکم مجھے مِل ہی نہیں رہا تھا۔ میرا اختیار اور میری ذمہ داری صرف اتنی تھی کہ میں جہاز کے پہیوں کو روکے رکھوں۔ اور یہ کام میں کر ہی چکا تھا۔ جھٹپٹے کا عالم تھا۔ روشنی مدھم ہو چلی تھی۔ مگر کپتان صاحب ابھی تک گھنٹی نہیں دے رہے تھے بلکہ گھنٹی پر تو کپتان صاحب کا ہیٹ رکھا ہوا تھا۔ اور وہ کمرے کے اندر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ وہ سوچ رہا کہ کپتان صاحب بالکل بیخبر ہیں اور گھنٹی بجانا بھول گئے ہیں۔ مگر ایسی بات نہیں تھی۔ کپتان صاحب ڈیوٹی کے بڑے پابند تھے۔ اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ میں گھنٹی کو نہ چھوڑوں۔ اندیشہ یہ تھا کہ اگر کشتی ساحل پر لگائی گئی تو وہ وہاں کھڑی ہوئی کسی کشتی سے ٹکرا سکتی تھی ایسی خطرناک حالت میں میں تو صرف یہی کر سکتا تھا کہ کشتی کو حتی الامکان بہنے سے روکے رہوں۔ چاہے نتیجہ کچھ بھی ہو۔ اور میں نے کیا بھی یہی ہماری کشتی دوسری کشتیوں کے پچھلے حصّوں کے بالکل قریب ہی تھی اور اُن سے ٹکرانے جا رہی تھی۔ مگر کپتان صاحب اب بھی بے خبر تھے۔ ان کا ہیٹ ابھی تک گھنٹی کے اوپر ہی پڑا ہوا تھا۔ افسوس کپتان صاحب ٹیکساس[1] میں بیٹھے اونگھ رہے تھے اور میں گھبرا رہا تھا کیونکہ خطرہ اب بالکل قریب آ گیا تھا۔ مجھ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ کہ جب تک کپتان صاحب آئیں گے کشتی ٹکرا کر تباہ ہو جائے گی۔ لیکن نہیں۔ ایسا نہیں ہوا۔ کپتان صاحب آ گئے ہماری کشتی جیسے ہی ایک دوسری کشتی کے دنبالے سے ٹکرانے والی تھی کہ وہ پائلٹ ہاؤس میں آ دھمکے اور حکم دیا "کشتی کو پیچھے ہٹا کر کنارے پر لگا دو" میں نے فوراً حکم کی تعمیل کی مگر لمحہ بھر دیر ہو جانے کی وجہ سے ہماری کشتی ایک دوسری کشتی کے باہری حصّے سے جو بہت ہلکا اور نازک تھا اتنے زور سے ٹکرائی کہ بڑے زور کا دھماکا ہوا۔ لیکن کپتان صاحب نے اس حادثہ پر مجھے ذرا بھی سخت سُست نہیں کہا۔ بلکہ یہ کہا کہ "تم نے ٹھیک کیا اور مجھے امید ہے کہ آئندہ بھی ایسے حالات میں تم یہی کرو گے۔"

ایک اور پائلٹ جسے میں اسوقت سے جانتا ہوں جب سے میں نے دریا پر ملازمت کی تھی

---

[1] جہاز کا بالائی عرشہ

بڑی بہادری اور عزت کی موت مرا۔ اس کی کشتی میں آگ لگ گئی تھی مگر جب تک اُس نے کشتی کو ساحل
تک نہیں پہونچا دیا وہ جلتی آگ میں برابر اپنا کام کرتا رہا۔ جب وہ ساحل پر پہونچ کر کشتی سے نیچے اُترا
تو اس کے کپڑوں میں آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اس طرح اس نے اپنی جان کی پروا نہ کی اور
سب سے آخر اس کنارے پر پہونچا مگر اس کا جسم زخموں سے چھلنی ہو گیا اور وہ جاں بر نہ ہو سکا۔ دو تین
گھنٹے ہی میں وہ راہیٔ ملکِ عدم ہو گیا مگر اپنی جان دے کر اس نے اور سب کی جانیں بچا دیں۔ مرنے
والوں کی فہرست میں اکیلا وہی تھا۔

دریائے مسی سپی کی تاریخ میں پائلٹوں کی اس طرح کی شہادتوں کی چھ سات مثالیں ملتی
ہیں۔ اور قریب پچاس مثالیں ایسے جانبازوں کی ملتی ہیں جو دوسروں کی جانیں بچانے میں
خود موت کے منہ میں جانے سے بال بال بچے۔ مگر ایسی ایک بھی مثال آپ کو نہیں ملے گی کہ پائلٹ
اپنی جان بچانے کے لئے ڈیوٹی سے بھاگ گیا ہو یعنی جب وہ اپنی جان دے کر دوسروں کی جانیں
بچا سکتا تھا تو اس نے اپنی جان قربان کرنے سے گریز کیا ہو یہ حقیقت اتنی شاندار اور باوقار ہے
کہ اس کا ذکر اس کی پوری اہمیت کے ساتھ اور جلی حروف میں ہونا چاہیئے۔

جب کوئی امیدوار پائلٹ کا کام سیکھنے آتا ہے تو اُسے ہدایت کی جاتی ہے کہ اگر وہ اس پیشے
میں آنا چاہتا ہے تو اسے خطروں کی بالکل پروا نہیں کرنی چاہیئے۔ اگر وہ خطرہ کے وقت اپنی جان دیکر
بھی دوسروں کی مدد کر سکتا ہے تو اسے جان دینے سے بھی گریز نہ کرنا چاہیئے۔ ایسے موقعوں پر
بھاگنے اور بے عزتی سے جینے سے مر جانا بہتر ہے۔ یہ ہدایتیں اتنی اچھی طرح اس کے ذہن نشین
کرا دی جاتی ہیں کہ نوجوان پائلٹ جو ابھی کام سیکھ رہا ہوتا ہے۔ اس نصب العین کو ہمیشہ
اپنے سامنے رکھتا ہے۔ وہ خطرے کے وقت جہاز چھوڑ کر نہیں بھاگتا اور ضرورت پڑتی ہے
تو جان کی بازی بھی لگانے سے گریز نہیں کرتا شہر میمفس کے قبرستان میں ایک ایسے ہی نوجوان
آدمی کی قبر ہے جس نے بہت سال پہلے دریائے وہائٹ میں جلتے ہوئے جہاز پر ہی جان دے کر
دوسروں کی جانیں بچائیں۔ اس نے کپتان سے کہا کہ اگر آگ نے مہلت دی اور وہ قریب
والے ریت کے پشتے تک پہونچ گیا تو وہ سب کی جانیں بچانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن
اگر اس نے چٹان والے ساحل پر ہی کشتی روکنے کی کوشش کی تو وہاں پانی میں ڈوبی ہوئی

چٹان سے ٹکرا کر اس کی کشتی چور چور ہو جائے گی۔ اور بہت سی جانیں ضائع ہو جائیں گی۔ لہٰذا وہ پشتے کی طرف پہونچا اور اس نے اتھلے پانی میں کشتی کو دریا کی تہ سے لگا دیا۔ اسی اثنا میں آگ کے شعلوں نے اس کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور وہ بُری طرح جل کر مر گیا۔ اس سے بہت کہا گیا کہ وہ بھی بھاگ کر اپنی جان بچالے لیکن اُس نے وہی جواب دیا جو ایک بہادر پائلٹ کو دینا چاہیئے تھا۔ "یعنی کہ میں نہیں جاؤں گا۔ اگر میں بھاگ گیا تو ایک بھی مسافر موت کے منہ سے نہیں بچے گا اور اگر میں اپنی ڈیوٹی پر ڈٹا رہا تو سوائے میرے کسی اور کی جان ضائع نہیں ہوگی۔ اس لئے میں یہیں رہوں گا"

اس جہاز پر دو سو آدمی سوار تھے اور سوائے پائلٹ کے کسی اور کی جان ضائع نہیں ہوئی۔ میمفس کے قبرستان میں اس نوجوان پائلٹ کا مقبرہ بنایا گیا ہے۔ دریا کے کنارے پہاڑ پر چلتے ہوئے جب ہم میمفس میں رُکے تھے تو میں نے اس مقبرے کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ہمارے پاس وقت بہت کم تھا اس وجہ سے مجھے یہ کام ادھورا ہی چھوڑ کر واپس جانا پڑا۔

اِسی گفتگو کے دوران میں مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ میمفس کے قریب میرا ایک دوست ڈِک کینٹ کشتی میں آگ لگنے کی وجہ سے جل کر مر گیا اور کئی اور لوگ جن سے میں واقف تھا جنگ میں مارے گئے۔ دو ایک تو کشتی چلاتے ہوئے ڈیوٹی پر ہی مارے گئے۔ ایک اور پائلٹ تھا جو میرا جگری دوست تھا اور جس کے ساتھ میں نے کئی مرتبہ سفر کیا تھا اور اس کے بجائے اس کی کشتی بھی چلائی تھی۔ اسکے بارے میں میں نے یہ سنا کہ ایک رات وہ نیو اورلینز میں اپنے مکان سے باہر نکلا اور شہر سے باہر دور کسی محلّے میں گیا جہاں سے اسے کچھ پیسہ لانا تھا مگر لوٹ کر اپنے گھر واپس نہیں آیا۔ ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ راستے ہی میں اُسے کسی نے مار ڈالا اور اس کی لاش کو دریائے مسیسپی میں پھینک دیا۔ میرا ایک اور ساتھی بین تھارن برگ بہت دن پہلے مر چکا تھا اور اس کا وہ شاگرد بھی جس سے میں قریب قریب روز ہی ڈیوٹی پر لڑا کرتا تھا۔ وہ ایک لاابالی اور بے پروا قسم کا نوجوان تھا۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی شرارت کرنا اور پریشانی مول لینا اس کا معمول تھا۔ ایک دن اورکنسا کا کوئی مسافر ایک بہت بڑا بچھڑا لے کر کشتی پر آیا اور اُس نے ہری کیبن ڈیک

پر اُسے ایک لائف بوٹ سے باندھ دیا۔ تھارن برگ کے شاگرد سے نہ رہا گیا۔ اس نے جاکر ریچھ کو کھول دیا محض یہ تماشہ دیکھنے کیلئے کہ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔ اُسے اس شرارت کا مزہ فوراً مل گیا ریچھ عرشے پر دوڑ دوڑ کر اس کا پیچھا کرنے لگا اور بڑی دیر تک اس کا تعاقب کرتا رہا۔ جنگلے کے چاروں طرف کھڑے مسافر مسکرا رہے تھے اور تماشہ دیکھ رہے تھے۔ آخر کار ریچھ نے لڑکے کو آدبایا اور اس کے کوٹ کا ایک کونہ نوچ کر ٹیکساس[1] کے اندر گھس گیا اور چبانے لگا۔ کمرے کے اندر جو لوگ آرام کر رہے تھے فوراً وہ ڈر کر بھاگ گئے۔ کمرے میں اب صرف ریچھ اکیلا رہ گیا۔ غالباً تنہائی سے ملول ہو کر وہ تفریح کے لئے باہر نکلا۔ اس نے تمام کشتی کا چکر لگا ڈالا اور ہر حصّے میں پہونچا۔ آگے آگے لوگ اس کے ڈر سے بھاگتے جاتے تھے اور پیچھے پیچھے وہ ریچھ بھاگ رہا تھا۔ لوگ کونوں میں جا چھپے۔ تمام عرشہ خالی ہو گیا اور کشتی پر سناٹا چھا گیا آخر کار جب ریچھ کے مالک نے اُسے پکڑا تو عرشے پر ان دونوں کے سوا اور کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ سب مسافر ڈر کے مارے جہاں انھیں موقع ملا جا چھپے۔ ساری کشتی سنسان پڑی تھی۔

مجھے لوگوں نے بتایا کہ میرا ایک دوست اسٹیرنگ وہیل ہی پر گر کر مر گیا۔ غالباً وہ دل کی کسی بیماری میں مبتلا تھا۔ اسوقت کپتان کشتی کے بالائی عرشہ پر تھا جونہی اس نے دیکھا کہ کشتی بہک کر ساحل سے ٹکرانے جا رہی ہے وہ چلّایا مگر جب پائلٹ ہاؤس سے کوئی جواب نہیں ملا اور وہ دوڑ کر آیا تو اس نے پائلٹ کو فرش پر مرا ہوا پایا۔

مسٹر یجبی تو میدڑ ڈکے موڑ پر کشتی کا بوائلر پھٹ جانے کی وجہ سے کشتی سے دور جا گرے لیکن ان کے چوٹ نہیں آئی مگر دوسرے پائلٹ کی جان ضائع ہو گئی۔ جارج زیگی مفس کے قریب بوائلر کے پھٹنے سے اسٹیرنگ وہیل سے دریا میں گر پڑے اور بُری طرح مجروح ہوئے۔ پانی یخ بستہ تھا۔ وہ کپاس کی گانٹھ سے لپٹ گئے جسے انھوں نے دانتوں سے پکڑ رکھا تھا۔ جب وہ تیرتے تیرتے نڈھال ہو گئے تو اسی وقت دوسرے مسافروں نے جو ایک ٹوٹے ہوئے تختے پر تیر رہے تھے انھیں اوپر کھینچ لیا اور یوں ان کی جان بچ گئی۔ مسافروں نے روئی کی گانٹھ کھول کر مسٹر زیگی کو روئی میں دبا دیا۔ جس سے ان کے بدن میں گرمی آگئی اور لوگ انھیں حفاظت سے

---

[1] آرام گھر

میمفس لے گئے اب وہ مسز مجسی کے ساتھ بیٹن روج جہاز پر پائلٹ کا کام کرتے ہیں۔
دخانی کشتی کے ایک کلرک کی زندگی بھی ایک رومانی داستان ہے۔ یہ کلرک اب زندہ نہیں ہے۔ مگر اس کی داستان بہت عجیب و غریب ہے۔ عجیب و غریب ہونے کے باوجود بھی یہ رومانی ہے۔ جب میری اس کلرک سے ملاقات ہوئی تھی تو اسوقت وہ بہت کاہل، فضول خرچ، فضول گو، نیک دل، مگر لاابالی اور بے پروا معلوم ہوتا تھا۔ اور ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنی دولت کو جو اس کے پاس بچی ہے جلد برباد کر دے گا۔ اور آوارہ ہو جائے گا۔ کسی مغربی شہر میں ایک بوڑھا پردیسی اور بیوی رہتی تھی۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی مگر ان کے پاس ایک نوجوان لڑکی رہتی تھی جو ان کے یہاں نوکرانی کا کام کرتی تھی وہ ان کی بڑی اطاعت شعار اور بہی خواہ تھی۔ جس نوجوان کلرک کا میں ذکر کر رہا ہوں اس کو میں جارج جانسن کے نام سے موسوم کر رہا ہوں دراصل یہ اس کا اصلی نام نہیں تھا۔ مگر میں اس قصے میں اس کا تذکرہ اسی نام سے کروں گا۔ اس کلرک اور اس نوجوان لڑکی میں جان پہچان ہو گئی۔ جو بڑھتے بڑھتے محبت میں تبدیل ہو گئی یہاں تک کہ ان دونوں کو اس بوڑھے پردیسی نے ہمبستری کرتے دیکھ لیا۔ جس پر اس نے انھیں بہت لعنت ملامت کی۔ شرمندہ ہو کر گناہ کو چھپانے کے لئے انھوں نے جھوٹ بول دیا۔ اور بوڑھے کو یہ بتایا کہ ان کی آپس میں شادی ہو چکی ہے جو انھوں نے بغیر کسی کو بتائے اپنی مرضی سے کر لی ہے اس پر بوڑھے کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور اس نے انھیں معاف کر دیا اور دعا دی کہ وہ خوش و خرم رہیں۔ اسکے بعد تو وہ بے خوف ہو کر ایکدوسرے سے ہمبستری کرتے رہے کچھ عرصہ بعد اس بوڑھے کی بیوی مر گئی اور اس کے فوراً بعد خود بوڑھا بھی راہیٔ ملکِ عدم ہو گیا۔ مرحوم کے دوست و احباب ماتم پرسی کے لئے جمع ہوئے جن میں وہ دونوں گنہگار بھی شامل تھے۔ بوڑھے کی وصیت کو کھولا گیا اور اسے بڑے غور سے پڑھا گیا۔ اس بوڑھے کی کل دولت یعنی پائی پائی تک کی وصیت مسز جارج جانسن کے نام کی گئی تھی۔
اور اس نام کا کوئی آدمی تھا ہی نہیں۔ بیوقوفی سے ان دونوں نوجوان گنہگاروں نے یہ غلطی کی کہ وہ بھاگ کر ایک عدالت میں گئے اور کسی معمولی جج کے روبرو انھوں نے اپنی شادی کر لی اور اس واقعے کی تحریر پر کوئی پرانی تاریخ ڈلوا دی جس سے انھیں کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

کیونکہ بوڑھے کے دور کے کچھ رشتہ دار آگئے تھے۔ انھوں نے بڑی آسانی سے ان کی شادی کی فرضی تاریخ اور ان کے مکر و فریب کا پردہ فاش کر دیا۔ جسے دیکھ کر سب کو حیرت ہوئی چنانچہ بوڑھے کے رشتہ دار اس کی سب دولت لے گئے اور مسٹر اور مسز جانسن کو مایوس ہونا پڑا بلکہ اب وہ قانوناً بھی خاوند و بیوی بن چکے تھے۔ اور ان کی شادی کا یہ بندھن اب بالکل پختہ اور ناقابل اعتراض ہو چکا تھا۔ مگر بے چاروں کو شادی کی مبارکباد کے موقع پر ایک حبہ بھی نصیب نہ ہوا۔

تو یہ ہیں چند حقائق غالباً آپ کو بہت کم ناولوں میں ایسے دلچسپ واقعات ملیں

پچاسواں باب

پرانے جیکیس (دھوکے باز لوگ)

باتوں باتوں میں کپتان جیباؔ سیلرس کا ذکر چل پڑا۔ جن کو مرے ہوئے کافی عرصہ ہو گیا تھا وہ شخص بڑا خلیق اور عالی ظرف تھا۔ ملاّح اور شہری سبھی اس کی عزت کرتے تھے۔ صورت شکل میں وہ خوبصورت۔ متناسب الاعضا اور قد آور تھا۔ اور جیسا کہ مجھے یاد ہے بڑھاپے میں بھی اس کے بال قبائلیوں جیسے سیاہ تھے اس کے ہاتھ مضبوط، نظر تیز اور اعصاب تندرست تھے اور اس کی قوت فیصلہ بڑی مستحکم تھی غرضیکہ وہ بوڑھے اور جوان سبھی پائلٹ ساتھیوں میں افضل ترین تھا۔ جیباؔ صاحب نکڑی کی ناؤ کے بانی تھے۔ دخانی کشتی کے وجود سے پیشتر وہ چپٹے تلے والی ناؤ چلاتے تھے۔ اور سب سے پہلے دخانی

کشتی بھی انھوں نے ہی چلائی ۔ غالباً دوسرے پائلٹوں کو ان کے بعد ہی یہ شرف حاصل ہوا ۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے ساتھی پائلٹوں میں ان کا ویسا ہی رعب و دبدبہ تھا جیسا کہ پرانے نامور اشخاص کا اپنے ساتھیوں میں ہوتا ہے اور انھیں خود بھی معلوم تھا کہ لوگ ان کا رعب مانتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ان میں تھوڑی بہت رعونت آگئی تھی تاہم ان کی شخصیت پہلے ہی سے باوقار تھی۔

اُن کے مرنے کے بعد ان کی ایک ڈائری ملی ۔ لیکن ان کے پہلے دخانی جہاز کے سفر کا تذکرہ نہیں تھا کہا جاتا ہے کہ یہ سفر انھوں نے ۱۸۱۱ء میں کیا تھا۔ جب کہ پہلا دخانی جہاز دریائے مسی سپی میں چھوڑا گیا تھا۔ سینٹ لوئی ریپبلکن کے نامہ نگار نے ان کے انتقال پر انکی ڈائری سے حسب ذیل اقتباس شائع کیا۔

"ماہ فروری ۱۸۲۵ء میں وہ فلورنس ایلا میں ریبلکر نامی سیمر میں سوار ہوئے اور سال بھر کے اندر وہ تین مرتبہ نیو اورلینز گئے اور واپس آئے۔ یہ کشتی ایک سو پندرہ ٹن بوجھ لیجا سکتی تھی ۱۸۲۶ء میں انھوں نے کیرلِ نامی جہاز میں نیش وِلے اور نیو آرلینز کے درمیان سفر کیا۔ اور اسی کشتی کے دورانِ ملازمت میں انھوں نے پائلٹ ہاؤس میں گھنٹی پر ایک کھٹکا لگوایا جس کو دبانے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ پنسال کو اُوپر اٹھا لیا جائے اس سے پیشتر جب پانی کی گہرائی ناپنا مقصود ہوتا تھا۔ تو نیچے پنسال برداروں کو آواز دینی پڑتی تھی۔ اس سے پیشتر جب چھوٹے جہازوں میں پائلٹ ہاؤس اور ملازمین کے کمرے پاس پاس ہوتے تھے تو آواز دینے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی ۔ مگر آج کل کے اونچے اور عالیشان جہازوں میں اُوپر سے آواز دینا کتنا مشکل ہے۔

۱۸۲۷ء میں ہم نے انھیں پریسیڈنٹ جہاز پر ملازمت کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ کشتی دو سو پچاسی ٹن وزن لے جا سکتی تھی اور یہ سمتھ لینڈ اور نیو اورلینز کے درمیان چلا کرتی تھی پھر ۱۸۲۸ء میں انھوں نے جو بلی جہاز پر ملازمت کر لی۔ اس جہاز سے وہ پہلی مرتبہ سینٹ لوئی کی بندرگاہ تک تجارتی سامان لے گئے اس مرتبہ ان کی ڈیوٹی بھی کیو نیفیم سے سینٹ جنیو یونک بڑھا دی گئی ۶ ماہ مئی ۱۸۳۶ء کو یہ ڈیوٹی پوری کر کے وہ بیٹس برگ سے اسٹیمر

پر ہولٹی کے انچارج ہو کر چلے گئے۔ یہ جہاز چار سو ٹن وزن لے جانے والا تھا۔ اور سینٹ لوئی میں یہ پہلا جہاز تھا جس میں آرام دہ اور شاندار کمرہ بھی تھا۔ ۱۸۵۷ء میں انھوں نے دو کشتیوں کے ملاحوں کے لئے دور سے بات چیت کرنے کے لئے کچھ اشارات مقرر کئے جو معمولی ترمیم کے ساتھ عام طور پر ہر جگہ مستعمل ہوتے ہیں۔ کانگریس نے بھی انھیں قانوناً منظور کرلیا ہے۔ دریا کی تواریخ کے متعلق ان کے روزنامچے کے حاشیے کی عبارت سے ہم نے مندرجہ ذیل باتیں نوٹ کی ہیں۔

"مارچ ۱۸۲۵ء کو جنرل لفائیٹ ایک کم رفتار اسٹیمر نیچز کے ذریعہ نیو آرلینز سے سینٹ لوئی کے لئے روانہ ہوئے۔"

"جنوری ۱۸۲۸ء میں جنرل جیکسن کی اس شہر میں آمد کے اعزاز میں ۲۱ جہاز نیو اورلینز کے گھاٹ سے روانہ ہوئے۔"

"۱۸۳۰ء میں نارتھ امریکن جہاز نیو آرلینز سے میمفس صرف چھ دن میں پہونچ گیا یہ اس زمانے کا سب سے عمدہ ریکارڈ تھا۔ لیکن بعد میں تو یہ فاصلہ دو دن اور دس گھنٹے میں طے کرلیا گیا۔

۱۸۳۱ء میں دریائے ریڈ کا کٹاؤ ظہور میں آیا۔

۱۸۳۲ء میں ہڈسن اسٹیمر دریائے وہائٹ سے ہیلینا کو روانہ ہوا اس نے پچھتر میل کا فاصلہ صرف بارہ گھنٹے میں طے کرلیا۔ لوگوں میں اس بات کا خوب چرچا رہا۔ اور طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہوئیں۔

۱۸۳۹ء میں گریٹ ہارس شو کا کٹاؤ بنا۔

روزنامچے کے حوالہ سے ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آج تک سینتیس سال کی مدت میں عیبیا صاحب نے نیو آرلینز تک چار سو ساٹھ بار سفر کیا یعنی انھوں نے دس لاکھ دس ہزار چار سو میل کا فاصلہ طے کیا۔ اور اوسطاً چھیاسی میل روز چلے۔

اگر کہیں پائلٹ آپس میں کانا پھوسی کرتے ہوتے اور اتفاق سے وہاں کپتان سیلرس

پہونچ جاتے۔ تو لوگ ڈر جاتے اور ان کی گفتگو ایک دم بند ہو جاتی جیسے کسان پر اوس پڑ گئی ہو اور اس کا اثر نئے لوگوں پر اور بھی ہیبت ناک ہوتا تھا۔ اگر کہیں چند پائلٹ اکٹھے ہو جاتے تو ان میں ایک یا دو نو وارد ضرور ہوتے تھے پرانے پائلٹ ہمیشہ ان غریبوں پر رعب جمایا کرتے تھے۔ نئے پائلٹوں کو یہ محسوس کرایا جاتا کہ ابھی وہ بالکل ناتجربہ کار ہیں کیونکہ جمعہ جمعہ آٹھ دن تو انھیں ملازمت ملے ہوئے ہیں۔ پرانے تجربہ کار ملاحوں کے مقابلے میں وہ کتنے ادنیٰ اور حقیر ہیں۔ یہ پرانے لوگ دریا کے متعلق اپنے تجربات کو بہت شیخی اور مبالغے کے ساتھ بیان کرتے تھے اور ہر واقعے کی اتنی قدیم تاریخ بتاتے کہ بیچارے نئے پائلٹ اپنے آپکو کمتر اور طفلِ مکتب محسوس کرنے لگتے اور ان پرانے پائلٹوں کے اعلیٰ مراتب پر انھیں رشک آتا اور تب یہ گرگ باراں دیدہ شیخی بگھارنے لگتے اور خوب جھوٹ بولتے۔ اپنے ان مشاہدات اور واقعات کو دس، پندرہ، بیس سال یا زیادہ سے زیادہ پرانا بتاتے اور جب نئے پائلٹ ان کی باتوں پر اور زیادہ متعجب ہوتے اور ان کی بزرگی پر رشک کرتے تو انھیں بڑا مزہ آتا۔

عین اسی خوشگوار موقع پر کپتان عیسیا سیلرس کہیں سے آجاتے۔ ان کے خوبصورت اور وجیہہ ڈیل ڈول کو دیکھ کر پائلٹوں پر ہیبت طاری ہو جاتی اور ایکدم سب لوگ خاموش ہو جاتے، اور جب یہ پرانا خرانٹ پائلٹ اپنے قدیم تجربات سناتا تو خود کو پرانا کہنے والے سب پائلٹوں کی شیخیاں ماند پڑ جاتیں۔ البتہ نئے پائلٹوں کو بڑی مسرت ہوتی۔ عیسیا صاحب بڑی لاعتنائی کے ساتھ بتانے لگتے کہ فلاں جزیرہ کب غرق آب ہوا۔ اور فلاں کب ڈوب بنا اور پھر بڑی شیخی کے ساتھ کہتے کہ جو واقعات انھوں نے سنائے ہیں وہ حاضرین میں سے سب سے پرانے پائلٹ کی ملازمت شروع ہونے سے بھی کئی برس پہلے کے ہیں۔

اسی طرح سینکڑوں بار یہ بوڑھا ملاح پائلٹوں کی بھیڑ میں اچانک آجاتا اور لوٹتے وقت ان لوگوں میں کمتری اور ندامت کے احساسات کو چھوڑ جاتا۔ کسی کو یقین آئے یا نہ آئے مگر عیسیا صاحب جب کسی جزیرے کا ذکر کرتے تو اس کی قدامت کو دریا کی پرانی سے پرانی تواریخ سے وابستہ کر دیتے اور جس جزیرے کا ایک بار ذکر کر دیتے دوبارہ اس کا نام ان کی زبان پر کبھی نہیں آتا اور موجودہ جزیروں کا تو وہ تذکرہ ہی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ کسی ایسے جزیرہ

کا نام لینا بھی انھیں پسند نہ تھا۔ جیسے کسی پرانے پائلٹ نے بھی سُن رکھا ہو۔ آپ کو یقین آئے یا نہ آئے وہ ہر واقعے کی جذبات اور تفصیلات کو بڑی سنجیدگی سے بیان کرتے مثلاً اگر انھیں ریاست مسی سپی کا نام لینا ہوتا تو وہ یوں کہتے کہ جب مسی سپی کی ریاست وہاں تھی جہاں ارکنسا کی ریاست ہے یا جب انھیں لوئی آنا یا مسوری کا ذکر مقصود ہوتا تو وہ براہِ راست نہیں کرتے۔ بلکہ بات کو گھما پھرا کر اس طرح کہتے کہ سامعین کے ذہن پر ایک غلط اور مبہم تصویر رہ جاتی۔ وہ کہتے جب لوئی آنا دریا کی چڑھائی پر بہت دور واقع تھا.....
.... یا جب مسوری الی نوائے کی جانب واقع تھی وغیرہ وغیرہ۔

یہ شریف النفس بزرگ پائلٹ زیادہ تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ اور نہ ہی ان میں ادبی مذاق کی صلاحیت تھی۔ لیکن وہ مختصر طور پر دریا کی روزمرہ کی معلومات کو جو جہاز کے چلانے کے لئے نہایت کارآمد ہوتی تھیں نوٹ کر لیا کرتے اور اس کے نیچے مارک ٹوین نام کے دستخط کر دیا کرتے اور یہ نوٹ وہ نیو آرلینز پکیشون نامی اخبار کو بھیج دیا کرتے ان کے یہ مشاہدات دریا کے مختلف حالات اور اس اتار چڑھاؤ سے وابستہ ہوتے جو بہت اہم ہوتے تھے۔ اس لئے ان میں بہت کم لغویت ہوتی۔ لیکن موجودہ دریا کے کسی مقام کی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ گذشتہ سالوں کی تاریخ بہت دہرایا کرتے تھے اور مختصر سا تبصرہ کرتے ہوئے وہ کہتے کہ انچاس سال سے دریا کی تاریخ میں ایسا موقع کبھی نہیں آیا کہ پانی کی سطح اس مقام پر اسقدر اونچی یا نیچی ہوئی ہو ۔ اور اپنے بیان میں کبھی کسی جزیرے کا فرضی نام لکھ دیتے اور آگے بریکٹ میں یہ لکھ دیتے کہ اگر مجھے ٹھیک یاد ہے تو یہ جزیرہ ۱۸۰۷ء میں غرق آب ہو کر غائب ہو گیا تھا در اصل اسی قسم کے الفاظ سے جب وہ اپنے پرانے تجربات کی شیخی بگھارا کرتے تھے تو دوسرے پرانے پائلٹ بہت برگشتہ ہوتے تھے اور وہ مارک ٹوین کے بیانات پر کڑی نکتہ چینی ہی نہیں کرتے بلکہ ان کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔

اتفاق ایسا ہوا کہ میں نے اخبار کے لئے جو اپنا پہلا مقالہ بھیجا تھا اس کا موضوع

عیسیٰ صاحب کے نوٹ کا ایک پیراگراف[۱] تھا۔ میں نے اپنے مقالہ میں ان کے نوٹ کا بہت مذاق اڑایا اور قریب ہزار آٹھ سو الفاظ میں عجیب و غریب بیڈھنگی باتوں سے اُس کی لغویت ثابت کر دی۔ میں اُس زمانے میں پائلٹ کی ٹریننگ لے رہا تھا۔ میں نے اپنے مضمون کو چند پائلٹوں کو دکھایا جس کو انھوں نے فوراً نیو اورلینز ٹریو ڈیلٹا[۲] اخبار میں شائع کرا دیا۔ افسوس یہ کوئی اچھی بات نہ تھی کیونکہ اس سے کسی کو فائدہ نہیں ہوا۔ بلکہ اس سے ایک اچھے آدمی کو واقعی سخت صدمہ پہونچا۔

میری فضول گوئی میں کسی کے خلاف کوئی کینہ نہیں تھا۔ البتہ اس میں کپتان صاحب کا مذاق ضرور اڑایا گیا تھا۔ خصوصاً ایسے شخص کا جس کے لئے ایسا مذاق غیر متوقع اور وحشتناک تھا۔ مجھے اسوقت یہ احساس نہیں تھا کہ جس شخص کو پہلی مرتبہ اخبار کے کالم میں مذاق کا نشانہ بنایا جائے اسے کتنی ذہنی تکلیف ہوتی ہے۔

کپتان سیلرس نے مجھے یہ اعزاز بخشا کہ اس دن سے وہ مجھ سے سخت نفرت کرنے لگے۔ اعزاز بخشنے کا فقرہ جو میں نے استعمال کیا وہ غلط نہیں کہا۔ واقعی یہ میرے لئے باعث ناز تھا کہ کپتان سیلرس جیسے عظیم المرتبت کے ذہن میں مجھے جگہ ملی۔ کیونکہ ضرور وہ اندر ہی

---

[۱] قلمی نسخہ جو کپتان صاحب کا خود نوشت تھا مجھے نیو اورلینز سے موصول ہوا تھا۔ اس میں اس طرح کی عبارت تھی:۔ وکس برگ ۴ر مئی ۱۸۵۹ء

نیو آرلینز کے شہریوں کی بھلائی کے لئے میری رائے:۔

اس مقام پر جتنا پانی کا چڑھاؤ اسوقت ہے اتنا ۱۸۱۵ء سے ابتک کبھی نہیں دیکھا گیا۔ اور میری رائے ہے کہ آئندہ ماہ جون کی پہلی تاریخ سے پیشتر کینال اسٹریٹ میں پانی چار فٹ گہرا ہوگا۔ مسٹر ٹرز کا فارم جو بلیک آئی لینڈ پر واقع تھا بوری طرح تہ آب ہو چکا ہے جبکہ ۱۸۱۵ء سے آجتک عیسیٰ سیلرس۔ ایسا نہیں ہوا ہے۔

[۲] NEW ORLEANS TRUE DELTA

اندر مجبور خشم آلودہ رہتے ہوں گے۔ مگر میرے لئے تو یہ باعثِ فخر تھا۔ میں اس بات سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ درحقیقت یہ بڑے امتیاز کی بات تھی کہ کپتان جیسا عالی مرتبہ شخص کسی کو لطف و کرم کی نگاہ سے دیکھے۔ مگر اس سے بھی زیادہ امتیاز اس بات میں تھا کہ وہ کسی سے نفرت کریں۔ کیونکہ وہ محبت تو وہ بہت انسانوں سے کرتے ہوں گے۔ مگر راتوں میں جاگ جاگ کر نفرت وہ میرے سوائے اور کسی سے نہ کرتے ہوں گے۔ اس کے بعد عمر بھر انھوں نے اپنے اقتباسات کا دوسرا پیراگراف شائع نہیں کرایا اور نہ کبھی انھوں نے مارک ٹوین کے نام سے دستخط کئے۔ جب ان کے انتقال کی خبر ٹیلیگراف میں شائع ہوئی تو میں "پیسفک کوسٹ" نامی جہاز پر تھا۔ میں نے اخبار نویسی کا کام شروع ہی کیا تھا۔ اس لئے اپنی تصانیف کے لئے مجھے ایک فرضی نام کی ضرورت تھی۔ لہٰذا میں نے سیلرس صاحب کا چھوڑا ہوا نام یعنی مارک ٹوین ہی اپنے لئے منتخب کر لیا اور اس کو اپنی انتہائی کوششوں اور کاوشوں سے اسی طرح قائم رکھنے کی کوشش کی جیسے سیلرس صاحب نے کی تھی۔ حالانکہ اس نام کے ساتھ دقیانوسی واقعات وابستہ تھے جن کے صحیح ہونے میں شبہ تھا اور لوگ ان کی سچائی پر شرطیں بدنے کو تیار رہتے تھے۔ یعنی ان پر سچ اور جھوٹ کی بازی لگائی جا سکتی تھی۔ مگر اس نام کے ساتھ مجھے کتنی کامیابی ہوئی یہ بتانا میرے لئے انکساری سے تجاوز کرنا ہوگا۔

کپتان صاحب کو اپنے پیشے پر بجا طور پر فخر تھا۔ انھیں اس پیشے سے واقعی بڑی محبت تھی۔ مرنے سے پہلے ہی انھوں نے اپنا ایک بت بنوا لیا تھا جو آخری دم تک انھوں نے اپنے پاس ہی رکھا۔ یہ بت اب سینٹ لوئی کے قبرستان بیلفونٹین میں ان کی قبر پر نصب ہے۔ یہ ان کا سنگِ مرمر کا بت جس میں انھیں اپنی ڈیوٹی پر پائلٹ کی چرخی پکڑے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ واقعی یہ نصب کئے جانے کے قابل ہی تھا۔ اس کو دیکھ کر ہر طرح کی نکتہ چینی کا جواب خود بخود مل جاتا ہے۔ کیونکہ یہ بت اس آدمی کا ہے جو ضرورت پڑنے پر مسافروں کی جان بچانے کے لئے اپنی جگہ پر اس وقت تک جما رہتا جب تک وہ خود جل کر راکھ کا ڈھیر

نہ ہو جاتا۔

دریائے مسی سپی کے سفر میں سب سے خوبصورت شے جو ہم نے اسٹیم ٹگ میں سفر کرتے ہوئے نیو اورلئینز کے قریب پہونچنے پر دیکھی وہ تھی اس شہر کا پُر فضا منظر جو بہت خوبصورت اور قابلِ دید ہے۔ تمام شہر پانچ میل کی گولائی میں بجلی کے قمقموں سے جگ مگ جگ مگ ہوتا ہے۔ نصف دائرے کی گولائی میں پھیلے ہوئے اس شہر کا یہ منظر واقعی بے حد خوبصورت ہے۔

اِکیانواں باب

یادِ ماضی

ہم "سٹی آف بیٹن روج" میں سوار ہو کر سینٹ لوئی کو چل دیئے۔ گرمی کا سہانا دِن تھا۔ لیکن اس سفر کا جو خاص مقصد تھا وہ پورا نہ ہو سکا۔ میرا مقصد یہ تھا کہ قریب سو جہازراں ساتھیوں کو تلاش کر کے ان سے گفتگو کروں مگر میں شہر کے دیگر لوگوں سے ملنے جُلنے اور دوسرے کاموں میں اتنا مشغول رہا کہ مجھے پائلٹوں سے ملنے کے لئے زیادہ وقت نہ مل سکا اور میں ملاحوں سے بمشکل پانچ منٹ ہی بات کر پایا۔

جب ہماری کشتی پہلے ذرا پیچھے ہٹ کر آگے کو روانہ ہوئی تو اس وقت میں پائلٹ ہاؤس میں ایک بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ کشتی اُسی پرانے ڈھنگ سے سٹارٹ ہو رہی تھی اور چمنیوں میں سے دھوئیں کے کالے کالے مرغولے بل رہے تھے۔ اب کشتی اپنی پوری رفتار پر آ چکی تھی اور ہم دندناتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ سب کام حسبِ معمول ٹھیک

چل رہا تھا۔ وہی پہلے جیسے خوبصورت مناظر ساحل پر نظر آنے لگے تھے گویا میرا سفر مسلسل رہا ہو اور میں کہیں نہ رکا ہوں۔ جہاز پر ایک امیدوار پائلٹ کا کام سیکھ رہا تھا میرا خیال تھا کہ اب وہی پہیہ پر آکر بیٹھے گا اور یہی ہوا۔ وہ پہیے پر آ بیٹھا۔ اسی وقت کپتان بھی پائلٹ ہاؤس میں داخل ہوئے۔ امیدوار پائلٹ نے اپنی کشتی کو دوسری دخانی کشتیوں سے آگے لے جانے کی کوشش کی۔ مگر میں گھبرا گیا کیونکہ اُس کی غلطی سے ہماری کشتی اور دوسری کشتیوں کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ ہو گیا تھا جس کی وجہ سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا اور پھر دریا کے اندر چھپی ہوئی کسی چٹان سے ٹکرا جانے کا اندیشہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ میرا ڈر بجا تھا اور میں خطرے سے بخوبی واقف تھا۔ کیونکہ ایکبار مجھ سے بھی ایسی ہی غلطی ہو چکی تھی۔ مجھے وہ دن یاد تھا جبکہ میں ایسے خطرے میں پھنس گیا تھا۔ وہ تاریخ بھی میری ڈائری میں لکھی ہوئی تھی خوش قسمتی سے اُسی وقت کپتان صاحب نے صورت حال کا بغور جائزہ لیا اور نصف منٹ تک خاموش کھڑے رہنے کے بعد انھوں نے پہیہ خود اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کشتی کو ساحل کی طرف کھینچا یہاں تک کہ وہ کھسکتی ہوئی دوسری کشتیوں کے پاس آکر صرف ہاتھ بھر کے فاصلے پر ان کے برابر چلنے لگی۔ بالکل اسی طرح انھوں نے تقریباً پچیس سال پہلے میری مدد کی تھی اور وہ غالباً اسی جگہ پر جب نیو اورلینز کی بندرگاہ سے روانہ ہو کر اس جگہ پہنچا تھا۔ اس وقت جب انھوں نے وہی مہربانی دوسرے نئے پائلٹ کیساتھ کی تو مجھے واقعی بڑی خوشی ہوئی۔

ہم نیچز کی بندرگاہ پر جو تین سو میل تھی بائیس گھنٹے تیس منٹ میں پہونچ گئے۔ اتنی تیز رفتاری سے میں نے کبھی دریا کے اس حصے میں سفر نہیں کیا تھا۔

دوسرے صبح چار بجے کی ڈیوٹی کے وقت میں پائلٹ ہاؤس میں پھر آیا۔ میں نے دیکھا کہ مسٹر بچی نے کہرے کے باوجود بھی تقریباً ایک درجن گھاٹ اچھی طرح پار کر لئے تھے وجہ یہ تھی کہ انھوں نے مسٹر بکسبی کے بنائے ہوئے ایک چارٹ سے مدد لی تھی۔ اس چارٹ کی اہمیت اور افادیت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا تھا۔ ؟

کہرا جلد ہی صاف ہونے لگا اور ساحل کے قریب جہاں پانی کافی چڑھا ہوا تھا اور صاف بھی تھا میں نے ایک درخت کا عکس پانی میں جھلملاتے دیکھا۔ یہ عکس ہم سے قریب

چھ سو گز کے فاصلے پر تھا اور ساحل درخت سے کہیں زیادہ گھنا، سیاہ اور خوفناک دکھائی دیتا تھا۔ ساحل پر دور تک پھیلے ہوئے درخت اس جھٹ پٹے میں دھندلے دھندلے دکھائی دیتے تھے جن پر بھوتوں کا گمان ہونے لگتا تھا۔ یہ منظر بڑا۔۔۔ پُر فضا اور دلکش تھا۔

نیچز کے مقام پر ایک بھاری طوفان نے آگھیرا تھا۔ اسی طرح کا ایک طوفان وکسبرگ میں اور ایک میمفس سے قریب پچیس میل دور آیا۔ بڑی مدت سے میں نے ایسے خوفناک طوفان نہیں دیکھے تھے۔ اس آخری طوفان میں جو میمفس کے قریب آیا ہوا بہت تیز تھی۔ اس لئے طوفان کے آتے ہی ہم نے کشتی کو ساحل سے اچھی طرح باندھ دیا۔ اسوقت میرے علاوہ اور سب لوگ پائلٹ ہاؤس چھوڑ کر چلے گئے تھے ہوا کے زور سے چھوٹے چھوٹے درخت جھک گئے تھے۔ پتے ٹوٹ ٹوٹ کر پڑ رہے تھے اور نیچے کی طرف سے یہ پیلے پیلے دکھائی دیتے تھے۔ ہوا کے تند جھونکے برابر چل رہے تھے جس کی وجہ سے درختوں کی شاخوں میں ایک ہیجان برپا تھا۔ وہ کبھی نیچے، کبھی اُوپر۔۔۔ کبھی اس طرف اور کبھی اُس طرف قلابازیاں کھا رہی تھیں۔ پتوں کی ہر سطح کے سامنے آتے تا دوری تک سبزہ ہی سبزہ دکھائی دینے لگتا اور جب ان کی دوسری سطح سامنے آتی تو تمام شاخیں سفید ہی سفید نظر آتیں اس طرح ہریالی اور سفیدی میں آنکھ مچولی ہو رہی تھی پے در پے ہوا کے تند جھونکوں اور شاخوں کے اس طرح جھومنے سے اسوقت وہی سماں پیدا ہو رہا تھا جو اکثر ہوا کے تیز جھونکوں سے جئی کے کھیت میں نظر آتا ہے اس وقت کوئی شے اپنی قدرتی ہیئت میں نظر نہیں آتی تھی کیونکہ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے جن کا سایہ نیچے زمین کی ہر چیز پر پڑ رہا تھا اور جسکی وجہ سے ہر چیز کا رنگ بدل گیا تھا۔ ہر چیز سیسے کے رنگ کی سی معلوم ہو رہی تھی چنانچہ دریا کے پانی کا رنگ بھی کچھ کالا نظر آ رہا تھا۔ مختصر یہ کہ سارے ماحول میں ہر سمت تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ جھاگوں سے لبریز دور تک پھیلی ہوئی دودھ جیسی سفید لہریں بھی بادلوں کے سائے میں ویسی ہی سیاہ اور بھدی سی معلوم ہوتی تھیں جیسی کہ پہلے والی ہزاروں لہریں جو اسی تاریک فضا میں آگے جا کر غائب ہو چکی تھیں۔ بجلی برابر چمک رہی تھی اور اس کی گرج میں کان پڑی آواز تک سنائی نہیں دیتی تھی۔ دھما کے پر دھما کا ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ رک رک کر غیر متعین وقفے کے بعد بم کے گولے چھوڑے جا رہے ہوں آوازیں

تیز سے تیز تر ہوتی جاتی تھیں اور کان پھٹے جا رہے تھے۔ جتنی بجلی کی کوند تیز تھی اتنی ہی اس کی گرج ہولناک۔ یہ سماں واقعی سحر انگیز تھا اور اس کا اثر جسم کے کل اعصاب پر بجلی کی لہر کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔ کبھی مسلسل اور کبھی تھوڑے تھوڑے وقفے سے بجلی کی کوند یا گرج سے دل و دماغ پر وجد سا طاری ہوتا تھا اس میں مسرت اور خوف دونوں ایک ساتھ محسوس ہوتے تھے اور سارا بدن کانپ اٹھتا تھا بارش موسلا دھار ہو رہی تھی۔ کانوں کو پھاڑنے والی بجلی کی گرج اب تیز تر ہوتی جا رہی تھی اور ہوا کی تیزی کہیں زیادہ بڑھ چکی تھی۔ درختوں کی شاخیں اور پتے ٹوٹ ٹوٹ کر ہوا میں اڑ رہے تھے تمام پائلٹ ہاؤس بری طرح ہلنے اور لڑکھڑانے لگا۔ میں نیچے کمرے میں چلا آیا تاکہ معلوم کروں کہ کیا بجا ہے۔

لوگ ایلپس پہاڑ پر چلنے والے طوفانوں کو بڑا خوفناک بتایا کرتے ہیں لیکن میں نے جو طوفان ایلپس پر دیکھے وہ ان طوفانوں کے مقابلے میں جو دریائے مسیسپی کی وادی میں آتے رہتے ہیں کچھ بھی نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے میں نے ایلپس کے سب سے خطرناک طوفان نہ دیکھے ہوں۔ اگر وہ واقعی مسیسپی کے طوفانوں سے بڑھ چڑھ کر ہوتے ہیں تب تو میں انہیں دیکھنا پسند نہیں کروں گا۔

دریا کے چڑھاؤ پر اس سفر میں میں نے ایک چھوٹا سا جزیرہ دیکھا جو صرف آدھ میل لمبا تھا اور جو پچھلے انیس سال میں بنا تھا۔ اگر خالق کے پاس اتنا زیادہ وقت ہی تھا کہ انیس سال میں صرف ایک ذرا سا جزیرہ بنائے تو اسے کیا عجلت تھی کہ اس نے کل عالم کی تخلیق صرف چھ دن ہی میں کر ڈالی۔ اگر وہ تخلیقِ عالم میں زیادہ وقت لگاتا تو غالباً دنیا زیادہ صحیح اور خوبصورت بنتی اور اس وقت جو اصلاح اور ترمیم و تنسیخ کی ضرورت پڑتی رہتی ہے وہ نہ پڑتی لیکن جب وہ تخلیقِ عالم ہو چکا ہے کسی مکان کی تعمیر اگر عجلت میں کی جائے گی تو کوئی نہ کوئی کمی ضرور رہ جاتی ہے۔ کہیں چھوٹے سے جزیرے کی کمی رہ جاتی ہے یا کہیں صرف [illegible] رکھنے کا مذاق کرتے رکا اور کچھ [illegible] کتنی ہی وقت ہو [illegible] ہو جائے گا۔

دریا کے بہاؤ کے خلاف چلتے ہوئے [illegible] تاریکی میں گزر گیا لیکن [illegible]

ایک دلچسپ بات یہ بھی تھی کہ جب ہم کسی ساحلی شہر پر ٹھہرتے تھے تو وہاں بجلی کی روشنی دکھائی دیتی۔ وہاں یہ روشنی اتنی تیز ہوتی تھی کہ ساحل کے درخت اور دیگر چیزیں اتنی صاف چمکتی تھیں جتنی کہ دن کی تیز دھوپ میں۔ اور دن کا دھوکہ کھا کر پرندے ہزاروں کی تعداد میں پتوں کی آڑ سے نکل نکل کر روشنی میں باہر آجاتے اور اِدھر اُدھر اڑنے لگتے۔ گانے والی چڑیاں چہچہانے لگتیں جس سے صاف ظاہر ہو تا کہ بھولے بھالے پرند بجلی کی روشنی میں رات کو دن سمجھ بیٹھے ہیں۔

ہمارا جہاز بہت عالیشان اور آرام دہ تھا۔ اسلئے جب ہمارا سفر جلد ختم ہو گیا تو ہمیں اس کے اتنی جلد ختم ہونے پر دُکھ ہوا۔ ہمیں اپنے پرانے ساتھیوں سے ملنے کے لئے بڑی تلاش اور دوڑ دھوپ کرنی پڑی مگر ہم مل تقریباً سب ساتھیوں سے لئے۔ صرف ایک ساتھی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ معلوم یہ ہوا کہ تقریباً دو سال ہوئے اُسے اپنے کئے کی سزا مل گئی۔ اسکے متعلق جو معلومات ہوئیں ان سے یہ سبق ملتا ہے کہ کبھی کبھی ذرا سی غلطی کے بھی بڑے تباہ کُن نتائج ہوتے ہیں۔ جب وہ لڑکا ہمارے گاؤں میں لوہار کا کام سیکھتا تھا تو اسوقت میں اسکول میں پڑھتا تھا۔ اسی زمانے میں دو انگریز ہمارے گاؤں میں آکر کچھ دن ٹھہرے۔ ایکدن انھوں نے گاؤں کے لڑکوں کے سامنے سستی اور مصنوعی قسم کی شاہی پوشاک پہن کر رچرڈ سوم کا پارٹ ادا کیا اور بڑی جوشیلی تقریریں کیں اور تلوار کے ہُنر دکھائے جسے دیکھ کر اس لوہار کا کام سیکھنے والے لڑکے کو بھی جوش آگیا اور تواریخی ہیرو بننے کا بھوت اس کے سر پر سوار ہو گیا اب کیفیت یہ تھی کہ اس گنوار کا جسم تو کافی لحیم شحیم تھا مگر نہ اس میں عقل تھی اور نہ ایکٹنگ کرنے کا ڈھنگ۔ مگر اسٹیج پر کام کرنے کا اسے ایسا شوق چرایا کہ اس نے اپنا لوہار کا کام بھی چھوڑ دیا اور بھاگ کر سینٹ لوئی پہونچا۔ تھوڑے دنوں بعد ہی وہ مجھے وہاں بلاسٹرک کے کنارے پر کھڑا وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ اس کا بایاں ہاتھ کولہے پر رکھا ہوا تھا اور دائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے وہ اپنی ٹھوڑی پکڑے ہوئے تھا۔ وہ اپنا چہرہ ذرا آگے کو جھکائے ہوئے تھا اور تیوری چڑھی ہوئی تھی۔ اپنے سلائم ہیٹ کو آگے کھینچ کر اس سے اپنے ماتھے کو ذرا ڈھک رکھا تھا غالباً اسوقت وہ خود کو اتھیلو یا کوئی دوسرا ہیرو سمجھ رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا کہ اس کو اس الیہ انداز میں کھڑے دیکھ کر لوگ اس سے بہت مرعوب ہونگے۔ میں اس سے ملا اور بات چیت کرکے اسکو اصلی رنگ میں لانیکی کوشش کی مگر اسوا ایسے مجھے

کامیابی نہ ہوئی البتہ دوران گفتگو میں مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ وہ وال نٹ اسٹریٹ تھیٹر کمپنی میں ملازم ہو گیا تھا۔ اگرچہ اس کے بات چیت کرنے کے لہجے میں بے پروائی اور بے توجہی تھی مگر اس بے پروائی میں بھی اس کے چہرے سے خوشی نمایاں ہوتی تھی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اُسی روز رات کو اسکی کمپنی جولیس سیزر کا ڈراما کھیلے گی جسمیں اُسے ایک پارٹ دیا جائے گا۔ اُس نے مجھ سے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ میں ڈرامہ دیکھنے آؤں اور اسکی ایکٹنگ دیکھوں میں نے جواب دیا کہ اگر زندہ رہا تو اسکی ایکٹنگ ضرور دیکھنے آؤں گا۔

اس سے ملکر مجھے سخت تعجب ہوا کہ یہ شخص اتنی جلدی کیسے بدل گیا۔ جس شخص کو ہم ہمیشہ بیوقوف سمجھتے رہے وہ اتنا ہوشیار کیسے بن گیا۔ دراصل شہروں میں ہی آدمی کو اپنا ہنر دکھانے کا موقع ملتا ہے اور وہیں اسکی فہم و فراست جلا پاتی ہے اور اسکی داد دی جاتی ہے۔ اس گنوار کو بھی لو جبتک وہ گاؤں میں رہا اسکا ہنر پوشیدہ رہا مگر شہر میں آتے ہی وہ آشکار ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ شہر میں اسکا اتنا خیر مقدم کیا گیا، اور اسکی اتنی ہمت افزائی ہوئی۔

لیکن رات کو جب میں اس تھیٹر سے واپس آیا تو مجھے بڑی مایوسی ہوئی اور اس شخص پر غصہ بھی بہت آیا کیونکہ تھیٹر میں مجھے وہ کہیں دکھائی نہ دیا اور نہ ایکٹروں کی فہرست ہی میں کہیں اس کا نام تھا۔ دوسرے دن پھر وہ مجھے اُسی سڑک پر ملا اور پیشتر اسکے کہ میں اس سے کچھ دریافت کروں وہ خود ہی مجھ سے پوچھ بیٹھا "کیا آپنے کل رات مجھے تھیٹر میں دیکھا؟"

میں نے جواب دیا "نہیں۔ تم وہاں نہیں تھے"

یہ سُنکر اُسے کچھ تعجب بھی ہوا اور کچھ مایوسی بھی۔ وہ پھر بولا۔

"ارے میں تو وہیں تھا۔ یقیناً میں وہیں تھا۔ میں رومن سپاہی بنا ہوا تھا"

"کیا کہا۔ رومن سپاہی؟ کونسا رومی سپاہی۔؟"

کیا تم نے پیچھے ایک قطار میں کھڑے ہوئے سپاہیوں کو نہیں دیکھا جو کبھی کبھی اسٹیج پر فوجی انداز سے چلتے تھے"

"کیا تمہارا مطلب سپاہ روم سے ہے۔ انھیں چھ حقیر انسانوں سے جو سینڈل اور نائٹ شرٹ پہنے ہوئے تھے، جنکے ہاتھوں میں ٹین کی ڈھالیں اور سر پر ٹین کی ٹوپیاں تھیں اور جو

قدم سے قدم ملائے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے چل رہے تھے، جنکی ٹانگیں لمبی لمبی اور سوکھی اور چہرے مریضوں جیسے زرد تھے اور جن کا لباس بھی انکی شکل و صورت کی طرح ہی ادنیٰ اور نمولی قسم کا تھا۔"

"ہاں، وہی۔ ٹھیک، بالکل، وہی۔ میں انہیں رومن سپاہیوں میں تھا۔ میں آخری سپاہی کے پارٹ کرتا تھا۔ چند مہینے پیشتر مجھے سب سے آخری نمبر پر کھڑا کیا جاتا تھا لیکن بعد کو مجھے ترقی دی گئی۔"

بعد میں لوگوں نے مجھے بتایا کہ وہ بیچارہ لوہار آخری وقت تک رومن سپاہی کا کردار ہی ادا کرتا رہا اور چونتیس سال کی ملازمت میں اسے اور کوئی رول نہ دیا گیا۔ اگر اسے کبھی کچھ بولنے کا پارٹ دیا بھی جاتا تو وہ بڑا مختصر سا ہوتا تھا کیونکہ اس سے زیادہ کی اس سے توقع ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ اس سے اتنا کہلوایا جاتا تھا کہ "حضور، گاڑی حاضر ہے" اور "حضور، اگر اجازت ہو تو" اس میں ایک دو جملے اور جوڑ دیئے جاتے تو اسکی یادداشت جواب دے جاتی اور وہ کچھ نہ کچھ غلطی ضرور کر بیٹھتا پھر بھی یہ بیوقوف شیخی خور تیس سال تک ہیملیٹ کا پارٹ ادا کرنے کا خواب دیکھتا رہا اور اس پارٹ کو یاد کرنے کی ناکام کوشش بھی کرتا رہا۔ زندگی بھر اسے یہی امید رہی کہ کبھی نہ کبھی تو اسے اس عظیم کردار کو اسٹیج پر ادا کرنے کے لئے بلایا جائے گا اور غالباً اسی حسرت کو ساتھ لئے وہ مر بھی گیا کہ اسے ہیملیٹ کا رول ادا کرنے کا موقعہ نہیں ملا۔

یہ نتیجہ تھا اُن دو انگریزوں کے مختصر سے قیام کا جو برسوں پہلے ہمارے گاؤں میں آئے تھے۔ اگر وہ انگریز نہ آتے تو غالباً یہ ایک اچھا خاصا لوہار بن جاتا اور عمدہ قسم کے نعل بناتا لیکن تھیٹر میں تو بیچارہ رومن سپاہیوں کے رول میں بھی ناکام رہا۔

اسکے ایک یا دو دن بعد ہم سینٹ لوئی پہنچ گئے۔ وہاں ایک روز میں فورتھ اسٹریٹ میں گھوم رہا تھا کہ اچانک میری ملاقات ایک کھوسٹ بالوں والے آدمی سے ہو گئی وہ مجھے دیکھ کر چونکا، کھڑا ہو گیا اور پھر کچھ ناک بھوں چڑھا کر اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر بڑی تندی سے کہا "کہیئے جناب کچھ بیچنے کو ملا یا ابھی نہیں۔؟"

پہلے تو میں سمجھا کہ شاید یہ کوئی پاگل ہے لیکن پھر اچانک میں نے اُسے پہچان لیا۔ میں نے بڑی کوشش سے مسکراتے ہوئے اور شرماتے ہوئے بڑے نرم اور محبت آمیز لہجے میں کہا۔
"وہاں مجھے ذرا دیر ہوگئی۔ لیکن اب میں فوراً شراب کی دوکان پہ جا رہا ہوں۔ آیئے ذرا میری مدد کیجئے۔"

پھر وہ بھی ملائم لہجہ میں مجھ سے بات کرنے لگا۔ اس نے مجھ سے کہا "اگر آپ شیمپین لینا چاہیں تو میں آپ کے ساتھ چلوں۔"

پھر اس نے مجھے یہ بتایا کہ اس نے میرا نام اخباروں میں پڑھا تھا اور اُسے میرے یہاں آنے کی خبر مل گئی تھی۔ اسی لئے وہ اپنا سب کام چھوڑ کر مجھ سے ملنے آیا تھا اور ہر قیمت پر وہ مجھے تلاش کر کے ہی دم لیتا۔ اس کے بعد اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ اُسے مجھ سے ایک ضروری سوال بھی پوچھنا تھا اگر میں اسکے سوال کا اطمینان بخش جواب نہ دے سکا تو وہ مجھے مار ڈالے گا۔ مگر شروع شروع میں جو تند مزاجی اس نے مجھے دکھائی وہ محض مصنوعی اور دکھاوٹی تھی۔

اسکی ان باتوں سے مجھے اُس بلوہ و فساد کی یاد آگئی جو سینٹ لوئی میں قریب تیس سال پہلے ہوا تھا۔ اس وقت میں سینٹ لوئی کے ایک بورڈنگ ہاؤس میں تھا جہاں میں قریب ایک ہفتہ رہا تھا۔ یہ شخص میرا پڑوسی تھا جو میرے کمرے سے ملحق ایک دوسرے کمرے میں رہتا تھا۔ اُسی جگہ ہمارے سامنے لوگوں میں لڑائی اور کشت و خون ہوا تھا۔ لہٰذا فوراً ہم لوگ رات ہی میں اسلحہ خانے میں پہونچ گئے تھے جہاں قریب دو سو آدمی جمع تھے جنھیں وہاں بلایا گیا تھا تاکہ وہ اسلحہ خانے سے اسلحہ لیکر ایک فوجی افسر کی زیر کمان بلوائیوں کو مار بھگائیں ہمیں رات کے دس بجے تک ٹریننگ دی گئی۔ اُسی وقت خبر ملی کہ شہر کے زیریں حصے میں بلوائیوں کا زور بہت بڑھ چکا ہے اور وہ لوگ وہاں کی ہر چیز کا صفایا کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اسلئے ہمارا دستہ وہاں پہونچ گیا۔ اس رات گرمی شدید تھی اور میرے پاس جو بندوق تھی وہ بہت وزنی تھی۔ جیسے جیسے ہم لڑائی کے قریب پہنچتے گئے مجھے گرمی اور زیادہ محسوس ہوتی رہی اور میری پیاس کی شدت میں اضافہ ہوتا رہا۔ میں اپنے دوست کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ جب مجھ سے نہ رہا گیا تو میں نے اس سے التجا کی کہ ذرا میری بندوق تھام لے تاکہ میں کہیں جا کر اپنی

پیاس بجھاؤں ۔ اس نے میری درخواست منظور کرلی اور میں وہاں سے گھر چلا آیا۔ بیشک میں نے اس کی حفاظت کی کوئی فکر نہیں کی کیونکہ مجھے یقین تھا کہ اسکے پاس اپنی حفاظت کرنے کے لئے کافی اسلحہ موجود ہیں۔ البتہ اگر مجھے اس بارے میں کوئی شک ہوتا کہ اپنی حفاظت کرنے کیلئے اسکے پاس اسلحہ کی کمی ہے تو میں اسکے لئے کہیں سے ایک اور بندوق لے آتا۔ دوسرے روز علی الصبح ہی میں اس شہر سے چل دیا۔ یہ اچھا ہوا کہ اس بھورے بالوں والے شخص نے (جو وہی دوست تھا) میرے متعلق اخبار میں پڑھ لیا اور اس نے مجھے تلاش کرلیا ورنہ مجھے مرتے دم تک یہ فکر لگی رہتی کہ کہیں وہ بیچارہ اس دنگے فساد میں مارا نہ گیا ہو۔ بیشک مجھے اسکی خیروعافیت تیس سال پہلے ہی معلوم کرنی چاہیئے تھی مگر میرے پاس تو بندوق بھی نہیں رہی تھی جس سے میں اپنی حفاظت کرسکتا اور اس کی خیروعافیت معلوم کرنے جاتا جبکہ اسکے پاس اسقدر اسلحہ ضرور تھا کہ وہ آزادی سے گھوم پھر سکتا۔ لہٰذا وہ مجھے بڑی آسانی سے تلاش کرسکتا تھا۔

سوموار کے روز جب ہم سینٹ لوئی پہونچنے والے تھے تو اخبار "گلوب ڈیموکریٹ" میں دو صفحوں پر مشتمل حسب ذیل اعدادوشمار شائع ہوئے جن میں زیادہ تر وہ اعدادوشمار ہیں جنکا تعلق گرجاگھروں میں اتوار کی حاضری سے ہے :۔

سینٹ لوئی کے گرجا گھر کی دعا میں صبح وشام حاضر ہونے والوں کی تعداد ۸۴،۴۹۱

اتوار کے دن لگنے والے اسکول میں حاضر بچوں کی تعداد ۲۳،۱۰۲

اسطرح شہر کی کل چار لاکھ آبادی میں سے ۱۴۲،۵۵۰ اشخاص نے دین کی عظمت کو سمجھ کر۔ اتوار کے دن دعا میں حصّہ لیا۔

مجھے یہ اعدادوشمار مختصر طریقے پر اسوسیئیٹڈ پریس سے بذریعہ تار موصول ہوئے۔ اور میں نے انھیں احتیاط سے رکھ لیا تھا۔ ان اعدادوشمار سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ جسقدر نیک اور دیندار لوگ سینٹ لوئی میں اسوقت موجود ہیں اتنے میرے زمانے میں نہیں تھے ۔ لیکن جب میں ان اعدادوشمار کا بغور جائزہ لیتا ہوں تو مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں اخبار میں اعدادوشمار بڑھاکر نہ دیئے گئے ہوں کیونکہ اس شہر میں ایک لاکھ پچاس ہزار سے زیادہ رومن کیتھولک مذہب کے ماننے والے نہیں ہوسکتے باقی دو لاکھ پچاس ہزار تو پروٹیسٹنٹ ہیں اور ان دو لاکھ

پچاس ہزار میں سے اس مشتبہ تار کی خبر کے مطابق ۲۶۳۶۲ نے گرجا گھر اور سنڈے اسکول میں حاضری دی جبکہ ایک لاکھ پچاس ہزار رومن کیتھلک لوگوں میں سے ایک لاکھ سولہ ہزار ایکسو اٹھاسی گرجا اور سنڈے اسکول میں حاضر ہوئے۔

باونواں باب

پکّا بدمعاش

اچانک بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا کہ میں نے ابھی تک مسٹر براؤن سے ملاقات نہیں کی۔

یہاں میں اپنے اصل موضوع سے ہٹ رہا ہوں اور ایک دوسری ہی داستان شروع کر رہا ہوں۔ دراصل جس راز کو میں گزشتہ نو برس سے اپنے دل ہی میں مخفی رکھے ہوئے تھا آج میں اُسے ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کیونکہ یہ میرے دل پر ایک بوجھ بنا ہوا ہے۔

نو سال پہلے کسی خاص موقع پر میں نے ایک خواہش کے زیر اثر یہ کہا تھا کہ اگر میں کبھی پھر سینٹ لوئی گیا تو مسٹر براؤن کو جو وہاں کے غلّے کے ایک بڑے بیوپاری ہیں ضرور تلاش کرونگا اور اُن سے معانقہ کرنیکا شرف حاصل کروں گا۔

موقع اور حالات حسب ذیل تھے

ایک دن شام کو میرا ایک دوست جو پادری تھا میرے پاس آیا اور اس نے مجھ سے کہا ”میرے پاس ایک عجیب و غریب خط ہے جسے میں تمہیں پڑھ کر سنانا چاہتا ہوں بشرطیکہ میں اسے پوری طرح پڑھ سکا۔ کیونکہ یہ اتنا غمناک ہے کہ ہر انسان کو رُلا

دیتا ہے۔ مگر اس خط کو پڑھنے سے پہلے میں اسکے متعلق کچھ اور بتلادوں ــــ یہ خط ایک مشہور چور اور بدمعاش نے لکھا ہے جو بہت نیچ خاندان کا تھا اور بڑے کمینے ماحول میں پلا تھا اور جس نے اپنی تمام زندگی جہالت اور گناہوں میں گذاری تھی مگر جیسا کہ تمھیں اس خط سے معلوم ہوگا اس کا باطن نہایت پاک تھا۔ اس نے یہ خط وکیس نامی ایک شخص کو جو چور تھا اور جو چوری ہی کے جرم میں سرکاری جیل میں نو سال قید بامشقت کی سزا بھگت رہا تھا، لکھا۔ ولیس بڑا دلیر قسم کا چور تھا اور کئی سال سے یہ کام کر رہا تھا لیکن بالآخر وہ پکڑا گیا اور اسکو قید کی سزا ملی۔ اسکا مقدمہ اسی شہر کی ایک عدالت میں زیر سماعت تھا جہاں اس نے ایک مکان میں رات کو پستول لیکر نقب لگائی تھی اور پستول دکھا کر مالک مکان سے آٹھ ہزار ڈالر کے سرکاری بانڈ چھین لئے تھے۔

وکیس معمولی شخصیت کا آدمی نہیں تھا۔ اس نے ہارورڈ کالج سے بی۔اے کی ڈگری لی تھی اور وہ نیو انگلینڈ کے ممتاز امراء میں سے تھا۔ اس کا باپ پادری تھا۔ جیل میں پڑے پڑے اسکی صحت گرنے لگی تھی اور اسے ٹی۔ بی ہو جانے کا اندیشہ تھا کچھ تو اس بیماری کے خدشہ سے اور کچھ جیل کی تنہائی کے اثر سے وکیس کا مزاج بدلنے لگا اور وہ بہت متین، سنجیدہ اور متفکر بن گیا۔ نیز اوپچی تعلیم و تربیت جو اس کو ملی تھی اس کا خاصا اثر اسکے دل و دماغ پر ہونے لگا تھا۔ چوری کے پیشے سے توبہ کر کے وہ نیک اور سچا عیسائی بن رہا تھا۔ شہر کی کچھ عورتوں نے اس انقلاب کے بارے میں سنا تو وہ جیل میں اس سے ملنے گئیں۔ انھوں نے اس کی خدا پرستی کی تعریف کی اور اس کی بڑی ہمت افزائی کی تاکہ وہ دینداری کے راستے پر گامزن ہو جائے اور اس کی زندگی میں جو بڑا انقلاب رونما ہوا تھا اُسے قائم رکھے۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں عدالت میں اس کا مقدمہ پیش ہوا اور چونکہ اس کا جرم ثابت ہو چکا تھا اسلئے اُسے نو سال قید کی سزا بھگتنے کیلئے سرکاری جیل میں بھیج دیا گیا۔ یہاں جیل میں اسکی ملاقات اس بدنصیب جیک ہنٹ سے ہوئی جسکا ذکر میں نے اس داستان کے شروع ہی میں کیا ہے اور جو اس خط کا جسے میں سُنانے جا رہا ہوں، مصنف ہے۔ خط کو سننے کے بعد آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ اس ملاقات کا جیک ہنٹ پر کتنا اچھا اثر پڑا۔ جب ہنٹ جیل سے رہا ہوا تو وہ سینٹ

لوئی پہونچا اور وہاں جاکر اس نے ولیمس کو یہ خط لکھا۔ مگر یہ خط صرف جیل کے وارڈن ہی تک پہونچا کیونکہ قیدیوں کو جیل کے باہر کسی سے خط و کتابت کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر کوئی باہر سے انھیں خط بھیجتا تو وارڈن صاحب کے دفتر ہی میں ضائع کر دیا جاتا ہے اور قیدی کو نہیں دیا جاتا۔ چنانچہ اس خط کو بھی وارڈن صاحب کے دفتر ہی میں روک لیا گیا۔ وہاں اسے پڑھا گیا مگر ضائع نہیں کیا گیا کیونکہ انکے دل نے نہیں چاہا کہ ایسے اچھے خط کو پھاڑ پھینکا جائے۔ انھوں نے یہ خط کئی لوگوں کو پڑھ کر سنایا اور بالآخر یہ خط ان مستورات کے ہاتھ لگ گیا جنکا ذکر میں نے ابھی اوپر کیا ہے۔ دوسرے دن مجھے اپنا ایک پرانا دوست جو کہ پادری تھا ملا۔ اس نے وہ خط دیکھا تھا اور وہ اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اسے یاد کرتے ہی ایکبار پھر اس پر رقت طاری ہو گئی اور وہ اس کا ذکر کرتے کرتے رو پڑا اور آگے نہ بول سکا۔ بہرحال اس نے مجھے اس خط کی نقل دینے کا وعدہ کیا اور اس نے یہ وعدہ پورا کیا۔ اور یہ ہے اس خط کی بعینہٖ نقل جس میں اصل خط کی غلطیاں بھی موجود ہیں اس میں عامیانہ زبان کے بہت سے محاورے ہیں مثلاً 'Thieves argot' جنکے معنی حکام جیل نے قوسین کے اندر لکھ دیئے ہیں۔ خط حسب ذیل ہے۔

"سینٹ لوئیس، ۹ر جون ۱۸۷۲ء مسٹر ڈبلو —— کیا میں آپ کو دوست جارلی کہکر مخاطب کر سکتا ہوں مجھے معلوم ہے کہ میرا یہ خط پڑھ کر تمہیں بہت تعجب ہوگا، مگر مجھے یہ امید ہے کہ تم مجھ پر خفا نہیں ہوگے۔ میرا مقصد تمہارا شکریہ ادا کرنا ہے کیونکہ جب میں تمہارے پاس جیل میں تھا تو تم نے جو پند و نصائح مجھے کئے ان سے میں بہت متاثر ہوا۔ بلکہ یوں کہیئے اِن باتوں نے میری کایا ہی پلٹ دی اور مجھے ایک نیک و شریف انسان بنا دیا۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت تو تم نے یہی سمجھا ہوگا کہ میں نے تمہاری نصیحتوں پر ذرا بھی دھیان نہیں دیا اور اس میں شک نہیں کہ میں نے تمھاری باتوں پر کوئی توجہ نہیں کی لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ تم نے کئی انسانوں میں انقلاب پیدا کر کے انھیں نیک اور شریف بنا دیا مگر اس کے عوض میں، تم نے کسی سے کوئی مدد نہ چاہی اور نہ کبھی بدلے کی توقع کی اور یہ بات ہم سب لوگ جانتے تھے۔

ہر رات سونے سے قبل میں آپ کی باتوں پر غور کیا کرتا اور جیل سے رہائی پانے سے پانچ ماہ پیشتر ہی میں نے گناہوں سے بچنے کی قسم کھانا شروع کر دی تھی کیونکہ میں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ کسی اچھی بات کے محض جان لینے سے کام نہیں چلتا بلکہ اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ جس دن میری جیل کی میعاد پوری ہوئی اور میں رہا کیا جا رہا تھا اس دن تم نے مجھے مزید نصیحت کی تھی کہ کم از کم میں تین مہینے تک چوری کرنے سے باز رہوں اور ایمانداری کی زندگی بسر کروں۔ واقعی اس سے بڑھکر میرے لئے زندگی میں اور کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا۔ رہائی کے بعد سرکار کی طرف سے سینٹ لوئی تک جانے کے لئے مجھے ایک ٹکٹ دیا گیا۔ گاڑی میں سفر کرتے ہوئے میں آپ کی نصیحتوں ہی پر غور کر رہا تھا مگر اسوقت تک میں کوئی مصمم ارادہ نہیں کر پایا تھا کہ ان پر عمل کروں یا نہیں۔ جب میں گاڑی میں شکاگو سے یہاں آ رہا تھا تو راستے میں میں نے ایک بوڑھی عورت کا بٹوا پار کر دیا لیکن فوراً ہی میرے ضمیر نے مجھ پر ملامت کرنی شروع کر دی اور میں نے یہ خواہش ظاہر کی کاش میں وہ بٹوا نہ چرا تا کیونکہ چرانے سے ذرا دیر پہلے ہی میں نے تمھاری نصیحت کے مطابق تین مہینے ایمانداری سے زندگی گذارنے کی قسم کھائی تھی لیکن بٹوا دیکھ کر میرے منہ میں پانی بھر آیا اور میں اپنا عہد بھول گیا۔ بٹوے کا پار کرنا بڑا آسان تھا لہٰذا میں نے یہ کام فوراً کر ڈالا لیکن رہا میں اس بڑھیا کے قریب ہی اور جب وہ راستے میں گاڑی سے اتری تو میں نے اس سے پوچھا "محترمہ آپ کی کوئی چیز تو گم نہیں ہوئی۔؟" اس نے اپنا سامان دیکھ کر بتایا کہ اس کا بٹوا غائب ہو گیا ہے چنانچہ بٹوا پیش کر کے میں نے اس سے پوچھا "یہ تو نہیں ہے۔؟" اور یہ کہتے ہوئے میں نے بٹوا اس کو لوٹا دیا۔ وہ کہنے لگی "اگر آپ ایماندار نہ ہوتے تو۔۔۔۔۔" مگر چونکہ میں دل میں شرمندہ تھا اور اس قسم کی کوئی بات نہیں سننا چاہتا تھا اسلئے میں جلدی ہی وہاں سے چلدیا۔ جب میں سینٹ لوئی پہونچا تو میرے پاس ایک ڈالر اور پچیس سینٹ رہ گئے تھے۔ وہاں۔۔۔ تین دن تک مجھے کوئی مزدوری نہیں مل سکی کیونکہ گھاٹ پر کام کرنے والے قلیوں کی سی جسمانی طاقت تو مجھ میں تھی نہیں جس سے گھاٹ پہ مزدوری کر کے ہی پیٹ بھر لیتا۔ تیسرے دن سہ پہر کے وقت میں نے بچے ہوئے آخری دس سینٹ کے دو بڑے بڑے بسکٹ لیکر کھائے۔ سوقت میری نیت پھر کچھ خراب ہو رہی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ پھر کہیں جا کر کسی کی جیب کاٹوں۔

اسوقت مجھے آپکے نصائح یاد آئے۔ آپ نے ایکمرتبہ مجھے بتایا تھا کہ کسی بیکس نے حضرت عیسیٰ مسیح کو پکارا تو انھوں نے فوراً اُسکی مدد کی۔ چنانچہ میں نے بھی ارادہ کیا کہ کم ازکم ایکمرتبہ میں بھی ایسا کر کے دیکھوں، لیکن جیسے ہی میں نے بولنے کی کوشش کی میری زبان گنگ ہو گئی اور بڑی مشکل سے میں یہی کہہ سکا "اے عیسیٰ مسیح! ایک غریب و بیکس انسان کو اتنی توفیق دیدیجئے کہ وہ تین مہینے تک ایمانداری کی زندگی گذار سکے۔ کاش میری یہ دعا قبول ہو جائے" یہ کہہ کر اسی غور و فکر میں کہ دیکھوں کیا ہوتا ہے میں آگے بڑھا۔ قریب ایک گھنٹہ بعد فورتھ اسٹریٹ میں جو واقعہ ہوا اُسی کی بدولت میں آج اس جگہ اور اس مرتبہ کو پہنچا ہوں۔ اس سے پیشتر کہ میں یہ خط ختم کروں میں آپکو وہ واقعہ سنانا چاہتا ہوں۔

"جب میں سڑک پر چلا جا رہا تھا تو میں نے ایک جگہ بڑا شور و غل سُنا اور یہ دیکھا کہ ایک بدمست گھوڑا ایک گاڑی کو جس میں دو بچے بیٹھے تھے کھینچتے ہوئے بے تحاشا بھاگا جا رہا ہے۔ میں سڑک پر پڑے ہوئے ایک صندوق کے ڈھکن کو اٹھا کر دوڑا اور سڑک کے بیچ میں آگیا اور جیسے ہی گھوڑا میرے سامنے آیا میں نے ڈھکن کو بڑے زور سے اس کے سر میں دے مارا۔ وہ ڈھکن تو ضرور ٹوٹ گیا مگر گھوڑا ٹھٹک گیا۔ تبھی میں نے اس کی لگام پکڑلی اور اسکے سر کو نیچے کی طرف زور سے کھینچا جس سے گھوڑا بالکل رک گیا۔ اسی اثنا میں گھوڑے کا مالک بھی وہاں آپہونچا اور جب اس نے دیکھا کہ گاڑی کے اندر بچے بخیریت موجود ہیں تو وہ میرا بہت شکر گذار ہوا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور مجھے پچاس ڈالر کے ہرے ہرے نوٹ دیئے۔ اُسی وقت مجھے یاد آیا کہ حضرت مسیح نے میری دُعا قبول کرلی اور یہ رقم میری مدد کے لئے بھیج دی تاکہ میں کم ازکم تین ماہ ایمانداری سے اپنی گذر اوقات کر سکوں۔ میں حیرت زدہ کھڑا تھا اور گھوڑے کی لگام ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ نہ تو میرے ہاتھ سے لگام چھوٹ رہی تھی اور نہ میری زبان ہی کھل رہی تھی کہ کچھ کہوں۔ گھوڑے کے مالک نے سمجھ لیا کہ ضرور کوئی خاص بات ہے۔ اس نے میرے پاس آکر پوچھا "عزیز لڑکے! تمھارے کہیں چوٹ تو نہیں لگی۔ تبھی مجھے خیال آیا کہ میں اُس شخص سے کہوں کہ وہ مجھے کوئی مستقل ملازمت دلوا دے۔ لہٰذا میں نے اس سے کہا "آپ یہ رقم واپس لے لیجئے اور مجھے کوئی ملازمت دلوا دیجئے" وہ بولا "آیئے گاڑی میں بیٹھ جایئے اور ہم آپ کی

ملازمت کے بارے میں بات چیت کرینگے ۔ فی الحال آپ یہ رقم بھی رکھیں " پھر اُس نے مجھ سے پوچھا " کیا آپ گھوڑوں کی دیکھ بھال کا کام بھی کر سکتے ہیں " میں نے جواب دیا " میں ضرور کرلونگا۔ کیونکہ میں اکثر اصطبلوں میں جایا کرتا تھا اور گھوڑوں کی صفائی اور انھیں تربیت دینے کا کام کیا کرتا تھا " اس پر اس نے کہا " مجھے ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی " چنانچہ اس نے مجھے سولہ ڈالر ماہانہ اور خوراک پر ملازم رکھنے کی پیشکش کی اور جیسا کہ تم سمجھتے ہو گے میں نے اُسے منظور کرلیا۔ اُسی رات اصطبل کے چھوٹے کمرے میں بیٹھا میں اپنی گذشتہ گناہ آلودہ زندگی کے بارے میں کافی دیر تک سوچتا رہا۔ مجھے رہ رہ کے یہی خیال آرہا تھا کہ حضرت عیسیٰ کی دہائی دیتے ہی میری زندگی میں کیتنا بڑا انقلاب آگیا چنانچہ اسی وقت دوزانو ہو کر میں نے حضرت مسیح کا شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے ہی آڑے وقت میں میری مدد کی اور مجھے یہ ملازمت دلوا کر مجھے ایمانداری سے زندگی گذارنے کے قابل بنادیا۔ ساتھ ہی میں تمہارا شکریہ ادا کرتا ہوں کیونکہ تمھیں نے مجھ میں یہ جذبہ پیدا کیا کہ میں نیک بنوں ۔ دوسرے روز میں نے پھر دوزانو ہو کر حضرت مسیح کا شکریہ ادا کیا اور ان سے مزید مدد مانگی اور فوراً ہی انکے فیض و کرم سے مجھے مدد بہم پہنچی ۔ میرے آقا نے مجھے کچھ نئے کپڑے اور ایک بائبل کا نسخہ عطا کیا کیونکہ اس واقعہ کے بعد میں نے یہ عہد کرلیا تھا کہ میں ہر روز صبح کو اور شام کو سونے سے قبل بائبل پڑھا کروں گا اور حضرت مسیح کے حضور میں عرض کروں گا کہ وہ مجھے گناہوں سے محفوظ رکھیں ۔ جب میں ایک ہفتہ اپنے آقا یعنی براؤن صاحب کی ملازمت کر چکا تو ایک دن رات کو وہ میرے کمرے میں آئے اور انھوں مجھے بائبل پڑھتے دیکھا۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں عیسائی ہوں۔ جب میں نے یہ کہا کہ میں عیسائی تو نہیں ہوں تو انھوں نے مجھ سے سوال کیا " تم اخباروں اور دوسری کتابوں کے بجائے بائبل کیوں پڑھا کرتے ہو " تب میں نے انھیں سب قصّہ سنایا کس طرح میں جیل میں رہا تھا اور کس طرح میری تم سے ملاقات ہوئی، کسطرح میں ملازمت کی تلاش میں بھٹک رہا تھا اور کس طرح حضرت عیسیٰ نے میری پکار سنکر مجھے یہ ملازمت مہیا کی تھی۔ لہٰذا حضرت مسیح کا شکریہ ادا کرنے کا اس سے بہتر طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ میں انجیل پڑھوں، انکے نصائح پر عمل کروں اور ایمانداری کی زندگی بسر کروں۔ پھر میں نے براؤن صاحب سے التجا کی کہ وہ مجھے اپنی ملازمت میں کم از کم

تین مہینے رہنے دیں۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے اور دیر تک باپ کی سی شفقت کیساتھ میرے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ انھوں نے مجھ سے یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ مجھے اس ملازمت سے نہیں نکالیں گے۔ اسوقت مجھے جتنا سکون اور اطمینان نصیب ہوا اتنا پیشتر کبھی نہیں ہوا۔ اگر میں حقیقت کو چھپا کر مسٹر براؤن کے یہاں یہی ملازمت کرتا تو غالباً اُن پر میری صدق دلی کا اتنا اچھا اثر نہ پڑتا جتنا کہ اسطرح ہوا۔ اب مجھے اس بات کی مطلق فکر نہیں ہے کہ کوئی میرے اعمالِ گذشتہ کا پردہ فاش کردے گا اور مجھے ملازمت سے برطرف کرا دے گا۔ دوسرے روز صبح میرے آقا نے مجھے اپنے گھر بلایا اور ایک نصیحت آموز تقریر کی اور ہدایت کی کہ میں روزانہ تھوڑا بہت پڑھا کروں۔ انھوں نے روزانہ رات کو گھنٹے دو گھنٹے مجھے پڑھانے کی پیشکش کی اور ایک کتاب حساب کی، ایک ہجے سکھانے والی، ایک جغرافیہ کی نیز ایک نوٹ بک مجھے دی۔ اب ہر روز رات کو وہ مجھ سے کچھ نہ کچھ سنتے ہیں۔ ہر روز صبح کی دعا کے لئے وہ مجھے اپنے گھر بلا لیتے ہیں۔ علاوہ ازیں انھوں نے میرا نام سنڈے اسکول کی ایک بائبل کلاس میں بھی لکھوا دیا ہے جس سے مجھے بہت فائدہ ہوا کیونکہ اس سے مجھے بائبل سمجھنے میں بہت مدد ملی ہے۔

پیارے چارلی، ایمانداری سے زندگی بسر کرتے ہوئے میرے وہ تین مہینے ختم ہوئے اور تب سے دو مہینے اور بھی گذر گئے ہیں۔ چونکہ تم نے مجھے بتایا تھا کہ میرے لئے زندگی میں سب سے اچھا کام یہی ہوگا کہ کم از کم تین ماہ میں نیک زندگی گذاروں لہٰذا تین مہینے کی نیک زندگی گذارنے کا اب یہ دوسرا دور بھی میں نے شروع کر دیا ہے۔ یہ خداوند کریم کے ہاتھ میں ہے کہ اس طرح وہ مجھے ہمیشہ توفیق عطا کرتا رہے اور میں نیک زندگی گذارتا رہوں۔ پیارے چارلی میں تمہیں یہ خط محض یہ بتانے کیلئے لکھ رہا ہوں کہ میرا الیقین واثق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری دعا قبول کر کے میرے گناہوں کو معاف کر دیا ہے کیونکہ تم نے مجھ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ تم میرے لئے خدا سے دعا کرو گے اب مجھے انجیل پڑھنے میں بڑا مزہ آتا ہے اور میں صدق دلی سے خدا کے حضور میں اپنی تمام مشکلات پیش کر دیا کرتا ہوں اسی لئے وہ میری مدد کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اسکی مدد نہ ہوتی تو شاید میں پھر چوری کرنے لگتا کیونکہ میرے سامنے چوری کرنے کے

سینکڑوں موقع آئے مگر مجھے اس فعل کی ویسی خواہش کبھی نہ ہوئی جیسی پہلے ہوا کرتی تھی۔
اب تو بجائے کھیلنے کے مجھے گرجا گھر جانے میں زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات پہلے نہیں
تھی۔ پادری لوگ مجھ سے اکثر گفتگو کرتے ہیں اور ایک مہینے قبل تو انھوں نے مجھ سے
پادری بننے اور گرجا گھر میں وعظ دینے کو بھی کہا تھا۔ مگر میں نے کہا کہ ابھی میں اسکے قابل نہیں
ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ میرے خیالات اور جذبات ابھی خام ہوں اور مجھے دھوکہ دیجائیں
اسلئے میں ابھی کچھ عرصہ اور اسی طرح کی زندگی گذارنا چاہتا ہوں۔ لیکن اب میں یہ محسوس
کرنے لگا ہوں کہ خدائے تعالیٰ نے مجھے خدمت کے لئے طلب کیا ہے کہ میں لوگوں کو مذہب
کی تلقین کروں لہٰذا اگلی جولائی کے پہلے ہی اتوار کو میں گرجا گھر جا کر پادری بن جاؤں گا۔
پیارے دوست، کاش میں اپنے احساسات کی مکمل ترجمانی اس خط میں کرسکتا مگر ہنوز میں
ایسا کرنے سے قاصر ہوں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ لکھنا
پڑھنا تو میں نے جیل ہی میں شروع کیا تھا اور وہ بھی تمہارے سامنے اس لئے لکھنے میں
میری ابھی اتنی مشق کہاں ہے کہ میں اسی طرح لکھ سکوں جس طرح بات کرتا ہوں۔ مجھے اندیشہ
ہے کہ جو الفاظ میں نے اس خط میں استعمال کئے ہیں ان میں سے بہت سے غلط ہوں گے۔
انکے ہجے بھی صحیح نہیں ہوں گے۔ علاوہ اس کے خط میں اور بھی بہت سی غلطیاں رہ گئی ہونگی
لیکن مجھے امید ہے کہ ان سب کے لئے تم مجھے معاف کردو گے تمہیں میرے بچپن کا سب حال معلوم
ہی ہے کہ میری پرورش ایک ادنیٰ گھرانے میں ہوئی۔ ذرا بڑا ہونے پر میں گھر سے بھاگ آیا۔
مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ میرا باپ کون تھا اور ماں کون۔ نہ ہی مجھے اپنا اصلی نام معلوم ہے۔
اسلئے مجھے امید ہے کہ تم مجھ پر خفا نہیں ہوگے۔ ہاں یہ تو میرا حق ہے کہ میں کوئی سا بھی نام اپنے
لئے منتخب کرلوں۔ لہٰذا میں نے تمہارا ہی نام اپنا لیا ہے کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ جیل سے
رہا ہونے کے بعد شاید تم اپنا یہ نام استعمال نہیں کروگے علاوہ اسکے دنیا میں تمھیں ایک
ایسے شخص ہو جس سے مجھے سب سے زیادہ لگاؤ ہے اور تمھارا ہی خیال مجھے ہر دم رہتا ہے اسلئے
امید ہے کہ تم مجھ سے اس بات پر بھی ناراض نہ ہوگے۔ میں یہاں اچھی طرح ہوں۔ اُن
پچاس ڈالروں سے پچیس میرے پاس بینک میں محفوظ ہیں اسکے علاوہ ہر ماہ دس ڈالر

میں بینک میں اور جمع کرتا ہوں۔ یہ کُل رقم تمہارے لئے ہے اگر اس میں سے تھوڑی یا کُل رقم
تمہیں ابھی ضرورت ہو تو لکھو میں تمہیں فوراً بھیج دوں گا۔ میری خواہش ہے کہ تھوڑا بہت
تو مجھے ابھی بھیجنے کی اجازت دیدو اس خط کے ہمراہ میں تمہیں ایک رسید بھی بھیج رہا ہوں
جسکے ذریعہ تم سال بھر تک "ٹلس یونگ ایج" رسالہ منگا سکتے ہو۔ میں کہہ نہیں سکتا کہ تمہیں
یہ رسالہ پسند آئے گا یا نہیں۔ جب میں نے مسٹر براؤن سے اس بارے میں ذکر کیا تو انھوں
نے فرمایا تمہیں یہ رسالہ ضرور پسند آئے گا۔ میری مزید خواہش ہے کہ میں تمہارے قریب ہوتا
تاکہ میں تمہیں ہر چھٹی کے دن کچھ پھل اور مٹھائیاں بھیج سکتا۔ دور ہونے کی وجہ سے یہاں سے
بھیجنا تو مشکل ہے کیونکہ اس موسم میں وہاں تک پہنچتے پہنچتے یہ چیزیں خراب ہو جائیں گی
لیکن بطور شکرانے کے کم از کم ایک صندوق ضرور بھیجوں گا جسمیں کچھ کھانے کا سامان ہوگا۔
اگلے ہفتے مسٹر براؤن مجھے اپنے اسٹور ہاؤس میں نائب دربان کے کام پر بدلانا چاہتے ہیں
اور جیسے ہی میں تھوڑا کام سیکھ جاؤں گا وہ میری ترقی کر دیں گے۔ وہ ایک غلّے کے
گودام کے مالک ہیں اور تھوک فروش ہیں۔ ہاں۔ میں نے اپنے مشن اسکول، سنڈے اسکول
کلاس اور سہ پہر کے سنڈے کلاس کے بارے میں تو ابھی تمہیں کچھ بتایا ہی نہیں۔ میں دو اتواروں
کو بعد دوپہر باہر دیہاتوں میں گیا اور وہاں سات بچوں کو منتخب کر کے میں نے انھیں پڑھانا
شروع کیا۔ ان میں سے دو بچے تو میرے برابر ہی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ اسلئے میں نے
انھیں اونچے درجوں میں داخل کرا دیا تاکہ وہ آگے کی تعلیم حاصل کریں باقی بچوں کو میں
خود پڑھاتا ہوں۔ اگرچہ مجھے خود زیادہ لکھنا پڑھنا نہیں آتا مگر چونکہ یہ بچے تو بالکل
نہیں جانتے اسلئے انھیں میں اچھی طرح پڑھا لیتا ہوں اور یہ جاننے کے لئے کہ انھوں نے
کیسی ترقی کی ہے میں ہر اتوار کو اسکول کے وقت سے نصف گھنٹہ پیشتر جا کر ان سے
ملتا ہوں اور پوچھتا ہوں کہ انھوں نے اپنا سبق یاد کیا ہے یا نہیں۔ میں چار لڑکیوں
کو بھی پڑھاتا ہوں۔ براہ کرم میک اور ہیری صاحبان کو بھی میرے بارے میں بتا دیجئے
گا۔ اگر جہاز سے رہا ہونے کے بعد وہ سب سے یہاں میرے پاس چلے آئیں تو میں انھیں

فوراً ملازمت دلوا سکتا ہوں۔ اُمید ہے کہ اس طویل خط کے لئے اور اُن تمام غلطیوں کے لئے جو اس میں جا بجا تمھیں ملیں گی، تم مجھے معاف کر دو گے۔ میری خواہش ہے کہ میں خود تم سے ملکر بات چیت کروں کیونکہ میں جتنی اچھی طرح بول سکتا ہوں اتنی اچھی طرح لکھ نہیں سکتا امید ہے کہ اس سہانے گرم موسم میں آپکی صحت اچھی ہو گی کیونکہ یہ موسم پھیپھڑوں کیلئے صحت بخش ہوتا ہے۔ جب تم خون تھوکنے لگے تھے تو مجھے اندیشہ تھا کہ تم جانبر نہ ہو سکو گے۔ سب ساتھیوں سے میرا سلام کہنا اور انھیں بھی میرا حال بتا دینا۔ میں بہت خوش و خرم ہوں۔ ہر شخص مجھ پر مہربان ہے اور یہ احد درجہ خیال رکھتا ہے۔ غالباً مسٹر براؤن بھی کبھی تمہیں خط لکھیں۔ مجھے امید ہے کہ تم بھی کبھی نہ کبھی مجھے ضرور خط لکھو گے۔

تمہارا سچا دوست
سی۔ ڈبلو
(جس کو تم جیک ہنٹ کے نام سے جانتے ہو)

(میں تمہیں مسٹر براؤن کا پتہ ارسال کر رہا ہوں۔ جواب اسی پتہ پر دینا)

خط کی عبارت اتنی فصیح اور پُرخلوص تھی کہ بے ساختہ منہ سے واہ واہ نکلتی تھی اس کو مؤثر بنانے کیلئے تشبیہات یا استعارے استعمال نہیں کئے گئے تھے پھر بھی اتنی موثر تحریر میں نے پیشتر کبھی نہیں دیکھی۔ مجھ پر اس کا بڑا اثر ہوا اور جس پڑھنے والے نے میرے سامنے اسے پڑھا وہ خود اسکے جذبات سے اِتنا متاثر ہوا کہ اسکو مکمل پڑھ ہی نہ سکا۔ پڑھتے پڑھتے بیچ ہی میں رک گیا، رقت طاری ہو گئی، زبان لڑکھڑانے لگی اور بولنا مشکل ہو گیا، حالانکہ مجھے سنانے سے پہلے وہ اس خط کو کئی بار پڑھ چکا تھا پھر بھی وہ مکمل طور پر اپنے جذبات پر قابو پا کر اسکو نہیں پڑھ سکا۔ آئندہ وہ اس خط کو گرجا گھر کی بیار رکھنا تھا میں حاضرین جلسہ کو سنانے کی تیاری کر رہا تھا اور اسی لئے وہ مجھے سنا رہا تھا اور یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اپنے جذبات پر قابو پا کر روانی کے ساتھ اس خط

کو پڑھ بھی سکے گا یا نہیں لیکن اُسے کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہو رہی تھی پھر بھی وہ اُسے برابر تھنا سبھا میں پڑھنے کا مصمم ارادہ کئے ہوئے تھا خواہ اُسے کامیابی ہو یا نہ ہو۔ بالآخر اس نے اس خط کو گرجا گھر میں پڑھ کر سنایا اور خاصی اچھی طرح پڑھتا چلا گیا۔ سامعین پر شروع ہی میں رقت طاری ہو گئی جو آخر تک قائم رہی۔

اس خط کی شہرت سارے شہر میں پھیل گئی۔ ایک پادری صاحب مجھ سے اس خط کو مانگ کر لے گئے۔ انھوں نے اس خط کو اپنے وعظ میں شامل کر لیا اور ایک اتوار کو قریب بارہ سو آدمیوں کے مجمع میں اسے پڑھ کر سنایا جسکا اثر یہ ہوا کہ سامعین آبدیدہ ہو گئے اور خوب روئے۔ بعد میں میرے دوست نے بھی اُسی خط کو اپنے وعظ میں ایک اتوار کو مجمع کے روبرو پڑھا۔ یہاں بھی سامعین پر وہی کیفیت طاری ہو گئی تمام حاضرینِ جلسہ ایکساتھ رو پڑے اور دیر تک روتے رہے۔

بعد ازاں میرا دوست گرمیوں کی چھٹی میں جب شمال کی برطانوی نوآبادی میں مچھلی کا شکار کھیلنے گیا تو اس خط کو بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ اس نے سوچا کہ اگر اسے وہاں وعظ دینا پڑا تو اس خط کی عبارت اسکے بہت کام آئے گی' اور ہوا بھی یہی ایکدن اس سے وہاں وعظ کیلئے کہا گیا۔ وہ چھوٹا سا گرجا سامعین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ اس مجمع میں آنجہانی ڈاکٹر جے۔ جی ہولینڈ اور نیویارک ٹائمز کے ایڈیٹر مسٹر سیمر بھی شامل تھے۔ علاوہ ان کے مسٹر بیچ جو بہت اعتدال پسند خلیق اور بنی نوع انسان کے بڑے ہمدرد تھے' وہاں موجود تھے۔ نیز میرے خیال سے وہاں شہر برلن کے سینیٹر فرائی بھی تھے۔

اس حیرت انگیز خط نے یہاں بھی وہی کام کیا۔ تمام سامعین بڑے متاثر ہوئے لوگوں کا دل بھر آیا اور وہ رونے لگے۔ ڈاکٹر ہالینڈ کے رخساروں پر آنسوؤں کی دھاریں مسلسل بہ رہی تھیں اور یہی حال دوسروں کا بھی تھا۔ مسٹر بیچ پر تو اس

خط کا ایسا جادو ہوا اور ان کا دل اتنا بھر آیا کہ انھوں نے وہیں عہد کیا کہ وہ اس جیل کی زیارت کرنے ضرور جائیں گے جہاں ایک ایسا ایک خدا پرست عیسائی موجود ہے جس نے ایک مجرم و گنہگار کو ایسی نصیحت کی کہ وہ سچا دیندار بن کر ایسے دلآویز خطوط لکھنے لگا۔

آہ! اے سادہ لوح مسٹر ہیج اور مسٹر ہالینڈ۔ مجھے ایسے لوگوں کی سادہ لوحی اور ضعیف الاعتقادی پر بڑا ترس آتا ہے۔ اگر کہیں یہ لوگ جیریکو کی جیل میں اس شخص (رولیمس) سے ملنے پہونچ جاتے تو اس خط کی شہرت ساری دنیا میں پھیل جاتی اور اس کا اثر نہ معلوم اور کتنے انسانوں پر پڑتا۔ غالباً ایک ہزار سال تک دنیا کی مختلف نسلیں اس قصے سے دھوکہ کھاتی رہتیں اور کسی کو یہ شبہ تک نہ ہوتا کہ یہ خط محض ایک دھوکہ اور سفید جھوٹ ہے جسے بڑی مکاری چالاکی اور دلیری سے گھڑا گیا ہے۔ غالباً اس سے پیشتر دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لئے ایسا زبردست فریب کبھی نہیں کیا گیا ہوگا۔

دراصل وہ خط مکمل فریب تھا اور یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فریب لاثانی تھا کسی قسم کے شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی گئی تھی اور واقعی یہ بڑا ہی گمراہ کن اور خطرناک تھا۔

ناظرین کو تو یہ راز یہیں افشاں کر دیا گیا لیکن ہمیں اس فریب کا پتہ ہفتوں کے بعد بڑی جانفشانی سے سراغ لگانے پر ملا اور وہ بھی اسوقت جب ہم کافی دور جا چکے تھے۔ میرا دوست جب اپنے شکار کے دورے سے واپس آیا تو اس نے نیز دوسرے پادریوں اور واعظوں نے اپنے وعظوں میں اس خط کا ذکر کرنا پھر شروع کر دیا اور ہمیشہ کی طرح سامعین اور واعظ زار زار رونے لگتے۔ یعنی واعظ خود بھی روتا اور سامعین کو بھی رلاتا۔ میں نے اپنے دوست سے بڑی منت وسماجت کی کہ وہ مجھے اس خط کو کسی رسالہ میں

شائع کرنیکی اجازت دیدے تاکہ اس نصیحت آموز کہانی کو زیادہ سے
زیادہ لوگ پڑھ سکیں اور اپنی اصلاح کرسکیں۔ میرے علاوہ اور لوگوں
نے اس خط کی نقلیں بھی لے لیں تاکہ ہاتھ سے لکھ لکھ کر وہ دوسری نقلیں
اور لوگوں کو فراہم کرسکیں اور اسکی انھیں اجازت بھی مل گئی مگر خط کو شائع
کرانے کی اجازت کسی کو نہ ملی لیکن اسکی دستی نقلیں سینٹ ڈومنج جزائر میز دوسرے
دُور دراز کے علاقوں میں بھیج گئیں۔

ایکدن ایک گرجا گھر میں جہاں چارلس ڈوڈلے [illegible] بھی موجود تھے اُس
پُر اسرار خط کو پڑھا گیا۔ نتیجتاً سامعین نے رونا شروع کردیا۔ خط ختم
ہونے پر دروازے کے پاس چارلس ڈوڈلے نے پادری سے ایک ایسا سوال
کیا جسکو سنکر وہ بڑا اداس سا ہوگیا اور اس کا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔
سوال یہ تھا۔

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ خط اتنا پرانا ہے اور سچا ہے۔ جو اس قسم
کا شبہ پہلی مرتبہ کیا گیا تھا مگر اسکا اثر بڑا خطرناک ہوا۔ اس سے لوگوں کے
دلوں کو بڑی ہی صدمہ پہونچی جب کسی کے آرزو پر چوٹ لگتی [illegible]
پہنچتا ہے۔ کچھ لوگ ابھی [illegible] صاحب آپ کو یہ شبہ [illegible]
کہ یہ خط جعلی ہے۔؟"

انھوں نے جواب دیا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم مگر [illegible]
[illegible] شائع [illegible] گیا ہے کہ ایک [illegible]
[illegible] انسان [illegible]
[illegible] میرا خیال [illegible]
[illegible]
[illegible] نظر [illegible]
[illegible] دلی خوبی نظر آتی ہے۔

یہ سنتے ہی وہ پادری وہاں سے چلا گیا مگر شک وشبہ اسکے دل میں گھر کرچکا تھا۔ لہذا فوراً ہی اس نے شہر کے پادری کو جہاں ولیمس جیل میں سزا بھگت رہا تھا اور جہاں اُس نے عیسائی مذہب کو قبول کرلیا تھا' ایک خط لکھا کہ وہ اس خط کی تصدیق کرے اور اس سے یہ رائے بھی لی گئی کہ اگر کوئی اس خط کو مع حالوں کے شائع کرادے تو کوئی ہرج تو نہیں ہے اور اسکے لئے کسی سے اجازت لینے کی ضرورت تو نہیں پڑے گی۔ وہاں سے جو جواب آیا وہ یہ ہے۔

بخدمت جناب محترم پادری صاحب

"عزیز دوست۔ اس مجرم کے خط کی کہانی ایک حقیقت ہے۔ اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں وہ شخص جسے خط لکھا گیا ہے ولیمس ہے جو ہمارے یہاں جیل میں موجود ہے بتایا جاتا ہے کہ اس نے عیسائی مذہب کو قبول کرلیا ہے۔ بڑے پادری صاحب کو بھی یقین ہوگیا ہے کہ مجرم میں جو تبدیلی ہوئی ہے وہ حقیقی ہے الغرض اس معاملے کی صداقت میں کسی سے کم یقین نہیں ہے۔

وہ خط ہمارے مشن کی کسی خاتون کے پاس بھیجا گیا تھا یہ خاتون کسی سنڈے اسکول میں پڑھاتی تھیں۔ اُسے یہ خط یا تو خود ولیمس نے بھیجا ہوگا یا جیل کے پادری نے۔ اس خط کی اسقدر شہرت سے وہ خاتون پریشان ہیں کیونکہ اس سے ولیمس کو صدمہ پہنچا۔ ہوسکتا ہے کہ ولیمس اسے مشتہر نہ کرنا چاہتا ہو اور اس خاتون نے اسکے منع کرنے پر بھی اُسے مشتہر کیا ہو۔ رہا اسکے شائع کرانیکا سوال۔ تو میں تو اسکی اجازت نہیں دے سکتا۔ البتہ اگر اس خط میں دئے ہوئے نام اور مقام آپ بدل دیں اور اس کو ملک سے باہر کہیں شائع کرائیں تو یہ کام بیشک آپ ہی ذمہ داری پر کرسکتے ہیں۔

یہ ایک عجیب وغریب خط ہے۔ غیر عیسائی تو کیا کسی نہایت ذہین اور روشن دماغ عیسائی نے بھی ایسا حیرت انگیز خط کبھی نہ لکھا ہوگا۔ اس خط میں یہ دکھایا گیا ہے کہ دعا اور مناجات سے قلبِ انسانی کسقدر بدل جاتا ہے اور ایک گنہگار

اور ایمان سے گرے ہوئے انسان کے دل پر اللہ کا فضل و کرم کیا جادو کر سکتا ہے اس واقعے سے اللہ کے فضل و کرم کی کرامت ثابت ہوتی ہے۔ یہ لاادریت کے لئے یہ ایک کھلا چیلنج ہے۔ اگر اب بھی ہم یہ سمجھیں کہ ہم برائیوں پر قابو نہیں پا سکتے تو یہ ہماری سخت نادانی ہوگی۔
کسی شخص نے یہ بھی بتایا ہے کہ سینٹ لوئی کے مسٹر براؤن جو بڑے خدا پرست ہیں ہرٹ فورڈ کے رہنے والے تھے کیا ہرٹ فورڈ سے آنے والے سب لوگ اپنے اصلی آقا خدائے تعالیٰ کی اسی طرح خدمت کرتے ہیں۔
(خط ختم کرنیکے بعد) مسٹر ولیس اب بھی سرکاری جیل میں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کو نو سال کی لمبی قید ہوتی ہے اور وہ برابر بیمار چلے آرہے ہیں۔ انھیں تپِ دق کی بیماری کا خدشہ ہے لیکن میں پچھلے دنوں انکی صحت کے بارے میں کوئی خبر حاصل نہ کر سکا۔ جس خاتون کا میں نے ابھی ذکر کیا ہے وہ ان سے خط و کتابت کرتی رہتی ہے اور میرا خیال ہے وہ انکی صحت کی دیکھ بھال بھی ضرور کرتی ہوگی۔"

یہ خط لکھے جانے کے کئی دن بعد مکتوب الیہ کے پاس پہونچا۔ اس سے مسٹر ولیس کی شہرت و عزت اور زیادہ بڑھی اور مسٹر وآرنز کا شک و شبہ بے معنی اور بے بنیاد ثابت ہوا۔ انکے پاس کوئی ٹھوس ثبوت تو تھا ہی نہیں۔ انکی صرف قیاس آرائی تھی کہ خط مصنوعی ہوگا اور قیاس آرائی صحیح بھی ہوسکتی ہے اور غلط بھی علاوہ اسکے وآرنز صاحب کی قیاس آرائی کے خلاف مذکورہ بالا خط کے مصنف کی رائے سامنے آگئی ظاہر ہے کہ یہ رائے زیادہ مستند اور زیادہ قابل یقین ثابت ہوئی خصوصاً خط کے ان الفاظ نے کہ "یہ ایک حیرت انگیز خط ہے جسے کوئی غیر عیسائی تو کیا کوئی نہایت ذہین اور روشن دماغ عیسائی بھی شاید ہی لکھ سکے۔" وآرنز صاحب کی قیاس آرائی کو بالکل غلط ثابت کر دیا۔

مجھے اب اس خط کو شائع کرانے کی اجازت مل گئی تھی۔ شرط یہ تھی کہ میں خط میں دئیے ہوئے شخصوں اور جگہوں کے ناموں کو استعمال نہ کروں اور اپنی اشاعت کو ملک کے باہر بھیجدوں۔ لہٰذا میں نے اسکے لئے آسٹریلیا کا ایک رسالہ منتخب کیا ادھر پادریوں نے اس خط کا سہارا لیکر پھر اپنا وعظ شروع کر دیا۔

لیکن اس اثنا میں برادر ہیج کے دماغ میں اس خط کی حقیقت کے بارے میں برابر شک و شبہ بنا رہا۔ وہ خود تو واقعے کی تحقیقات کرنے کے لئے جیل میں نہیں گئے مگر انھوں نے وہاں کے ایک پادری کو اس شاندار خط کی ایک نقل بھیجدی اور اسکے متعلق کئی سوالات کئے۔ انھیں اس پادری کا جواب بھی موصول ہو گیا جو پہلے والے خط کے چار دن بعد تحریر کیا گیا تھا۔ یہ دوسرا خط میرے مضمون کے شائع ہونے سے پہلے ہی میرے پاس آگیا۔ اصل خط یعنی دوسرے پادری کا جواب میرے سامنے اسوقت موجود ہے اور میں اس کے مضمون کو ناظرین کے روبرو پیش کر رہا ہوں۔

سرکاری جیل۔ دفتر پادری

مورخہ ۱۱ر جولائی ۱۸۷۳ء

عزیز بھائی ہیج۔ آپ کا وہ خط جسے آپ نے میرے پاس تصدیق کیلئے بھیجا تھا واپس بھیج رہا ہوں۔ مجھے اس خط کی سچائی میں شک ہے۔ دیکھنے سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط اسی جیل کے کسی قیدی کو لکھا گیا ہے۔ مگر اس قسم کا کوئی خط کبھی اس دفتر میں موصول نہیں ہوا جتنے خطوط قیدیوں کیلئے یہاں آتے ہیں انکو پہلا افسران جیل بغور پڑھ لیتے ہیں اور تب وہ قیدیوں کو دیئے جاتے ہیں۔ اگر اس قسم کا کوئی خط یہاں آیا تو اسے نظرانداز کر دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا علاوہ اس کے چارلس ولیمس تو عیسائی ہے ہی نہیں۔ وہ تو آوارہ، بدچلن، چالاک اور فضول خرچ انسان رہا ہے۔ اس کا باپ البتہ ایک پروٹسٹینٹ پادری ہے۔ اس نے اپنا نام بھی فرضی رکھ چھوڑا ہے۔ مجھے آپ سے تعارف حاصل کر کے بڑی خوشی ہوئی۔

میں ایک لیکچر تیار کر رہا ہوں جسکا موضوع قیدیوں کی زندگی کی ایک جھلک ہوگا
میں چاہتا ہوں کہ کہیں آپکے علاقے میں بھی میں یہ لیکچر دوں۔
اور اسطرح اُس حیرت انگیز خط کا تماشہ ختم ہوا اور اسکے ساتھ ہی
میرا طبع شدہ مضمون بھی بیکار ہو گیا۔ حالانکہ اب اس مضمون کیلئے بہت کافی
مواد اکٹھا ہو چکا تھا اور مجھے ٹھوس اور دلچسپ دلائل بھی مل گئے تھے مگر اب
لوگ نہیں چاہتے تھے کہ میں اسکے متعلق کچھ بھی لکھوں اب تو لوگ یہ چاہتے
تھے کہ اس لغو داستان کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا جائے تاکہ اور زیادہ تلخی پیدا
نہ ہو۔ مجھ سے خود لوگوں نے کہا " ذرا ٹھہریئے۔ ابھی کچھ مت لکھئے۔ ہمارے
زخم ابھی تازہ ہیں۔" قصہ کوتاہ یہ کہ دیکھتے دیکھتے اس خط کے سب نسخے سوائے
اس نسخے کے جو میرے پاس تھا، غائب ہو گئے اور گرجا گھروں میں پھر وہی اداسی
اور بے رونقی چھا گئی۔ دراصل لوگوں میں کچھ عرصے تک بڑی کھسیانہ پن رہی
لیکن کچھ مقامات ایسے بھی تھے جہاں ابھی لوگ خاموش تھے اور وہاں اس خط
کے متعلق کچھ کہنا خطرے سے خالی نہ تھا۔
لیجئے۔ اس خط کے مخفی راز کو میں واضح کر دوں۔ خط کا مصنف جیک
ہنٹ ایک فرضی نام تھا۔ ولیمس نے یہ خط خود لکھا تھا یہ شخص ہارورڈ یونیورسٹی
کا گریجویٹ اور ایک پادری کا لڑکا تھا۔ اس نے اس خط کا مکتوب الیہ خود ہی
کو بنایا تھا اور راقم ایک فرضی شخص جیک ہنٹ کو۔ پھر اس نے اس خط کو کسی
نہ کسی طرح چوری سے جیل سے باہر بھجوا دیا اور ان لوگوں تک پہونچا دیا جو اسے
عیسائی بنانے کی کوشش کر رہے تھے اور اسلئے اسکی مدد اور ہمت افزائی
کر رہے تھے اور اس طرح اس خط کی شہرت ہونے لگی۔ اُسے یقین تھا کہ اس خط
کی مشتہر ہونے سے دو نتائج تو ضرور ہونگے۔ اوّل تو یہ کہ لوگوں کو خط کے سچے
ہونے میں کوئی شک و شبہ نہ ہوگا اور نہ اس کے بارے میں کوئی تفتیش ہی کی
جائے گی اور دوسرے یہ کہ اس خط کی داستان کا لوگوں پر بڑا گہرا اثر پڑیگا

جس سے انکے دلوں میں ولیمس کیلئے اتنی ہمدردی پیدا ہو جائے گی کہ وہ اسکو جیل سے رہا کرانے کیلئے ایک تحریک شروع کر دیں گے۔

واقعی جس غرض سے یہ ساری داستان گھڑی گئی اور لوگوں کے سامنے پیش کی گئی وہ بڑی چالاکی اور ہوشیاری سے حذف کر دی گئی۔ خط میں نہ اس کو ظاہر کیا گیا ہے اور نہ اس پر کوئی تبصرہ کیا گیا ہے۔ غرض پڑھنے والا کبھی یہ شبہ بھی نہ کرتا کہ خط کے مصنف کی کوئی ذاتی غرض بھی ہو سکتی ہے۔ مگر اسکے دلمیں یہ احساس ضرور پیدا ہوتا کہ اتنے نیک اور خدا پرست انسان کا جیل میں سڑنا بڑا ظلم ہے اور جس جملے سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے :-

"مجھے امید ہے کہ خوشگوار موسم تمھاری صحت کیلئے اچھا ہے۔ جب تم خون تھوکنے لگے تھے تو مجھے تمہارے جانبر ہونے میں شک ہو گیا تھا۔ برائے مہربانی میرا سلام فلاں فلاں اصحاب کو کہہ دیجئے گا۔"

اصل میں کل خط کا لب و لباب اسی ایک جملے میں تھا جس کا سامعین پر بہت گہرا اثر ہوتا تھا اور انھیں ایک خدا پرست انسان سے جو اسقدر مصیبت میں تھا ہمدردی پیدا ہو جاتی تھی۔ اس ایک جملے کا خط میں ہونا ہی کافی تھا اسکی توضیح و تشریح کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر بھی اس جملے کو دیکھنے اور سمجھنے کے لئے دیدۂ بینا اور رقیق دل کی ضرورت تھی جو اس غریب قیدی پر ترس کھاتا اور اسکو مصائب سے نجات دلانے کی کوشش کرتا یعنی جو ایسے نیک اور لاچار قیدی کی مدد کرتا جو دیندار اور حقیقی معنوں میں مذہبی بن چکا تھا اور جو بیچارہ تپ دق جیسے مہلک مرض میں مبتلا تھا اور ساتھ ہی جیل کی اذیت بھی برداشت کر رہا تھا۔

آج سے نو سال پہلے بیشتر جب یہ خط پہلی بار لوگوں نے مجھے پڑھکر سنایا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ایسا حیرت انگیز خط تو میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا نہ سنا اور ساتھ ہی ساتھ سینٹ لوئی کے مسٹر براؤن کیلئے بھی میرے دل

میں اتنی عزت و عظمت پیدا ہو گئی کہ میں نے یہ ارادہ کر لیا کہ جب کبھی میں اس شہر کی سیر کرنے جاؤں گا تو میں اس مرد نیک کو ضرور تلاش کرونگا اور اگر وہ نئے یا صاف کپڑے پہنے ہو گا تو میں اسکے دامن کو چوم لوں گا اور میں سینٹ لوئی گیا بھی لیکن میں نے مسٹر براؤن کو تلاش نہیں کیا۔ افسوس کہ میرے وہاں پہونچنے سے بہت پہلے ہی لوگوں نے تفتیش کر کے یہ پتہ لگا لیا تھا کہ مسٹر جیک ہیٹ کی طرح مسٹر براؤن بھی ایک فرضی نام تھا اور یہ فرضی نام اس بدمعاش ویمیس کے دماغ کی اختراع تھے۔ میرا مطلب اسی چلاو لیمس سے ہے جو ہارورڈ کا گریجویٹ تھا ایک پادری کا لڑکا تھا۔

ترپنواں باب

میرے بچپن کا گھر

ہم سینٹ لوئی اور سینٹ پال پیکٹ کمپنی کی ایک تیز رفتار کشتی میں سوار ہوئے اور دریا کے چڑھاؤ کی طرف چلے۔ بچپن میں جب میں نے دریائے مسوری کا دہانہ دیکھا تھا تو پائلٹوں کے اندازے کے مطابق وہ سینٹ لوئی سے بائیس۲۲ یا تیئیس۲۳ میل اوپر کی طرف تھا لیکن دریا کے کٹاؤ کی وجہ سے اب وہ دہانہ آٹھ میل نیچے کی طرف کھسک آیا ہے اور پائلٹوں کا خیال ہے کہ اگلے پانچ برسوں میں یہ دہانہ پانچ میل اور نیچے کھسک آئیگا اور تب سینٹ لوئی سے اس کا فاصلہ صرف دس۱۰ میل رہ جائے گا۔

شام کیوقت ہم الی نوائے شہر کے ساحل سے گذرے۔ یہ شہر ریاست ایلنؤ میں واقع ہے اور بڑا بارونق ہے۔ دوسرے دن پو پھٹنے سے پہلے ہم ریاست لوئی آنا کے شہر مسوری کے

ساحل پر پہونچ گئے۔ میرے زمانۂ طفلی میں یہ شہر ایک اُجاڑ سا گاؤں تھا مگر اب یہ بڑا بارونق ریلوے جنکشن بن گیا ہے اور یہی شہر کیا اب تو اسطرف کے قریب قریب سبھی قصبے ریلوں کے مرکز بن چکے ہیں۔ شہر مسوری تو اب بالکل بدل ہی گیا ہے۔ میں اسے اچھی طرح پہچان بھی نہ پایا۔ میرے لئے یہ بڑے تعجب کی بات تھی کیونکہ جب میں باغی فوج سے ۱۸۶۱ء میں ریٹائر ہوا تھا تو کوئی آنا ہی میں جا کر رہا تھا بلکہ یہاں کی سڑکوں پر باقاعدہ مارچ کرتا ہوا شہر کے اندر گھسا تھا۔ "باقاعدہ" سے میرا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ فوجی قواعد تو میں سیکھ نہیں پایا تھا پھر بھی اپنی عقل کے مطابق باقاعدہ مارچ کرنے کی مشق ضرور کیا کرتا تھا اور اس بات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے کہ میں نو آموز تھا میری چال کچھ ایسی خراب بھی نہیں تھی۔ اور آج اسی سرزمین کو میں پہچان بھی نہ سکا۔ اس کی وجہ غالباً یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں آگے آگے کبھی نہیں چلتا تھا بلکہ ہمیشہ اور لوگوں کے پیچھے ہی چلا کرتا تھا۔

یہاں دریا پر ایک ریل کا پل بھی تھا جس پر جگہ جگہ تیز روشنی کے قمقمے روشن تھے۔ دیکھنے میں یہ نظارہ بڑا دلفریب اور دلکش تھا۔

صبح سات بجے کے قریب ہم مسوری کے شہر ہینی بل میں پہونچے۔ یہیں میرا بچپن گذرا تھا۔ میں یہاں پندرہ سال پہلے آیا تھا اور اُس سے چھ سال پیشتر بھی آیا تھا۔ لیکن دونوں مرتبہ میرا قیام بہت مختصر سا رہا تھا اور اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا اور نہ اسکی کوئی یاد ہی باقی رہ گئی تھی البتہ اسوقت کی تھوڑی بہت یاد مجھے ضرور تھی جب میں نے اس جگہ کو انتیس سال پہلے چھوڑا تھا۔ اسوقت کا اس جگہ کا نقشہ میرے ذہن میں اتنا صاف اور روشن تھا جیسے کہ کسی تصویر میں نمایاں ہوتا ہے۔ جیسے ہی میں نے یہاں کے ساحل پر قدم رکھا تو مجھے ایسا محسوس ہوا گویا میں گذری ہوئی نسل کا بچا ہوا ایک فرد تھا جو پھر اسی جگہ واپس آ گیا تھا۔ اسوقت مجھے ویسی ہی خوشی ہو رہی تھی جیسی غالباً بیسیوں برس جیل سے رہا ہونیوالے قیدیوں کو عرصۂ دراز کے بعد اپنے وطن پیرس لوٹنے پر بھی ہوتی ہوگی۔ جو حیرت مجھے یہاں ہر نئی یا بدلی ہوئی چیز کو دیکھ کر ہو رہی تھی غالباً ایسی ہی حیرت ان غریب قیدیوں کو پیرس کے بازاروں میں جا کر ہوتی ہوگی جب وہ وہاں کی ہر بدلی ہوئی چیز کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں گے ظاہر ہے کہ کچھ چیزیں تو انھیں بالکل

نئی ملتی ہونگی اور کچھ انکی قدیمی جانی پہچانی ہوتی ہونگی اور نئی پرانی چیزوں کا یہ امتزاج انکے لئے کتنا عجیب و غریب ہوتا ہوگا۔ اسیطرح میں نے بھی بہت سی نئی عمارتیں دیکھیں جو بالکل سادہ نمونے کی بنی ہوئی تھیں۔ لیکن پرانے مکانوں کے نقشے میرے ذہن میں اب بھی محفوظ تھے اور نئے مکانوں کی اینٹوں اور چونے کے ملبے کو دیکھ کر مجھے گزشتہ مسمار شدہ مکانوں کی یاد آجاتی تھی کیونکہ وہ مکانات بناوٹ اور خوبصورتی کے اعتبار سے نرالے تھے۔

اتوار کا دن تھا۔ صبح ہو چکی تھی لیکن لوگ ابھی اپنے بستروں میں ہی تھے۔ چنانچہ جب میں شہر کی سڑکوں سے گذر رہا تھا تو ہرطرف سناٹا ہی سناٹا تھا۔ میرے تصوّر میں اب بھی شہر کا پرانا نقشہ ہی سمایا ہوا تھا اور اسکی موجودہ ہیئت سے بالکل بے نیاز تھا بلکہ ذہن میں اُبھرتے ہوئے ماضی کے نقوش اُن چیزوں کی یاد دلاتے تھے جن کا اب وہاں کوئی وجود بھی نہ رہا تھا۔ بالآخر میں چلتے چلتے ہالی ڈے کی پہاڑی پر چڑھ گیا تاکہ وہاں سے سارے شہر کا اچھی طرح نظارہ کرسکوں۔ اسوقت میری نگاہوں کے سامنے شہر دُور تک پھیلا ہوا تھا اور یہاں سے مجھے شہر کا ہر محلّہ اور محلّے کا ہر گلی کوچہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ مجھ پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ میں یہ سوچ رہا تھا "اس پُرامن دھرتی پر رہنے والے نہ معلوم میرے بچپن کے کتنے ساتھی راہیٔ ملکِ عدم ہوگئے ہونگے اور نہ جانے کتنے اس جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہوں کو چلے گئے ہوں گے"

اس ماحول نے مجھے اسقدر متاثر کیا کہ میں خود کو کچھ کھویا کھویا سا محسوس کرنے لگا اور مجھے ایسا معلوم ہونے لگا کہ میرے بچپن کے دن لوٹ آئے۔ میں یقین کرنیکی کوشش کر رہا تھا کہ کیا واقعی میں پھر لڑکا ہو گیا ہوں اور کیا واقعی اتنے لمبے عرصے تک میں ایک طویل خواب ہی دیکھتا رہا ہوں۔ لیکن زیادہ غور و فکر سے میرے خیالات کا تانتا ٹوٹ گیا اور بے ساختہ میرے منہ سے یہ نکلا "ارے وہ قریب ہی جو پچاس مکان دکھائی دے رہے ہیں ان میں سے ہر ایک میں میں بلا تکلف جا سکتا ہوں کیونکہ وہاں ہر گھر میں کوئی مرد یا عورت ایسی ضرور ملیگی جسے میں جانتا ہونگا۔ اسوقت جب میں یہاں آخری مرتبہ آیا تھا تب یہ لوگ بچے ہونگے

یا پیدا ہونیوالے ہونگے اور اگر اسوقت یہاں کسی گھر میں کوئی بوڑھی عورت دادی یا نانی بنی بیٹھی ہوگی تو لازمی طور پر اس وقت وہ نوجوان سی نئی دلہن ہوگی۔

اس اونچے مقام سے دریا کی بالائی اور زیریں دونوں سمت دور تک پھیلے ہوئے الی نوائے سے کے وسیع جنگلات کا منظر بڑا خوشنما لگتا تھا۔ دراصل یہ مسیسپی کی وادی کا خوبصورت ترین علاقہ ہے حالانکہ ایسا دعویٰ کرنا مشکل ہے کیونکہ سینٹ لوئی سے لیکر سینٹ پال تک دریائے مسیسپی کی آٹھ سو میل لمبی وادی میں بھی ہمیں متواتر ایک سے ایک خوبصورت منظر دیکھنے کو ملتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اس منظر کی خوبصورتی بیان کرنے میں، میں نے کچھ جانبداری سے کام لیا ہو۔ اسلئے میں اسکے بارے میں مزید کچھ کہہ نہیں سکتا۔ بہرحال کچھ بھی ہو اس مخصوص منظر کو دیکھکر مجھے انتہائی فرحت اور خوشی حاصل ہوئی تھی اور اسی لئے میں اسے دوسرے مناظر پر جنھیں مجھے ابھی دیکھنا باقی تھا ترجیح دے رہا تھا۔ یہ مقام اب بھی مجھے اتنا ہی تر و تازہ، شگفتہ اور دلکش نظر آرہا تھا جتنا کہ پیشتر۔ اسمیں ابھی کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی جبکہ دیگر مقامات پرانے اور بوسیدہ ہو چکے ہونگے جہاں لوگ اپنی زندگی کی جدوجہد میں ناکام اور مبتلائے رنج و آلام نظر آئیں گے۔ انھیں دیکھ کر میری طبیعت اور اداس ہو جائیگی اور مجھے کوئی خوشی نہیں ہوگی۔

اس جگہ مجھے ایک بزرگوار ملے جو غالباً صبح کی ہوا خوری کیلئے نکلے تھے میری ان سے بات چیت ہونے لگی۔ پہلے ان سے موسم کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ اسکے بعد دوسری باتیں چھڑ گئیں مگر انکی شکل و صورت سے میں انھیں پہچان نہ سکا۔ معلوم ہوا کہ وہ اٹھائیس سال سے اسی جگہ رہتے تھے غالباً وہ میرے بعد یہاں آئے ہونگے اسی لئے میری اُن سے واقفیت نہیں تھی۔ میں نے ان حضرت سے بہت سی باتیں دریافت کیں۔ اوّل تو میں نے ایک دوست کے بارے میں جو سنڈے اسکول میں کام کرتا تھا پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ میرے اس دوست نے ایسٹرن کالج سے آنرس کی ڈگری حاصل کی اور اسکے بعد وہ کہیں باہر چلا گیا۔ بدقسمتی سے وہ کسی پیشے میں کامیاب نہیں ہوا برسوں سے نہ اسکے بارے میں کسی کو کچھ علم ہے اور نہ اسکی کسی کو یاد ہی ہے اور اندیشہ یہ ہے کہ وہ برباد ہو گیا۔"

"لیکن بچپن میں جب وہ پڑھتا تھا تو بڑا ذہین اور ہونہار تھا۔"
"ہاں یہ تو ٹھیک ہے مگر اس کا انجام وہی ہے جو میں نے ابھی بتلایا۔"

اسکے بعد میں نے ایک احمد لڑکے کے بارے میں دریافت کیا بچپن میں ہمارے گاؤں کے اسکول میں سب سے ذہین طالب علم سمجھا جاتا تھا۔

"اس نے بھی ایسٹرن کالج سے آنرس کی ڈگری حاصل کی لیکن زندگی کی ہر جدوجہد میں اُسے شکست کا سامنا کرنا پڑا اور بالآخر کسی دوسری ریاست میں جاکر وہ مر گیا۔ آہ، ناکام انسان۔!"

پھر میں نے ایک دوسرے ذہین لڑکے کے بارے میں دریافت کیا۔

"ہاں۔ اس لڑکے کو ہمیشہ کامیابی ملی۔ میرا خیال ہے کہ وہ آیندہ بھی کامیاب رہیگا۔"

تب پھر میں نے ایک باہر سے آئے ہوئے لڑکے کے بارے میں دریافت کیا۔ یہ لڑکا کسی پیشے کی تعلیم حاصل کرنے کیلئے یہاں آیا تھا۔

"اس نے تو اپنے پیشے کی تعلیم مکمل ہی نہیں کی اور کسی دوسری طرف متوجہ ہو گیا۔ یا تو وہ طب چھوڑ کر قانون پڑھنے لگا یا قانون چھوڑ کر طب۔ اور پھر اسے بھی چھوڑ کر وہ اور کچھ سیکھنے لگا۔ بعد ازاں ایک سال کیلئے پردیس چلا گیا اور جب لوٹ کر آیا تو ایک نوجوان بیوی اسکے ساتھ تھی۔ اب وہ شراب نوشی کی بری عادت میں مبتلا تھا۔ اسکے بعد اُسے قمار بازی کا شوق لگ گیا۔ انجام خراب ہوا تنگ دست ہو کر اپنی بیوی اور دو بچوں کے ہمراہ اپنی سسرال چلا گیا۔ اور وہاں سے سنگاپور چلا گیا جہاں اسکی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی اور بالآخر اسکی موت وہیں ہو گئی۔ مرتے وقت غریب کے پاس کفن کے لئے ایک پائی بھی نہیں نکلی اور نہ غریب کی میت کیساتھ جانیوالا کوئی دوست تھا۔"

میں نے کہا "افسوس یہ تو بہت برا ہوا۔ وہ شخص تو بڑا خوش مزاج اور زندہ دل تھا اور اسے اپنی کامیابی کی پوری امید رہتی تھی۔ مایوس ہونا تو وہ جانتا ہی نہ تھا۔"

اسکے بعد میں نے ایک اور لڑکے کا نام لیا اور اسکے بارے میں دریافت کیا۔

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے۔ وہ اب بھی یہیں ہے۔ اس کے بیوی بچے بھی یہیں ہیں اور وہ بہت خوشحال ہے"

اسی قسم کی بہت سی باتیں ان بزرگوار سے دوسرے لڑکوں کے بارے میں معلوم ہوئیں۔ پھر میں نے تین لڑکیوں کے بارے میں پوچھا۔

"ان میں سے دو تو یہیں ہیں۔ شادی شدہ اور بال بچے والی ہیں مگر تیسری عرصہ ہوا مر گئی۔ اس نے شادی ہی نہیں کی۔"

پھر میں نے بڑے اشتیاق سے اپنی ایک پرانی محبوبہ کے بارے میں پوچھا۔

"وہ مزے میں ہے۔ اس نے تین مرتبہ شادی کی۔ اسکے پہلے دو شوہر تو مر گئے اور اور تیسرے نے اسے طلاق دیدی میں نے سنا ہے کہ اب وہ کولوریڈو میں کسی بوڑھے سے شادی کرنیوالی ہے۔ اسکے اولاد بھی کافی ہے جو ادھر ادھر ہر بار کیا ماری پھرتی ہے۔"

اسکے بعد میں نے اور کئی سوالات کئے جن کا جواب اس نے بہت مختصر اور سیدھے سادے الفاظ میں دیا۔

"وہ جنگ میں مارے گئے"

تب میں نے ایک اور لڑکے کے بارے میں پوچھا۔

"اس کا معاملہ بڑا حیرت انگیز ہے۔ اسکے متعلق پہلے ہر شخص کا یہی خیال تھا کہ وہ لڑکا بڑا ہی کوڑ مغز ہے۔ کاٹھ کا الو ہے اور بالکل گدھا ہے۔ آپ بھی شاید اسے ... لیکن بحمد ... سکتا ہوں کہ وہی لڑکا اب ریاست مسوری کا ایک ماکمال اور اعلیٰ درجے کا ... سکتا ... تا ہوں تو مجھے آپ ڈیموکریٹ ... سکتے ہیں۔"

"ارے کیا واقعی؟"

"ہاں ہاں یہ بالکل سچ ہے میں آپکو ... "

"... آپکے خیال میں اسکی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"وجہ کیا ہو ... ظاہر ... [illegible]

سب ... ریاست کے لوگوں ... دم شناد ... [illegible]

عقلمند بنا کر وہاں بھیج دیجئے۔ وہاں کے لوگوں کو تا قیامت اس بات کا پتہ نہیں چلے گا کہ وہ شخص درصل بیوقوف ہے۔ اسلئے میں تو یہ کہونگا کہ اگر آپ کے یہاں کوئی بیوقوف شخص ہو تو بہتر یہ ہوگا کہ آپ اُسے جہاز میں بٹھا کر سینٹ لوئی بھیجدیں۔ دنیا بھر میں بیوقوف آدمیوں کے لئے سینٹ لوئی سے بہتر اور کوئی جگہ نہیں ملیگی۔ مگر جب آپکو خود اس بات کا تجربہ ہو جائے اور آپ اچھی طرح سے سمجھ جائیں تو آپ اس راز کو اپنے تک ہی محدود رکھیں اور اسے باہر نہ پھیلائیں۔"

"ہاں، معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ آپ ٹھیک کہتے ہونگے مگر کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اس لڑکے کے بارے میں ہینیبل کے لوگوں کو غلط فہمی ہو گئی ہو؟"

"یہ تو آپ نے بالکل نادانوں کی سی بات کہدی۔ ہینے بل کے لوگ تو اسے جنم سے جانتے ہیں۔ سینٹ لوئی کے بیوقوف لوگ اسے کیا جانیں۔ ہینے بل والے سینٹ لوئی والوں سے دس گنا زیادہ جانتے ہیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ اگر کسی بیوقوف سے پیچھا چھڑانا ہو تو اسے آپ میری نصیحت مان کر سینٹ لوئی بھیجدیں۔"

پھر میں نے ان بزرگوار سے کئی دوسرے لوگوں کے بارے میں جنھیں میں پہلے سے جانتا تھا کئی سوالات کئے۔ ان لوگوں میں سے کچھ تو مر چکے تھے اور کچھ کہیں باہر چلے گئے تھے، کچھ خوشحال ہو گئے تھے اور کچھ برباد۔ بہرحال قریب ایک درجن لوگوں کے بارے میں ان بزرگوار نے میرے سوالوں کے بڑے قابل اطمینان جواب دئے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ سب لوگ بڑے مزے میں ہیں۔ آسودہ حال ہیں۔ آجکل یہیں رہ رہے ہیں اور انکی اولاد سارے شہر میں پھیل چکی ہے۔

میں نے ایک لڑکی کے بارے میں پوچھا۔

"تین یا چار سال پہلے وہ پاگل خانہ میں مر گئی۔ وہاں داخل ہونیکے بعد پھر وہاں سے وہ باہر نہیں نکلی۔ برابر دماغی خرابی میں مبتلا رہی اور اسکی دماغی حالت میں برابر بھی اصلاح نہ ہو سکی۔"

اگر اس بوڑھے آدمی کی بات صحیح تھی تو واقعی یہ بڑا افسوسناک واقعہ تھا۔ وہ بیچاری لڑکی قریب چھتیس سال پاگل خانے میں رہی۔ وہ کچھ بیوقوف قسم کی نوجوان لڑکیوں کے مذاق کی وجہ سے

اس حال کو پہنچی ۔ میں اس زمانے میں ایک چھوٹا سا لڑکا تھا ۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ وہ نوجوان لڑکیاں آدھی رات کے وقت چپکے چپکے دبے پاؤں اسکے کمرے میں داخل ہوئیں وہ لڑکی ایک لیمپ کے آگے بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی ۔ ان لڑکیوں میں سب سے آگے والی لڑکی نے سفید کفن جیسی چادر میں اپنا جسم لپیٹ رکھا تھا اور اپنے چہرے کے اوپر ایک موم کا بناوٹی چہرہ لگا رکھا تھا ۔ وہ جا کر اس لڑکی کے پیچھے چپکے سے کھڑی ہو گئی اور اس نے اس لڑکی کے کندھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے ۔ جیسے ہی لڑکی نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو خوف کے مارے اسکی چیخ نکل گئی اور پھر اسے بیہوشی کے دورے پڑنے لگے ۔ وہ اسقدر خوفزدہ ہو گئی کہ اسے زندگی بھر ڈر سے نجات نہ ملی اور پھر وہ ہمیشہ کیلئے پاگل ہو گئی ۔ یہ بات تھوڑے ہی عرصہ پہلے کی ہے حالانکہ یہ یقین نہیں ہوتا تھا کہ اس زمانے میں بھی لوگ بھوت پریت میں اتنا اعتقاد رکھتے ہوں گے مگر صورتِ حال یہی بتاتی ہے کہ اس وقت میں بھی ضعیف الاعتقاد لوگوں کی کمی نہ تھی ۔

اسکے بعد جن جن لوگوں کی مجھے یاد آتی گئی میں انکے بارے میں ان بزرگوار سے سوالات کرتا گیا اور آخر میں میں نے ان سے اپنے بارے میں پوچھا وہ کہنے لگے " وہ اپنی زندگی میں بہت کامیاب ہوا حالانکہ تھا تو وہ بھی کاٹھ کا الّو ۔ اگر لوگ اسے بھی سینٹ لوئی بھیج دیتے تو وہ وہاں اور بھی زیادہ کامیاب ہوتا ۔"

تسلی بخش جواب سننے کے لئے ہی میں نے شروع میں ان بزرگوار کو اپنا نام اسمتھ بتایا تھا کیونکہ میں نے یہ بھانپ لیا تھا کہ اس سادہ لوح بڈھے کو فرضی نام بتانا ہی عقلمندی ہوگی ۔

چونواں باب

ماضی اور حال

جب میں پہاڑی پر اکیلا رہ گیا تو میں نے دُور سے قصبے کے پرانے مکانوں کو ایک ایک کرکے پہچاننا شروع کیا اور ان مکانوں میں رہنے والے پرانے لوگوں کا تصور کرنا شروع کیا۔ چنانچہ ان میں سے ایک مکان کو میں نے پہچان لیا جہاں لیم ہیکٹ (ایک فرضی نام) کے پدرِ بزرگوار رہا کرتے تھے فوراً میری نگاہوں کے رُوبرو ایک پشت سے بھی پہلے کا زمانہ گھومنے لگا جبکہ زندگی سیدھی سادی تھی اور آجکل کی طرح بڑے بڑے قومی یا بین الاقوامی مسائل نہ تھے۔ ہر انسان کی زندگی کا ایک مخصوص نصب العین ہوتا تھا اور اسکے مقاصد بھی معین اور واضح ہوتے تھے آجکل کی طرح حکمتِ عملی کی چالیں نہیں تھیں۔ جزا و سزا کا خیال انھیں ہر کام کو کرتے وقت لگا رہتا تھا اور انکی زندگی کی تگ و دو ایک محدود دائرہ میں ہی رہتی تھی۔

میرے لڑکپن کے دنوں کی بات ہے کہ ایک اتوار کو لیم ہیکٹ ندی میں ڈوب کر مرگیا۔ وہ ایک خالی کشتی میں کھیل رہا تھا اور وہیں سے نیچے دریا میں گرگیا غالباً اس نے گناہ بہت کئے ہونگے جنکے بوجھ سے وہ لوہے کے ٹکڑے کی مانند دریا میں نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ اس روز رات کو غالباً وہی لڑکا ایسا تھا جو آرام کی نیند سویا ہوگا۔ خوف کے مارے ہم لوگوں کی نیند تو اڑ ہی گئی تھی۔ ساری رات ہم نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ پادری نے اپنے شام کے وعظ میں بتا دیا تھا کہ لیم ہیکٹ کو اسکے گناہوں کی کوئی سخت سزا ملے گی۔ ہم یہ بات پہلے ہی جانتے تھے لہٰذا ہمیں یہ معلوم کرنیکی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ اُسی رات ایک بڑا بھیانک طوفان آیا جسکی تندی صبح تک قائم رہی۔ ہوا میں بلا کا زور تھا جو کھڑکیوں کو توڑے ڈال رہا تھا۔ پل پل پر بجلی اس تیزی

سے کوندتی کہ خوفناک اندھیرا لمحہ بھر کے لئے کافور ہوجاتا اور گلی کوچوں میں کھڑے مکانات پل بھر کے لئے جگمگا اٹھتے اور اسکے بعد فوراً گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا۔ بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پاس پڑوس میں ہر چیز کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں گے اور کچھ بھی صحیح و سالم نہ بچے گا۔ میں بستر میں بیٹھا اری طرح کانپ رہا تھا اور مجھے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ جلدی ہی ساری دنیا تہس نہس ہوجانے گی میرا پکا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ گنہگاروں کو سزا دینے کے لئے ضرور کوئی نہ کوئی عتاب نازل کیا کرتا ہے اسلئے اگر کوئی یہ کہتا کہ خدا کا یہ عتاب لیم ہیکٹ کو سزا دینے کے لئے ہی تھا تو مجھے اسمیں کوئی تعجب نہ ہوتا اور نہ ہی یہ بات غیر مناسب معلوم ہوتی۔ بظاہر یہ عتاب بالکل مناسب معلوم ہوتا تھا۔ مجھے اس میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں تھا کہ اسوقت تمام فرشتے اکٹھے ہوکر لیم ہیکٹ کے گناہوں پر خشم آلود باتیں کرتے ہونگے اور اسی کے گناہوں کی پاداش میں انھوں نے ہمارے چھوٹے سے گاؤں پر بمباری شروع کردی تھی مگر اسوقت ایک بات جو مجھے پریشان کررہی تھی وہ یہ تھی کہ جو فرشتے اسوقت لیم ہیکٹ کی وجہ سے ہمارے دیہات کو اپنے قہر و غضب کا نشانہ بنائے ہوئے تھے انکی توجہ ہم لوگوں کی طرف مبذول ہوسکتی تھی کیونکہ لیم ہیکٹ جیسے اور گنہگار بھی ہم لوگوں میں ہوسکتے تھے جو ابتک کسی نہ کسی طرح قہر الٰہی سے بچے رہے تھے۔ اگر کہیں اُن سب کو سزا ملی تو نہ جانے کیا کیا غضب اور ڈھائے جائینگے۔ مجھے خود اپنے بارے میں ڈر تھا کہ گنہگاروں کی فہرست میں کہیں میرا نمبر نہ آجائے اور مجھے بھی قہر الٰہی کا نشانہ نہ بننا پڑے۔ تب تو لیم کیساتھ مجھے بھی دوزخ کی آگ میں اسوقت تک جلایا جائیگا جبتک ہم لوگ جل کر خاک نہ ہوجائیں گے۔ میری دانست میں گناہوں کی سزا یہی ہونی چاہیئے تھی۔ اب میرے معتوب ہونیکے امکان اور بھی قوی ہوتے جاتے تھے وجہ یہ کہ میرے دلمیں لیم کے خلاف غصہ اور حسد کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی تھی کیونکہ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اس نے ہی تو اپنی مثال سے میرے دلمیں یہ خوف پیدا کردیا تھا اور اس سزا کا خیال میرے دل سے نکلنا محال کردیا تھا۔ ہر چند کوشش کرنے پر بھی یہ خیال مجھے ستائے جارہا تھا۔ جوں ہی بجلی کوندتی تھی میں دم بخود ہوجاتا تھا۔ مجھے ڈر لگتا تھا کہ میں اب چلا، اب چلا۔ اس خوف اور مصیبت کے عالم میں، میں نے انتہائی کمینہ پن سے دوسر

لڑکوں کے نام گنانے شروع کر دئے جن کے افعال میری نظروں میں زیادہ گندے اور خراب تھے اور اسلئے وہ مجھ سے زیادہ سزا کے مستحق تھے۔ پھر میں اپنے دل کو اس طرح سمجھانے لگا اور سیتو میں اتفاقیہ سوچنے لگا۔ میرا منشار خود گناہوں کی پاداش سے بچنے اور دوسروں کو قہرِ الہٰی کا نشانہ بنانے کا نہیں تھا۔ میں نے نہایت ہوشیاری سے کام لیا اور ان واقعات پر اظہار تاسف کرتے ہوئے خدا سے دعا مانگی کہ "اے خدا تو میرے ساتھیوں کے گناہوں کو درگذر کر دے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خود اپنے کئے پر شرمندہ ہوں اور معافی مانگ کر تیرے رحم کے مستحق ہو جائیں" مگر یہ باتیں سب بناوٹی تھیں جو میں محض ڈر کے مارے کر رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں اسطرح کی دلیلیں دے رہا تھا کہ یہ تو صحیح ہے کہ جیمس اسمتھ نے کھڑکی کا شیشہ توڑا اور پھر جھوٹ بھی بولا مگر اس سے اس کا دلی منشار کسی کو نقصان پہونچانے کا قطعی نہیں تھا اسی طرح ٹام ہوکنس گاؤں کے دوسرے لڑکوں کے مقابلے میں بہت گالیاں بکا کرتا تھا اور بظاہر اس نے اپنی غلطیوں پر کسی کے روبرو اظہار افسوس بھی نہیں کیا مگر ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے دل میں پشیمان ہو۔ جان جونس کے بارے میں بھی یہ سچ ہے کہ ایک دفعہ اس نے اتوار کے دن مچھلی کا شکار کیا تھا مگر دراصل بیچارے کو ملا کیا۔ صرف ایک چھوٹی سی بے مصرف مچھلی، اگر اس نے اُسے پھینک دیا ہوتا تو اسکا گناہ اتنا بڑا نہ ہوتا۔ کہتا تو وہ یہی تھا کہ اس نے اُسے پھینک دیا تھا حالانکہ دراصل اس نے ایسا کیا نہیں تھا۔ یہ سب افعال میں تو واقعی افسوس کے قابل مگر امید ہے کہ وہ سب لوگ اپنے گناہوں پر پشیمان ہو کر توبہ کر لیں گے اور اللہ کے رحم کے مستحق ہو جائینگے۔ ہو سکتا ہے انھوں نے ابتک معافی مانگ بھی لی ہو۔

اسطرح دوسرے لڑکوں کے گناہوں کا ذکر کر کے اور ان پر افسوس ظاہر کر کے میں نہایت بے شرمی سے اپنے گناہ بھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ یہی لوگ اسوقت قہرِ الہٰی کو میری طرف منتقل کرا رہے ہوں حالانکہ مجھے اس قسم کے شبہ کرنیکی کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی تھی۔ اسی اُدھیڑ بُن میں اپنی موم بتی بجھانا بھول گیا۔ اسوقت میری نگاہ ذرا ذرا سی غلطیوں پر بھی تھی کیونکہ ہر غلطی خواہ چھوٹی ہو خواہ

بڑی میرے پچھلے گناہوں میں اضافہ کرتی تھی اور عتاب الہٰی کو میرے اور قریب لے آتی تھی۔
لہٰذا میں نے فوراً موم بتی گل کر دی۔

جیسی اُلجھن اور پریشانی مجھے اس رات کو ہوئی ویسی کبھی نہیں ہوئی۔ رات تھی کہ کاٹے نہیں کٹتی تھی۔ مجھے ندامت اور افسوس نہ صرف ان گناہوں پر ہو رہا تھا جو میں نے اپنی دانست میں کئے تھے بلکہ ان گناہوں پر بھی جو مجھ سے انجانے میں سرزد ہو گئے تھے۔ اگرچہ مجھے یہ یقین نہیں کہ مجھ سے ایسے کوئی گناہ ہوئے ہونگے۔ لیکن یہ یقینی ہے کہ اگر ہوئے ہونگے تو فرشتے نے انکو میرے نامۂ اعمال میں لکھ لئے ہونگے کیونکہ فرشتے انسانوں سے زیادہ عقلمند ہوتے ہیں اور وہ کوئی بات محض یادداشت پر نہیں چھوڑتے ہونگے۔ جلد ہی یہ وہم بھی ہونے لگا کہ میں نے بڑی حماقت اور بڑی زبردست غلطی کی ہے کہ میں نے دوسروں کی عیب جوئی کی کیونکہ گناہوں کا بار بار تصور کرنا بھی ارتکاب گناہ ہوتا ہے اور اسی طرح میں نے اپنی تباہی و بربادی کو یقینی بنالیا ہے۔ یکایک مجھے ڈر لگا کہ کہیں میرے سب ساتھی بجلی کی کوندکیساتھ ہی لقمۂ اجل نہ ہوگئے ہوں اور اپنے بستروں پر موت کی نیند سو رہے ہوں۔ اس خیال کا آنا تھا کہ مجھے انتہائی صدمہ ہوا اور جو خوف و ہراس میرے دل میں پیدا ہوا وہ پہلے سے کہیں زیادہ تھا۔

اب میں بہت سنجیدگی سے سوچنے لگا کہ مجھے کرنا کیا چاہیئے۔ گناہوں کی تلافی کرنے کے لئے میں نے کئی عہد کر ڈالے۔ میں نے عہد کیا کہ اگر صبح تک زندہ اور صحیح سلامت رہا تو کل سے ہی پاک زندگی گزارنے کی کوشش کرونگا گرجا گھر جانا شروع کرونگا ہر قسم کے گناہوں سے پرہیز کرونگا اپنی زندگی نیک اور معصومانہ بناؤنگا گرجا گھر اور سنڈے اسکول میں روزانہ جایا کرونگا۔ بیماروں کی تیمارداری کیا کرونگا اور غریب اور مسکینوں کو مفت کھانا بانٹا کروں گا۔

یہ تو محض خانہ پُری کی بات تھی۔ دراصل ہمارے قُرب و جوار میں کوئی اتنا غریب تھا ہی نہیں جسے کھانے کو نہ ملتا ہو بلکہ ایسے شیطان ضرور تھے جو اگر میرے سر پر کھانے کی ٹوکری رکھی دیکھتے تو مجھے تکلیف پہونچانے کیلئے آ کے میرے سر پر ہی توڑ ڈالتے۔

میں نے یہ بھی عہد کیا کہ میں اپنے ساتھیوں کو نیک ہدایت کرونگا اور اگر وہ مجھے ایذا بھی پہونچائیں گے تو اسے بڑے صبر و تحمل سے برداشت کرونگا میں دینی کتب کا درس دیا کروں گا

اور میخانوں میں جاکر شرابیوں کو مے نوشی کے تباہ کُن نتائج سے آگاہ کرونگا اور اگر نیک آدمیوں کی طرح جلد ہی نہ چل بسا تو میں اپنی زندگی پادری بنکر دین کی خدمت کرنے میں لگا دوں گا۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی طوفان اترنا شروع ہوگیا۔ مجھے اب نیند کے جھونکے آنے لگے اور جلد ہی میں گہری نیند سو گیا۔ گذشتہ رات کی بے چینی اور پریشانی کے لئے ایک طرح سے میں لیم ہیکٹ کا بہت ممنون و متشکر تھا کہ اس نے اپنے سب گناہوں کی پاداش میں قہرِ الٰہی خود اپنے اوپر ہی لے لیا اور اسطرح اس نے مجھ جیسے گنہگاروں کو تباہی و بربادی سے بچا لیا۔

لیکن جب میری آنکھ کھلی تو میں نے اپنے آپ کو بالکل ہشاش بشاش پایا رفتہ رفتہ معلوم ہوا کہ وہ سب لڑکے زندہ اور بخیریت تھے اب مجھے کچھ کچھ یقین ہونے لگا کہ وہ طوفان محض ایک دھوکا اور جھوٹا خوف تھا۔ قدرت کا یہ عذاب صرف لیم ہیکٹ کی وجہ سے نازل ہوا تھا اور کسی وجہ سے نہیں۔ دراصل دنیا اتنی شاندار اور آرامدہ جگہ ہے کہ یہاں نہ کسی چیز سے ڈرنے کی ضرورت ہے اور نہ زندگی کو نیا موڑ دینے کی۔ اس روز تو میں کافی سہما ہوا تھا اور دوسرے دن بھی کچھ خوفزدہ رہا مگر اسکے بعد مجھے زندگی میں اصلاح کرنیکی ضرورت محسوس نہیں ہوئی بلکہ میں نے یہ خیال ہی اپنے دماغ سے نکال دیا۔ پھر جبتک دوسرا طوفان نہ آیا مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی اور میں آرام و سکون سے زندگی بسر کرتا رہا۔

تین ہفتے بعد طوفان پھر آیا۔ یہ بڑا خطرناک طوفان تھا۔ اس سے پہلے ایسا زبردست طوفان میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسی روز سہ پہر کو "ڈچی" اس طوفان کی بھینٹ چڑھ گیا۔ ڈچی ہمارے سنڈے اسکول کا ساتھی تھا۔ وہ جرمنی کا رہنے والا تھا۔ اس غریب کو تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ بارش سے بچکر گھر کیسے پہنچا جا سکتا ہے۔ وہ بہت نیک تھا اور اسکی یادداشت غضب کی تھی۔ ایک اتوار کو جب اس نے بائبل کی تین ہزار آیتیں بلا ایک لفظ چھوڑے ہوئے زبانی سنا دیں، اور سبھی لوگوں نے اسکی بہت تعریف کی دوسرے لڑکوں کو اس پر بہت رشک آیا۔ اسکے دوسرے ہی دن بیچارہ ڈوب گیا۔

اسکی موت بھی عجیب و غریب حالات میں ہوئی جسکا چرچا بہت دنوں تک رہا۔ ہم لوگ دریا کی ایک کھاڑی میں جسمیں گدلا پانی بھرا رہتا تھا نہایا کرتے تھے۔ اس کھاڑی میں ایک کنڈ

جبیں چپٹے اور ٹب بنانیوالے کاریگروں نے کچھ لٹھے گاڑ رکھے تھے۔ یہ لٹھے اخروٹ کی لکڑی کے تھے جنہیں پکڑنے کے لئے چھلے ڈالدیے گئے تھے۔ اور انہیں ملائم بنانے کے لئے پانی کے اندر گیارہ فٹ گہرا گاڑ دیا گیا تھا۔ ہم لوگ پانی میں گھس گھس کر یہ کھیل کھیل رہے تھے کہ دیکھیں کون زیادہ دیر تک پانی کے اندر ٹھہر سکتا ہے۔ ہم انھیں لٹھوں کے چھلوں کو پکڑ کر پانی کے اندر ٹھہرنے کی کوشش کیا کرتے۔ اس کھیل میں ڈیچی ہر بار سب سے ہار جاتا۔ اسلئے جیسے ہی وہ پانی سے اپنا سر باہر نکالتا سب لڑکے اس پر ہنستے اور اس کا مذاق اڑاتے۔ آخر کار ساتھیوں کے طعنوں سے اسے اتنی چوٹ پہونچی کہ اس نے بھی اپنے جوہر دکھانے کا ارادہ کرلیا اور سب ساتھیوں سے درخواست کی کہ وہ چپ چاپ کنارے پر کھڑے ہوکر اسکا کرتب دیکھیں اور اسکی بہادری کی صحیح داد دیں اور کم ازکم ایک مرتبہ تو اسکے ساتھ انصاف اور ہمدردی کا سلوک کریں اور اس کا مذاق اڑانے کیلئے جھوٹ نہ بولیں بلکہ صحیح بتادیں کہ وہ واقعی کتنی دیر پانی میں ٹھہرا۔ اس پر سب لڑکوں نے شرارتاً ایک دوسرے کو آنکھ کا اشارہ کردیا اور ڈیچی سے بولے "اچھی بات ہے ڈیچی جاؤ پانی میں غوطہ لگاؤ ہم سب انصاف سے کام لیں گے۔"

ڈیچی تو پانی میں کود گیا مگر دوسرے لڑکوں نے اسے دھوکا دیا۔ بجائے اس کے وہ گنتی گنیں اور اسکے پانی کے اندر ٹھہرنے کا حساب لگائیں وہ ایک شیطان ساتھی کے پیچھے بھاگ کر پاس کی ایک بلیک بیری کی جھاڑی کے پیچھے چھپ گئے۔ انھوں نے سوچا کہ جب ڈیچی اپنا غیر معمولی کرتب دکھا کر پانی کے باہر آئیگا تو اسے باہر کوئی نظر نہیں آئیگا جو اسکی تعریف کرے اور اسلئے وہ ناامید ہوکر بہت کھسیائے گا اور تب انھیں بڑا مزہ آئیگا۔ اس شرارت پر انھیں اتنی ہنسی آرہی تھی کہ رکنے کے نہ رکی تھی۔ وہ لگاتار چھپے چھپے دکھی دکھی کر رہے تھے۔

جب بہت دیر ہوگئی تو لڑکوں کو کچھ شبہ ہوا اور ایک لڑکے نے جو برابر جھاڑی کے پیچھے سے جھانک کر دیکھ رہا تھا کہا "ارے ڈیچی تو ابھی تک نہیں نکلا!"

سب کی ہنسی رک گئی۔

ایک نے کہا "بھئی کیا غضب کا غوطہ لگایا ہے۔؟"

دوسرے نے کہا "کوئی بات نہیں۔ اب تو ہمیں اور زیادہ مزہ آئے گا" اسطرح

ایک دو اور جملے اچھالے گئے مگر پھر سناٹا چھا گیا اور سب خاموش ہو گئے اور جھاڑیوں کی آڑ سے جھانکنے لگے۔ اب تو لڑکوں کے چہروں پر پریشانی ہُویدا تھی اور سب خوفزدہ نظر آ رہے تھے۔ پانی کی سطح اب بھی ویسی ہی ساکت تھی۔ انہیں کوئی حرکت نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ خوف سے لڑکوں کے دل دھڑکنے لگے اور چہرے پیلے پڑ گئے۔ پھر ہم سب لوگ باہر نکل کر آئے اور چپ چاپ کنارے پر کھڑے ہو گئے گھبرائے ہوئے کبھی ایک دوسرے کے چہرے کی طرف دیکھتے اور کبھی پانی کی طرف۔ پھر کسی نے کہا " ہم میں سے کسی کو پانی میں گھس کر دیکھنا چاہیئے کہ کیا بات ہے"۔ تجویز تو معقول تھی مگر یہ خطرناک کام کرتا کون؟ پھر کسی نے کہا " آؤ تنکا کھینچیں"۔ اور ایسا ہی ہم نے کیا۔ ایک لڑکے نے اپنے ہاتھ پاؤں میں تنکا پھنسا لیا اور ایک ایک کر کے ہم سب اُسے کھینچنے لگے۔ تنکا اسکے ہاتھوں کے بیچ ایسا پھنسا ہوا تھا کہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کب نکل پڑے۔ بدقسمتی سے قرعہ فال میرے نام نکلا اور مجھے پانی کے اندر جانا پڑا۔ پانی اتنا گدلا تھا کہ مجھے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا لیکن جب میں نے لٹھوں کے بیچ ٹٹول کر دیکھا تو ایک مردہ ڈھیلی ڈھالی سی کلائی میرے ہاتھ میں آ گئی جسمیں کچھ جان نہیں معلوم ہوتی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ جان ہو اور مجھے محسوس نہ ہوئی ہو اسلئے چھوتے ہی ڈر کر میں نے اُسے چھوڑ دیا۔

بیچارہ ڈچی لٹھوں کے بیچ پھنس کر رہ گیا تھا۔ میں پانی سے باہر نکلا اور یہ خوفناک خبر اپنے ساتھیوں کو دی۔ ہم میں سے کچھ یہ جانتے تھے کہ اگر کسی طرح اس لڑکے کو باہر کھینچ کر لے آتے تو ممکن تھا اسکی جان بچ جاتی' لیکن اسطرف تو ہم لوگوں نے سوچا ہی نہیں۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ اسلئے ہم کچھ نہ کر سکے۔ ہم نے اسکی جان بچانے کی کوئی ترکیب نہ کی سوائے اسکے کہ ہم میں سے جو چھوٹے بچے تھے وہ رونے چلّانے لگے اور ہم سب خوفزدہ ہو کر اپنے اپنے کپڑے پہننے کو دوڑے مگر گھبراہٹ اور جلدی میں اپنے کپڑے پہچاننے کا کسے ہوش تھا۔ جسکے ہاتھ جو کپڑا لگا اس نے وہی بدن پر ڈال لیا اور الٹے سیدھے پہن کر بھاگے۔ بھاگتے ہوئے ہم چیختے چلّاتے جاتے تھے مگر ڈر کے مارے کوئی بھی پیچھے کو لوٹ کر نہیں گیا تاکہ یہ معلوم کرے کہ کسی نے اُسے نکالا یا نہیں۔ ہمیں تو اپنی اپنی فکر لگی تھی کہ کب گھر پہونچیں۔ اپنے اپنے گھر پہونچتے ہی ہم نے فوراً یہ عہد کیا کہ زندگی بھر نیک کام کریں گے۔

رات پھر ڈراؤنی ہو چکی تھی اور اسی وقت وہ ہیجان بپا کرنے والا بے انتہا خوفناک
طوفان آیا تھا۔ میں بالکل بھونچکا کھڑا تھا۔ میری عقل جواب دے چکی تھی۔ مجھے ایسا محسوس
ہوتا تھا کہ اس خوفناک طوفان کی ضرور کوئی وجہ ہے۔ عناصر منتشر تھے اور ہر طرف گڑگڑاہٹ
شور و شر اور بجلی کی چمک تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی پاگل پن اور جنون میں اندھا
دھند توڑ پھوڑ اور بربادی پر تلا ہوا ہو۔ میرا دل ٹوٹ گیا اور سب امیدیں کافور ہو گئیں اور
دماغ پراگندہ ہو گیا۔ میں سوچنے لگا اگر ایسا نیک لڑکا جو انجیل کی تین ہزار آیتیں زبانی سنا سکتا
ہو، قہر الہٰی سے نہ بچ سکا تو پھر اور کیسے امان مل سکتی ہے۔

اب میرے دل میں یہ سوال نہیں تھا کہ قہر الہٰی کا یہ غضبناک مظاہرہ کسکے باعث ہو رہا تھا۔
ڈچی کی وجہ سے یا کسی بے دین انسان کی وجہ سے۔ بلکہ فکر تو اب مجھے اپنے انجام کی تھی کیونکہ
مجھے مکمل یقین ہو گیا تھا کہ جب ڈچی جیسا دیندار اور نیک لڑکا خدا کو خوش نہ کر سکا تو میرے
دیندار بننے اور نیکی کرنے سے بھی کیا فائدہ نکلے گا۔ کیونکہ میں کتنا ہی دیندار بن جاؤں ڈچی سے
ہمیشہ ہی پیچھے رہوں گا۔ لیکن پھر خدا کے خوف نے مجھ پر ایسا قابو پایا کہ میں نے نیک زندگی گذارنا
شروع کر دی۔ لیکن بعد میں دکھاوے، موج اڑاؤ کے جذبے نے مجھے اسقدر مغلوب کر دیا کہ
ایک ماہ کے اندر ہی میں دین کے راستے سے پھر اتنی دور ہٹ گیا جتنا کہ پہلے تھا اور پہلے کی طرح
عیش و آرام میں مست ہو گیا۔

میں پہاڑی پر کھڑا ان پرانی یادوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ ناشتہ کا وقت ہو گیا۔
اسلئے میں نیچے اترا اور ہوٹل کی طرف چل دیا۔ اور ان پرانی باتوں کو بھول کر اپنے روزانہ کے معمول میں
مشغول ہو گیا۔

ہوٹل جاتے ہوئے میں اس مکان سے گذرا جہاں میں بچپن میں رہا کرتا تھا۔ جو لوگ اب
وہاں رہتے ہیں انکی حیثیت میری حیثیت سے زیادہ نہیں ہے۔ لیکن اس زمانے میں جب میں
وہاں رہتا تھا تو یہ لوگ کافی مالدار تھے اور ہر ایک کی آمدنی پانچ ڈالر سے کم نہ ہوگی۔ یہ لوگ کالی
نسل کے یعنی حبشی ہیں۔ ناشتہ کے بعد میں پھر اکیلا شہر میں گھومتا رہا۔ میرا ارادہ کچھ سنڈے
اسکول دیکھنے کا تھا۔ جس سے میں یہ اندازہ لگا سکتا کہ موجودہ دور کے بچے پچھلے دور کے بچوں سے

کتنے مختلف ہیں کیونکہ پچھلے دور میں تو میں بھی بچہ ہی تھا۔ اور سنڈے اسکول میں پڑھتا تھا میرے ساتھی مجھے نمونہ مان کر چلتے تھے۔ حالانکہ وہ سب باتیں میں بھول چکا ہوں پرانے زمانے میں یہاں پبلک اسکوائر کے پاس ہی ایک اینٹوں کا بنا ہوا پرانا سا گرجا گھر تھا جسکا نام اولڈ شپ آف زیان تھا۔ وہاں میں سنڈے اسکول کے طالب علم کی حیثیت سے جایا کرتا تھا۔ جگہ تو میں نے تلاش کر لی تھی لیکن اب وہاں وہ پرانا گرجا گھر نہیں تھا بلکہ اسکی جگہ وہاں ایک صاف ستھری عالیشان عمارت کھڑی ہوئی تھی۔ میرے زمانے کے مقابلے میں اب لوگ زیادہ اچھا لباس پہنے تھے دیکھنے میں بھی زیادہ اچھے معلوم ہوتے تھے وہ اپنے آباواجداد سے بالکل مشابہت نہیں رکھتے تھے اسلئے مجھے انمیں اپنے زمانے جیسی کوئی بات نظر نہیں آئی پھر بھی میں انھیں بڑے غور سے دیکھتا تھا اور انکے متعلق بڑی حسرت کیساتھ سوچنے لگتا تھا کیونکہ میرے ہم وطن ہوتے ہوئے بھی وہ میرے لئے غیر بن چکے تھے اگر میں لڑکی ہوتا تو افسوس کے مارے رو پڑتا کیوں کہ ان لوگوں کو دیکھ کر مجھے اپنے ساتھیوں کی یاد آرہی تھی یہ لوگ میرے ان ہی ساتھیوں کے بال بچے ہونگے۔ جن جگہوں پر یہ آج بیٹھے ہیں انھیں جگہوں میں ایکدن میرے ساتھ کے لڑکے اور لڑکیاں بیٹھتے تھے۔ گو کچھ کو میں پیار کرتا تھا اور کچھ سے نفرت۔ پھر بھی وہ سب کسی نہ کسی طرح میرے لئے عزیز تھے اب تو ان سے جدا ہوئے ایک عرصہ ہوگیا خدا جانے اب وہ کہاں ہونگے۔

اسوقت میرے دلمیں ایک طوفان بپا تھا اسوقت مجھے کوئی نہ چھیڑتا تو میں بہت خوش ہوتا اور جی بھر کے اس ماحول کو دیکھتا لیکن ایک گنجے سر والے آدمی نے مجھے ایکدم چونکا دیا۔ یہ شخص سنڈے اسکول کا سپرنٹنڈنٹ تھا اور اسی جگہ میرے ساتھ پڑھا کرتا تھا۔ اسوقت اس کے بال سن کی طرح سفید تھے اس نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ اور میں نے اپنے خیالات کو فوراً چھپانے اور بدلنے کی کوشش کی اور اسکول کے بچوں سے بہت سی فضول کی باتیں کرنا شروع کردیں مگر یہ سب میں اوپری دل سے کررہا تھا گو کہ یہ چیز میری فطرت کے خلاف تھی۔

بغیر تیاری کئے ہوئے برجستہ تقریر کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی اور اسلئے میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ اگر بولنے کا کوئی موقع آیا تو میں اسے ٹالنے کی کوشش کرونگا۔ لیکن جب میں ایک دوسرے

بڑے سنڈے اسکول میں گیا تو مجھے مجمع میں سب سے پیچھے جگہ ملی اسلئے میری خواہش ہوئی کہ میں اسٹیج پر جاکر پڑھنے والے بچوں کو ذرا غور سے دیکھوں میرے زمانے میں جب باہر سے کوئی ملاقاتی یا معائنہ کرنیوالے اسکول میں آتے تھے تو بچوں کو خطاب کرتے اور اوٹ پٹانگ بول کر چلے جاتے تھے۔ مجھے یہ برا معلوم ہوتا تھا۔ مگر اسوقت مجھے بھی ایسی ہی تقریر کرنیکی ضرورت پڑی تاکہ اسی بہانے بچوں کو جی بھرکے دیکھ سکوں۔ افسوس کہ اسوقت مجھے کوئی بات یاد ہی نہیں رہی تھی۔ مگر میں ان بچوں کی طرف جی بھرکے دیکھنا بھی چاہتا تھا۔ کیونکہ میرے خیال میں یہ بچے اس قسم کے دوسرے اسکولوں کے بچوں سے کہیں زیادہ ہشاش بشاش اور خوبصورت لگتے تھے۔ ان سے بات چیت کرنیکے بہانے میں انھیں غور سے دیکھ رہا تھا اور اپنی اوٹ پٹانگ باتیں صرف اس غرض سے کر رہا تھا کہ مجھے انکو اچھی طرح دیکھنے کا زیادہ سے زیادہ موقع مل سکے لیکن میرے خیال سے اسمیں کوئی برائی نہیں کہ میں اپنے اس ادنیٰ مقصد کا اظہار بھی کر دوں۔ اسی لئے میں نے ان سے اپنے دل کی بات کہدی۔

مجھے پتہ نہیں کہ ان دونوں سنڈے اسکولوں میں کوئی مثالی لڑکا تھا بھی یا نہیں اور اگر ہوگا تو میں نے اسے نہیں دیکھا۔ میرے زمانے میں جو مثالی لڑکا ہوتا تھا اسمیں بہت سی خوبیاں ہوتی تھیں وہ ہر طرح سے مکمل ہوتا تھا۔ اسکے آداب، اسکا اخلاق، اسکی پوشاک، اسکا برتاؤ، اسکی سعادتمندی تقویٰ اور خدا پرستی سب خوبیاں اسمیں بدرجہ اتم موجود ہوتی تھیں مگر اندر سے اس میں خود بینی اور خود پسندی ضرور ہوتی تھی۔ خواہ اسکے ذہن میں علم وحکمت کے بجائے بھوسہ بھرا ہوا یا شاید اس سے بھی کوئی خراب چیز بھری ہو پھر بھی اس لڑکے کو بے عیب اور مثالی بتاکر اسکے مقابلے میں گاؤں کے ہر لڑکے کو ناقص بتایا جاتا تھا۔ اسی لئے گاؤں بھر کی عورتیں اس مثالی لڑکے کی تعریف کیا کرتیں مگر انکے بیٹے اس سے نفرت کرتے تھے میرے زمانے میں جو مثالی لڑکا تھا اسکے بارے میں بھی مجھے بتایا گیا کہ اسے زندگی میں کیسی کامیابی ہوئی تھی۔ مگر میں اسکو یہاں بیان نہیں کروں گا کیونکہ اسکے حالات سے خود مجھے بڑی ناامیدی ہوئی۔ بہرحال یہاں اتنا ہی کہدینا کافی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کامیاب رہا۔

پچپنواں باب

اِنتقام قتل کی لڑائی اور دُوسری باتیں

میں ہینی بل کے قصبے میں تین دن ٹھہرا۔ وہاں کا ماحول برابر مجھے میرے بچپن کی یاد دلاتا رہا۔ ہر روز صبح کو جب میں سو کر اٹھتا تو یہ احساس ہوتا کہ میں ابھی لڑکا ہی ہوں۔ رات کو خواب میں جو شکلیں دیکھتا وہ بھی سب نوجوانوں کی ہوتیں۔ یعنی یہاں کے مرد و عورت جو اب سن رسیدہ ہو چکے تھے وہ مجھے خواب میں اتنے ہی نوجوان دکھائی دیتے جتنے کہ وہ میرے لڑکپن کے زمانے میں تھے۔ لیکن جب رات کو میں سونے جاتا تو اپنے آپکو سو سال کا بوڑھا محسوس کرتا کیونکہ دن بھر میں سن رسیدہ لوگوں کو انکی اصلی حالت میں دیکھتا۔

درحقیقت اس اثنا میں قصبے میں اتنی اہم تبدیلیاں ہو چکی تھیں پہلے تو مجھے قدم قدم پر تعجب ہوتا تھا۔ مگر پھر دھیرے دھیرے میں انکا عادی ہو گیا۔ جب میں کچھ جوان عورتوں سے ملا تو پہلے میں یہ سمجھا کہ یہ عورتیں پہلے کی طرح جوان ہیں اور انمیں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ عورتیں وہ نہیں تھیں جو میں سمجھا تھا بلکہ یہ انکی بیٹیاں یا پوتیاں تھیں۔ اگر آپ سے کسی اجنبی عورت کے بارے میں یہ کہا جائے کہ یہ پچاس سالہ عورت کسی کی دادی یا نانی ہے تو آپکو کوئی تعجب نہ ہوگا۔ لیکن اگر اسی عورت کو آپ نے اسوقت دیکھا ہو جبکہ وہ ایک چھوٹی سی لڑکی تھی تو آپ کو یہ سنکر واقعی تعجب ہوگا کہ وہ کچھ بچوں کی دادی یا نانی بن چکی ہے بلکہ شاید آپکو یقین بھی نہ آئے آپ اپنے دلمیں یہ سوچنے لگیں گے کہ ارے وہ ذرا سی لڑکی اتنی جلدی دادی یا نانی کیسے بن سکتی ہے؟ پھر دھیرے دھیرے آپ کو یقین آتا ہے کہ جب آپکی عمر برابر بڑھتی جا رہی ہے تو کیا دوسروں کی نہیں بڑھے گی۔

میں نے ایک اور بات دیکھی اور وہ یہ کہ تبدیلیاں مردوں کے مقابلہ میں عورتوں میں زیادہ تھیں۔ میں نے ایسے آدمیوں کو دیکھا جنہیں تیس سال میں بھی کوئی خاص تبدیلی واقع نہیں ہوئی جبکہ اس اثنا میں انکی بیویاں بوڑھی ہو چکی تھیں۔ وہ نیک تھیں اور نیک انسان ہی زیادہ مصائب اٹھایا کرتے ہیں۔

پہلے وہاں ایک زین ساز سے میری جان پہچان تھی میں اُس سے ملنا چاہتا تھا لیکن اب وہ وہاں نہیں تھا۔ لوگوں نے بتایا کہ وہ بہت سال ہوئے مر گیا۔ ان دنوں وہ دن میں ایک یا دو بار بازار میں نکلا کرتا تھا۔ وہ کوٹ پہنے ہوتا تھا جسے دیکھکر ہر آدمی سمجھ جاتا تھا کہ کوئی ہوائی جہاز آرہا ہے۔ اسکا نام تھا جون آسٹیوٹے ہر شخص جانتا تھا کہ جون آسٹیوٹے کو نہ تو جہاز پر کسی سے ملنا تھا اور نہ کسی سامان کا انتظار تھا۔ اُسے بھی یہ بات معلوم تھی کہ ہر شخص اس بات سے واقف ہے۔ پھر بھی اُسے روز گھاٹ تک جانے میں مزہ آتا تھا۔ وہ اس سنجیدگی سے جاتا تھا گویا وہ ایک لاکھوں زین کا سامان کشتی سے اتروانے جارہا ہو اور اسی خیال سے محظوظ ہونیکے لئے وہ عمر بھر گھاٹ کی سیر کرنے برابر جاتا رہا۔ اپنے تصور میں وہ غالباً یہ امید لگائے رہتا تھا کہ شاید کسی معجزے سے کہیں سے زینوں کا بنڈل آٹپکے۔ کیونسی کا ایک اخبار جو ہمیشہ ایسے لوگوں کیخلاف زہر اگلتا رہتا تھا اس قصبے کو نفرت آمیز لہجہ میں اسٹیوٹے گھاٹ کے نام سے موسوم کیا کرتا تھا۔ میں شروع شروع میں مسٹر اسٹیوٹے کی بہت تعریف کیا کرتا تھا اور اپنے روزگار کیمتعلق وہ جو خیالی پلاؤ پکاتا رہتا تھا اس پر مجھے بہت رشک آتا تھا خصوصاً اُسوقت جب وہ اجنبیوں کے سامنے سڑک پر نازو انداز سے چلتا اور اپنے کوٹ کو جو ہوا میں اڑتا رہتا تھا بار بار سنبھالتا۔

لیکن میرا سب سے بڑا ہیرو ایک بڑھئی تھا جو بہت جھوٹ بولتا تھا مگر مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔ اسلیے جو کچھ وہ کہتا میں اسکا یقین کر لیتا۔ اسکی باتیں بڑی رومانی، جذباتی، شورش انگیز اور جھوٹی ہوتی تھیں۔ اس کی وضع قطع کا مجھ پر بہت رعب تھا۔ مجھے ابھی طرح یاد ہے کہ ایکبار تبہ اس نے مجھ سے راز کی کچھ باتیں کہیں۔ وہ اسوقت ایک تختے پر رندہ کر رہا تھا۔ رُک رُک کر وہ سرد آہیں بھرتا اور کبھی کبھی ٹوٹے پھوٹے جملوں میں کچھ کہنے لگتا جو واضح نہ ہونے کی وجہ سے میری سمجھ میں نہ آتے تھے۔ لیکن بیچ بیچ میں جو صاف . . . .

بات اچانک اسکی زبان سے نکل جاتی وہ اتنی خوفناک ہوتی تھی کہ میں ڈر کے مارے کانپ اٹھتا تھا۔ تاہم اس سے مجھے اسکا کچھ راز معلوم ہو جاتا۔ وہ الفاظ یہ تھے "یا خدا یہ تو اس آدمی کا خون ہے" میں اسکے اوزاروں کے بکس کے اوپر بیٹھا ڈرتے ہوئے بڑی انکساری کے ساتھ اسکی تعریف کر رہا تھا۔ کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بڑا دلیر قسم کا مجرم ہے بالآخر اس نے خود ہی دھیمی آواز میں کہنا شروع کیا۔

"اے میرے ننھے دوست! کیا تم کوئی راز کی بات اپنے تک محدود رکھ سکتے ہو"

میں نے بڑے اشتیاق سے جواب دیا "ہاں ضرور"

اس نے پھر کہا "میرا راز بڑا خوفناک اور گھناؤنے قسم کا ہے"

اس پر میں نے اُسے اطمینان دلایا۔ کہ میں اسکے راز کو افشا نہیں کروں گا۔

وہ بولا "پھر میں تمہیں اپنی کہانی ضرور سناؤں گا کیونکہ مجھے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا ہے ورنہ میں مر جاؤں گا"

کچھ سنانے سے پہلے ایکبار اس نے پھر مجھے تنبیہہ کی کہ میں ہمیشہ اس کا راز اپنے تک رکھوں گا۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ وہ بہت بڑا قاتل ہے۔ اور یہ کہہ کر اس نے رندہ اپنے ہاتھوں سے رکھدیا۔ اپنے دونوں ہاتھ سامنے پھیلائے اور انکو دیکھ کر افسوس کرنے لگا۔ پھر بولا "دیکھو۔ ان ہاتھوں نے کم از کم تیس انسانوں کی جانیں لی ہونگی"

اسکی اس بات سے مجھ پر جو ردِ عمل ہوا اُسے دیکھکر اُسمیں اور جوش آیا اور اس نے بڑے جوش و خروش سے جی بھر کے بولنا شروع کر دیا۔ ایک ایک بات کہہ کے وہ اسکی تفصیل بیان کرنے لگا۔ اپنے پہلے قتل کی واردات کو شروع کر کے اس نے اسے بالتفصیل بیان کیا اور پھر یہ بتایا کہ لوگوں کے شبہات دور کرنے کیلئے اس نے کیا اقدام اٹھائے۔ پھر دوسرے، تیسرے، چوتھے قتل کا یکے بعد دیگرے ذکر کیا۔ اس نے ہر قتل ایک لمبے پھل والے چاقو سے کیا تھا۔ اچانک جب اس نے وہ چاقو نکال کر مجھے دکھایا تو مارے ڈر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اس پہلی نشست کے بعد جب میں گھر گیا تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میرے خوف میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا ہے۔ کیونکہ میرے دل پر چھ ہولناک قتلوں کے راز کا بوجھ

تھا ابتک میں رات کو کچھ دیر گہری نیند سو جاتا تھا۔ کیونکہ کچھ دنوں سے مجھے خواب کم ہی دکھائی دیتے تھے۔
مگر اب رات میں پھر سے مجھے خوفناک خواب پریشان کرنے لگے ہر سنیچر کی چھٹی میں میں اس شخص کو تلاش کیا
کرتا۔ دراصل میں نے اپنی گرمیوں کی سب چھٹیاں جن میں مجھے بہت سے کام کرنے تھے اسکے ساتھ ہی
گنوا دیں۔ پھر بھی اس شخص سے ملنے کا اشتیاق کم نہ ہوا۔ کیونکہ جب بھی وہ مجھ سے ملتا مجھے نئی اور
حیرت انگیز باتیں سناتا جو ہر بار کسی نئے قتل کی واردات سے منسلک ہوتی تھیں جس سے مجھ پر اور بھی
دہشت طاری ہو جاتی۔ مجھے یقین دلانے کیلئے وہ جگہ، تاریخ اور مقتولوں کے نام وغیرہ سب کچھ بتلاتا۔
آخر کار ان باتوں سے میں نے دو باتوں کا اندازہ لگا لیا۔ ایک تو یہ کہ اس نے اپنے دشمنوں کو دنیا کے
ہر خطے میں قتل کیا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہ اپنے ہر دشمن کا نام ہمیشہ لیج ہی بتلاتا تھا ان لیجوں کو وہ
بڑی صفائی سے سنیچر کے سنیچر قتل کرتا چلا جاتا تھا۔ یہانتک کہ اسکے مقتولوں کی تعداد ساٹھ تک پہنچ
گئی۔ حالانکہ پہلے اس نے کل تعداد صرف تیس ہی بتلائی تھی۔ اسکے باوجود اسکی کہانی ابھی باقی تھی۔
اب میرا خوف و ہراس تو کم ہو گیا تھا مگر اسکے بارے میں اور باتیں جاننے کا اشتیاق بڑھ گیا تھا۔ میں نے
اس سے یہ سوال کیا کہ اسکی کیا وجہ تھی کہ اسکے سب دشمنوں کا نام لیج ہی تھا۔ اس پر میرے ہیرو نے
مجھے بتایا کہ اس بات میں ایک راز تھا جو ابتک اس نے کسی کو نہیں بتلایا تھا۔ لیکن چونکہ مجھ پر اسے
کامل اطمینان تھا اسلئے وہ مجھے اپنی دکھ بھری کہانی من و عن سنا دیگا۔ اسکا عشق ایک بہت خوبصورت
لڑکی سے تھا۔ ایسی خوبصورت لڑکی اس نے روئے زمین پر کہیں نہیں دیکھی تھی۔ اور وہ لڑکی بھی
صدق دلی اور خلوص کیساتھ اسکی محبت کا جواب دیتی تھی وہ نیک خصلت اور خوش اخلاق تھی لیکن
اس سلسلے میں اسکا ایک رقیب بھی پیدا ہو گیا تھا۔ جو ایک کمینہ خصلت انسان تھا جسکا نام آرچی
بالڈ لیج تھا اور جو یہ کہتا تھا کہ یہ لڑکی اسی کو ملنی چاہیئے ورنہ وہ اسکے خون سے اپنے ہاتھ رنگے گا۔
ادھر بڑھئی بے چارہ معصوم اور عشق کے راگ رنگ میں مست تھا۔ اسلئے اس نے لیج کے چیلنج کا کوئی
خیال نہیں کیا۔ خوش قسمتی سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور اس نے اس سنہرے بالوں والی
محبوبہ سے شادی کر لی دونوں ایک جان دو قالب ہو گئے مگر ٹھیک اسی وقت جبکہ پادری انکے
سروں پر اپنا دست شفقت رکھے انہیں دعا دے رہا تھا بڑھئی کے رقیب نے اپنا گھناؤنا ارادہ پورا
کر ڈالا۔ یعنی اس نے لڑکی پر چاقو سے ایسا وار کیا۔ کہ بیچاری کا کام تمام ہو گیا اور اسکی لاش اس

کے خاوند کے قدموں پر گر پڑی۔ اور پھر خاوند نے کیا کیا؟ اس نے وہی چاقو لڑکی کے جسم سے نکالا اور اپنی محبوبہ کی لاش پر جھک کر قسم کھائی کہ دنیا میں جتنے بھی انسان قابلِ نفرین لیَنج نام کے ہونگے وہ ان سب کو موت کے گھاٹ اتارنے ہی میں اپنی زندگی وقف کر دیگا۔

چنانچہ یہی وجہ تھی کہ اس نے لیَنج نام کے مردودوں کو قتل کرنے کیلئے لینچوں کو کھوجنا اور انھیں مارنا شروع کر دیا اور اس روز سے آجتک بیس سال سے وہ یہی کام کر رہا تھا۔ اس کام میں اس نے اسی مخصوص چاقو کو استعمال کیا تھا۔ اس نے اسی چاقو سے لینچوں کی کثیر تعداد کا صفایا کر ڈالا تھا۔ ہر لیَنج کے ماتھے پر اسی چاقو سے وہ ایک گہرا کراس کی شکل کا زخم کاری لگایا کرتا تھا۔ اس کے بعد وہ بڑھیا مجھ سے مخاطب ہو کر بولا:۔

"اس پُر اسرار انتقام لینے والے کے کراس کی دھوم تمام یورپ، امریکہ، چین، سیام اور منطقہ حارہ کے ممالک میں یہانتک کہ قطبین تک نیز ایشیا کے ریگستانوں میں غرضیکہ دنیا میں ہر جگہ پھیل گئی۔ روئے زمین پر جہاں کہیں لیَنج نام کا کوئی شخص ہوتا۔ وہیں یہ کراس کا زخم بھی دیکھنے کو ملتا۔ اور جو بھی اسے دیکھتا ڈر کے مارے کانپتا اور کہتا "یہ زخم تو اسی نے لگایا ہے۔ معلوم ہوتا ہے وہ یہاں آیا ہوگا۔ تم نے بھی اس پُر اسرار انتقام لینے والے کا نام سنا ہوگا تو اب دیکھ بھی لو وہ تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ لیکن خبردار کسی سے کہنا ایک لفظ بھی نہیں۔ خاموش رہ کر بس سنتے جاؤ۔ دیکھنا کسی روز صبح صبح یہاں اس قصبے میں بھی لوگوں کے ہجوم کے ہجوم کسی خون آلودہ لاش کو دیکھنے کے لئے اکٹھے ہونگے اور اس لاش کے ماتھے پر وہی کراس کا زخم دیکھ کر خوفزدہ ہونگے اور کانپتے ہوئے کانا پھوسی کریں گے "وہ قاتل یہاں بھی آ گیا۔ اسی نے انتقام لینے کیلئے یہ زخم کاری لگایا ہے۔ تم تو یہیں رہو گے لیکن میں غائب ہو جاؤں گا اور تمہیں پھر کبھی دکھائی نہ دوں گا۔"

واقعہ در اصل یہ تھا کہ اس احمق نے جیتے نے لوٹے کعاب کے قصے کہانیاں پڑھ رکھی تھیں اور ان رومانی کہانیوں سے اس کا دماغ پھر گیا تھا۔ لیکن چونکہ میں نے اس وقت تک وہ کعاب دیکھی بھی نہیں تھی اسلئے میں اسکی من گھڑت باتوں کو سچ ہی مانتا رہا مجھے یہ شبہ تک نہ ہوا کہ اس نے

یہ سب لن ترانیاں کتابوں کے قصّوں سے چرائی تھیں۔

اتفاق سے اس شہر میں بھی ایک شخص لینج نام کا رہتا تھا۔ مجھے اسکی بہت فکر تھی کہ نہ معلوم اس غریب پر کب یہ بلا نازل ہوجائے لہٰذا جتنا میں اسکے بارے میں سوچتا اتنا ہی متفکر و پریشان ہوجاتا۔ یہانتک کہ میری نیند حرام ہوجاتی۔ مجھے خیال آیا کہ اسے بچانا میرا فرض اوّلین تھا۔ حالانکہ اس سے زیادہ مجھے اپنی صحت کی فکر تھی کہ میں کس طرح بیفکری کی نیند سوؤں۔ اسلئے میں نے یہ تہیہ کرلیا کہ میں مسٹر لینج کے پاس جاکر اُسے صاف صاف بتادوں گا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ اور اس سے یہ بات صیغۂ راز میں رکھنے کی ہدایت کردوں گا۔ چنانچہ میں نے اُسکے پاس جاکر اُسے ہدایت کی کہ وہ بھاگ جائے۔ اور میرا خیال تھا کہ وہ ضرور بھاگ جائیگا لیکن اسکے برخلاف وہ مجھ پر ہنسنے لگا۔ اور وہاں سے میرے ساتھ ہی چلدیا اور مجھے اس بڑھئی کی دوکان پر لے گیا اور اسکو بڑے حقارت آمیز لہجے میں بہت سخت و سُست کہا کہ وہ ایسی لن ترانیاں کیوں ہانکتا ہے۔ بلکہ اس نے بڑھئی کے گال پر تھپڑ بھی جڑ دیئے۔ اور اُسے قدموں پر گر کر معافی مانگنے پر مجبور کردیا۔ اس کے بعد وہ تو چلا گیا اور میں وہاں کھڑا یہ دیکھتا رہا کہ جس شخص کو ابھی تھوڑی دیر پہلے میں بڑا بہادر اور لاثانی ہیرو سمجھے ہوئے تھا کتنی جلدی اسکی سب شان کرکری ہوگئی۔ اسکے چلے جانیکے بعد بڑھئی کچھ بوکھلایا پھر اس نے اپنا چاقو نکال کر ہوا میں لہرایا۔ اور اس آدمی یعنی مسٹر لینج کو گالیاں دیں اور پہلے کی طرح غصّہ میں اُبل پڑا۔ اس نے گندے سے گندے الفاظ میں لینج کو بُرا بھلا کہا لیکن اب مجھ پر ان باتوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ میں اسے اب ہیرو ماننے کو تیار نہ تھا۔ وہ تو حمق، دھوکےباز اور مکّار تھا۔ اب مجھے اسکی لن ترانیوں پر شرم آرہی تھی اور اپنی بیوقوفی پر بھی۔ اس روز سے مجھے اُس بڑھئی میں کوئی دلچسپی نہیں رہی اور میں پھر اس کی دکان پر کبھی نہیں گیا۔ حالانکہ مجھے نقصان یہ ہوا کہ میرا سب سے بڑا ہیرو ہمیشہ کیلئے ختم ہوگیا کیونکہ بہادری کی جو داستانیں اُس نے سنائی تھیں ویسی پہلے مجھے کبھی سننے کو نہیں ملی تھیں یہ ماننا ہی پڑیگا کہ اس احمق میں بھی کچھ ہنر ضرور تھا۔ کیونکہ کچھ داستانیں اس نے اسقدر حیرت انگیز اور دلچسپ ڈھنگ سے سنائی تھیں کہ مجھے وہ ابتک تفصیل سے یاد ہیں۔

ہینی بل قصبے میں بہت تبدیلیاں ہوچکی ہیں۔ مگر یہاں کے لوگوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں

آئی۔ اب یہ گاؤں نہیں رہا۔ بلکہ شہر بن چکا ہے اور اب یہاں ایک میئر بھی ہے جسکی ایک کونسل ہے شہر میں پانی کی ٹنکی لگ چکی ہے یہاں کی آبادی تقریباً پندرہ ہزار کی ہے۔ اور یہ بہت خوشحال اور پُر رونق شہر بن گیا ہے جنوب اور مغرب میں واقع دوسرے شہروں کی طرح یہاں بھی پختہ سڑکیں بن چکی ہیں کیونکہ زیادہ تر شہروں میں ابھی تک پختہ سڑکیں اور سڑک کے کنارے پیدل چلنے والوں کیلئے راستے شاذونادر ہی ہوتے ہیں۔ اور اگر کہیں دکھائی بھی دیتے ہیں تو ان کے متعلق آنکھوں کو مشکل سے ہی یقین آتا ہے کہ یہ پختہ ہوں گے اور شہروں کی طرح ہیمبی بل بھی قریب پانچ چھ ریلوں کا مرکز بن چکا ہے یہاں ایک لاکھ ڈالر کی لاگت سے ریل سے آنیوالے سامان کا ایک نیا گودام بھی کھلا ہے۔ میرے زمانے میں اس شہر میں ایسی کوئی خصوصیت نہیں تھی اور نہ یہاں کی تجارت اتنے زوروں پر تھی اس زمانے میں تو دریا کے گھاٹ پر دن میں صرف ایکبار کشتی آتی تھی جس سے دو ایک مسافر یہاں اترا کرتے تھے اور کشتی کے ملاح یہاں کے بازار سے ایک آدھ مچھلی خرید لیا کرتے تھے۔ ایک دو مسافر یا معمولی سا سامان یہاں سے کشتی پر لدا کرتا تھا اور بس۔ مگر اب تو یہاں عمارتی لکڑی کی بہت بڑی تجارت ہوتی ہے اور اس وجہ سے اور بھی بہت سی متفرق اشیا درآمد برآمد ہونے لگی ہیں اور ہزاروں روپیہ کا لین دین ہوتا رہتا ہے۔

بیئر کریک یعنی دریا کی ریچھ والی شاخ (غالباً اس شاخ کا یہ نام اسلئے پڑ گیا کیونکہ یہ ریچھوں سے سدا محفوظ رہتی تھی اور کبھی کوئی ریچھ یہاں دکھائی نہ دیتا تھا۔) اب یہاں نظر نہیں آتی تھی۔ شاید یہ نئے نئے جزیروں اور عمارتی لکڑی کے انباروں کے نیچے دب گئی اور سوائے جاننے والوں کے اب کوئی یہ شناخت نہیں کر سکتا کہ پہلے یہاں دریا کی شاخ تھی یا نہیں۔ میں یہاں ہر سال گرمیوں میں تیرنے آیا کرتا تھا اور ہمیشہ ڈوبتے ڈوبتے بچتا۔ غوطے لگنے کے بعد مجھے لوگ باہر نکالا کرتے اور جب کوئی دشمن میرا مذاق اڑاتا تو مجھے پھر جوش آجاتا۔ اور میں پھر اسمیں کود پڑتا لیکن اب تو اس شاخ میں اتنی جگہ ہی خالی نہیں رہی ہے کہ کوئی ڈوب جائے ان دنوں جب یہ پانی سے لبریز رہتی تھی تو یہ شاخ جاڑا دینے والی بیماری پھیلانے کیلئے مشہور تھی مجھے اب بھی گرمیوں کا وہ موسم یاد ہے جب ہیمبی بل کے قصبے کا قریب قریب ہر انسان ایک ساتھ اس بیماری کا شکار ہو گیا تھا۔ طوفان آنے کی وجہ سے بہت سی چمنیاں ٹوٹ کر گر گئیں اور مکانات اتنی کثرت سے مسمار ہو گئے کہ شہر کو پھر سے تعمیر کرنا

پڑی۔ کچھ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ لورس لیپ اور اسکے مغرب کی طرف واقع پہاڑی کے درمیان جو وادی ہے وہ برفانی طوفان سے بن گئی ہے۔ مگر یہ دلیل صحیح معلوم نہیں ہوتی۔

ہیمی بل سے جنوب کی جانب ایک یا دو میل دور پُرفضا وادی میں ایک عجیب و غریب غار ہے جو چٹانوں کے درمیان واقع ہے۔ میں اُسے ایک بار پھر دیکھنا چاہتا تھا مگر وقت کم ہونیکی وجہ سے میں وہاں نہ جاسکا۔ میرے زمانے میں اس وادی کے زمیندار نے اس زمین میں اپنی چودہ سالہ مرحوم بیٹی کا مقبرہ تعمیر کرایا تھا۔ بیچاری لڑکی کی لاش کو تانبے کے ایک خول میں جسمیں شراب بھری تھی رکھا گیا اور پھر اسے غار کے ایک تاریک اندھیرے راستے میں لٹکا دیا گیا۔ چونکہ خول کے ڈھکن کو ہٹایا جا سکتا تھا اسلئے اکثر شریر قسم کے سیاح اس خول کو کھول کر لڑکی کے چہرے کو باہر گھسیٹ کر اسکا معائنہ کیا کرتے اور جسکی جو سمجھ میں آتا اس پر تبصرہ کرتا۔

چھپنواں باب

ایک قانونی نکتہ

پہلے بیبر کریک کے دہانے پر ایک مذبح تھا اور اسکے قریب ہی میں ایک چھوٹی سی جیل تھی جسکو کیلبوتھ کہتے تھے مگر اب وہاں انمیں سے کوئی بھی عمارت دکھائی نہیں دیتی یہاں کے ایک باشندے نے مجھ سے دریافت کیا "کیا آپ کو یاد ہے کہ جمی فن جو اس شہر کا ایک نامی شرابی تھا اسی جیل میں زندہ جلایا گیا تھا۔؟"

اب ذرا غور کیجیے کہ کس طرح وقت گذرنے پر لوگوں کی خراب یادداشت کے باعث تاریخ بگڑ جاتی چلی جاتی ہے۔ درامسل جمی فن کو اس جیل میں زندہ جلایا نہیں گیا بلکہ وہ اپنی قدرتی موت

مرا تھا اسکی موت شاہ بلوط کی لکڑی کی کوٹھری میں ہوئی جہاں نشے کی ہذیانی کیفیت میں خود
اس نے اپنی کوٹھری میں آگ لگائی اور اسکی زندگی اسی آگ کی نذر ہو گئی میں تو اسکو قدرتی موت ہی کہونگا۔
کیونکہ قدرت اسکو اسی طرح مارنا چاہتی تھی۔ دوسرے یہ کہ جمی فن یہاں کا باشندہ بھی نہیں تھا وہ تو
بیچارہ ایک پردیسی تھا جو دہسکی پیئے اِدھر اُدھر مارا مارا پھرتا تھا۔ اس معاملہ میں جتنی معلومات مجھے ہے
شاید ہی کسی اور کو ہوگی مجھے اس زمانے میں اس معاملے کا ذکر کرنے میں بڑا لطف آتا تھا کیونکہ مجھے
ہی اس بارے میں سب سے زیادہ علم تھا۔ ایک روز جاڑے کے موسم میں شام کے وقت یہ آوارہ گرد
اِدھر اُدھر گھومتا پھر رہا تھا۔ اسکے منہ میں پائپ تھا اور وہ لوگوں سے دیا سلائی مانگتا پھر رہا تھا
مگر بیچارے کو نہ تو کسی نے دیا سلائی دی اور نہ ہمدردی سے بات ہی کی۔ برخلاف اسکے کچھ شیطان
لڑکوں نے اسکا پیچھا کیا اور اسے پریشان کرنے لگا۔ مگر جب اُس نے کہا کہ مجھ پر رحم کرو میں غریب
اور بیکس پردیسی ہوں، تو مجھے شرم آئی اور مجھے اپنی غلطی پر افسوس ہوا۔ لہٰذا میں نے اُسے دیا سلائی
لادی۔ پھر میں بھاگ کر گھر گیا اور جاکر بستر میں لیٹ گیا۔ مگر میرے دل پر ایک بوجھ سا تھا۔ اور میرا
ضمیر مجھ پر ملامت کر رہا تھا۔ اس واقعہ کے ایک یا دو گھنٹہ بعد ہی وہ آدمی گرفتار کر لیا گیا اور مارشل
نے اسے لیجا کر اسی جیل میں بند کر دیا (وہاں کانسٹبل کو مارشل کہتے ہیں) صبح دو بجے کہیں آگ لگ
جانیکی وجہ سے گرجا گھر میں گھنٹی بجی تو لوگ گھروں سے نکل نکل کر باہر آگئے۔ میں بھی باہر آگیا۔ اس
آوارہ شخص نے دیا سلائی سے بڑا خطرناک کام لیا۔ اس نے اپنے پیال کے بستر میں آگ لگادی جس
سے کمرے کے فرش اور دیواروں میں جن پر شاہ بلوط کی لکڑی کی پرت چڑھی تھی۔ آگ لگ گئی جب
میں وہاں پہونچا تو قریب دو سو مرد، عورتیں اور بچے وہاں سہمے ہوئے کھڑے جیل کی سلاخ دار
کھڑکیوں کو جلتا دیکھ رہے تھے۔ ان سلاخوں کے پیچھے کھڑا جنون میں بھرا ہوا وہ آوارہ گرد
زور زور سے سلاخوں کو جھٹکا دے رہا تھا اور چیخ چیخ کر مدد کیلئے لوگوں کو بلا رہا تھا اسکے پیچھے
آگ برابر تیز ہوتی جارہی تھی اور اسکی تیز روشنی میں اسکا چہرہ ایسا لگ رہا تھا جیسے سورج کے نزدیک
کوئی کالا دھبہ آگیا ہو جیلخانے کی چابی اسی مارشل کے پاس تھی اور وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔
تھا۔ لہٰذا یہ ترکیب سوچی گئی کہ لوہے کی مونٹھ والے ڈنڈوں سے جیل کا پھاٹک توڑ دیا جائے چنانچہ
ایسا کیا گیا شروع شروع میں ڈنڈوں کی چوٹیں جب پھاٹک پر دھاڑ دھاڑ پڑیں تو ایسا لگا کہ

دروازہ اب ٹوٹا کہ ٹوٹا۔ تماشائی خوشی کے نعرے لگانے لگے۔ انھیں یقین تھا کہ وہ غریب کی امداد کرنے میں کامیاب ہو جائینگے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ لکڑی کے تختے بہت مضبوط تھے اور وہ نہیں ٹوٹے۔ مگر اس نے بھی کھڑکی کی سلاخوں کو اتنی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا کہ مرجانیکے بعد بھی اسکے ہاتھ سے سلاخیں نہیں چھوٹیں۔ حتیٰ کہ آگ کی لپٹوں نے اُسے چاروں طرف سے جلا کر خاک کر ڈالا۔ اسکے بعد کیا ہوا مجھے نہیں معلوم۔ مگر جب وہ کھڑکی میں کھڑا چلا رہا تھا تو اسکے چہرے کو میں نے بھی پہچان لیا۔ مگر بعد کا حشر اور لوگوں نے دیکھا میں نے نہیں۔

اسکے اُس دن کے چہرے کا تصوّر میرے ذہن میں عرصے تک چھایا رہا۔ قریب قریب ہر رات کو مجھے اسکی یاد آجاتی اور مجھے یہ محسوس ہوتا کہ اسکی موت کیلئے میں بھی قصوروار تھا گویا میں نے اُسے دیا سلائی اسلئے لاکر دی تھی کہ وہ خود کو جلا ڈالے مجھے اسمیں کوئی شک نہیں تھا کہ اگر یہ بات ظاہر ہوجاتی کہ میں نے ہی اُسے دیا سلائی لاکر دی تھی تو مجھے ضرور پھانسی کی سزا دی جاتی۔ اس واقعہ کی یاد میرے ذہن میں ابھی تک تازہ ہے میں اُسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس واقعہ کو یاد کر کے مجھے پہلے جتنی پریشانی ہوئی تھی اب اتنا ہی مزہ آتا ہے۔ اسوقت تو میرا یہ حال تھا کہ اگر خوفناک واقعہ کا کہیں بھی ذکر ہونے لگتا تو میں کان لگا کر بڑے غور سے سُنتا اور اس انتظار میں رہتا کہ دیکھوں لوگ آگے کیا کہتے ہیں کیونکہ مجھے یہ ڈر ہمیشہ لگا رہتا کہ کہیں لوگ مجھ پر شبہ نہ کرتے ہوں۔ دراصل میرا گنہگار ضمیر اتنا سہما ہوا تھا اور اتنا ذکی الحس ہوگیا تھا کہ مجھے لوگوں کی سیدھی سادی باتوں پر شک ہوتا تھا حتیٰ کہ انکے چہروں نظروں اور اشاروں میں بھی بلاوجہ کوئی نہ کوئی بات مشتبہ نظر آتی تھی اور ڈر کے مارے میرا تمام جسم تھر تھر کانپنے لگتا تھا۔ اگر کہیں کوئی بلا ارادہ بے پروائی سے یہ کہدیتا کہ وہ قتل کا راز کھُل کر رہیگا تو سمجھ لیجئے کہ میری حالت غیر ہو جاتی۔ دس سال کے ایک لڑکے کے دل پر خوف و ہراس کا اتنا بوجھ توبہ توبہ۔ غنیمت یہ ہوئی کہ میں اس دوران میں ایک بات برابر بھولا رہا۔ اور وہ یہ کہ میں سوتے میں باتیں کرنیکا عادی تھا۔ ایک رات اتفاق سے میں جاگ اٹھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میرا چھوٹا بھائی جو میرے ساتھ میرے بستر پر ہی سویا کرتا تھا بیٹھا ہوا چاند کی روشنی میں میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھ رہا ہے میں نے پوچھا "کیا بات ہے؟" وہ بولا۔ آپ سوتے سوتے اتنا بولتے رہتے ہیں کہ میں سو نہیں سکتا۔" یہ سننا تھا کہ ڈر کے مارے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ کہ

میں نے اس سے پوچھا۔

"میں نے کیا کہا تھا۔ جلدی بتا۔ خدا جلدی۔"

"نہیں، کوئی خاص بات نہیں کہی۔"

"نہیں۔ تمھیں سب معلوم ہے۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"کیا کہا؟ میں سب جانتا ہوں۔ اس سے آپکا مطلب کیا ہے۔؟"

"تمہیں اس واقعے کے متعلق بہت کچھ معلوم ہے۔"

"کس واقعے کے متعلق؟ مجھے نہیں معلوم آپ کس واقعے کا حوالہ دے رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو آپ بیمار ہیں یا آپ کو کوئی وہم ہو گیا ہے۔ خیر اب آپ جاگ اٹھے ہیں تو مجھے بھی موقع مل گیا ہے کہ میں ذرا سو لوں۔"

چنانچہ میرا بھائی سو گیا اور میں لیٹے لیٹے سوچنے لگا۔ میں اسوقت ٹھنڈے پسینے سے شرابور تھا۔ میرے دلمیں خوف و ہراس کا ایک طوفان بپا تھا اور میں اس خطرے پر ہر پہلو سے غور کر رہا تھا کہ کیسے اس سے نپٹا جائے۔ مجھے اب یہ جاننے کی فکر تھی کہ خواب میں میں کیا کیا بک چکا تھا اور میرے بھائی کو کیا راز معلوم ہو گیا تھا۔ اس کشمکش کی حالت میں انسان کو کتنی پریشانی ہو سکتی ہے ذرا اسکا اندازہ لگائیے لیکن جلد ہی میرے دماغ میں ایک بات آئی کہ میں اس واقعے کے متعلق ایک فرضی نام لیکر اپنے بھائی سے دریافت کروں کہ اس نے اُسکے متعلق مجھ سے کیا سُن لیا ہے۔ چنانچہ میں نے اُسے جگا کر اُس سے کہا۔

"فرض کرو کہ کوئی آدمی شراب پیئے تمہارے پاس آئے۔ . . ."

وہ بیچ ہی میں بات کاٹ کر بولا "یہ بیوقوفی بات ہے۔ میں کبھی شراب نہیں پیتا۔"

میں نے کہا "بیوقوف میرا مطلب تم سے نہیں ہے۔ کوئی بھی آدمی۔ فرض کرو کہ کوئی آدمی شراب پیئے ہوئے تمہارے پاس آئے اور تم سے ایک چاقو پستول یا چھوٹی کلہاڑی مانگے اور تم اسے بھری ہوئی دیدو اور یہ بتانا بھول جاؤ کہ یہ بھری ہوئی ہے۔"

وہ پھر بیچ ہی میں بول پڑا "کیا کلہاڑی میں گولی بھری جاتی ہے۔"

"ارے میرا مطلب کلہاڑی سے نہیں ہے۔

میں نے تو پستول کہا تھا۔ اچھا، اسطرح تم میری بات مت کاٹو۔ میں ایک سنگین معاملے کے بارے میں تم سے بات کر رہا ہوں۔ ایک آدمی مارا گیا ہے۔"

"وہ کیا اسی شہر میں۔؟"

"ہاں۔ اسی شہر میں۔"

"اچھا۔ آگے بتاؤ۔ میں اب نہیں ٹوکوں گا۔ کہے جاؤ۔"

"اچھا تو فرض کیجئے کہ آپ اُسے یہ بتانا بھول جائیں کہ یہ پستول بھری ہوئی ہے اور وہ جاکر اُس سے خودکشی کرلے یا اس سے دھوکے سے پستول چل جائے اور وہ خود ہی نشانہ بنجائے یا وہ شراب کے نشے میں اُسے اپنے ہی اوپر چلا بیٹھے تو کیا تم اِسے قتل کہو گے۔؟"

"وہ نہیں تو۔ یہ تو خودکشی ہوئی۔"

"وہ نہیں، نہیں، میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ مرنے والے کے جرم کو کیا کہا جائیگا۔ میرا مطلب تمہارے اپنے عمل سے ہے۔ کیا اسے پستول دینے کی وجہ سے تم قاتل نہیں مانے جاؤگے۔؟"

بہت غور و خوض کے بعد میرے بھائی نے جواب دیا۔

"وہ ہاں مجھے محسوس تو ضرور ہونا چاہیئے کہ میں نے کوئی غلطی کی ہے جو قتل کے مترادف ہے۔ ہاں۔ اسے قتل ہی سمجھئے۔ لیکن میں بالکل صحیح نہیں بتلا سکتا۔"

بھائی کے اس جواب سے مجھے بڑی بیچینی ہوئی مگر یہ کوئی قطعی فیصلہ نہیں تھا۔ دراصل مجھے اسکو صحیح بات بتانی چاہیئے تھی۔ اسکے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ اسلئے میں نے یہی طے کیا۔ کہ میں اسے بتا ہی دوں مگر میں اس معاملہ میں احتیاط سے کام لوں گا اور یہ دیکھتا رہوں گا کہ وہ مجھ پر کوئی شبہ تو نہیں کرتا ہے۔ چنانچہ میں نے کہا۔

"یہ قصہ تو فرضی تھا۔ اب میں تمھیں اصل واقعہ بتاتا ہوں۔ تمھیں معلوم ہے کہ کیلیوس جیل میں وہ آدمی کیسے مرا تھا۔؟"

"وہ نہیں۔"

"وہ کیا تمہیں اسکے متعلق کچھ نہیں معلوم۔؟"

"وہ نہیں، بالکل نہیں۔"

"اور اگر تمہیں علم ہو تو تم بے موت مرو۔!"

"ہاں اگر مجھے اسکے متعلق کوئی علم ہو تو میں بے موت مروں۔"

"اچھا تو قصہ یہ تھا کہ وہ آدمی اپنا پائپ سلگانے کیلئے دیا سلائی چاہتا تھا۔ ایک لڑکے نے اُسے دیا سلائی مہیا کر دی مگر اس کمبخت نے اس دیا سلائی سے جیل کی کوٹھڑی میں ہی آگ لگا دی۔ اور خود کو اس میں جلا ڈالا۔"

"کیا یہ بات تھی۔؟"

"ہاں، یہی واقعہ تھا۔ اب بتاؤ کیا تم اس لڑکے کو قاتل کہو گے۔؟"

"ذرا مجھے اس معاملہ پر غور کر لینے دیجئے۔ کیا وہ آدمی شراب پیئے ہوئے تھا۔؟"

"ہاں۔ وہ شراب تو ضرور پیئے ہوئے تھا۔؟"

"کیا بہت پیئے ہوئے تھا۔؟"

"بلاشک۔"

"کیا لڑکے کو بھی یہ بات معلوم تھی۔؟"

"ہاں، اُسے بھی معلوم تھی۔"

اس پر میرا بھائی بہت سوچ بچار میں پڑ گیا۔ تب اس نے سنگین فیصلہ سنایا۔ "اگر وہ آدمی شراب پیئے ہوئے تھا اور لڑکا یہ بات جانتا تھا تو بلاشک لڑکا اس آدمی کا قاتل ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں۔"

یہ سنتے ہی ڈر کے مارے میرا چہرہ فق ہو گیا اور جسم سے جان نکل سی گئی۔ اسوقت میں نے یہ محسوس کیا کہ جب عدالت پھانسی کی سزا سناتی ہو گی اسکے دل و دماغ پر کیا اثر ہوتا ہو گا۔ اب میں اس انتظار میں تھا کہ دیکھوں میرا بھائی آگے کیا کہتا ہے گو مجھے معلوم تھا کہ وہ کیا کہے گا اور میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ اس نے کہا۔

"میں اُس لڑکے کو جانتا ہوں جس نے آدمی کو دیا سلائی دی۔"

اب میرے پاس کہنے کو اور کچھ نہ تھا۔ اسلئے خاموش رہا مگر خوف سے کانپتا ضرور رہا۔ اس نے پھر کہا۔ "جب تم نے اپنی نصف بات ہی ختم کی تھی میں تبھی یقینی طور پر سمجھ گیا تھا کہ وہ لڑکا

کون تھا۔ وہ تھا بین کونز۔"

اب ذرا میری ہمت بندھی جیسے کسی مُردے میں جان آگئی ہو۔ اس کی تعریف کرتے ہوئے میں نے کہا "تم نے یہ کیسے جان لیا۔؟"

"تم نے نیند میں یہ بکا تھا"

میں نے اپنے دلمیں کہا "میری عادت بھی عجیب وغریب ہے۔ یہ عادت تو فائدہ مند بھی ہو سکتی ہے اور اسلئے سب لوگوں کو یہ عادت اپنانی چاہیئے۔"

پھر میرے بھائی نے معصومیت کیساتھ صاف صاف مجھے بتایا "جب آپ سوتے سوتے باتیں کر رہے تھے تو آپ منہ میں چبا چبا کر دیا سلائی کی کوئی بات کر رہے تھے جس کو میں اسوقت بالکل نہیں سمجھ سکا لیکن اب جبکہ آپ اس آدمی اور جیل کی باتیں بتانے لگے اور آپ نے دیا سلائی کا ذکر کیا تبھی مجھے یاد آگیا کہ آپ نے نیند میں "بین کونز" کا نام دو یا تین بار لیا، لہٰذا آگے اور پیچھے کی سب باتیں ملا کر میں فوراً سمجھ گیا کہ دراصل بین کونز ہی نے اس آدمی کو جلا دیا۔"

میں نے اپنے بھائی کی عقلمندی کی داد دی۔ تب اس نے مجھ سے پوچھا۔

"کیا آپ اس لڑکے کو قانون کے حوالے کر دیں گے۔؟"

"نہیں۔ میرے خیال سے اسے خود اپنی غلطی کا احساس ہے البتہ آئندہ میں اُس پر نگاہ رکھونگا اور میرے خیال سے یہ ٹھیک ہی ہے۔ اگر وہ اور کوئی غلطی نہیں کرتا اور اپنی اصلاح خود کر لیتا ہے تو پھر کوئی مجھ پر یہ الزام نہیں لگائے گا کہ میں نے اُس سے وعدہ شکنی کی۔"

"آپ کتنے نیک ہیں۔!"

"ہاں، میں نیک بننے کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔ اِس دنیا میں آدمی یہی کر سکتا ہے اسکے اختیار میں اور کچھ نہیں ہے۔"

اب چونکہ میرا جرم دوسرے لڑکے کے کندھوں پر جا پڑا تھا اسلئے میرا خوف جلد ہی دور ہو گیا۔

ہینی بل چھوڑنے سے ایکدن قبل میں نے وہاں کی ایک عجیب وغریب بات دیکھی۔ یعنی دو جگہوں کے بیچ فاصلے کی بنا پر وہاں کے وقتوں میں بڑا حیرت انگیز فرق ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ بات

وہاں کے ایک بہت معمولی آدمی نے بتائی۔ یہ شخص ایک حبشی تھا اور میرے دوست کا گاڑی بان تھا۔ وہ شہر سے قریب تین میل کی دوری پر ایک دیہات میں رہتا تھا۔ میں نے اُسے پارک ہوٹل میں شام کے ساڑھے سات بجے بلایا تھا کہ وہ مجھے باہر سیر کرا لائے۔ لیکن وہ ٹھیک وقت پر نہیں آیا دس بجے کے قریب جب وہ آیا تو یہ کہہ کر معافی مانگنے لگا "جناب، معاف کیجئے۔ شہر اور گاؤں کے وقتوں میں ڈیڑھ گھنٹے کا فرق رہتا ہے۔ گاؤں کی گھڑیاں یہاں کی گھڑی سے ڈیڑھ گھنٹہ پیچھے رہتی ہے اور اسی وجہ سے ہمارے پاس کافی وقت رہتا ہے مگر کبھی کبھی اتوار کے دن ہم گرجا گھر کے لئے گاؤں سے جلدی ہی چل دیتے ہیں مگر شہر میں گرجا گھر میں وعظ شروع ہونیکے بعد پہونچتے ہیں۔ یہ سب وقت میں تفاوت ہونیکی وجہ سے ہوتا ہے۔ یہاں وقت کا صحیح اندازہ لگانا ہمارے لئے بہت مشکل ہے۔"

گو میرے قیمتی ڈھائی گھنٹے ضائع ہوئے لیکن مجھے ایک ایسی حقیقت کا علم ہو گیا جسکے لئے میں چار گھنٹے تک ضائع کر سکتا تھا۔

ستاونواں باب

ایک بہت بڑا فرشتہ

سینٹ لوئی سے شمال کو چلئے تو آپکو ایک سرسبز و شاداب اور خوشحال علاقہ ملیگا جہاں کے لوگ مستعد، چست، پھرتیلے، طاقتور، ذہین اور محنتی ہیں۔ حقیقی معنوں میں یہ انیسویں صدی کے حقیقت پسند اور باعمل لوگ ہیں۔ وہ خیالی پلاؤ نہیں پکاتے بلکہ عملی زندگی پسند کرتے ہیں اور اپنے کام میں جٹے رہتے ہیں۔ اسی کا خوشگوار نتیجہ یہ ہے کہ ہر طرف خوشحالی اور ترقی نظر آتی ہے۔ یہاں کے لوگ تندرست ہیں اور آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

شہر کیونسی کی نمایاں مثال لیجئے۔ یہ شہر تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ بڑا خوبصورت اور قرینے سے بسا ہوا ہے۔ پہلے کی طرح اب یہاں کے لوگ علوم و فنون کے شائق ہیں اور اونچے خیالات کے دلدادہ ہیں۔

لیکن میرین شہر میں یہ بات نہیں ہے۔ نہ معلوم اس شہر کی تنزلی کس وجہ سے ہوئی اس شہر کی ترقی کے آثار دیکھکر منصوبہ بنانیوالوں نے پہلے سے ہی اسکو شہر کہنا شروع کر دیا تھا اور انھیں پورا یقین تھا کہ ایکدن یہ جگہ ایک بڑا شہر بنکر رہیگی مگر یہ پیش گوئی یا قیاس آرائی غلط ثابت ہوئی۔ پینتیس سال قبل میں نے جب میرین شہر کو پہلے پہل دیکھا تھا تو وہاں صرف ایک سڑک تھی اور غالباً چھ مکان تھے مگر اب یہاں صرف ایک مکان رہ گیا ہے اور وہ بھی بربادی کی منہ بولتی تصویر۔ دوسرے پانچ مکانوں کی طرح یہ بھی عنقریب ہی دریا کی نذر ہو جائیگا۔

دراصل شہر میرین' شہر کیونسی کے بہت قریب تھا اور یہ بات اسکے لئے بہت نقصان دہ ثابت ہوئی۔ دوسرے یہ نشیب میں دلدلی جگہ پر آباد تھا اور سیلاب کے نشان سے بھی نیچا تھا جبکہ شہر کیونسی ایک ڈھلوان پہاڑی کے اوپر بسا ہوا ہے۔

شروع شروع میں کیونسی کو دیکھنے سے یہ خیال ہوتا تھا کہ اسکا درجہ نیو انگلینڈ سے مثالی شہر کا ہوگا اور اب بھی یہاں ایسے آثار پائے جاتے ہیں جنھیں دیکھکر یہ امید ہوتی ہے کہ شہر آئندہ بھی ترقی کرتا رہے گا مثلاً یہاں کی کشادہ خوبصورت اور دلکش عمارتیں اور انکے سامنے پھیلے ہوئے سبزہ زار' عالیشان حویلیاں' بڑے بڑے تجارتی مرکز اور انکی اونچی اونچی عمارتیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ یہاں بڑے بڑے کشادہ اور وسیع میدان ہیں جہاں میلے لگتے ہیں۔ یہاں ایک خوبصورت پارک بھی ہے جسکی بڑی اچھی طرح دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ یہاں کے پہاڑی راستے بہت خوبصورت ہیں جنکے دونوں طرف مناظر ہیں۔ اِن راستوں پر کاریں اور دوسری سواریاں مسلسل دوڑتی نظر آتی ہیں۔ یہاں ایک لائبریری' کئی دارالمطالعے' دو کالج اور کئی خوبصورت اور بیش بہا گرجا گھر ہیں نیز ایک بہت عالیشان عدالت ہے جسمیں خوبصورت چوکور صحن ہیں۔ شہر کی آبادی کم و بیش بیس ہزار ہے۔ یہاں کئی بڑے بڑے کارخانے ہیں جنمیں انواع اقسام کی چیزیں کثیر مقدار میں بنتی ہیں۔

لاگر سیج اور کینٹن کا شمار ترقی یافتہ شہروں میں ہوتا ہے لیکن بد قسمتی سے میں الیگزینڈریہ کی سیر نہ کر سکا۔ مجھے بتایا گیا کہ شہر میں پانی بھرا ہوا ہے اور یہ موسم گرما میں ہی دیکھنے کے قابل ہوگا۔

میں نے کیوکک شہر کو بہ آسانی پہچان لیا۔ میں وہاں ۱۸۵۰ء میں رہا تھا اس سال یہاں تجارت بڑے زوروں پر تھی۔ غضب کی سرگرمیاں تھیں۔ غالباً وا عظوں یا بیواؤں کو چھوڑ کر ہر شخص کسی نہ کسی خرید و فروخت میں مصروف تھا۔ لوگ برابر خرید و فروخت کرتے رہتے تھے اور ڈرتے تھے کہیں ایسا نہ ہو کہ بازار سرد ہو جائے اور وہ پیچھے رہ جائیں کیونکہ جب کاروبار سرد ہو جاتا تو ہما ہمی ختم ہو جاتی۔ یہاں ہر چیز بکتی تھی۔ زمین کا چپہ چپہ چاہے وہ کہیں واقع ہوتا بک جاتا اور اگر وہ جگہ سرسبز و شاداب وادی میں واقع ہوتی تو اُسی کی قیمت دُگنی و چوگنی ہو جاتی۔

اب اس شہر کی آبادی پندرہ ہزار ہے اور اسمیں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جب ہم وہاں پہونچے تو رات ہو چکی تھی اسلئے ہم شہر کو اچھی طرح نہ دیکھ سکے جسکا ہمیں افسوس رہا کیونکہ کیوکک بڑا خوبصورت شہر بتایا جاتا ہے۔ بہت پہلے بھی یہ بڑا پر رونق شہر تھا اور رہنے کے لئے بڑی عمدہ جگہ تھی اور اب تو یہاں اور بھی ترقی ہو چکی ہے اور اسکی رونق میں کہیں زیادہ اضافہ ہو چکا ہے۔ بیشک یہاں کی زندگی اب اور بھی خوشگوار ہو گئی ہے۔

میرے زمانے میں یہاں تعمیر کا ایک بہت بڑا کام شروع کیا گیا تھا جو اب مکمل ہو چکا ہے۔ یہ ایک نہر ہے جو ریپڈس کے اوپر بنائی گئی ہے۔ یہ آٹھ میل لمبی اور تین سو فٹ چوڑی ہے۔ اسکی گہرائی کہیں بھی چھ فٹ سے کم نہیں ہے۔ اسکا نقشہ بڑا شاندار ہے کیونکہ محکمۂ جنگ کے زیر انتظام تعمیر کا کام ہمیشہ شاندار ہوتا ہے یہ نہر بھی روم کی نہروں کی مانند پائیدار رہے گی اسکی تعمیر میں چالیس یا پچاس لاکھ ڈالر صرف ہوئے تھے۔

ایک یا دو گھنٹے اپنے پرانے دوستوں کیساتھ گذار کر ہم پھر اپنے دریائی سفر پر روانہ ہوئے کسی زمانے میں ہنری کلے ڈین اکثر کیوکک میں اپنا وقت گذارنے آیا کرتا تھا۔ یہ شخص اپنی ذہانت اور لاابالی پن کیلئے مشہور تھا۔ میرا خیال ہے کہ میری اس سے یہاں صرف ایک مرتبہ ہی ملاقات ہوئی ہوگی لیکن جب میں یہاں رہتا تو اکثر اسکا چرچا سنا کرتا تھا۔ اسکے حالات اس طرح ہیں:۔

عہد طفلی میں وہ بہت غریب تھا جسکی وجہ سے وہ تعلیم حاصل نہ کر سکا لیکن بعد کو اپنی

جانفشانی سے اس نے خود پڑھا لکھا۔ وہ اسی شہر میں ایک سڑک کے کنارے پڑا رہتا اور ایک پتھر پر اپنی کتاب لیکر بیٹھا رہتا۔ سڑک پر تاجروں اور راہگیروں کا آنا جانا برابر لگا رہتا اور بڑا شور و غل ہوا کرتا مگر اس لڑکے کی توجہ اپنی کتاب سے ذرا دیر کو بھی نہ ہٹتی تھی۔ وہ اپنی پڑھائی میں ہمہ تن مشغول رہتا اور اُسے اپنے گرد و پیش کی کوئی خبر نہ ہوتی۔ بغیر ہلے جلے وہ ایک ہی جگہ پر گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ سوائے اسکے کہ کبھی کبھی وہ اپنے گھٹنوں کو اسلئے سمیٹ لیتا کہ اسکے پاس سے گذرنے والی ٹھیلہ گاڑی سے اسکے گھٹنے نہ ٹکرانہ جائیں ورنہ وہ جیسا بیٹھا ویسا ہی بیٹھا رہتا اور اسکی نگاہ برابر کتاب پر رہتی۔ اور جب وہ اپنی کتاب ختم کر لیتا تو اسکا مضمون خواہ یہ کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو، ہمیشہ ہمیشہ کیلئے اسکے ذہن کی گہرائیوں میں محفوظ ہو جاتا۔ اسطرح اس نے ہر طرح کے علم کا حیرت انگیز ذخیرہ اکٹھا کر لیا تھا جو اسکے دماغ میں اتنا محفوظ رہتا کہ وہ جب چاہتا اُسے استعمال کر سکتا تھا۔

اسکی زندگی بالکل سادہ تھی۔ اسکے پہننے کے کپڑے قلیوں کے کپڑوں سے بھی بدتر ہوتے تھے۔ بالکل بے ڈھنگے، بے جوڑ اور عجیب طرح کے جن پر میل کی تہیں چڑھتی رہتی تھیں۔ اسکی شکل دیکھکر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسکی کھوپڑی میں ایسا بہترین دماغ چھپا ہوگا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بولنے اور تقریر کرنیکا فن تو اُسے پیدائش سے ہی ملا تھا جسمیں تجربہ اور مشق نے چار چاند لگا دیئے تھے۔ جب وہ باہر کہیں ووٹ مانگنے کے سلسلے میں تقریر کرنے جاتا تو اسکا نام سنکر ہی پچاس پچاس میل دور سے لوگ اسکی تقریر سننے آتے اور اسکے ارد گرد جمع ہو جاتے۔ وہ ہمیشہ سیاسی معاملات پر بولا کرتا تھا۔ اُسے تحریری اشارات یا نکات کی ضرورت نہیں ہوتی تھی کیونکہ بھوتنے ہوئے لادے کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ۱۸۶۲ء میں کیو گلگ کے ایک معزز شخص کے بیٹے کلے گٹ نے ہنری کلے ڈین کے بارے میں مندرجہ ذیل واقعہ سنایا۔

"یہ ۱۸۶۱ء کا واقعہ ہے۔ کیو گلگ میں جنگ کی خبروں کا بہت زور تھا اور ایک خاص دن نیو اتھینیم میں ایک مجلس ہونے جارہی تھی۔ اس مجلس کو خطاب کرنے کے لئے باہر سے کوئی معزز شخص آنیکو تھا اُس دن معینہ وقت پر ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ عورتیں اور مرد بھی گرمی سے پریشان تھے مگر اسٹیج ابھی خالی تھا کیونکہ معزز مہمان ابھی تک نہیں آیا تھا۔ لوگ بے چین اور ناراض ہو رہے تھے اور جتنی زیادہ دیر ہو رہی تھی اُتنے ہی وہ اور مشتعل ہو رہے تھے۔ مجلس کا منتظم بہت پریشان ہو رہا تھا۔ اچانک

اسکی نگاہ سڑک کے کنارے پتھر پر بیٹھے ہوئے ہنری کلے ڈین پر پڑی۔ اس نے فوراً جاکر اس سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا اور اسکی کتاب چھین کر اسکو جلدی سے اس عمارت کے عقبی دروازے سے لے آیا اور اس سے درخواست کی کہ وہ ملک کی خاطر اسٹیج پر جاکر تقریر کرے۔

ہنری ڈین کو اسٹیج پر دیکھتے ہی جو لوگ بڑبڑا رہے تھے وہ ایکدم خاموش ہو گئے اور ہال میں سناٹا چھا گیا اور سبکی نگاہیں اسٹیج پر مرکوز ہو گئیں۔ اسٹیج کشادہ مگر سونا تھا اور اس پر دری یا قالین وغیرہ کچھ بھی نہیں بچھایا گیا تھا۔ ہنری کلے ڈین کو جاننے والے مشکل سے بارہ چودہ آدمی ہی اس مجمع میں ہونگے۔ اسکی شکل بد وضع اور ڈیل ڈول بھدی تھی۔ پیروں میں لومڑی کی کھال کے بنے نیچی ایڑی کے جوتے۔ بھدّے رنگ کے نیچے موزے کسی ہوئی پتلون جو بہت پرانی ہو چکی تھی اور پھٹ بھی گئی تھی نیز اسقدر اونچی ہو گئی تھی کہ اسکی آدھی پنڈلیاں کھلی رہتی تھیں۔ اسکی واسکٹ بٹنوں سے بے نیاز تھی اور وہ بھی کچھ اونچی تھی جسکی وجہ سے کمر تک اسکی میلی اور شکنیں پڑی ہوئی قمیض صاف دکھائی دے رہی تھی اور قمیض بھی ایسی کہ جس میں سینہ ننگا ہی رہتا۔ گلے میں ایک کالا رومال مثل پٹی کے بندھا ہوا تھا۔ ایک اونچا سا نیلا کوٹ جس سے پوری کمر بھی نہ ڈھک پاتی تھی اور جسکی آستینیں اتنی چھوٹی تھیں کہ پہونچوں کا کم از کم چار چار انچ حصّہ کھلا رہتا۔ چھوٹی سی سخت نوک والی سپاہیوں کی سی ٹوپی جو اسکے سر کے کسی کونے پر رکھی رہتی۔ ہنری کلے ڈین بڑی سنجیدگی کیساتھ اسٹیج کی طرف بڑھا اور خاموشی کیساتھ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سامنے اسٹیج پر آ گیا اور کھڑے ہو کر حاضرینِ جلسہ کی طرف دیکھا۔ بولا کچھ نہیں۔ غالباً کسی خیال میں محو تھا۔ لوگ متعجب ہو کر ایک لمحہ تو خاموش رہے پھر خوشی کی ایک لہر اُن کے چہروں پر دوڑ گئی اور انمیں سرگوشیاں شروع ہو گئیں لیکن ہنری ابھی تک کسی خیال میں محو تھا اور غور سے لوگوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب لوگوں میں پھر کچھ ہلچل شروع ہوئی اور اس بار کچھ ہنسی بھی سنائی دی۔ اب قہقہے شروع ہو گئے اور پھر شور و غُل ہونے لگا۔

ہنری اب ایک قدم پیچھے ہٹا۔ اس نے اپنی سپاہیوں جیسی ٹوپی اُتار کر ایکطرف کو پھینک دی اور بولنا شروع کیا۔ وہ بہت سوچ سوچکر آہستہ آہستہ بول رہا تھا لیکن کوئی اسکی بات نہیں سُن رہا تھا۔ لوگ ہنس رہے تھے یا کانا پھوسی کر رہے تھے مگر ہنری ڈین بغیر گھبرائے بولے چلا جا رہا تھا۔ اچانک اس نے کوئی ایسی بات کہی کہ لوگ ایکدم خاموش ہو گئے اور بڑے غور سے اُسکی بات سننے لگے۔ اسکے بعد یکے بعد دیگرے اس نے کئی ایک ایسی ہی زوردار اور موثر باتیں کہیں۔ اب اُسے جوش آیا اور اس نے دھڑا دھڑ

بولنا شروع کر دیا۔ آپ یہ کہینگے کہ الفاظ بیساختہ اسکی زبان سے اسطرح نکل رہے تھے جیسے تیز بارش میں پانی کی بوچھاریں۔ اسکا جوش برابر بڑھتا ہی جارہا تھا اور وہ آندھی طوفان کی طرح گرجے جارہا تھا۔ اب حاضرین نے تالیاں بجا کر اسکی تقریر کی داد دی مگر اس نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ ایک سے ایک پُر اثر جملے اسکے ہونٹوں پر پھسلتے جارہے تھے جو لوگوں کے دل ودماغ پر ہتھوڑے کی سی ضرب لگا رہے تھے اب اُسنے اپنے گلے کی کالی پٹی کھولکر پھینکدی۔ وہ برابر بجلی تقریر کیے جارہا تھا۔ پھر اس نے اپنا اونچا کوٹ بھی اتار کر پھینکدیا۔ اُس کی اشتعال انگیز تقریر مسلسل تیزی پکڑتی جارہی تھی۔ آخر میں اُسنے اپنی واسکٹ بھی اتار کر پھینکدی اور پھر وہ وہاں نہ جانے کتنی دیر ڈٹا کھڑا رہا جسطرح آتش فشاں رات دن دھواں، شعلے، لاوا شہرہ۔ جھاڑ اور انگارے اُگلتا رہتا ہے اسیطرح یہ غضب کی ذہانت رکھنے والا مقرر اپنے فصیح و بلیغ پُرمغز فقروں سے سامعین پر ہیبت طاری کررہا تھا لوگ جوش وجنون میں ایکساتھ اُٹھ اُٹھکر اُسے داد تحسین پیش کر رہے تھے وہ نعرے بلند کرتے اور رومال ہلا ہلا کر اسکی قابلیت کی داد دیتے۔

مسٹر کلیکبٹ نے بتایا کہ جب ہنری کلے ڈین اسٹیج پر آیا تھا تو اسوقت لوگوں نے سمجھا کہ یہ کوئی پاگل آدمی ہے جو لوگوں سے الگ تھلگ سڑک پر اکیلا پڑا رہتا ہے مگر جب وہ تقریر ختم کرکے واپس گیا تو بیساختہ اُنکی زبان سے نکل پڑا "ارے یہ تو بہت بڑا فرشتہ ہے جو عام انسانوں سے کہیں بلند و برتر ہے"۔

برلنگٹن میں بھی ایک خوشنما پہاڑی شہر ہے۔ اسمیں کوئی . . . شبہ نہیں کہ یہ بہت ہی خوبصورت اور خوشحال شہر ہے اور برابر ترقی کے راستے پر گامزن ہے۔ اسکی آبادی پچیس ہزار نفوس پر مشتمل ہے۔ یہاں ہر قسم کے کارخانے موجود ہیں جنمیں سینکڑوں ضروریات کی چیزیں تیار ہوتی ہیں اور جہاں ہزاروں آدمی کام کرتے ہیں۔ یہاں کے لوگ عقلمند اور سنجیدہ قسم کے معلوم ہوتے ہیں جسکا ثبوت یہ ہے کہ یہاں ایک قانون پاس کرانیکی کوشش ہورہی تھی جسکی رُو سے شراب نوشی قطعی طور پر ممنوع قرار دیدی جاتی۔ یہی نہیں بلکہ ساری ریاست آئی اووا میں سوائے پانی کے بر نقصان دہ مشروب ممنوع قرار دیدیا جاتا اور اسکا بنانا، اسکی درآمد یا برآمد، خرید و فروخت، اسکا ادھار لینا یا دینا، چرانا، پینا، سونگھنا، کسی سے چھین کر اپنے قبضہ میں کرلینا، اسے وراثتاً پانا ارادتاً یا غیر ارادتاً کسی طرح بھی اسکا اپنے پاس رکھنا سب ناجائز قرار دیدیا جاتا۔ اس ریاست کے تمام باشعور اور عقلمند لوگوں نے اس تجویز

کی تائید کی مگر ججوں نے اُسے منظور نہ کیا۔

برلنگٹن جدید زمانے کا ایک ترقی یافتہ شہر ہے جہاں عمدگی اور قابلیت کیساتھ شہر کا انتظام کرنے کیلئے ہر سہولیت مہیا ہے۔ یہاں آگ بجھانے کے انتظام کا ایک باقاعدہ محکمہ ہے جسکے ملازمین کو پورے سال تنخواہیں ملتی ہیں جبکہ بنو اور ریلنز جیسے بڑے شہروں میں بھی ابھی تک کوئی ایسا انتظام نہیں ہے وہاں ابھی تک آگ بجھانے کا وہی پرانا طریقہ چل رہا ہے۔

برلنگٹن کی آب وہوا اوہائیو مسیسپی کے شمالی شہروں کی سی ہے۔ یہاں کھلی ہوا میں سانس لینا اور گھومنا بڑا خوشگوار لگتا ہے۔ ابھی حال ہی میں یہاں ایک خوبصورت تھیٹر بنا ہے۔ یہ یہاں کی ایک انوکھی چیز ہے کیونکہ دوسرے شہروں میں جو قریب قریب اتنے ہی بڑے ہیں اب بھی تھیٹر گندی اور خراب خستہ عمارتوں میں پائے جاتے ہیں۔

ہمارے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ ہم مسکاٹین کے گھاٹ پر اُتر کر شہر میں جاتے۔ البتہ ہم نے اس شہر کو دور ہی سے کشتی پر سے ہی دیکھا۔ بہت عرصہ پہلے میں اس شہر میں کچھ دنوں رہا بھی تھا لیکن اب یہ جگہ اتنی بدل چکی تھی کہ میری جانی پہچانی کوئی پرانی چیز مجھے یہاں نظر نہیں آئی اور مجھے یہ جگہ بالکل نئی معلوم ہوئی۔ میرے زمانے کا مسکاٹین بالکل بدل گیا ہے کیونکہ ان دنوں یہ ایک مختصر سی جگہ تھی مگر اب تو اچھا خاصا شہر بن چکا ہے اس جگہ کا ایک واقعہ مجھے ابتک بعینہٖ یاد ہے۔

ایک اتوار کے دن مجھے یہاں ایک کھیت میں ایک پاگل نے پکڑ لیا اور اپنے جوتے سے ایک چھرا نکالکر اُس نے مجھے دھمکایا ور اگر تم نے مجھے شیطان کا اکلوتا بیٹا تسلیم نہ کیا تو میں تمھیں اسی چھرے سے قتل کر دونگا" میں نے کہا" تم اپنے گھرانے کے واحد آدمی ہو جس سے ملنے کا شرف مجھے حاصل ہوا ہے لہٰذا میرے نزدیک تو تم اکلوتے بیٹے ہی ہو" مگر اس بات سے وہ مطمئن نہیں ہوا اور نہ اس نے مجھے چھوڑا۔ اس نے کہا "میں اسطرح نہیں مان سکتا۔ تمھیں یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ میں شیطان کی واحد اولاد ہوں اور یہ کہکر وہ اپنے جوتے پر چھرے کو رگڑ رگڑ کر تیز کرنے لگا۔ میں نے سوچا اتنی سی بات پر مصیبت مول لینا حماقت ہوگی اسلئے میں نے اسکی حسب منشاء اسے شیطان کا واحد بیٹا تسلیم کر کے جان چھڑائی۔ اسکے بعد فوراً ہی وہ اپنے باپ کے پاس چلا گیا اور چونکہ اسوقت سے ابتک واپس ہی نہیں آیا ہے اسلئے غالباً وہ اب بھی وہیں ہے۔

مسکاٹین کی یاد مجھے ایک اور وجہ سے بھی آتی ہے اور اس سے مجھے خوشی بھی بہت ہوتی ہے اور وہ ہے گرمیوں میں شام کیوقت ڈوبتے ہوئے سورج کا دلکش منظر۔ اسوقت سورج پہاڑیوں کے پیچھے سرکتا ہوا بڑا حسین معلوم ہوتا ہے۔ میں نے اپنے تمام بحری سفر میں اتنا حسین نظارہ کم ہی دیکھا ہے دریا کے ساکت پانی میں غروب آفتاب کا سنہرا عکس دیکھکر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی مصوّر نے پردے پر تصویر کھینچدی ہو اور اسمیں اپنی قوت متخیلہ کے زور سے بہترین رنگ بھر دئے ہوں ان رنگوں میں سفید نیلگوں، بلوری طرح طرح کے ہلکے ہلکے خوشنما رنگ دعوتِ نظارہ دیتے ہیں۔ کہیں کہیں کئی کے ملنے سے بہت شوخ رنگ بن جاتا ہے مثلاً بہت گہرے ارغوانی یا قرمزی رنگوں کے ملنے سے آسمان پر آگ سی لگی ہوئی معلوم ہوتی ہے جو نظر کو مسحور کر دیتی ہے اور جسکی دلکشی بیان سے باہر ہے اور جس پر نگاہ کا ٹکنا مشکل ہوتا ہے۔ مسیسپی کے بالائی علاقے میں ہر جگہ یہ غروبِ آفتاب کے حسین مناظر کیلئے مشہور ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کسی بھی دوسرے ملک میں غروب آفتاب کے ایسے حسین نظارے نہیں ہونگے۔ کہاجاتا ہے کہ طلوع آفتاب کے نظارے بھی یہاں خوشنما ہوتے ہیں مگر مجھے اس سلسلہ میں کوئی تجربہ نہیں ہے۔

(اٹھاونواں باب)

دریا کے بالائی حصّے میں

جب ہم دریائے مسیسپی کے بالائی حصّے کی طرف سفر کرتے ہیں تو بڑے بڑے شہر جلد جلد آتے اور گذرتے چلے جاتے ہیں۔ شہروں کے درمیان ہرے بھرے سرسبز اور لہلہاتے ہوئے کھیت نظر آتے ہیں اور کوئی جگہ سنسان اور ویران نہیں معلوم ہوتی۔ شمال مغرب کی طرف جتنا ہم آگے بڑھتے جاتے ہیں ہمیں پہلے سے کہیں زیادہ گنجان علاقے دکھائی دیتے ہیں یہانتک کہ ہر ایک گھنٹہ بعد زیادہ سے زیادہ گنجان علاقے آنے لگتے ہیں جہاں کی ترقی دیکھکر ہمیں نہ صرف تعجب ہوتا ہے بلکہ وہاں کے

ترقی پسند لوگوں کیلئے ہمارے دلوں میں عزت و احترام کے جذبات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ انکے کارناموں اور انکی کامیابی کو دیکھکر ہمارا سر تعظیماً انکے سامنے جھکنے لگتا ہے یہ لوگ ایک آزاد قوم کے فرد ہیں جو اپنے مسائل کا حل خود ڈھونڈتے ہیں اور وہ اسکے اہل بھی ہیں کیونکہ وہ تعلیم یافتہ اور با مغز ہیں۔ وہ تعلیم کا شغل برابر جاری رکھتے ہیں اور جدید ترین ایجادات اور اختراعات سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اپنے ملک میں ہر جگہ علم و ہنر کو فروغ دینے کیلئے وہ اسکول، کالج، لائبریری اور دارالمطالعے قائم کرتے ہیں اور مستعدی سے قانون کی پابندی کرتے ہیں۔ اسلئے ایسی قوم کا مستقبل لازمی طور پر شاندار ہوگا۔

یہ علاقہ حال ہی میں آباد ہوا ہے۔ اسے اس علاقے کے بچپن کا دور کہا جا سکتا ہے۔ اگر بچہ بچپن میں ہی اتنی ترقی کرلے تو جوانی میں کیا کچھ نہ کریگا۔ اس علاقہ کو آباد ہوئے اتنا کم عرصہ ہوا ہے کہ کسی غیر ملکی سیاح نے غالباً اسکے بارے میں ابھی سنا بھی نہیں۔ اسکے یہاں پہونچنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پچھلے ساٹھ سال کے عرصے میں اس دریا کے اُتار چڑھاؤ پر سینٹ لوئی اور نیو آرلنز کے درمیان غیر ملکی سیاحوں نے سینکڑوں بار سفر کیا ہوگا اور اپنے وطن لوٹ کر اپنے سفر کا حال ایک کتاب کی شکل میں قلمبند بھی کیا ہوگا۔ غالباً انھوں نے یہی فرض کرلیا ہوگا کہ دریائے مسیسپی کیمتعلق جو کچھ بھی دیکھنے کے لائق تھا وہ سب انھوں نے دیکھ لیا مگر ایسی بات نہیں ہے۔ ان سیاحوں کی لکھی ہوئی ایسی چھ کتابیں جو اسوقت دستیاب ہیں ان میں سے کسی ایک میں بھی دریا کے بالائی شہروں کا ذکر نہیں ملتا۔ غالباً ان پانچ یا چھ سیاحوں کے اپنے وطن واپس چلے جانیکے بعد ہی ان نئے شہروں کی تعمیر شروع ہوئی سب سے بعد والا سیاح جو ۱۸۷۸ء میں یہاں آیا تھا اُسنے بھی پرانے سیاحوں کی طرح دریا کی سیر کی اور تمام ساحلی علاقے چھان مارے مگر اُسنے بھی غالباً یہ کہیں نہیں سنا کہ سینٹ لوئی کے شمال میں بھی کوئی نئے شہر بسے ہیں۔

بہرحال شہر تو ضرور بسے ہیں۔ یہ علاقہ واقعی بڑا پُر رونق ہے اور یہ دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ یہ شہر اتنی جلدی کیسے ترقی کر گئے۔ ایسا لگتا ہے جیسے کل ہی منصوبہ بنا ہو اور آج شہر تعمیر ہو گیا ہو قریب دس بارہ شہروں میں تو پندرہ سو سے لیکر پانچ ہزار تک کی آبادی ہے مثلاً مسکاٹین کی آبادی دس ہزار، ولونا کی دس ہزار، مولائن کی دس ہزار، ژاک آئیلنڈ کی بارہ ہزار، اسکی بارہ ہزار، برلنگٹن کی پچیس ہزار، ڈبوک کی پچیس ہزار، ڈیون پورٹ کی تیس ہزار، سینٹ پال کی اٹھاون ہزار، مینی پولس کی ساٹھ

ہزار یا اس سے بھی زیادہ۔ کسی غیر ملکی سیاح نے ان شہروں کے بارے میں کبھی سنا بھی نہ ہوگا کیونکہ سیاحوں کی لکھی ہوئی کتابوں میں کہیں انکا ذکر نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیر ملکی سیاح حرات کو سوراہو گا اور اسی دوران میں یہ شہر بن گئے ہونگے۔ یہ علاقہ اتنا نیا ہے کہ مجھ جیسے نوجوان آدمی کیلئے بڑا نیا ہی ہے یعنی میرے بھی سامنے یہ آباد نہیں ہوا تھا میرے وطن سے باہر چلے جانے کے بعد ہی یہ نئے نئے شہر بسے حالانکہ مجھے وہ علاقہ چھوڑے ہوئے ابھی بہت عرصہ نہیں ہوا۔ جب میں پیدا ہوا تھا تو اسوقت سینٹ پال میں صرف تین آدمی رہتے تھے جبکہ منی پولس میں صرف ایک ہی آدمی آباد تھا۔ دو سال ہوئے جب منی پولس کا وہ پرانا باشندہ مرا تو اس نے کثیر اولاد چھوڑی یعنی قریب چالیس سال میں وہاں کی آبادی ایک سے بڑھکر انسٹھ ہزار نو سو ننانوے ہو گئی گویا اس آدمی کی نسل ایسے بڑھی جیسے کسی مینڈک کے بچے۔

یہاں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ سینٹ پال اور منی پولس کی آبادی کے یہ اعداد و شمار کئی مہینے پیشتر کے ہیں اور اب تو وہاں آبادی اور بھی زیادہ ہو گئی ہو گی۔ در اصل میں نے ابھی اخبار میں پڑھا ہے کہ ان شہروں کی آبادی تخمیناً اکہتر ہزار اور اٹھتر ہزار بالترتیب ہے اور چونکہ اس کتاب کے شائع ہونے اور لوگوں تک پہونچنے میں ابھی چھ سات مہینے اور لگ جائینگے لہٰذا اسوقت تک ان شہروں کی آبادی نہ معلوم کتنی ہو چکے گی اور اسوقت یہ اعداد و شمار بیکار ہو جائینگے۔

ہم نے شہر ڈیون پورٹ کو بھی سرسری نظر سے دیکھا یہ بھی بڑا خوبصورت شہر ہے جو ایک پہاڑی پر آباد ہے اور اسے پہاڑ کا تاج یا سرمور کہا جاتا ہے۔ در اصل یہ خطاب یہاں کے سب پہاڑی شہروں کیلئے مستعمل ہوتا ہے کیونکہ وہ سب خوبصورت اور نفیس ڈیزائن کے بنے ہوئے ہیں۔ بڑے صاف ستھرے اور دلکش ہیں۔ انھیں دیکھکر طبیعت بڑی خوش ہوتی ہے اسلئے انھیں پہاڑ کا تاج کہنا بڑا مناسب ہے۔ یہاں کے پرانے باشندوں یعنی ریڈ انڈین لوگوں میں یہ روایت مشہور ہے کہ اسی جگہ جہاں ڈیون پورٹ بسا ہوا ہے ۱۶۷۳ء میں مارکویٹ اور جولیٹ قیام پذیر ہوئے تھے اور اس واقعہ کے ایکسو ستر سال بعد ۱۸۳۴ء میں ایک دوسرا گورا آدمی یہاں آکر ٹھہرا۔ صرف پچھلے تیس سالوں میں ہی ڈیون پورٹ کی آبادی تیس ہزار ہو گئی۔ اب سے تینتیس سال قبل جتنی یہاں کی کل آبادی تھی اس سے تو کہیں زیادہ تعداد میں اب یہاں وہ بچے ہیں جو اسکولوں میں

پڑھتے ہیں۔ دوسرے شمالی شہروں کی طرح یہاں بھی کئی کارخانے، اخبار، اسکول اور کالج ہیں یہاں ٹیلیفون ٹیلیگراف الیکٹرک الارم اور آگ بجھانے والا باقاعدہ محکمہ ہے جہاں کے ملازمین تنخواہ پر رکھے گئے ہیں۔ اس محکمے میں چھ ہک لیڈر کمپنیاں ہیں۔ علاوہ اسکے یہاں چار آگ بجھانیوالے اسٹیم انجن اور تیس گرجا گھر بھی ہیں اور یہاں دو پادری رہتے ہیں جنمیں سے ایک ایپسکوپل اور دوسرا کیتھلک ہے۔

ڈیون پورٹ کے مقابل راک آئی لینڈ کا خوشحال شہر ہے جو اپر ریپڈس کے دامن میں بسا ہوا ہے۔ یہ دونوں شہر ایک ریلوے پل کے ذریعہ ملا دئے گئے ہیں۔ اسطرح کے تیرہ پل ہیں جو دریائے مسیسپی کے اوپر سینٹ لوئی اور سینٹ پال کے درمیان واقع ہیں اور جن سے جہاز رانوں کو خطرہ رہتا ہے۔

راک آئی لینڈ کا خوبصورت جزیرہ تین میل لمبا اور آدھ میل چوڑا ہے یہ ریاستہائے متحدہ میں شامل ہے۔ گورنمنٹ نے اسکو ایک خوبصورت پارک میں تبدیل کر دیا ہے اور بناوٹ اور آرائش کے ذریعہ اسکی قدرتی خوبصورتی میں چار چاند لگا دئیے ہیں۔ یہاں کے جنگلات کو صاف کر کے میلوں لمبے صاف راستے بنا دیئے گئے ہیں جن پر خوب آمد و رفت ہوتی ہے اور گاڑیاں دوڑتی رہتی ہیں۔ جزیرے کے وسط میں درختوں کے بیچ کھڑی ہوئی چار منزلہ دس عمارتیں دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کم از کم ایک ایکڑ جگہ گھیرے ہوئے ہے۔ ان میں گورنمنٹ کے کارخانے ہیں۔ یہاں گورنمنٹ کا اسلحہ خانہ اور جنگی سامان کا گودام ہے۔

جوں جوں ہم شمال کی جانب آگے بڑھتے ہیں قدرتی مناظر کی دلکشی بڑھتی جاتی ہے اور قریب قریب ایک ہی طرح کے مناظر سامنے آتے چلے جاتے ہیں۔ جلدی ہی ہم مولائن سے گذر جاتے ہیں یہ جگہ بہت بڑا صنعتی مرکز ہے۔ پھر کلنٹن اور لیئنس سے گذرتے ہیں۔ یہ دونوں شہر عمارتی لکڑی کے بہت بڑے مرکز ہیں۔ آگے چلکر ہم ڈبیوک پہونچتے ہیں جہاں معدنیات کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ یہاں سیسے کی کئی بڑی بڑی کانیں ہیں۔ یہاں بہت سے کارخانے بھی ہیں جنمیں سے ایک ہل کا کارخانہ بھی ہے جہاں کا بنا ہوا مال تقریباً تمام عیسائی ممالک میں پہونچتا ہے۔ یہ بات مجھے ایک کارخانے کے ایجنٹ نے بتلائی جو اس کشتی میں سفر کر رہا تھا۔ اس نے کہا "آپ مجھے دنیا بھر میں کسی ایسے ملک کا نام بتائیے جہاں ہل استعمال ہوتا ہو اگر میں نے وہاں کے ہل پر اپنے یہاں کی مہر نہ دکھا دی تو صاحب میرا دعویٰ ہے کہ میں اس ہل کو نگل کر دکھا دونگا۔

اور وہ بھی بغیر کسی چھٹی کی مدد سے "

دریا کے اس حصے کے متعلق بہت سی روایتیں اور واقعات مشہور ہیں۔ بلیک ہاک کا نام تو اسی طرح مشہور ہے جسطرح جنوب میں کیوکک کا۔ ڈبیوک[۱] سے کچھ میل جنوب کی طرف ہٹ کے ڈی مارٹ[۲] ہے جو ہوت کے سر کی چٹان کے نام سے مشہور ہے کہا جاتا ہے کہ شروع میں جب فرانسیسی لوگ اس علاقے میں آئے تھے تو انھوں نے یہاں کے قدیم باشندوں کو بھگا کر اس پہاڑی کی طرف دھکیل دیا تھا جہاں انکی موت یقینی تھی کیونکہ یا تو وہاں یہ لوگ بھوکوں مر جاتے یا پہاڑی سے گر کر ہلاک ہو جاتے بلیک ہاک نے تو گورے ... لوگوں کی تقلید کی تھی چنانچہ وہ ڈے موائنس[۳] کے قریب مرا تو اُسے عیسائی رسم و رواج کے مطابق دفنایا گیا۔ البتہ ریڈ انڈین لوگوں کے پرانے رسم و رواج کے مطابق کچھ تبدیلی ضرور کر لی گئی مثلاً جب اُسے دفنایا گیا تو عیسائی فوجی لباس میں تو اسے ضرور ملبوس کیا گیا اور اسکے ہاتھ میں ایک چھڑی بھی تھما دی گئی لیکن اسکو قبر کے اندر بٹھا کر ہی رکھا گیا۔ پیشتر جب کسی افراد کو دفنایا جاتا تو اسکے ساتھ اسکے گھوڑے کو بھی دفنایا جاتا تھا مگر بلیک ہاک کے ہاتھ میں جو چھڑی دی گئی تھی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسکا غرور واقعی کچھ کم ہو گیا ہوگا اور یہ امید کی جاتی تھی کہ اگر وہ جی اٹھتا تو غالباً پیدل چلنا ہی پسند کرتا۔

یہاں ہم نے ایک اور بات کا بھی مشاہدہ کیا اور وہ یہ کہ ڈبیوک کے آگے مسیسپی کا پانی زیتون کے رنگ جیسا ہرا معلوم ہوتا ہے اور دیکھنے میں بڑا خوبصورت اور شاندار لگتا ہے۔ صاف و شفاف بھی ہے اور دھوپ میں کافی چمکتا ہے۔ ہر جگہ پانی اتنا صاف اور عمدہ نہیں ہے۔ بلکہ دوسرے موسموں میں تو یہاں پانی اور بھی صاف ہوتا ہے کیونکہ اس موسم میں دریا کے کنارے سے مٹی گر گر کر پانی کو قدرے گدلا کر دیتی ہے۔

اس علاقے میں دریا کے ساحل پر جا بجا آپکو بڑی خوبصورت چٹانیں نظر آئینگی جو اپنی گوناگوں شکلوں اور رنگوں کی وجہ سے بڑی حسین اور دلکش معلوم ہوتی ہیں۔ انکے اوپر پیڑ پودے اور سبزہ لہلہاتا ہے اور اور انکے دامن میں دریا موجیں مارتا ہے۔ کہیں کہیں سے ٹوٹ کر یہ چٹانیں گنبدوں یا پشت پناہوں کی شکل اختیار کر گئی ہیں اور اپنے ہلکے پیلے رنگ میں دور سے واقعی بڑی شاندار نظر آتی ہیں۔ انکا رنگ عموماً گہرا بھورا یا ہلکا ہرا ہوتا ہے لیکن کہیں کہیں انمیں دوسرے رنگوں کی آمیزش بھی ہے نیچے صاف و شفاف پانی والا دریا بہتا ہے جو سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا ٹیڑھے میڑھے راستے پر رواں ہے اسکے راستے میں

جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے جزیرے ملتے ہیں جو جنگلات سے ڈھکے ہوئے ہیں انکے بیچ سے صاف و شفاف پانی کی دھاریں گذرتی ہیں دور دھندلکوں میں خال خال اونچے پر آباد کچھ خاموش دیہات دکھائی دیتے ہیں یا کبھی چھوٹے چھوٹے ڈونگے ساحل پر کھڑے ہوئے درختوں کے سائے میں پانی میں دھیرے دھیرے سرکتے نظر آتے ہیں یا بہت دوری پر سفید رنگ کے اسٹیمر تیزی سے نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ہر طرف ایسی خاموشی اور ایسا سناٹا چھایا ہوتا ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے ہم کسی خیالی دنیا میں کھوئے ہوئے ہوں اور اس دنیا سے ہمارا کوئی واسطہ نہ رہا ہو اور نہ ہمیں کسی بات کی فکر و پریشانی ہو

مگر اس خیالی دنیا کا سکون و سکوت اسی لمحے تک رہتا ہے جبتک کہ کوئی ملعون ریل گاڑی ادھر سے نہیں گذرتی کیونکہ ریل کی سڑک یہاں بالکل قریب ہے اور ریل گاڑی کو آتے دیر نہیں لگتی۔ وہ دندناتی، دہاڑتی، چنگھاڑتی اور میدانِ جنگ کا سا شور بپا کرتی ہوئی آتی ہے اور دریا کی سنسان وادی کا سکوت ایکدم توڑ دیتی ہے۔ اسکے تیز دوڑنے والے پہیئے بجلی کی کڑک سے کم شور نہیں کرتے۔ خاموشی اور تنہائی کی تو دھجیاں ہی اڑ جاتی ہیں اور تب آپ پھر اس دنیا میں آجاتے ہیں اور پریشانی سی محسوس کرنے لگتے ہیں یہاں ریل کے آنے سے ایک نقصان یہ ہوا ہے کہ چیزیں خریدنے میں بڑا اگھاٹا رہتا ہے جب آپ کوئی چیز خریدنے لگتے ہیں تو بازار کا بھاؤ چڑھ جاتا ہے اور آپ جب اُسے مہنگے داموں پر خرید لیتے ہیں تبھی بازار کا بھاؤ گر جاتا ہے سیطرح جب آپ کوئی چیز فروخت کرنے جاتے ہیں تو بازار کا بھاؤ گر جاتا ہے اور آپکے فروخت کرنیکے بعد ہی بھاؤ چڑھ جاتا ہے۔ اس بارے میں ایکدن مجھے جو تلخ تجربہ ہوا اُسے یاد کر کے آج بھی میں ڈر سے کانپ اٹھتا ہوں۔ اُسدن ہر چند کوشش کے باوجود میرا مال مناسب قیمت پر نہ بک سکا۔ واقعی ریلوے اسٹیشن کے پاس خرید و فروخت ایک لعنت ہے۔

ریلوے لائن دریا کے برابر برابر دُور تک چلی گئی ہے اور اسی لئے دریا میں سفر کرنیوالوں کو سینٹ لوئی اور سینٹ پال کے درمیان آٹھ سو میل کے ٹکڑے میں برابر ریلیں آتی جاتی نظر آتی ہیں۔ اِن ریلوں کی وجہ سے دریا سے ہونیوالی تجارت بالکل چوپٹ ہو گئی ہے۔ ریلوں کا جال بچھنے سے پہلے ہماری کشتی کا کلرک ایک دخانی کشتی میں کام کرتا تھا۔ وہ بتلاتا ہے کہ اس زمانے میں کشتیوں پر اتنی بھیڑ رہتی تھی اور اتنا سامان لدا کرتا تھا کہ کشتیوں میں اتنی گنجائش ہی نہیں رہتی تھی کہ پبلک کی مانگ کو پورا کر سکیں۔ اسی لئے کپتان لوگ بڑے مغرور ہوتے تھے یا چچا ٹامس کے الفاظ میں یوں کہیئے کہ وہ اپنے

کو بہت بڑا آدمی سمجھتے تھے۔ اِس زمانے اور اُس زمانے کے حالات میں کتنا فرق ہو گیا ہے اسکا نقشہ وہ یوں کھینچتا ہے:۔

"وہ کشتی ساحل پر آ کر کھڑی ہوتی ہے۔ کپتان صاحب بالائی عرشے پر تشریف فرما ہیں۔ مسافروں کیساتھ بڑی بے التفاتی سے پیش آتے ہیں۔ انکی نشست گاہ کے پیچھے بندوق بھرنے کا لوہے کا گز رکھا ہوا ہے۔ ہاتھوں میں بکری کی کھال کے دستانے۔ سر پر ریشمی ہیٹ، بال پیچھے کو کھڑے ہوئے۔ یہ ہے انکی شانِ بے نیازی۔ کنارے پر کھڑا ہوا ایک مسافر تعظیماً اپنا ہیٹ اتار کر ان سے گذارش کرتا ہے "کپتان صاحب میرے پاس اٹھائیس ٹن گیہوں ہے۔ بڑی مہربانی ہو گی اگر آپ میرا مال کشتی پر لاد لیں۔" کپتان صاحب فرماتے ہیں "میں صرف دو ٹن لیجا سکتا ہوں۔" اور اسکے بعد وہ نہایت بے اعتنائی سے منہ پھیر لیتے ہیں اتنی مہربانی بھی نہیں کرتے کہ بیچارے کی طرف ایک نظر دیکھ ہی لیں۔

مگر اب کپتان کی وہ سب شان ختم ہو چکی ہے۔ وہ بڑی نرمی اور خوش اخلاقی سے پیش آتا ہے۔ وہ اپنا ہیٹ تعظیماً اُتارتا ہے اور چاروں طرف کھڑے لوگوں کو دیکھ کر مسکراتا ہے اور سلام کرنے یا سلام کا جواب دینے کیلئے سر جھکاتا ہے۔ پہلے یہ بات نہیں تھی۔ اب اسکے پیچھے نہ بندوق کا گز ہے اور اور کوئی چیز۔ اب تو وہ اسطرح بات کرتا ہے:۔

"مسٹر اسمتھ، آپ سے ملکر بڑی خوشی ہوئی۔ آجکل آپکی صحت بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ میں نے اتنا ہشاش بشاش آپکو پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ کہئیے میرے لئے کوئی خدمت۔؟"

اور اسمتھ صاحب بے رُخی سے جواب دیتے ہیں "کچھ نہیں" اور یہ کہکر اپنا ہیٹ پہن کر منہ پھیر کر کسی دوسرے شخص سے بات کرنے لگتے ہیں۔

ٹھیک ہے۔ آٹھ سال پیشتر کپتان صاحب مسندِ اوج پر تھے لیکن اب مسٹر اسمتھ کا زمانہ ہے پہلے جب کشتی دریا کے چڑھاؤ پر جاتی تھی تو مسافروں کے بیٹھنے کا کمرہ کھچا کھچ بھرا رہتا تھا یہانتک کہ کیبن کے فرش پر بھی مسافروں کی پانچ چھ قطاریں لگی رہتی تھیں۔ علاوہ اس کے نیچے کا درجہ کھیتوں کی فصل یا کسانوں سے جو غیر ممالک سے لائے جاتے تھے بھرا رہتا تھا مگر درجہ اوّل میں ہر کسی کو نشست نہیں ملتی تھی۔ اسمیں صرف اعلیٰ خاندان کے اُمراء و شرفاء ہی بیٹھ سکتے تھے۔ اس درجے میں بیٹھنے کے لئے لازمی تھا کہ مسافر کم از کم چار سو سال سے کسی اچھے خاندان سے نسبت رکھتا ہو اور کم از کم

اسکے سوا موجودہ رشتہ دار اونچے خاندان کے ہوں یا پھر کوئی حبشی ہو جو کپتان صاحب کے جوتے صاف کرتا ہو لیکن اب نقشہ بدل گیا ہے۔ کشتی میں کئی عمدہ کمرے ہوتے ہیں اور اب نیچے کے درجے میں کسانوں کو نہیں بھرا جاتا۔ اس قسم کا قانون بھی بن گیا ہے کہ کشتی میں اب کسان لوگ فصل لیکر نہیں چلیں گے اب فصل تو فارم سے سیدھی ریل گاڑیوں پر لاد دی جاتی ہے۔ اسلئے کسان اب ریل سے ہی سفر کرتے ہیں اسٹیم بوٹ سے نہیں۔

اس علاقے میں شمال کی جانب جاتے ہوئے ہمیں عمارتی لکڑی لیجانیوالی بہت سی کشتیاں دریا کے بہاؤ کی طرف آتی ہوئی ملتی ہیں مگر اب وہ پہلے کی طرح سست رفتار نہیں چلتیں۔ پہلے ان کا نقشہ ہی نرالا ہوتا تھا۔ ان پر سوار مست و بے فکر ملاح موج اڑاتے گاتے بجاتے شراب پیتے اور مست ہو ہو کر ناچتے گاتے چلتے تھے مگر اب کشتیاں تیز انجنوں سے چلتی ہیں اور ہر چیز جدید فیشن کی ہے۔ تھوڑے سے مسافر جو کشتی پر ہوتے ہیں وہ بھی خاموش طبع اور قاعدہ سے بیٹھے ہوتے ہیں۔ انھیں اپنے کام سے کام اور کسی سے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ انکی طرز گفتگو میں رومانیت یا لاابالی پن کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔

ہمیں کہیں ایک اندھیری رات میں ہم نے ایک بہت تنگ اور نازک ڈھلان کو بجلی کی روشنی میں پار کیا تھا۔ ہمارے پیچھے تو گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا ایکطرف ایک سپاٹ ساحل، سامنے ایک تنگ پانی کا راستہ جو گھنے درختوں کے بیچ سے گذرتا تھا اور ہماری کشتی کا اگلا حصہ دونوں طرف ان درختوں سے چھوتا ہوا چلتا تھا۔ اس جگہ ہر پتی صاف نظر آرہی تھی کیونکہ بجلی کی روشنی میں وہ ایسی چمکتی تھی جیسے کہ دوپہر کی دھوپ میں۔ یہ نظارہ عجیب وغریب اور دلکش تھا۔

بعدازاں ہم پریری ڈو چین[۱] سے گذرے۔ یہ دوسری جگہ تھی جہاں فادر مارکویٹ نے اپنا خیمہ نصب کیا تھا۔ کئی گھنٹوں تک مختلف گوناں گوں مناظر سے گذرتے ہوئے ہم لاکراس پہونچے اس شہر کی آبادی بارہ یا تیرہ ہزار ہے۔ یہاں سڑکوں پر بجلی کی روشنی ہوتی ہے یہاں کی عمارتوں کے بلاک بڑے شاندار ہیں جنکا ڈیزائن قابل تعریف ہے اور دوسرے شہروں کے لئے باعث رشک ہے لاکراس ایک مشہور شہر ہے۔ ہمیں یہاں صرف ایک گھنٹہ رکنے کا موقع ملا اور اسی ایک گھنٹے میں ہم نے شہر کو خوب گھوم پھر کر دیکھ لیا حالانکہ بارش ضرورت سے زیادہ ہو رہی تھی۔

۱؎ Prarie Du Chien

اُنسٹھواں باب

روایاتِ اور مناظر

لاکراس سے ہماری کشتی میں کئی اور مسافر سوار ہوئے۔ انیں ایک بوڑھا آدمی تھا جو اس شمالی مغربی علاقے میں ان سب سے پہلے آباد کاروں کیساتھ آیا تھا جو یہاں ایک نوآبادی قائم کرنے آئے تھے۔ وہ یہاں کی ہر جگہ سے واقف تھا اور اپنی واقفیت پر اُسے بڑا ناز تھا جو کسی حد تک بجا بھی تھا۔ اُس نے ہم سے کہا۔

"جب آپ اس مقام سے سینٹ پال کی طرف چلیں گے تو راستے میں آپکو بہت سے قابلِ دید مناظر ملیں گے جو دریائے ہڈسن کے مناظر کہلاتے ہیں۔ اوّل اوّل آپکو کوئینس بلف نام کی چٹان ملیگی جو سات سو فٹ اونچی ہے اور ایسی عالیشان معلوم ہوتی ہے کہ شاید ہی آپ نے ایسی اور کہیں دیکھی ہو گی۔ پھر آپ کو ٹریمپلو جزیرہ ملیگا جسکے مقابلے کا جزیرہ امریکہ بھر میں نہیں ہے کیونکہ یہ بہت عالیشان ہے یہ ایک بڑا پہاڑ سا معلوم ہوتا ہے جو کناروں پر ڈھلواں ہے۔ اسکے متعلق قبائلیوں کی بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔ پہلے یہاں سانپ بہت ملتے تھے۔ اگر آپ دھوپ کے وقت اسکو دیکھیں تو اس وقت کا شاندار نظارہ آپ کبھی نہیں بھولیںگے۔ ونونا کے شمال میں سرسبز و شاداب کہستانی میدان ہیں۔ آگے چل کر آپکو تھاؤزینڈ آئلینڈ نام کے جزائر ملیں گے جنکی خوبصورتی بے مثال ہے۔ آپ سبزے کی بات کرتے ہیں۔ ایسا گہرا سبزہ تو شاید ہی آپ نے کہیں دیکھا ہو۔ جب دریا کا پانی ساکت ہو تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہزاروں مخمل کے تکئے یا گدّے کسی شفاف آئینہ کے اوپر سرک رہے ہوں۔

دریا کے دونوں اطراف میں جو عظیم الجثہ ناہموار کھردری اور سیاہ رنگ کی چٹانیں ہیں وہ تصویر کے مضبوط اور عمدہ چوکھٹے کا کام کرتی ہیں کیونکہ اگر چوکھٹا مضبوط اور عمدہ ہوگا تو آپکی نفیس تصویر اور بھی عمدہ لگے گی نیز پائیدار بھی ہوگی۔

اس بوڑھے نے امریکہ کے قبائلیوں کی ایک دو روایتیں بھی سنائیں لیکن وہ زیادہ دلچسپ یا موثر نہیں تھیں۔

امریکہ کے تاریخی واقعات سنانے کے بعد وہ پھر وہاں کے مناظر کے متعلق گفتگو کرنے لگا اور تھاوزینڈ آئی لینڈ سے سینٹ پال تک ہر چیز کو تفصیل وار بتانے لگا۔ وہ انکے ناموں کو اتنی آسانی سے بتاتا جاتا تھا اور اپنی داستان کو اتنی روانی اور خود اعتمادی کیساتھ بیان کر رہا تھا کہ مجھے اسکی لیاقت پر تعجب ہوتا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ بڑے زوردار الفاظ میں کہتا "ارے یہ تو کچھ بھی نہیں۔ یہ سب تو میرے بائیں ہاتھ کا کام ہے" اور پھر مناسب وقفہ کے بعد وہ بڑی فصاحت و روانی کے ساتھ ایسی حیرت انگیز باتیں چھوڑ دیتا کہ انکی صداقت میں مجھے شبہ ہونے لگتا۔ خیر میرے شبہ کی تو بات جانے دیجیے، اس بوڑھے کا بیان آگے سنئے۔ وہ کہہ رہا تھا "دلونا کے دس میل شمال میں ہم خاوشٹین سٹی پہونچے یہاں ہم ساحلی چٹانوں کے دامن میں کچھ دیر ٹھہرے۔ انکی پُرجلال چوٹیاں نیلے آسمان کی حدوں کو چھوتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں یعنی اس عرشِ پاک تک پہونچی تھیں جہاں فرشتوں کے سوا کسی کا پر مارنا بھی ممکن نہیں۔

اب ہماری کشتی دھیرے دھیرے آگے سرکتی ہے دریا کا پانی چاندی جیسا سفید ہے۔ یہاں کے عالیشان اور حسین قدرتی مناظر دل پر ایسا جادو کرتے ہیں کہ زبان سے بیساختہ واہ واہ نکلتی ہے قریب بارہ میل چلنے پر آپ ورنن پہاڑی پر پہونچ جاتے ہیں۔ یہ پہاڑی چھ سو فٹ اونچی ہے پہلے یہاں ایک بہت شاندار ہوٹل تھا جو اب مسمار ہو چکا ہے اور اسکے کھنڈر ہی باقی رہ گئے ہیں جنھیں دیکھکر دل پر ایک رومانی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ یہ ہوٹل پہاڑی کی سب سے اونچی چوٹی پر واقع تھا جہاں یہ ہمیشہ بادلوں کے دھندلکوں میں چھپا رہتا تھا۔ کسی زمانے میں اس پہاڑی پر ایک بارونق شہر آباد تھا لیکن اب تو یہاں ہر طرف ویرانی اور خاموشی چھائی رہتی ہے۔ پرانی عمارتوں میں صرف اس ہوٹل کے کھنڈر ہی باقی رہ گئے ہیں۔

جب ہم اور آگے بڑھتے ہیں تو جمنی راک سے گذرتے ہیں۔ یہ چھ سو فٹ اونچا ایک عالیشان

ستون ہے۔ اسکے آگے منی ایسا پہونچنے سے قبل ہمیں ایک داس دکھائی دیتی ہے جو ایک قابل دید جگہ ہے۔
یہ ایک اونچے ٹیلے کی شکل کی ہے جو سطح دریا سے پانچسو فٹ بلند ہے اور ایک مینار کے مشابہ ہے اسکی
مخروطی شکل، اسکے اوپر چاروں طرف پھیلے ہوئے گھنے جنگل اور اسکی اونچی چوٹی دیکھکر ہمیں قدرت کی صناعی
پر بڑی حیرت ہوتی ہے۔ اسکی چوٹی پر کھڑے ہو کر اسکے دامن میں میلوں تک پھیلے ہوئے جنگلات،
چشمے، چٹانیں، پہاڑیاں اور وادیاں سب صاف صاف دکھائی دیتی ہیں۔ جب ہم ایسی اونچی چٹانوں
کی چوٹیوں سے نیچے وادیوں کی طرف دیکھتے ہیں تو ان خوبصورت مناظر کے پس پردہ دریا کا منظر کتنا
عالیشان اور دلفریب معلوم ہوتا ہے۔ یہاں کے مناظر کتنے حسین ہیں اور یہاں کتنا سکوت چھایا رہتا
ہے اسکو دیکھکر قدرت کی کاریگری کی داد دیتے ہی بنتی ہے۔ نیز صانعِ اعظم کیلئے ہمارے دلوں میں
انتہائی عقیدت پیدا ہوتی ہے اور ہم اسکی تحسین و توصیف میں سر جھکا دیتے ہیں۔ ان حیرت انگیز
نظاروں کی یاد کبھی دل سے بھلائی نہیں جا سکتی۔

اسکے بعد ہم لائنس ہیڈ اور لوائنس ہیڈ پر پہونچتے ہیں۔ انکی خوبصورتی دیکھ کر ایسا معلوم
ہوتا ہے کویا انھیں صانع نے اپنے ہاتھوں سے ہی تراشا ہے تاکہ ان سے خوبصورت چشموں کی
دلکشی میں اور اضافہ ہو سکے۔ اسکے آگے دریا کا پاٹ اور بھی بڑھ جاتا ہے اور یہیں سے ہمیں
ایک پہاڑی وادی نظر آنے لگتی ہے جسکا شمار سب سے زیادہ دلکش اور عالیشان جگہوں میں کیا جاتا
ہے۔ یہاں کی ناہموار پہاڑیاں اوپر سے نیچے تک سرسبز و شاداب جنگلوں سے لدی پڑی ہیں۔ یہاں کے
ہموار میدانوں میں ویباشا کا خوبصورت شہر بسا ہوا ہے جہاں بیماروں کو شفا دینے والے چشمے ہیں۔
ان چشموں کا پانی برائٹ نام کی مہلک بیماری میں تریاق کا کام کرتا ہے۔ علاوہ اسکے یہاں ایک لاثانی
جھیل بیپن ہے جو کہ قدرت کی صناعی کا ایک بہت بڑا معجزہ ہے۔ ان دونوں چیزوں کو سیاح گھنٹوں
دیکھتے رہتے ہیں اور پھر بھی انکی سیری نہیں ہوتی۔ درحقیقت انھیں یہاں جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ بیان
سے باہر ہے۔

اسطرح جب ہم ان حسین مناظر کو دیکھتے ہوئے مزے مزے میں آگے بڑھتے ہیں تو ہمارے
سامنے دو عظیم الشان گنبد نظر آتے ہیں ان میں سے ایک کو عظیم شوگر لوف اور دوسرے کو شاندار

میڈنس راک کہتے ہیں۔ میڈنس راک کے بارے میں ایک عجیب رومانی روایت مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ اس گنبد میں سے ایک عجیب آواز آتی ہے جب لکڑی کے ڈونگے شام کے جھٹ پٹے میں ادھر سے گذرتے ہیں تو تاریکی میں ملاح کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی آہستہ آہستہ ایک دلکش نغمہ گا رہا ہے اور لوگوں کا ایسا اعتقاد ہے کہ نغمہ گانے والی دیوی ونو نا ہے جو عرصہ دراز ہوا اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئی اور جسکے متعلق قبائلیوں نے بہت سے گیت اور کہانیاں بنا ڈالی ہیں۔

آگے چل کر مقام فرینٹینک آتا ہے۔ یہ مقام گرمیوں میں تھکے ہوئے سیاحوں کیلئے بڑی خوشگوار جگہ ہے۔ اسکے بعد مشہور ریڈنگ اور ڈائمنڈ بلف نظر آتے ہیں۔ یہ دونوں بڑے عظیم الشان اور دلکش پہاڑ ہیں۔ انکے آگے پریسکاٹ اور سینٹ کروئکس آتے ہیں اور پھر جلد ہی آپ کو سینٹ پال کے گنبد اور مینار نظر آنے لگتے ہیں۔ یہ نیا شہر شمالی امریکہ کا ایک بہت بڑا ترقی یافتہ شہر بن گیا ہے اور ترقی کی راہ پر بڑی تیزی سے گامزن ہے۔ یہ نئی اور اعلیٰ تہذیب کا علمبردار ہے۔ اسکی ترقی اور خوشحالی کی وجہ سے اسکی تجارت دن دونی رات چوگنی ہو گئی ہے اور اسی کیساتھ ساتھ یہاں عیسائی تہذیب و تمدن خوب پھیلا ہے۔ پہلے یہاں ضعیف الاعتقادی، سستی اور جہالت پھیلی ہوئی تھی لیکن اب یہاں تعلیم اور سائنس کا بول بالا ہے اور کاشتکاری ہاتھ کے ہلوں کی بجائے دخانی طاقت سے چلنے والے ہلوں سے ہوتی ہے، جبکہ اسکے اگلے علاقے میں جہالت، لاقانونیت، بے آئینی، جرائم اور مایوسی کا دور دورہ ہے۔ اسکے پیچھے جو علاقہ ہے وہاں جیل، پھانسی اور اصلاح کی چرچا زیادہ ہوتی ہے۔"

یہ سب باتیں سنکر میں نے قصہ گو سے پوچھا "کیا آپ نے کبھی راستوں کے مناظر کی تصویریں ساتھ لے کر سفر کیا ہے۔؟

"ہاں پہلے میں ایسا ہی کرتا تھا۔"

اب مجھے پکا شبہ ہو گیا کہ وہ شخص سراسر جھوٹ بول رہا ہے۔

میں نے پھر پوچھا "کیا آپ اب بھی تصویریں ساتھ لیکر سفر کرتے ہیں۔؟"

"نہیں۔ میں موسم خزاں کا انتظار کر رہا ہوں۔ میں آجکل مواد اکٹھا کر کے ایک کتاب

"ٹورسٹ گائڈ" لکھ رہا ہوں جسکو سینٹ لوئی اور سینٹ پال پیکٹ کمپنی اِسی سال گرمیوں میں شائع کریگی اور جوان سیاحوں کیلئے بہت کارآمد ہوگی جو اس کمپنی کے جہازوں سے سفر کیا کریں گے۔"

"جب آپ میڈنس راک کی بات کر رہے تھے تو آپ نے دیوی ونونا کا ذکر کیا تھا جو بہت عرصہ ہوا اس جہانِ فانی سے رخصت ہوگئی اور جسکا ذکر قبائلیوں نے اپنی کہانیوں اور گیتوں میں کیا ہے" کیا وہ اسی چٹان کی دیوی تھی؟ اگر نہیں تو اس دیوی کا نام اس چٹان سے کیوں وابستہ کیا گیا ہے کیا اسکے متعلق کوئی روایت ہے۔؟"

"ہاں ہے۔ ایک بہت ہی دردناک روایت ہے۔ کہتے ہیں کہ دریائے مسیسپی کیمتعلق جتنی روایتیں مشہور ہیں انہیں سب سے زیادہ مشہور یہی المناک داستان ہے۔"

"اچھا تو سنایئے۔"

اب اس نے بلا تامل بڑی آسانی کیساتھ اپنے مخصوص لہجے میں کہنا شروع کیا مگر اسوقت اسنے گفتگو کا لہجہ بدلکر لیکچر کا انداز اختیار کر لیا۔ اس نے کہا۔

'لیک سٹی سے کچھ دور شمال کی طرف ایک مشہور مقام میڈنس راک ہے جو ۔۔۔۔ محض ایک خوبصورت جگہ ہی نہیں ہے بلکہ اسکے ساتھ کچھ رومانی داستان بھی وابستہ ہے جسکی وجہ سے اس کا یہ نام پڑا۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا جب سیاوکس فرقے کے قبائلی لوگ یہاں بڑی تعداد میں رہتے تھے کیونکہ انھیں مچھلی مارنے اور دوسرے شکار پکڑنے کی بہت سہولیات میسّر تھیں۔ جن قبیلوں کے افراد یہاں اکثر آیا کرتے تھے انہیں سے ایک قبیلہ ویباشا تھا۔ ونونا کا عاشق اسی قبیلہ کا تھا۔ اس لڑکی نے اسی عاشق سے شادی کا وعدہ کیا تھا۔ مگر لڑکی کے والدین بہت سخت گیر تھے۔ وہ اس کی شادی ایک دوسرے آدمی سے جو ایک جنگجو سپاہی تھا کرنیکا وعدہ کر چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اصرار کیا کہ وہ انکے منتخب شدہ لڑکے سے شادی کرے اور شادی کا دن بھی انھوں نے ہی مقرر کر دیا۔ لڑکی کو نہایت رنج تھا مگر اس نے کہا کچھ نہیں بلکہ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے انکی بات مان لی ہے چنانچہ وہ انکے ساتھ اِس چٹان تک جانے اور تقریب کے موقع کیلئے پھول اکٹھے کرنے پر تیار ہو گئی۔ مگر جب یہ لوگ چٹان کے پاس پہونچے تو ونونا دوڑ کر اس چٹان کی چوٹی پر پہونچ گئی

اور وہاں کھڑے ہو کر اس نے اپنے والدین کو جو نیچے چٹان کے دامن میں کھڑے تھے بہت لعنت وملامت کی اور کہا کہ انھوں نے اس کیساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ پھر اس نے ایک ماتمی گانا گایا اور چوٹی سے نیچے چھلانگ مار دی اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔"

"کس کے ٹکڑے کر دیئے۔؟ کیا اپنے والدین کے۔؟"

"ہاں۔ والدین کے۔"

"بیشک جیسا کہ آپ نے بتایا یہ بڑا المناک واقعہ تھا۔ علاوہ اسکے اس قصے میں ناٹک کی طرح امید و بیم کا پہلو بھی پایا جاتا ہے جسکا میں پہلے قیاس نہ کر سکا تھا قبائلیوں کی دیگر روایتوں میں واقعات روکھے پھیکے ڈھنگ کے ہوتے ہیں مگر اس روایت میں ایک بہترین اصلاح کی گئی ہے۔ میسیپی کی تمام وادی میں تقریباً پچاس ایسی چٹانیں ہیں جنکی چوٹیوں سے ناامید کنواری لڑکیوں نے چھلانگ لگا کر اپنی جان دیدی لیکن صرف یہی ایک ایسی چوٹی ہے جہاں سے چھلانگ لگانیوالی لڑکی نے صحیح معنوں میں کامیابی کی۔ اچھا تو پھر ونونا کا کیا بنا۔؟"

"اسے بہت برا بھلا کہا گیا جس سے اسے بہت صدمہ پہونچا لیکن منفتش موتی (وہ افسر جو موت کے اسباب کی تفتیش کرتا ہے) کے مقام حادثہ تک پہونچنے سے پہلے ہی وہ فرار ہو گئی اور کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے سچے عاشق کو تلاش کر لیا اور اسکے ساتھ گھومتی رہی۔ وہ کسی دور دراز کے ملک کو چلی گئی جہاں وہ دونوں بخیر و عافیت رہنے لگے لیکن اس کا نرم دل کچھ پژمردہ رہنے لگا کیونکہ اس حادثے کا اسکے دل پر بہت اثر ہوا تھا۔ اسے صدمہ ہوا کہ وہ اتنی کم عمر میں اپنی ماں کی شفقت اور باپ کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو گئی اور اب نہ اس کا کوئی دوست تھا اور نہ مددگار۔ اب تو وہ بے رحم زمانے کے رحم و کرم پر تھی جو اسے بدنام کرنے پر تلا ہوا تھا۔"

اس مقرر نے دریائے میسیپی کے مناظر کا جو نقشہ اپنے الفاظ میں کھینچا اسکو سنکر میں بہت خوش ہوا کیونکہ اس سے ابتک جو مناظر میں نے دیکھے تھے انکی خوبصورتی پر تبصرہ کرنے میں مجھے بڑی مدد ملی نیز اس سے مجھے ان چیزوں کا تصور کرنے میں بھی بڑی مدد ملی جنھیں رات کی تاریکی میں میں نہ دیکھ سکا تھا۔

جیسا کہ مقرر نے بتایا اس سارے علاقے سے متعلق بہت سی قبائلی روایتیں اور افسانے مشہور ہیں لیکن میں نے پوچھا کہ اسکی کیا وجہ ہے کہ سنانیوالے عام طور پر ان روایتوں یا افسانوں کی طرف

اشارہ کرکے بتا خاموش ہو جاتے ہیں اور انکو سناتے بہت کم ہیں۔ گیا وہ اشارہ اسلئے کر دیتے ہیں کہ
قصوں کے نام سے سننے والوں میں اشتیاق پیدا ہو جائے اور انکے منہ میں پانی بھر آئے اور اسکے بعد وہ
وہ مصلحتاً اسلئے خاموش ہو جاتے ہیں کہ لوگوں میں اشتیاق بنا رہے۔ بتایا تو یہ جاتا ہے کہ یہ کہانیاں
واقعات پر مبنی ہیں اور قوتِ تخیلہ کا کمال بھی اُن میں دکھایا گیا ہے مگر در اصل وہ کہانیاں ایسی ہیں
نہیں اور اسی لئے یہ ڈر رہتا ہے کہ اگر انھیں ایک بار سنا دیا گیا تو آئندہ کے لئے لوگوں کا اشتیاق جاتا
رہیگا اور وہ یقین نہیں کرینگے کہ ان کہانیوں میں وہ خصوصیات ہیں جو بتلائی جاتی ہیں۔ میں نے اسے
اُسی علاقے کے متعلق بہت سی مطبوعات جو میں وقتاً فوقتاً اکٹھا کرتا رہتا تھا دکھائیں۔ اس نے اعتراف
کیا کہ واقعی وہ مطبوعات ادنیٰ درجہ کی تھیں۔ پھر میں نے جرأت کر کے اس سے یہ بھی کہدیا کہ جو روایتیں
اور داستانیں اس نے مجھے سنائیں وہ بھی تو ایسی ہی تھیں۔ صرف وتوناکی داستان ضرور قابلِ ستائش
تھی۔ اس نے ان سب حقائق کا بھی اعتراف کر لیا۔ پھر اس نے مجھے رائے دی کہ میں مسٹر اسکول کریفٹ
کی کتاب پڑھوں یہ کتاب قریب پچاس سال پہلے شائع ہوئی تھی مگر اب بازار میں موجود نہیں ہے اس
کتاب میں قبائلیوں کی کچھ تصانیف ہیں جن میں واقعات نگاری اور تخیلہ کی پرواز دونوں خاص طور
پر پائی جاتی ہیں۔ جیسا دا تھا کی کہانیاں اسی قسم کی ہیں اور یہ سب اسکول کریفٹ کی کتاب سے لی گئی
ہیں اس کتاب میں اور بھی بہت سی کہانیاں ہیں جنکو اگر مسٹر لانگ فیلو چاہتے تو بڑے موثر ڈھنگ سے
منظوم کر سکتے تھے۔ ان ڈا تنگہ ہیڈ کی کہانی ایسی ہی ہے۔ مگر مقرر اس کہانی کو سنا نہیں سکا کیونکہ
اسکا بہت سا حصہ وہ بھول گیا تھا اسلئے اس نے مجھے ہدایت کی کہ میں اس کتاب سے اس کہانی کو خود
پڑھ لوں اور قبائلیوں کی قوتِ تخیلہ کی پرواز کے متعلق اپنی واقفیت کو دوبالا کروں اور اسے داد
دوں۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ کہانی اور کچھ دوسری کہانیاں جو اسی کتاب میں موجود ہیں اُسوقت
وادیٔ مسیسپی میں بہت مشہور تھیں جب وہ یہاں آباد ہونے آیا تھا اور جن لوگوں نے ان کہانیوں کو
مسٹر گرانٹ کی کتاب کیلئے مہیا کیا انھوں نے انمیں کوئی آمیزش یا مبالغہ نہیں کیا بلکہ جوں کی توں کتاب
کے مؤلف تک پہونچا دیں۔ اسلئے ان کہانیوں میں کوئی آمیزش نہیں ملیگی۔ مجھے مسٹر اسکول
کرانٹ کی کتاب مل گئی۔ اسکی کئی کہانیاں پڑھنے پر مقرر کے بیان کی تصدیق ہو گئی۔ میں اسکی وجہ

کہانیاں یہاں پیش کرتا ہوں۔ ایک کہانی بہار ۔ ڈائنگ۔ ہیڈ کی اور دوسری ہے پی۔ یو۔ ان اور سیگ۔ ون کی جو موسموں پر ایک مجازیہ ہے۔ اس مجازیہ کا ذکر ہیاواتھا کی نظم میں بھی ہے مگر اصل نسخے کو پڑھنے میں اور ہی مزہ آتا ہے۔ ایک خاص بات اس نظم میں آپ یہ دیکھیں گے کہ اوزانِ شاعری یا ردیف و قافیہ کی خوبیوں کے بغیر بھی مضمون کو سادگی اور موثر ڈھنگ سے کیسے پیش کیا جا سکتا ہے۔

پی۔ یو۔ ان اور سیگ۔ ون کی کہانی:۔

ایک منجمد دریا کے کنارے ایک بوڑھا اپنے مکان میں اکیلا بیٹھا ہوا تھا موسم سرما کا اختتام تھا اور اسکے مکان میں آگ قریب قریب بجھ چکی تھی۔ وہ بہت ضعیف تھا اور بالکل تنہا تھا۔ سن رسیدہ ہونے کی وجہ سے اسکے بال بالکل سفید ہو چکے تھے۔ اسکے جسم کا ہر جوڑ کمزوری سے کانپ رہا تھا۔ وہ اپنا وقت تنہائی میں گذار رہا تھا۔ وہاں نہ کوئی آدم تھا نہ آدم زاد جسکی وہ آواز سنتا۔ سننے کو تو وہاں صرف طوفان کی بھیانک آواز تھی۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے حال ہی میں گری ہوئی برف ہر طرف بکھری ہوئی تھی۔

ایک رات جب اسکی انگیٹھی بجھنے والی تھی تو اسکے دروازے پر ایک خوبرو نوجوان آیا۔ وہ مکان کے اندر داخل ہوا۔ اسکے رخسار جوانی کی آگ سے دہک رہے تھے اور جوانی کے خون کی گرمی سے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اسکے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور اسکی چال میں سبک روی اور پھرتی تھی۔ کسی جنگجو کے ماتھے کی پٹی کی بجائے اسکے ماتھے پر خوشبودار گھاس کا بنا ہوا ایک ہار تھا اور اسکے ہاتھ میں پھولوں کا ایک گلدستہ تھا۔

بوڑھے آدمی نے اس سے کہا "اے میرے بیٹے تمہیں دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ اندر آ جاؤ۔ مجھے اپنے کچھ کارنامے سناؤ۔ تم کن کن نئے ملکوں میں گھوم کر آئے ہو۔ آؤ مل کر بیٹھیں اور رات گذاریں۔ میں تمہیں اپنی شجاعت کے کارنامے سناؤنگا اور تمہیں بتاؤنگا کہ اب بھی میں اپنے زور بازو سے کیا کیا کر سکتا ہوں۔ تم اپنا حال سنانا اور اسطرح ہم دونوں اپنا دل بہلائیں گے۔"

پھر اس نے اپنے تھیلے سے پرانے فیشن کا ایک انوکھا سا پائپ نکالا۔ اسے تمباکو سے بھرا۔ پھر تمباکو کو ہلکا کرنے کیلئے کچھ پتیوں کو مسل کر اسمیں ملایا اور نوجوان کو پائپ پیش کیا۔ اسکے بعد دونوں

آپس میں بات چیت کرنے لگے۔

بوڑھے آدمی نے کہا "اگر میں پھونک ماروں تو ندی کا پانی رک جائے اور وہ جم کر پتھر جیسا سخت اور چمکدار بن جائے۔"

نوجوان نے کہا "جب میں پھونک مارتا ہوں تو میدان میں پھول کھل جاتے ہیں۔ بوڑھا پھر بولا "جب میں اپنے بال جھاڑتا ہوں تو زمین برف سے ڈھک جاتی ہے میرے حکم سے پیڑوں کی پتیاں گرنے لگتی ہیں اور پھر میں پھونک مار کر اڑا دیتا ہوں۔ چڑیاں پانی سے باہر نکل آتی ہیں اور کسی دوسرے ملک کو اڑ جاتی ہیں۔ میری پھونک سے ڈر کر جانور چھپ جاتے ہیں اور زمین ایسی سخت ہو جاتی ہے جیسے سنگِ چقماق۔"

نوجوان نے جواب دیا "جب میں اپنے چھلے دار بال جھاڑتا ہوں تو گرم گرم پھواریں زمین پر گرنے لگتی ہیں۔ پودے زمین سے باہر نکل آتے ہیں اور ان میں ویسی ہی چمک ہوتی ہے جیسی کہ خوشی میں بچوں کی آنکھوں میں۔ میری آواز پر سب پرندے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ میری سانس کی گرمی سے منجمد ندیاں پگھل کر بہنے لگتی ہیں۔ جب میں چلتا ہوں تو میرے قدموں کی آواز سے راگ پیدا ہوتے ہیں اور چمن موسیقی سے گونج اٹھتے ہیں۔ ساری کائنات خوش و خرم نظر آتی ہے۔"

اور پھر آفتاب نمودار ہوا۔ ہر طرف نرم نرم سی خوشگوار حدت پھیل گئی۔ بوڑھا خاموش تھا۔ مکان کی چھت پر رابن اور بلیو برڈ چہچہانے لگے۔ دروازے کے پاس ہی منجمد ندی پگھل پگھل کر بہہ نکلی اور ہر طرف موسم بہار کی ہوا کے ساتھ نئے پودوں اور پھولوں کی مہک پھیل گئی۔

دن نکلنے پر نوجوان آدمی کو معلوم ہوا کہ اسکے بوڑھے میزبان میں کیا خوبیاں تھیں جب اس نے بوڑھے کی طرف دیکھا تو اس کا چہرہ جاڑے کا برفانی چہرہ تھا۔ اسکی آنکھوں سے ندیاں بہہ رہی تھیں۔ جب آفتاب کی حدت اور بڑھی تو تھوڑی ہی دیر میں اس کا منجمد چہرہ پگھل گیا۔ اسکے گھر کی آگ غائب ہو گئی اور وہاں مسکوڈیڈ بیل اُگ آئی جس پر ایک سفید پھول نمودار ہوا جسکے کنارے گلابی تھے۔ شمالی علاقے میں اُگنے والے پودوں میں یہ سب سے پہلا پودا تھا۔

اِن وِنڈ اِنگ ہیڈ[۱] ایک لمبی کہانی ہے لیکن اسمیں عجیب و غریب خیالات ملتے ہیں۔ اسمیں

---

[۱] دیکھئے ضمیمہ ڈ

الوکھی انوکھی پریوں کی کہانیاں ہیں اور گونا گوں واقعات ہیں اور خصوصیت یہ ہے کہ بیان میں بہت روانی ہے اور یہ سب خوبیاں اسکی طوالت کی تلافی کرتی ہیں۔

ساٹھواں باب

استخراج اور اختتام

ہم اپنی منزل مقصود یعنی سینٹ پال پہونچ گئے جہاں ہمارا دریا مسیسپی کا دو ہزار میل لمبا سفر جو نیو آرلینز سے شروع ہوا تھا ختم ہوا۔ سٹیمر سے یہ فاصلہ صرف دس دن میں طے ہوجاتا ہے مگر ریل سے وقت اور بھی کم لگتا ہے کیونکہ میرا تجربہ یہ ہے کہ سینٹ لوئی سے مینی پل تک جانے میں جو قریب ایکسو بیس میل دُور ہے ریل سے صرف سات گھنٹے لگتے ہیں۔ پھر بھی دریا سے سفر کرنا زیادہ دلچسپ ہے بشرطیکہ آپ کو منزل مقصود پر پہونچنے کی جلدی نہ ہو۔

جب ہم نیو اورلینز میں تھے تو موسم بہار کا خاصا حصہ گذر چکا تھا اور میگنولیا اور گلاب کے پھول جھڑنے لگتے تھے لیکن یہاں سینٹ پال میں ابھی موسم سرما ہی تھا اور برف پڑ رہی تھی۔ نیو اورلینز میں تو ہواؤں میں کافی گرمی آچکی تھی اور گرم ہوا سے ہر چیز مرجھا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہوا کسی آتش فشاں پہاڑ سے آرہی ہو لیکن یہاں سینٹ پال میں ہوا ہمارے جسموں کو سُن کئے دیتی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ ہوا کسی برف کے پہاڑ سے آرہی ہے۔

اس مقابلے سے میرا منشا کسی کو اچنبھے میں ڈالنے کا نہیں ہے بلکہ یہ امر بدیہی ہے کہ مختلف عرض البلاد میں آب و ہوا میں فرق ہوا ہی کرتا ہے اور اگر دو مقام ایکدوسرے سے ایک ہزار یا دو ہزار میل دُور ہونگے انکی آب و ہوا میں فرق تو ہونا ہی چاہیئے۔ میں اس جغرافیائی اصول کو

مانتا ہوں اور آیندہ بھی اُسے صحیح مانتا رہوں گا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ لیکن اخبار والے اس اصول کو نہیں مانتے کیونکہ ایکسال فروری کے مہینے میں اخباروں میں بڑے حیرت آمیز انداز سے یہ چھاپا گیا تھا کہ سینٹ پال کے لوگ برف باری کی مصیبت جھیل رہے ہیں جبکہ جنوب کے شہروں میں لوگ موسم بہار کا لطف لے رہے ہیں اور اسٹرابیری اور مٹر جیسے گرمیوں کے تحفوں کا مزہ لے رہے ہیں۔ وہاں گھروں کے باہر نرگس کے پھول کھل رہے ہیں اور لوگ موسم گرما سے پریشان ہیں۔ اخباروں میں یہ خبریں ہر سال فروری کے مہینے میں شائع ہوا کرتی تھیں اور انکی حیرت میں کبھی کوئی کمی نہیں ہوتی تھی وجہ غالباً یہ تھی کہ ایڈیٹوریل بورڈ کے لوگ بدلتے رہتے تھے اور نئے لوگوں کو پرانے لوگوں کی طرح ہر سال یہی حیرت ہوتی تھی اور وہ یہی خبر شائع کرتے تھے۔ اگر ایک ہی ایڈیٹر ہر سال یہ صورت حال دیکھتا تو اُسے کوئی تعجب نہ ہوتا کیونکہ کوئی بھی شخص کسی عجیب و غریب چیز کو دیکھ کر زیادہ سے زیادہ ایک یا دو بار تعجب کا اظہار کرے گا لیکن بعد میں اس کا عادی ہو جائیگا لہذا جنوبی امریکہ میں فروری کے مہینے میں گرمی بھی کسی کو ایک یا دو بار سے زیادہ نہیں چونکا سکتی۔ لیکن اگر آپ ہر سال یا ہر تیسرے سال ایڈیٹوریل بورڈ میں نئے آدمی بھرتی کرتے رہینگے اور انھیں شمال اور جنوب کی آب و ہوا کے اس عجیب و غریب فرق کا راز نہیں سمجھائیں گے تو اداریہ میں ہر سال آپ وہی ہنگامہ خیز مضمون دیکھیں گے۔ ہر سال نئے ایڈیٹر کو موسم کے متعلق وہی حیرت ہوگی۔ اسکے لئے تو یہ حیرت ایک ہی سال رہے گی مگر ایڈیٹر بدلتے رہنے کی وجہ سے اداریہ میں ہر سال یہی حیرت انگیز مضمون شائع ہوتا رہے گا اور اسمیں کوئی اصلاح نہ ہو سکے گی ہر سال فروری میں اسٹرابیری کے متعلق حیرت کا اظہار کیا جائیگا کہ یہ جنوب میں اتنی جلدی کیسے آگئی۔ نئے آدمی کو تو یہ فرق سمجھایا جا سکتا ہے لیکن اخبار کی اصلاح کیسے کی جائے کیونکہ ایکسال کے بعد پرانا ایڈیٹر تو ملازمت چھوڑ کر چلا جائیگا اور نیا آجائیگا۔ کیا امریکہ کی کانگریس کوئی ایسا ایکٹ بنا سکتی ہے جسکی رُو سے اسٹرابیری کے متعلق یہ خبر شائع نہ ہوا کرے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ کانگریس کیلئے ایسا ایکٹ بنانا مشکل ہو جائیگا کیونکہ یہ اُس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔ البتہ ریاست کے آئین میں تبدیلی کر کے یہ ایکٹ بنایا جا سکتا ہے نیز ایسی ترمیم شدہ ایکٹ میں یہ بھی شامل ہونا چاہیے کہ ایسی خبریں شائع کرنے والے ایڈیٹر کو پہلی بار حبس دوام کی سزا دی جائیگی اور اگر پھر بھی کوئی یہ جرم کرے تو اُسے سزائے موت دیجائے اور ایسی سزائے موت

دیجائے کہ جس میں مجرم کو وقفہ دے دکر اور ایذا پہونچا ہو پکڑ کر ملا جائے تو امیں کوئی شبہ نہیں کہ پھر ایسی غلطی کوئی نہیں کریگا۔ اسی ایکٹ میں آگے چل کر اور ترمیم کی جا سکتی ہے اور اسکے دائرۂ اختیار میں دوسرے جرائم کیلئے بھی سزا کا اہتمام ہو سکتا ہے مثلاً ایسے پرانے ختم انتوں کو سزا دینا جو دوسروں اپنی غلط باتوں سے گمراہ کرتے ہیں یا ایسے کہنہ مشق گھاگھوں کی گوشمالی کرنا جو الیکشن کے معاملے میں چالاکی اور مکاری سے دوسروں کو دھوکا دیتے ہیں یعنی جنھوں نے جارج واشنگٹن سے لیکر آجتک کے ہر پریذیڈنٹ کو ووٹ دیا ہو اور گذشتہ کل جب ووٹ دینے آیا ہو تو اسوقت بھی انکی آنکھوں میں وہی چمک ہو اور اسکے پیروں میں وہی مستعدی ہو۔ اسی طرح کے دوسرے پرانے گنہگار بھی اس ایکٹ کی وجہ سے کیفر کردار کو پہنچ جائیں گے۔ اسی قسم کی دس گیارہ سالانہ خبریں اور بھی ہیں جنھیں شائع کرنیوالے گردن زدنی ہیں۔ مثلاً "پرانا فری میسن" "پرانا پرنٹر" "پرانا بپٹسٹ پادری" اور سب سے پرانا شاگرد اور یہ کہ فلاں عورت کے ایک ساتھ تین بچے پیدا ہوئے وغیرہ ....
اور تب ہم سے سبق لیکر انگلینڈ بھی قانون پاس کریگا کہ سڈنی اسمتھ کے لطیفوں پر پابندی لگادی جائے اور ایک کمیشن مقرر کردیا جائے کہ وہ نئے نئے لطیفے تیار کرے۔ تب زندگی زیادہ خوشگوار اور آرامدہ ہوگی اور لوگ اس دنیا سے اکتاکر بہشت جانے کا خیال ترک کردیں گے۔
مجھے ڈر ہے کہ میں اپنے موضوع سے بہک گیا ہوں۔ سینٹ پال ایک حیرت انگیز شہر یہاں مضبوط اور پختہ عمارتیں ہیں جو امینٹ پتھر کی بنی ہوئی ہیں اور بڑی مستحکم اور پائیدار معلوم ہوتی ہیں یہاں ایک ڈاک گھر، چھتیس سال پہلے بنایا گیا تھا۔ اسکے متعلق ایک لطیفہ مشہور ہے اور وہ یہ کہ اس ڈاکخانہ میں سب سے پہلے جو خط موصول ہوا اُسے مکتوب علیہ تک پہونچانے کے لئے ڈاک منشی صاحب خود گھوڑے پر سوار ہو کر یہ پوچھنے واشنگٹن گئے کہ اس خط کا کیا کیا جائے۔ اس سال یہاں دو نئے مکانات اور تعمیر ہوئے ہیں اور یہاں کی آبادی میں کوئی آدمیوں کا اضافہ ہوا ہے۔ سینٹ پال کے ایک شہری اخبار پائینیر پریس نے کچھ اعداد و شمار دئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ پرانے زمانے کے مقابلہ میں حالات اب کسقدر مختلف ہیں۔ اعداد اسطرح ہیں۔
۱۸۶۲ء میں خزاں کے موسم میں مردم شماری اکبتر ہزار
سال کے پہلے پر مینولس میں خطوط کی تعداد بارہ لاکھ نو ہزار تین سو بتاسی ۔ ۱۲۰۹۳۸۷

سال کے پہلے نو مہینوں میں تعمیر ہونیوالے مکانوں کی تعداد نو سو نواسی ۹۸۹

ان مکانوں کی تعمیر کا خرچ اکتیس لاکھ چھیاسی ہزار ۳۱۸۶۰۰۰ ڈالر

سال گذشتہ کے چھ مہینوں کے مقابلے میں اس سال خطوط کی تعداد میں اضافہ پچاس فیصدی

سال گذشتہ کی عمارتوں کی تعمیر کا خرچ۔ پینتالیس لاکھ ڈالر

سینٹ پال کی ترقی اسکی تجارت کی وجہ سے ہوئی حالانکہ اور شہروں کی طرح یہ بھی صنعت و حرفت کا بہت بڑا مرکز ہے اور یہاں ہر سال بہت سا سامان تیار ہوتا ہے پھر بھی اس شہر کی ترقی خاص طور سے تجارت کی بدولت ہی ہوئی ہے۔ گذشتہ برس اسکی مختلف اشیاء کی تجارت پانچ کروڑ بتیس لاکھ ڈالر کی تھی۔ یہاں ایک محصول خانہ بھی ہے جسکے لئے ایک نئی عالیشان عمارت بن رہی ہے کیونکہ پرانی عمارت ابھی حال ہی میں جل گئی تھی۔ یہاں گرجاگھر تو بیشمار ہیں جو گھٹیا قسم کے نہیں بلکہ عمدہ اور قیمتی ہیں جیسے کہ نئے پروٹسٹینٹ چرچ ہوا کرتے ہیں۔ اس قسم کے چرچ آئرلینڈ کی غریب مزدور لڑکیاں ہی بنایا کرتی ہیں۔ آئرش لڑکیوں کو شاندار گرجاگھر بنانے کا بیحد شوق ہے۔ ہمارے فن تعمیر کیلئے تو یہ اچھی بات ہے مگر ہم جب گرجاگھر کی تعریف کرتے ہیں تو ان غریب لڑکیوں کا شکریہ ادا کرنا بھول جاتے ہیں۔ ہم یہ نہیں سوچتے کہ اس خوبصورت گرجے کی ایک ایک اینٹ اور ایک ایک پتھر ان غریب لڑکیوں کی محنت اور جانفشانی کا مرہون منت ہے۔ گھنٹوں محنت کرکے اور خون پسینہ ایک کرکے انھوں نے اپنے جسم کو تھکا کر چُور کیا تھا تب کہیں یہ خوبصورت گرجا بنا تھا۔ افسوس کہ ان غریب مزدور لڑکیوں کی محنت کی ہم داد دینا بھول جاتے ہیں اور صرف عمارت کی دلکشی اور خوبصورتی پر ہماری نگاہ ٹھہر جاتی ہے اور اسی کی تعریف و توصیف کرتے ہماری زبان نہیں تھکتی مگر درحقیقت یہ خوبصورت عمارتیں انھیں غریب مگر فراخدل مزدور لڑکیوں کی محنت و جانفشانی کی چلتی جاگتی یادگار ہیں۔

اس علاقے میں اسکول اور پبلک کتب خانے بھی کثرت سے ہیں۔ سینٹ پال میں تین لائبریریاں ہیں اور اوسطاً چالیس ہزار کتابیں ہیں۔ اس شہر میں ایکسو سولہ اسکول ہیں اور یہاں ستر ہزار ڈالر سالانہ سے بھی زیادہ مدرسین کی تنخواہوں پر خرچ کیا جاتا ہے۔

یہاں کا ریلوے اسٹیشن بہت عمدہ ہے اور ایسے اسٹیشن کم ہی ہونگے جو اتنے کشادہ اور وسیع ہوں۔ جب یہ اسٹیشن بنا تھا تو اسوقت یہ احساس ہوا تھا کہ یہ اسٹیشن ضرورت سے زیادہ بڑا ہے مگر کچھ ہی مہینے گذرنے کے بعد معلوم ہوا کہ نہیں یہ بڑا نہیں ہے بلکہ قدرے چھوٹا ہی رہ گیا ہے اور اسمیں توسیع کی ضرورت ہے۔

یہ شہر اونچائی پر آباد ہے اور سطح سمندر سے سات سو فیٹ اونچا ہے۔ بلندی پر آباد ہونے کی وجہ سے یہاں کی سڑکوں اور گلیوں سے دریائے مسیسپی اور اسکے قریب کے نشیبی میدان بخوبی نظر آتے ہیں۔

یہ شہر بڑا عجیب و غریب ہے اور اسکی تعمیر و توسیع برابر ہو رہی ہے۔ ہر جگہ گلیوں اور سڑکوں پر آپکو عمارتی سامان ملیگا جسکی وجہ سے آنے جانے میں بھی رکاوٹ ہوتی ہے۔ اس سامان کو بہت جلد کام میں لایا جا رہا ہے تاکہ مزید سامان کیلئے جگہ خالی ہوتی رہے اور جیسے ہی سڑکیں کچھ خالی ہوتی ہیں تو لوگ جو عمارت بنانے کے خواہشمند ہوتے ہیں وہ اپنا سامان مثلاً اینٹ چونا پتھر وغیرہ لاکر وہاں ڈالدیتے ہیں۔ کسی نے بڑی اچھی اور دلچسپ بات کہی ہے کہ تہذیب و تمدن کی ابتداء نہ تو کبھی دخانی کشتیوں سے ہوتی نہ ریلوے لائن سے نہ اخبارات سے نہ مذہبی اسکولوں اور مشن کے کاموں سے بلکہ ہمیشہ وہسکی سے ہوتی ہے اور یہ ہے بھی حقیقت۔ پہلے وہسکی آئی اور بعد میں دوسری چیزیں۔ اگر آپ تاریخ کا مشاہدہ کریں تو آپکو معلوم ہوگا کہ جہاں وہسکی پہنچی وہیں پادری بھی پیچھے پیچھے پہنچے اور اسکے بعد وہاں باہر سے غریب الوطن اپنی کلہاڑی بیلچہ اور رائفل لیکر پہونچ گئے اور انکے پیچھے تاجر لوگ اور پھر مختلف پیشہ ور عام لوگ اور پھر جواری غنڈے بدمعاش راہزن اور دوسرے جرائم پیشہ جنمیں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے۔ بعد کو کوئی ایسا چست چالاک انسان آگیا جس نے کل زمین ہی اپنے نام کرالی جسکی وجہ سے مقدمہ بازی شروع ہوگئی اور وکیل آنے شروع ہوگئے۔ پھر شہر کی دیکھ بھال کرنے والی کمیٹی بن گئی جس نے مرنے والوں کیلئے ایک تابوت بردار بھی مقرر کردیا۔ ان سب چیزوں کیلئے اخبار کی ضرورت پڑی اور اخبار کے ذریعہ سیاسی معاملات پھیلے پھر ریلوے لائن آئی۔ ان سب لوگوں نے ملکر گرجا گھر اور جیل بناڈالے اور اسطرح تہذیب و تمدن اس علاقے میں پھیلا۔ لیکن جیسا کہ آپ نے دیکھا ان سب کاموں کی پیشوائی وہسکی نے کی اور ہر جگہ ہمیشہ ہی ہوتا رہا ہے۔ یہ چیز

پردیسی کی طرح ہی وہ اس حقیقت سے بےخبر رہی کہ تہذیب و تمدن کی ترقی اُسی کی وجہ سے ہوئی۔ وہ اپنے لئے اجرام فلکی میں سے کوئی مناسب نام تلاش کرتی رہی جو اسکی جگہ بطور علامیہ استعمال کیا جاسکے۔ اگر اُسے سب واقعات کا پتہ ہوتا تو وہ یہ کہتی۔

"حکومت کی صراحی مغرب کی طرف بڑھتی ہے"۔

تہذیب و تمدن کا یہ سب سے بڑا پیشوا یعنی وہسکی سب سے پہلے جون ۱۸۳۶ء میں اس جگہ آئی جو اب سینٹ پال کہلاتی ہے۔ اُسی دن پیئرے پیرینٹ نے جو کینا ڈا کا رہنے والا تھا اپنی چھوٹی سی وہسکی کی دکان کھولی اور قبائلیوں کو وہسکی فراہم کرنے لگا۔ اسکا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔

شہر سینٹ پال کی نئی عمارتوں، وہاں کی دن دونی اور رات چوگنی ترقی، وہاں کی دولت، وہاں کے لوگوں کی ذہانت، وہاں کے فنِ تعمیر کے عمدہ نمونے، وہاں کے بازاروں کی بھیڑ بھاڑ اور سرگرمی کی بابت جو کچھ میں نے بتایا وہی سب اسکے پڑوسی شہر منی پولس پر بھی صادق آتا ہے۔ صرف اتنا اور کہنا ہے کہ منی پولس سینٹ پال سے بھی بڑا ہے۔

چند ماہ بیشتر ان دونوں غیر معمولی شہروں کے درمیان دس میل کا فاصلہ تھا لیکن اب ان کی توسیع اتنی زیادہ ہو چکی ہے کہ اُمید ہے عنقریب ہی یہ دونوں شہر ایک دوسرے سے ملجائینگے اور ایک ہی میئر کے دائرہ اختیار میں آجائیں گے۔ اگلے پانچ برسوں میں تو دونوں شہروں کی نئی ہونیوالی عمارتیں ایک دوسرے سے اتنی ملحق ہو جائیں گی کہ ایک کیلئے یہ پہچاننا مشکل ہو جائیگا کہ ایک عمارت کہاں ختم ہوئی اور دوسری سے کہاں سے شروع ہوئی۔ اگر انکی آبادی اتنی تیزی سے ہی بڑھتی رہی تو دونوں شہروں کے ملجانے پر یہاں کی مشترکہ آبادی ڈھائی لاکھ ہو جائیگی اور آبادی کے لحاظ سے سینٹ پال جو اس مقام پر واقع ہے جہاں دریائے مسیسپی میں جہازرانی شروع ہوتی ہے اور نیو اورلینز یعنی وہ شہر جہاں اس دریا میں جہازرانی ختم ہوتی ہے یا جو اس دریا کے دہانے پر واقع ہے، ایک دوسرے کے حریف اور مدِ مقابل ہو جائینگے۔

شہر منی پولس سینٹ اینتھانی کے آبشاروں کے پاس دریائے مسیسپی کے دونوں جانب پندرہ سو فٹ تک چلے گئے ہیں، آباد ہے۔ ان آبشاروں میں پانی بیاسی فیٹ کی اونچائی سے گرتا ہے

اور اس سے جو بجلی پیدا ہوتی ہے اس سے بے انتہا فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ نقصان صرف اتنا ہی ہوا ہے کہ ان آبشاروں کی قدرتی فضا کچھ مصنوعی سی ہو کر رہ گئی ہے اور آپ کو اپنا فوٹو کھنچوانے کیلئے اب پہلے جیسا قدرتی پس منظر نہیں ہوتا۔

یہاں تیس آٹا پیسنے کی چکیاں ہیں جن سے ہر سال بیس لاکھ بیرل بہت عمدہ آٹا پیسا جاتا ہے۔ یہاں بیس آرا ملیں ہیں جہاں ہر سال بیس کروڑ فٹ لکڑی کے تختے چیرے جاتے ہیں۔ علاوہ بریں یہاں اونی اور کپڑے، لکڑی کے آئینہ دار بٹوں، کھیلوں، فرنیچر، پیپوں اور کئی دوسری چیزوں کے بنانے کی ان گنت ملیں اور کارخانے ہیں۔ اس شہر میں اور سینٹ پال میں جو آٹا پیسنے کی ملیں ہیں ان میں سائنس کے جدید طریقوں سے کام ہوتا ہے یعنی گیہوں چکی میں پسنے کے بجائے ایک بیلن جیسی مشین سے کچلا جاتا ہے اور آٹا تیار ہو جاتا ہے۔

منی پولس میں سولہ ریلوے لائنیں مختلف سمت اطراف سے آکر ملتی ہیں اور روزانہ بیشمار سواری گاڑیاں آتی جاتی رہتی ہیں۔

سینٹ پال کی طرح یہاں بھی صحافت یعنی اخبار نویسی کے فن میں کافی ترقی ہوئی ہے۔ یہاں تین بڑے روزنامے، دس ہفتہ وار اور تین ماہانہ جریدے شائع ہوتے ہیں۔ یہاں ایک یونیورسٹی ہے جسمیں چار سو طلبا پڑھتے ہیں۔ یہ ادبی تعلیم صرف لڑکوں تک ہی محدود نہیں ہے۔ لڑکیاں بھی اس سے فیضیاب ہوتی ہیں یہاں سولہ سرکاری سکول ہیں جنکی عمارتوں پر پانچ لاکھ ڈالر خرچ ہوئے ہیں۔ ان اسکولوں میں چھ ہزار طلبا تعلیم پاتے ہیں اور ایک سو اٹھائیس مدرس پڑھاتے ہیں یہاں ستر گرجا گھر ہیں اور کئی تعمیر کئے جانیکی تجویزیں ہیں۔ یہاں کے بینکوں میں تقریباً تیس لاکھ ڈالر کا سرمایہ لگا ہوا ہے اور یہاں کی مختلف چیزوں کی تجارت کا تخمینہ پانچ کروڑ ڈالر سالانہ ہے۔

سینٹ پال اور منی پولس کی کئی چیزیں بہت دلچسپ اور مشہور ہیں مثلاً فورٹ اسنیلنگ[1] یعنی ایک چھوٹا سا قلعہ جسکے اندر ایک چٹان ہے جو سو فٹ اونچی ہے۔ منے ہاہا[2] کا آبشار، وہائٹ بیر لیک[3] وغیرہ وغیرہ۔ منے ہاہا کے خوبصورت آبشار تو پہلے ہی بہت مشہور ہیں مجھے انکے بارے میں کچھ بیان کرنیکی ضرورت نہیں ہے۔ دوسری چیز جو قدرے کم مشہور ہے وہ ہے وہائٹ بیر لیک

---

1. Fort Suelling 2. Minne Haba 3. White Bear Lake

جھیل کی ایک خوشنما چادر معلوم ہوتی ہے۔ گرمیوں میں یہاں شہر کے مالدار اور فیشن ایبل لوگ تفریح کرنے آتے ہیں۔ یہاں ایک کلب ہے اور ایک ہوٹل بھی ہے جہاں آرام و آسائش کی سبھی جدید ترین چیزیں مہیا ہیں۔ گرمیوں میں ٹھہرنے کیلئے یہاں عمدہ مکانات ملجاتے ہیں۔ مچھلی مارنے شکار کرنے اور کاروں میں سیر کرنے کیلئے یہ جگہ بہت خوشگوار ہے۔ سینٹ پال اور منی پولس کے ارد گرد بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے مقامات ہیں جہاں گرمیوں میں تفریح کیلئے لوگ جاتے ہیں لیکن وہائٹ بیئر لیک اس مقصد کیلئے بہترین ہے۔ اسکے متعلق قبائلیوں میں ایک اعتقاد کہانی مشہور ہے۔ میں چاہتا تھا کہ میں اسے یہاں نہ لکھوں مگر دل نہ مانا اور میں نے اسے شامل کر ہی دیا۔ گائڈ بک میں تو کہانی کو محفوظ رکھنے والے کا نام اور اسکی فصاحت بیانی کی تعریف بھی کی گئی ہے مگر میں اسکے متعلق اور کچھ نہ کہہ کر اس رومانی کہانی کو یہاں ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہوں:۔

وہائٹ بیر لیک کا قصّہ

وہائٹ بیر لیک کے بیچ میں ایک جزیرہ تھا جہاں ہر سال موسم بہار میں قبائلیوں کا ایک گروہ آکر رہا کرتا تھا۔ یہ لوگ میپل کے درخت سے شکر بنایا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ قریب قریب سو سال تک جبتک وہاں قبائلی رہے چلتا رہا۔

روایت اسطرح ہے کہ بہت عرصہ گذرا اس جزیرہ پر ایک نوجوان بہادر سپاہی اپنے سردار کی لڑکی سے محبت کرتا تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ لڑکی بھی اس سے محبت کرتی تھی لیکن لڑکی کے والدین سے جب بھی دریافت کیا گیا تو انھوں نے اسکی شادی اس سپاہی سے کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ بڈھے سردار کی رائے یہ تھی کہ وہ سپاہی بہادر نہیں ہے اور یہی رائے لڑکی کی ماں کی بھی تھی جو اس سپاہی کو عورت سمجھتی تھی۔

شام کا وقت تھا۔ آفتاب کی روشنی میپل کی جھاڑیوں پر سے رخصت ہو چکی تھی اور چمکیلے نیلگوں آسمان میں چاند نمودار ہو گیا تھا۔ نوجوان سپاہی نے اپنی بانسری لی اور اکیلا چلدیا وہ ایک بار پھر اپنی محبت کا راگ الاپنا چاہتا تھا۔ لطیف و خوشگوار ہوا کے جھونکے چل رہے تھے جن سے اسکے سر پر لگی ہوئی ٹوپی کے دو پر لہرا رہے تھے۔ جب وہ ایک جھکے ہوئے

درخت کے تنے پر چڑھا تو اسکے پیر سے پھسل کر برف کا ڈھیر ڈھیر نیچے گر پڑا اور جب اس نے بانسری ہونٹوں پر رکھی تو اسکا کمبل اسکے سڈول کندھوں پر سے سرک کر نیچے گر پڑا اور ذرا سا برف کے نیچے ڈھلک گیا۔ اب اس نے اپنا محبت کا مجنونانہ راگ الاپنا شروع کیا۔ مگر جلد ہی اُسے ٹھنڈ محسوس ہوئی اور وہ اپنا کمبل لینے کیلئے نیچے اُترا۔ تبھی کسی نے پیچھے سے اسکے کندھے پر اپنا نازک ہاتھ رکھدیا۔ یہ اسکی محبوبہ کا ہاتھ تھا جو اسکی حفاظت کرنیوالے فرشتے کا کام کررہی تھی۔ وہ اسکے پاس بیٹھ گئی اس وقت دونوں بڑے خوش و خرم نظر آرہے تھے کیونکہ ہر قبائلی کے دلمیں محبت کا جذبہ اتنا ہی زبردست ہوتا ہے جتنی کہ آزاد رہنے کی خواہش؛ جسکی وجہ سے وہ جنگل میں رہنا پسند کرتا ہے۔ قصے میں آگے بیان کیا گیا ہے کہ اُسی وقت ایک بڑا سفید ریچھ قطب شمالی سے جہاں ہر جگہ برف منجمد تھی اور سخت سردی پڑ رہی تھی جنوب کی طرف روانہ ہوا اور چلتے چلتے وہ اس جھیل کے شمالی کنارے پر جو اب اسی کے نام سے وہائٹ بیر مشہور ہے پہونچا اور پھر دھیرے دھیرے گھنی برف پر چلتے ہوئے اُسی جزیرے کی طرف روانہ ہوا جہاں اس موسم بہار میں وہ عاشق و معشوق پہلی بار ملے تھے۔ وہ اب اپنی پہلی جگہ چھوڑ کر ایک لمبے ایلم درخت کی شاخوں کے بیچ بیٹھے ہوئے تھے اس درخت کی شاخیں پانی کی سطح سے کہیں زیادہ اونچائی پر تھیں (یہ پیڑ وہاں ابتک موجود ہے اور ہر شخص کو اسے دیکھنے کا اشتیاق ہوتا ہے)۔ یہ دونوں اس ڈر سے کہ کہیں پکڑ نہ لئے جائیں۔ دھیرے دھیرے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ یہ سوچکر کہ جلد ہی کیمپ کو لوٹ جائیں تاکہ ان پر کوئی شبہ نہ کرسکے وہ وہاں سے اٹھکر چلنے کو تیار تھے کہ اچانک نیچے ریچھ کو دیکھکر لڑکی کی چیخ نکل گئی جسکی آواز کیمپ تک پہونچ گئی۔ لڑکی نے اچھل کر نوجوان سپاہی کا کمبل پکڑ لیا لیکن اس کا پیر پھسل گیا جسکی وجہ سے وہ مع کمبل کے نیچے اس خطرناک جانور کے اوپر گر پڑی۔ ادھر کیمپ سے آدمی عورتیں اور بچے دوڑتے ہوئے جھیل پر پہونچے مگر کسی کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ہر شخص چلا رہا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیا کیا جائے۔ اس اثناء میں اس خونخوار سفید ریچھ نے دم بخود لڑکی کو اپنے پنجوں میں دبوچ لیا تھا۔ ریچھ اپنے شکار سے کھیل رہا تھا جیسی کہ اسکی عادت ہوتی ہے۔ اس قبیلے کے ہزاروں آدمی چیخ رہے تھے اور سب سے اونچی آواز اس بہادر سپاہی کی آرہی تھی۔ پھر وہ سپاہی اپنے خیمے کی طرف بھاگ کر گیا اور اپنا وفادار چاقو نکال کر لایا۔ وہ ایک ہی جست میں دوبارہ اس خوفناک منظر کے قریب پہونچ گیا اور اس جھکے ہوئے پیڑ کی طرف

جھپٹا جہاں اسکی محبوبہ گری تھی اور ایک پاگل شیر کی طرح غصہ میں بپھرے ہوئے اس نے ریچھ پر وار کیا۔ جانور نے بھی اسکی طرف مڑ کر جوابی حملہ کیا اور اپنے پنجے کے ایک ہی وار سے اُس نے سپاہی کو بھی دبوچ لیا اور اسطرح اِن عاشق و معشوق یکجا کر دیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ سپاہی نے اپنا چاقو ریچھ کے جسم میں پار کر دیا جس سے خون کا فوارہ چھوٹ پڑا اور مرتے ہوئے ریچھ نے اپنا پنجہ ڈھیلا کر دیا۔

اس رات کو مارے خوشی کے نہ عاشق کو اور نہ اسکی محبوبہ کو نیند آئی اور نہ اس قبیلے کے لوگوں کو۔ بوڑھے جوان سب خوشی سے ریچھ کی لاش کے چاروں طرف ناچنے لگے۔ بہادر سپاہی کو بطور بہادری کے تمغے کے ایک پر اور پیش کیا گیا اور چاند نکلنے سے پہلے اسکی محبوبہ آسکو بطور تحفہ دیدی گئی اور انکی شادی کی رسم دھوم دھام سے ادا کی گئی۔ انکے بچے برسوں تک اس سفید ریچھ کی کھال سے کھیل رہے۔ اسی سفید ریچھ کے نام پر اس جھیل کا نام وہائٹ لیک پڑا۔ وہ دوشیزہ اور اسکا عاشق اس خوفناک نظارے کو برسوں نہیں بھولے کہ کسطرح وہ موذی جانور کے نیچے سے چھوٹ کر پھر ایکدوسرے سے ملے۔ یہ عاشق و معشوق کس۔ سے۔ می۔ پا[1] اور کا گو کا[2] اس ریچھ سے اپنی خطرناک جنگ کبھی نہ بھول پائے کیونکہ اسی کی وجہ سے وہ اس خوش نصیب شکارگاہ میں پہونچے جہاں انکی قسمت کا فیصلہ انکے حق میں ہوا۔"

یہ قصہ فہم سے بالاتر معلوم ہوتا ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ لڑکی پیڑ سے گرتی ہے اور مع کمبل کے گرتی ہے اور ریچھ اسکو پکڑ لیتا ہے اور اسے پیار کرتا ہے یعنی لڑکی کو مع کمبل کے۔ اسکے بعد پھر وہ پیڑ پر پہونچ جاتی ہے اور کمبل اس سے چھوٹ جاتا ہے۔ اسی اثنا میں سپاہی جنگی نعرے لگاتا ہوا گھر جاتا ہے اور چاقو لیکر واپس آتا ہے۔ وہ پھر پیڑ پر چڑھتا ہے اور ریچھ کے اوپر چھلانگ مارتا ہے۔ دوشیزہ بھی سپاہی کے پیچھے پیچھے کود پڑتی ہے (ظاہر ہے کہ ابتک وہ پیڑ پر تھی۔) پھر وہ کمبل کیساتھ ریچھ کی بغل میں پہونچ جاتی ہے۔ اس کا عاشق اپنا چاقو ریچھ کی بغل میں بھونک دیتا ہے اور اسے بچالیتا ہے۔" کیسے۔؟" "کمبل کو۔" نہیں۔ آپکی تمامتر توجہ کمبل ہی پر مرکوز ہے اور پھر یکایک کہانی ایک خوشگوار موڑ پر آجاتی ہے اور آپ خلاف توقع یہ سنتے ہیں کہ کمبل کو نہیں بلکہ

---

1. Kia-Se-Me-Pa 2. Ka-Go-Ka

لڑکی کو بچا لیا گیا۔ آپکو یہ سنکر دھچکا سا لگتا ہے کیونکہ آپکے نزدیک لڑکی سے زیادہ کہانی میں کمبل اہم تھا۔ مزید براں کہانی ادھوری بھی ہے کیونکہ اسمیں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ کمبل کیسے ملا۔ یہ ادھوری کہانی آپکے لئے ایکہزار سال تک معمہ بنی رہیگی۔ لیکن مردہ بھی اس سے اچھی کہانی کہدیتا۔ میری مراد کسی حال ہی میں مرے ہوئے آدمی سے نہیں ہے بلکہ کسی ایسے شخص سے ہے جسے مرے ہوئے ہفتوں اور مہینوں ہوگئے ہوں۔

اب ہم وطن کی جانب چل پڑے اور کچھ ہی گھنٹوں میں شکاگو پہونچ گئے جو ایک عجیب و غریب شہر ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ہر الہ دین کا چراغ موجود ہے۔ جسے بار بار رگڑ کر اور جن کو بلا بلا کر ناممکن چیزوں کو بھی ممکن کیا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی آنیوالے سیاح کو شکاگو کو پہچاننا مشکل ہوجاتا ہے کیونکہ یہاں کی ترقی کے بارے میں جو قیاس آرائی وہ کرتا ہے اس سے کہیں بڑھکر یہاں ترقی ہوچکی ہے۔ یہ شہر آپکو ہر بار نیا دکھائی دیگا۔ کیونکہ پچھلی بار آپ نے جو کچھ یہاں دیکھا ہوگا اسمیں بڑی بڑی تبدیلیاں ہوچکی ہونگی۔ پینسلوانیا سڑک سے ہم نیویارک آئے راستے میں ہم دس منٹ سے زیادہ کہیں نہیں ٹھہرے۔ اور اسطرح ہمارا پانچ ہزار میل کا سفر جو بڑا پر لطف تھا اختتام کو پہونچا۔ ایسے خوشگوار سفر کا موقعہ مجھے قسمت نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیا تھا۔

ضمیمہ (الف)

(نیو آرلینز ٹائمس ڈیموکریٹ مورخہ ۲۹ ر مارچ ۱۸۸۲ء کے شمارے سے ماخوذ)
ٹائمس ڈکریٹ کی امدادی کشتی کا سیلاب زدہ علاقوں کا دورہ۔

جمعرات کے دن صبح نو بجے جب سوسی کشتی دریائے مسی سپی سے نکل کر اولڈ ریور یعنی دریائے ریڈ کے دہانے میں داخل ہوئی، اور جب ہم بائیں جانب بڑھے تو دیکھا کہ سیلاب کا پانی پشتے کے اوپر نیچے سے نکل کر چانڈلر فارم کے اوپر بہہ رہا تھا۔ یہ فارم پوائنٹے کوپی[1] کلیسائی حلقہ کے انتہائی شمال میں واقع ہے۔ وہاں ہر طرف پانی ہی پانی ... نظر آتا تھا۔ حالانکہ دریا کے اونچے پشتے میں کوہی دیر پہلے شگاف ہوا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ جانوروں کو ایک چپٹے پیندے والی بڑی کشتی میں اکٹھا کر دیا گیا تھا۔ جہاں یہ بیچارے بھوکے کھڑے غالباً یہ انتظار کر رہے تھے کہ کوئی جہاز کھینچنے والی کشتی آئے اور وہاں سے باہر نکال کر کسی محفوظ مقام پر پہنچا دے۔ دریا کی دائیں جانب ٹرن بلز[2] کا جزیرہ ہے۔ جس پر ایک بڑا بھاری فارم ہے جسکو ریاست کا سب سے زرخیز فارم بتایا جاتا تھا۔ اس سے بیشتر یہاں معمولی سیلاب آتے رہتے تھے اور یہ جزیرہ انکی زد سے بچا رہتا تھا۔ مگر اس سیلاب میں یہ جزیرہ فارم سمیت تہ آب ہو گیا۔ دور تک پھیلی ہوئی پانی کی چادر سے ہی یہ پتہ چلتا تھا کہ کھیت اسی کے نیچے ہوں گے۔ پشتے کے بالائی کنارے کہیں کہیں نظر آرہے تھے۔ مگر اسکا باقی حصہ پانی میں ڈوب چکا تھا۔

پانی میں کھڑے ہوئے درختوں کے پتے اور ٹہنی تازے اور ہرے معلوم ہوتے ہیں۔ اور جنگل میں ہر طرف ہریالی ہی ہریالی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن یہ خوشنما نظارہ سیلاب تباہی کی وجہ سے بے مزہ معلوم ہوتا ہے۔ ہم میلوں تک بڑھتے جا رہے ہیں مگر ہمیں پانی میں اوپر تک ڈوبے ہوئے درختوں کے علاوہ اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ کا ہے بگاہے کوئی نیل مرغ اڑا تا ہوا

---

1. Pointe Coupee 2. Turn Bulls Island

دکھائی دے جاتا ہے۔ اور پھر دیر تک سناٹا ہی سناٹا یا کبھی کوئی دو مستولی کشتی جھاڑیوں کے پیچھے سے نکل کر دریائے ریڈ کو پار کرتی اور کسی سیپی میں جاتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اسکے غمزدہ ملاح ہماری کشتی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ کشتی کے بادبانوں کی سرسراہٹ اس مایوسی اور تیرگی میں بھی ایک ایسا نغمہ پیدا کر رہی ہے جو ہر کسی کو متاثر کرتا ہے یہ تیرگی گھنے جنگلوں یا تاریک غاروں کی تیرگی نہیں ہے۔ یہ ایک عجیب قسم کی تیرگی ہے جو اتنی گمبھیر اور پر جلال ہے کہ خواہ مخواہ لوگوں کے دلوں پہ ہیبت طاری ہوتی ہے۔ آج صبح ہم نے دو حبشی گھرانوں کو ایک بیڑے پہ بیٹھے ہوئے دیکھا۔ جسکو انھوں نے بید کے درخت سے باندھ رکھا تھا۔ یہ لوگ خوشحال معلوم ہوتے تھے۔ کیونکہ انکے پاس خوراک کا اچھا انتظام تھا اور تین یا چار سور تھے۔ ان کا یہ بیڑہ تقریباً بیس مربع فٹ کا تھا جس پر ایکطرف آڑ کر کے انھوں نے تھوڑی سی مٹی رکھ لی تھی اور اسی مٹی پر آگ جلانے کا انتظام کر لیا تھا۔

اپٹ چافالیا[1] کے پاس پانی کا بہاؤ بہت تیز تھا کیونکہ مسی سپی اسی سمت میں بہہ رہا تھا جس سے یہ بات صحیح معلوم ہوتی تھی کہ یہ دریا خلیج میکسیکو تک پہنچنے کے لئے اپنا راستہ برابر مختصر کرنے پر تلا ہوا ہے۔ چھوٹی کشتیاں ڈونگیاں اور دو مستولی کشتیوں کی مانگ بہت بڑھ گئی ہے ان کشتیوں کو حبشی بحری قزاق چرا کر لیجاتے ہیں اور رات جنگلوں پر لیجا کر جہاں انکی قیمت زیادہ ملتی ہے بیچ ڈالتے ہیں۔ میری گفتگو مسٹر سی۔ پی فرگوسن سے ہوئی جو دریائے ریڈ کے قریب کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ انکا فارم بھی سیلاب کی زد میں ہے۔ مجھے انکی باتوں سے پتہ چلا کہ اس علاقے میں دور تک بڑی تباہی اور بربادی ہوئی تھی۔ یہاں کے حبشیوں کو کبھی یہ خیال ہی نہ آیا تھا کہ پشتے میں بھی دراڑ پڑ سکتی تھی کیونکہ یہ پشتہ تو مدتوں سے نہایت مضبوطی سے کھڑا تھا۔ لہذا جب پشتے میں شگاف پڑا تو ان بیچاروں کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔ جمعرات کے دن بہت سے لوگوں کو درختوں اور کیبنوں کی چھتوں سے اتارا گیا اور انھیں محفوظ مقام پر پہونچا دیا گیا۔ لیکن پھر بھی بہت سے لوگ باقی ہیں۔

آپکو زمین اور اسکے اوپر کی چیزوں کی اہمیت اُسی وقت معلوم ہوتی ہے جب کئی روز تک آپکو زمین دیکھنے ہی کو نہ ملے اور آپکو سیلاب کے پانی میں ہی سفر کرنا پڑے۔ سمندر میں سفر کرتے ہوئے تو زمین دیکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مگر یہاں کم از کم کہیں کہیں ہوا میں اڑتی ہوئی پتیاں

---

1. Atchapalaya

یا جنگلوں سے ڈھکے جزیرے یا مکانوں کی چھتیں تو دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔ اگر کہیں قبرستان کی زمین بھی پانی سے باہر نکلی ہوئی دکھائی دیتی تو ہمیں کچھ تسلی ہوتی۔ یہاں ہر طرف پانی ہی پانی ہے اور یہ جاننا مشکل ہے کہ دریا کہاں ہے۔ صرف یہی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ جہاں درختوں کے درمیان خاصا لمبا فاصلہ ہے وہیں دریا ہوگا۔ اسوقت فورٹ ایڈم سے جو دریائے مسی سپی کے بائیں کنارے پر واقع ہے ریڈ بیز پیرش کے ساحل تک تقریباً ساٹھ میل کی چوڑائی میں پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ اس علاقے کے ایک بڑے حصے پر کاشتکاری ہوتی تھی خاصکر دریائے مسی سپی کے کنارے کنارے اور دریائے ریڈ کے عقبی حصے میں۔ جب ہم لوگ دریائے ریڈ میں داخل ہوئے تو ایسا محسوس ہوا کہ اس دریا کے آر پار دریائے مسی سپی کے بالکل متوازی ایک تیز دھارا بہہ رہا ہے۔

چند گھنٹوں کی جدوجہد کے بعد ہم بلیک میں داخل ہوئے۔ داخل ہوتے ہی ہمیں یہاں تباہی و بربادی کے آثار نظر آنے لگے۔ ساحل کے کنارے کھڑے بید کے درختوں کی ہری بھری شاخیں ٹوٹ گئی تھیں۔ ہمیں وہاں ایک آدمی ملا جس سے آپکے نامہ نگار نے بات چیت کی۔ اُس نے بتایا کہ اسکے پاس مویشیوں کے دو گلے تھے ایک میں ایکسو پچاس مویشی اور دوسرے میں سو سؤر تھے۔ سیلاب کو دیکھتے ہی اس نے اپنے جانوروں کو اوویلیز[1] کے پہاڑی علاقہ کی جو یہاں سے پینتیس میل دُور تھا ہانکنا شروع کر دیا۔ پھر بھی اسکے پچاس مویشی اور ساٹھ سؤر سیلاب کی زد میں آکر ہلاک ہو گئے۔ دریائے بلیک بہت دلکش نظر آتا ہے حالانکہ اسکے ساحل زیرِ آب ہیں۔ جنگلی خود رو درختوں اور شاہ بلوط کیکر اور اخروٹ کے پیڑوں کی کثرت کے سبب ساحل سے گذرنا مشکل ہے۔ ان درختوں کے درمیان اندھیرے میں اگر کچھ دکھائی دیتا ہے تو صرف دُور کھڑے ہوئے ٹھنٹھوں کی دھندلی دھندلی شکلیں۔

ہم دریا کے بہاؤ کی طرف چند میل آگے گئے جہاں پانی کی گہرائی کنارے پر بھی آٹھ فیٹ سے کم نہ تھی پانی کے بہاؤ کی تیزی کے باوجود ابھی کچھ مکانوں کی چھتیں اپنی جگہ پر قائم تھیں اور صاف دکھائی دیتی تھیں جگہ جگہ مسمار شدہ مکانوں کے گرد ٹوٹے ہوئے درخت اکٹھے ہو گئے تھے۔ اور ملبے میں پھنس گئے تھے۔ یہ غالباً آئندہ بننے والے جزیرہ کی بنیاد تھی۔

---

1 Avoyellies

ہم نے اپنا کوئلہ بچانے کی غرض سے لکڑی کے ذخیروں کی تلاش کی کیونکہ اس مہم میں ہمیں کہیں بھی دریا کوئلہ ملنے کی اُمید نہیں تھی۔ جب ہم چکر کاٹ کر ایک مقام پر آئے تو ہمیں ایک دو مستولی کشتی ملی جسے ایک نوجوان لڑکا بڑا ہوشیاری سے چلا رہا تھا۔ کشتی کے اگلے حصے میں ایک پندرہ سالہ سیاہ آنکھوں والی لڑکی بیٹھی تھی جو خوبصورت اور شرمیلی تھی۔ لڑکے نے ہم لوگوں سے کاغذ مانگا جو ہم نے اسکی طرف پھینک دیا اور وہ دونوں اپنی چھوٹی سی کشتی کو تیز بھگا کر ہماری کشتی کے آگے لہروں میں غائب ہو گئے۔

اسیوقت ایک چھوٹی سی لڑکی جسکی عمر یقیناً بارہ سال سے زائد نہ ہو گی ایک بہت ہی چھوٹے سے ڈونگے کو چلاتی ہوئی نظر آئی تو وہ اسکو ایسی ہوشیاری اور سبکدستی سے چلا رہی تھی جیسے کوئی بڑا تجربہ کار ملاح چلا رہا ہو۔ یہ لڑکی سفید فام قبائلی لگتی تھی۔ جب ہم نے اس سے پوچھا "تمہیں ڈر تو نہیں لگتا" وہ ہنس پڑی غالباً اسکی پرورش کشتی میں ہی ہوئی تھی لہٰذا وہ تنہا کشتی میں کہیں بھی جا سکتی تھی۔ اسوقت وہ اپنے مویشیوں کے لئے پتے اکٹھے کرنے آئی تھی۔ اس نے اپنے مکان کی طرف اشارہ کیا جسکے فرش پر تین تین انچ اونچا پانی کھڑا تھا۔ مکان کے عقبی دروازے سے تیس ۳۰ مربع فٹ کا ایک بیڑا بنا رہا ہوا تھا جس پر چاروں طرف باڑھ لگا دی گئی تھی اسکے اندر سولہ گائیں بھینسیں اور سور کھڑے تھے۔ اس گھرانے کے لوگوں کا کوئی زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ اگرچہ انکے کچھ مویشی ضرور ہلاک ہو گئے تھے۔ یہ لوگ کچھ لکڑی اپنے بیڑے پر لاد کر ہمیں دے گئے۔

اس جگہ سے دریائے مسی سیپی تک پندرہ میل کی دوری میں زمین کا کوئی حصہ پانی سے اوپر نظر نہیں آتا اور اسی طرح مغرب کی طرف بھی پینتیس میل تک پانی کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

۲۳ تاریخ بروز جمعرات دریائے بلیک میں پانی پونے دو انچ اور چڑھ گیا اور رات بھر چڑھتا رہا۔ مگر اب ہم جیسے جیسے آگے بڑھتے ہیں ہمیں آبادی اور مکانات زیادہ نظر آتے ہیں مگر آبادی دور دور ہی دکھائی دیتے ہیں۔ قریب قریب سبھی مکان سنسان اور ویران معلوم ہوتے ہیں۔ مکانوں کے ملحقہ حصے جیسے اصطبل وغیرہ سب سیلاب میں بہہ گئے ہیں۔ ہر طرف سناٹا ہی سناٹا ہے۔ پرندے تک غائب ہیں کسی چڑیا کی چہچہاہٹ یا کسی گلہری کی ہمیں چیں تک سنائی نہیں دیتی۔ صرف کبھی کبھی کوئی مچھلی پانی سے اوپر اپنی دم کو اٹھاتی ہوئی نظر آتی ہے مگر فوراً ہی غائب ہو جاتی ہے۔ اسکے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا۔ ہر طرف موت کی سی ویرانی اور خاموشی ہے۔ دریا کی سطح پر کبھی کوئی مرغیوں کا سفید ڈربہ یا

مکان کے احاطے کی ٹوٹی ہوئی لکڑی کی پٹیاں یا کسی مکان کا دروازہ بہتا نظر آتا ہے یا کوئی پانی سے پھولی ہوئی لاش دکھائی دیجاتی ہے جس پر گیدھ کا جوڑا بیٹھا ہوتا ہے۔ گیدھ ہی ایک ایسا پرندہ ہے جو اس ویرانی میں نظر آتا ہے۔ لاش پر بیٹھے ہوئے گیدھ اسے نوچتے رہتے ہیں۔ ایک بار ایک تصویر کا فریم بہتا ہوا دکھائی دیا۔ جسکے اندر روغنی رنگوں سے بنی ہوئی ایک سپاہی کی تصویر تھی جسمیں اسے گھوڑے پر سوار دکھایا گیا ہے۔ یہ چیز اس بات کی شاہد ہے کہ جس مکان میں یہ تصویر رکھی ہوگی وہ سیلاب کی زد میں آگیا اور تصویر کا فریم وہاں سے بہ آیا۔

شام کیوقت جب اندھیرا اور بڑھ گیا تو ہم نے آگے جانا مناسب نہ سمجھا اور پہاڑوں کے نیچے ایک جگہ تلاش کر کے ایک ببول کے درخت سے اپنی کشتی رات بھر کے لئے باندھ دی۔

اُفق پر نئے چاند کا صرف چوتھائی حصہ نمودار ہوا۔ جسکی روشنی میں دریا اور جنگل بڑے حسین معلوم ہونے لگے۔ اگر کوئی مصور اپنے کینوس پر اس ماحول کی تصویر کھینچتا تو وہ قدرتی مناظر کے مطالعہ کیلئے ہمیں بڑی دلچسپ چیز مہیا کرتا۔ اسوقت ہماری کشتی کا انجن بند تھا اسلئے بھاپ کی پھک پھک کی آواز بھی نہیں آرہی تھی۔ ہر طرف خاموشی اور ہُو کا عالم چھایا ہوا تھا۔ سناٹا واقعی بڑا بھیانک تھا۔ عموماً جنگل میں رات کیوقت کم از کم مینڈکوں کی ٹراہٹ یا کیڑے مکوڑوں کی بھنبھناہٹ یا پرندوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ تو سنائی دیتی ہے لیکن یہاں تو ایکدم سناٹا تھا۔ سامنے ایک گرجا گھر ویران عمارت نظر آتی ہے مگر اسکے اندر یا اسکے بغلی راستوں سے بھی کوئی آواز نہیں آتی۔ خاموشی کا یہ عالم ہے کہ دریا کے ہلکوروں تک کی آواز معدوم ہے۔

جمعہ کی صبح کو تڑکا ہوتے ہی ہم سب اٹھ بیٹھے اور دریائے بلیک کے چڑھاؤ کی طرف روانہ ہوئے۔ صبح بڑی سہانی تھی تعجب کی بات یہ تھی کہ دریائے مسی سپی کا راستہ جو عموماً ٹیڑھا میڑھا ہے اس جگہ بالکل سیدھا نظر آرہا تھا۔ اور منظر بھی حسین ترین تھا۔ ہاتھورن کے پھولوں سے ہوا معطر ہو رہی تھی۔ کچھ چڑیاں ساحل پر بیٹھی بڑی خوش الحانی سے چہچہا رہی تھیں۔ پہلے کے مقابلے میں یہاں درخت زیادہ لمبے اور زیادہ قدیم معلوم ہوتے تھے۔ دریا کے دہانے کی بہ نسبت یہاں کھیت بھی زیادہ تعداد میں تھے لیکن تباہی کا یہاں بھی وہی عالم تھا۔ مکان مسمار ہو گئے تھے اور لوگ چراگاہوں میں آگ جلائے بیٹھے تھے حبشیوں نے اپنے عارضی مکانات گھبراہٹ اور عجلت میں شاہ بلوط کے درختوں سے باندھ

دیتے تھے۔ جنکے چھجے پانی سے کچھ ہی باہر دکھائی دیتے تھے۔ قرمزی سورج اپنی پوری تابناکی سے نکل آیا تھا جسکی روشنی میں درخت مختلف قسم کے ہرے رنگوں میں چمک اٹھتے تھے مگر ایک انچ بھی زمین کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔ پانی اونچا ہوتا جا رہا تھا اور بلند سے بلند درختوں کی شاخوں سے ٹکرا رہا تھا۔ ساحل کے کنارے کھڑے بید کے درختوں کی پتیاں ختم ہو چکی تھیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ لوگ نہ جانے کتنے دنوں سے اپنے مویشیوں کیلئے ان پتوں کو توڑ رہے تھے۔ ایک بوڑھے آدمی سے جو ایک دو مستولی کشتی میں بیٹھا تھا یہ دریافت کیا گیا کہ کیا یہ مویشی ان پتیوں کو خوشی سے کھا لیتے ہیں تو اس نے بددلی سے سر ہلا کر جواب دیا "ہاں جناب یہ انکے جسموں میں حرارت برقرار رکھتی ہیں اور ہمارے لئے یہی تسلی کافی ہے۔ لیکن سؤر تو انکو مشکل سے ہی کھاتے ہیں۔ خاصکر انکے بچے۔ وہ بھوک سے مر رہے ہیں مگر ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔؟ ہمارے پاس انکو کھلانے کیلئے ان پتیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

دریائے بلیک کے دہانے سے تیس میل اوپر پانی دریائے مسی سپی پر واقع بیچز سے لوئی آنا کے صنوبر کے جنگلوں تک بہتر میل کے فاصلے میں پھیلا ہوا ہے اور کہیں بھی دس فٹ سے کم گہرا نہیں ہے۔ دریائے بلیک کے بالائی حصے میں پانی کے بہاؤ کا رُخ مغرب کی جانب ہے درصل سیلاب اس زور کا آیا ہے کہ دریائے بلیک کا پانی کیلیکسی کے علاقے کی طرف بہہ رہا تھا اور ایک طرف نشیب میں اتر آیا ہے۔ اور دریائے بلیک کا پانی اپنے دہانے سے پندرہ میل اوپر دریائے ریڈ سے جا ملا ہے۔ سب سے پرانے ملاح بھی کہتے ہیں کہ ہم نے اتنا بڑا سیلاب اس سے بیشتر کبھی نہیں دیکھا۔ اسوقت جہانتک ہماری نظر جاتی ہے صرف مسی سپی کا ہی پانی ہر طرف نظر آتا ہے۔ ٹرینٹی اور ٹرائے کے مقامات سے جو کچھ دور نشیب میں ہی واقع ہیں اوپر کے علاقے کے تمام لوگ دوسری جگہوں پر چلے گئے ہیں اور اور صرف وہی لوگ وہاں رہ گئے ہیں جنکے پاس ضروریات زندگی کی تمام چیزیں کافی مقدار میں موجود ہیں۔ انکے جانور بڑی تعداد میں بیمار ہو ہو کر مر رہے ہیں جسکی ایک وجہ تو ہر وقت بیڑے میں بند رہنا ہے۔ اور دوسرے جو چارہ انہیں ملتا ہے وہ بھی انھیں بیمار کر دیتا ہے۔

کچھ وقفہ کے بعد ہم پھر اپنی مہم پر روانہ ہو گئے اور جلد ہی ایک ایسے علاقے میں پہنچے جہاں کشادہ کھیت تھے اور لوگوں کے رہنے کے عارضی مکانات دور دور تک پھیلے ہوئے تھے یہاں اونچی

تباہی و بربادی دکھائی دی۔ مکانوں کے اندر لوگوں نے صندوقوں کو ملا ملا کر مچان بنا لئے تھے جن پر انھوں نے اپنا فرنیچر رکھ لیا تھا۔ پلنگ کے پائے اوپر سے رندہ مار کر چھیل دیئے گئے تھے کیونکہ عارضی بنے ہوئے فرش سے مکان کی چھت مشکل سے ہی چار فٹ اونچی ہو گی۔ یہ کیبنیں بہت غیر محفوظ معلوم ہوتی تھیں۔ کیونکہ یہ کسی بھی لمحہ پانی میں بہہ سکتی تھیں۔ انکے نزدیک ہی مویشی کھڑے ہوئے تھے جنکے پیٹ تک پانی پہنچ رہا تھا اور یہ بیچارے بس جہاں کے تہاں کھڑے اس بات کے منتظر تھے کہ انھیں یہاں سے کوئی نکال لے۔ یہ نظارہ بڑا المناک تھا اور یہ بالکل یقینی تھا کہ اگر انکو جلد ہی محفوظ مقام پر نہ پہنچایا گیا تو بیچارے بے موت مر جائیں گے گھوڑے اور دوسرے مویشیوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ گھوڑا جب یہ دیکھتا ہے کہ کھانے کو کچھ نہیں مل رہا ہے تو وہ خوراک کی جستجو میں پانی میں کود کر تیرنے لگتا ہے جبکہ مویشی اُسی جگہ پر اسوقت تک کھڑے رہتے ہیں جبتک کہ وہ بھوک سے نڈھال ہو کر پانی میں گر کر مر نہیں جاتے۔

ساڑھے بارہ بجے کے قریب ایک چپٹے پیندے والی کشتی سے جو ساحل کے اندر کی جانب کھڑی تھی ہمیں آواز دی گئی ہم نے اپنی کشتی گھمائی اور ساحل کے کنارے؟ ادی سے پہنچ گئے۔ جنرل یارک اپنی کشتی پر باہر آئے۔ اُسوقت وہ جانوروں کو اتارنے میں مشغول تھے۔ انھوں نے خوش ہو کر ٹامس ڈیموکریٹ کی کشتی کا استقبال کیا اور کہا کہ انھیں ہماری بہت ضرورت تھی پھر ہمیں انھوں نے بتایا کہ سیلاب کی جس تباہی کی ہمیں اطلاع دی گئی تھی وہ عین حقیقت ہے اور اسمیں کوئی مبالغہ نہیں کیا گیا تھا۔ عوام کی حالت اسقدر ناگفتہ بہ تھی کہ اسکا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ پانی اسقدر اونچا ہو گیا تھا کہ مکانوں کے بہ جانیکا اندیشہ تھا۔ چھجوں تک تو پانی آہی گیا تھا اور جب پانی اتنا اونچا ہوتا ہے تو پھر مکانوں کے بہہ جانے میں کسر ہی کیا رہ جاتی ہے خدانخواستہ اگر سب مکان بہہ جاتے تو کتنی جانیں ضائع ہوتیں۔ جنرل یارک نے بہت سے لوگوں کی بہادری کو سراہا کہ انھوں نے اپنے مویشیوں کی جانیں بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ پھر بھی انکے خیال سے پچیس فیصدی سے کم مویشی ہلاک نہیں ہوئے۔ قریب ڈھائی ہزار آدمیوں کو شہر ٹرائے سے جو دریائے بلیک پر واقع ہے راشن پہونچ چکا تھا۔ جنرل یارک نے بہت سے مویشیوں کو پانی سے باہر نکال کر محفوظ مقام پہنچا دیا تھا۔ لیکن پھر بھی بہت سے جانور ابھی غیر محفوظ تھے جنکو بچانیکی اشد ضرورت تھی ۱۸۷۴ء کی نسبت اس سال پانی اٹھارہ انچ زیادہ

اونچا تھا اور روڈالیا سے لیکر کیٹاہولا کی پہاڑیوں کے درمیان کہیں بھی زمین دکھائی نہیں دیتی تھی۔

دو بجے کے قریب ہماری کشتی سو' سی شہر ٹرائے پہونچی جو دریائے بلیک کے دہانے سے پینسٹھ میل دور واقع ہے۔ یہیں پر بائیں جانب سے آکر دریائے لٹل ملتا ہے۔ اس سے تھوڑی دور آگے اوراچٹا[1] ہے اور اسکے مقابل دائیں طرف ٹینساس[2] ہے۔ ان ہی تینوں دریاؤں سے ملکر دریائے بلیک بنتا ہے۔ ٹرائے یا اس کا کچھ علاقہ تین بڑے بڑے ٹیلوں کے اوپر اور اسکے ارد گرد بسا ہوا ہے۔ یہ ٹیلے گول ہیں اور اسوقت سیلاب کے پانی کی سطح سے بارہ فیٹ اوپر نکلے ہوئے ہیں۔ انکا محیط ایکسو پچاس فیٹ ہے۔ اور انکے درمیان کا فاصلہ قریب دو سو فیٹ ہے۔ یہاں جتنے مکانات ہیں وہ سب ان ہی گنبدوں کے بیچ بیچ میں بنے ہوئے ہیں۔ اسی لئے انکے فرشوں پر اٹھارہ اٹھارہ انچ پانی کھڑا ہے۔

ان ٹیلوں کو یہاں کے قدیمی باشندوں نے صدہا سال پیشتر بنایا تھا۔ میلوں تک صرف یہی جگہ ایسی ہے جہاں سیلاب سے پناہ ملسکتی ہے۔ جب ہم یہاں پہونچے تو ہم نے اس جگہ مویشیوں کے جھنڈ کے جھنڈ دیکھے۔ سب کے سب مویشی اتنے دبلے پتلے اور کمزور تھے کہ بیچاروں کو کھڑا ہونا بھی دوبھر تھا۔ ان میں سب طرح کے مویشی شامل تھے یعنی بھیڑے، سوئر، گھوڑے، خچر، بیل اور گائیں۔ ان ٹیلوں میں سے ایک برسوں سے قبرستان کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ آج یہاں بھوک سے نڈھال گائیں قبروں کے پتھروں کے سہارے بیٹھی دکھائی دیتی ہیں۔ جنرل پارک نے انھیں کچھ اناج کھانے کو دیا ہے جسے کھا کر یہ اطمینان سے جگالی کر رہی ہیں۔ ان ٹیلوں کے ارد گرد پانی میں کچھ عورتیں اور لڑکیاں چھوٹی چھوٹی ڈونگیاں چلاتی ہوئی نظر آتی ہیں مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچے ان خطرناک چھوٹی کشتیوں کو ایسی ہوشیاری اور سبکدستی سے چلاتے ہیں کہ جیسے کوئی ہوشیار تجربہ کار ملاح چلاتا ہو۔ گویا یہ انکے لئے محض ایک کھیل ہو۔

جنرل پارک نے امداد بہم پہونچانے کا بہت اچھا انتظام کیا ہے۔ جہاں کہیں بھی ان سے امداد مانگی جاتی وہ وہاں بذات خود جاتے ہیں اور جگہ کا بغور معائنہ کرتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں

---

1. Tensas 2. Ouachita

کہ انھیں کرنا کیا ہے۔ پھر وہ دو کشتیاں اور فی الفور اس جگہ بھجوا دیتے ہیں جہاں سے وہ مویشیوں کو بیڑوں کے ذریعہ باہر نکال کر صنوبر کی پہاڑیوں اور کٹھا ہو لا کے اونچے مقامات پر بھجوا دیتے ہیں۔ انھوں نے ٹرائے کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنالیا ہے اور اسی جگہ تک کشتیاں مویشیوں کا چارہ لیکر آتی ہیں۔ دریائے لٹل جو دریائے بلیک کی بائیں شاخ ہے کے مقابل اسکے اور اواچیٹا کے بیچ ٹربینیٹی کا قصبہ واقع ہے جسکے سیلاب سے تباہ ہونیکا خطرہ ہر لمحہ لگا رہتا ہے یہ شہر ٹرائے کے مقابلہ میں بہت نشیب میں واقع ہے اسی لئے یہاں مکانوں میں آٹھ آٹھ اور نو نو فٹ پانی بھرا ہوا ہے اس جگہ سیلاب کا بہاؤ بھی بہت تیز ہے تعجب ہے کہ اس شہر کے کچھ مکانات ابتک کیسے بچے رہے۔ ٹرائے اور ٹربینیٹی کے لوگوں کی ضروریات بہم پہونچائی جارہی ہیں۔ لیکن انکے کچھ مویشیوں کیلئے ابھی تک چارہ مہیا نہیں ہو سکا ہے۔

جیسے ہی سوسی کشتی شہر ٹرائے میں پہونچی اسکو جنرل پارک کی تحویل میں دیدیا گیا تاکہ وہ جہاں چاہیں اسے بھیجدیں اور امداد دینے کا کام تیزی سے ہو سکے۔ اس کشتی کا تقریباً تمام سامان ایک ٹیلے پر اتار دیا گیا تاکہ کشتی ہلکی ہو جائے اور پھر اسے دریا کے بہاؤ کی طرف روانہ کر دیا گیا۔ تاکہ دوسرے لوگوں کو بھی امداد پہونچائی جا سکے۔ ٹرائے سے چند میل دور ٹام ہوپ کے مقام پر ایک بہت بڑے بیڑے کو جس پر پچاس مویشی بندھے ہوئے تھے کھینچ کر محفوظ مقام پر پہونچا دیا گیا۔ انھیں چارہ کھلا دیا گیا۔ جس سے جلد ہی انہیں کچھ قوت آگئی۔ آج ہمارا پروگرام دریائے لٹل کی طرف جانیکا ہے کیونکہ وہاں کے علاقے میں بہت زیادہ تباہی و بربادی ہوئی ہے۔

دریائے بلیک کے بہاؤ کی طرف

بروز سنیچر بوقت شام مورخہ ۲۵ مارچ۔

جنرل پارک کی رہنمائی میں صبح تڑکے ہم دریائے بلیک کے بہاؤ کی سمت چل پڑے تاکہ غیر محفوظ جگہوں پر جو مویشی ملیں انھیں محفوظ مقامات پر پہنچا دیں ہم نے ایک جگہ پر ایک بیڑہ ایک بوجھ کھینچنے والی کشتی پر دیکھا اس کشتی کو کچھ آدمی ڈانڈوں کے سہارے فارم کے عقبی حصے میں لے جا رہے تھے۔ جہاں کہیں انھیں جانور نظر آتے وہ انھیں بیڑے پر چڑھا لیتے۔ ایک مویشی

باڑے کے کوٹھے پر ہمیں سترہ جانور ملے۔ ہم نے فوراً ہی اسکی چھت سے بیڑے تک ایک زینہ بنا دیا جس سے بڑی آسانی سے اُن جانوروں کو بیڑے پر اُتار لیا گیا۔ جنرل کیساتھ ایک چھوٹی ڈونگی میں سوار ہو کر آپ کا نامہ نگار ایک دو کمروں والے چھوٹے سے مکان میں پہونچا جہاں فرش پر دو فٹ پانی اونچا کھڑا تھا اس مکان کے ایک بڑے کمرے میں گھوڑے اور گائیں جھنڈ بنائے کھڑے تھے اور دوسرے کمرے میں ٹیلر کی بیوہ اور اسکا بچہ فرش پر بنائے ہوئے ایک اونچے مچان پر بیٹھے تھے۔ ایک یا دو چھوٹی ڈونگیاں کمرے میں اِدھر اُدھر پانی میں پڑی ہوئی تھیں تاکہ ضرورت پڑنے پر کسی وقت بھی انھیں استعمال کیا جا سکے۔ بیڑا لاتے وقت مکان کی باہری دیوار کو توڑنا پڑا تھا۔ کیونکہ جانوروں کو وہاں سے باہر نکالنے کا اور کوئی راستہ نہ تھا انھیں کشتی پر سوار کرانیکا یہی ایک طریقہ تھا۔ جنرل یارک نے حسبِ معمول اس گھر کے لوگوں سے بھی دریافت کیا کہ آیا وہ اس جگہ کو چھوڑنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ اور انھیں یہ بھی بتایا گیا کہ ٹامس ڈیموکریٹ کے میجر برک صاحب نے انھیں لیجانے کیلئے اپنی کشتی "سوسی" بھیجی ہے مسز ٹیلر نے کہا کہ وہ میجر صاحب کا شکریہ ادا کرتی ہیں لیکن وہ ابھی یہیں رہ کر سیلاب کا مقابلہ کرینگی یہاں کے لوگوں کا اپنے گھروں سے اتنا زبردست لگاؤ نا قابلِ فہم ہے۔ نشیب میں ٹرلائے سے سولہ میل دُور ایک مقام سے یہ اطلاع ملی کہ وہاں مسٹر ٹام ایلس کے مکان کو سیلاب سے خطرہ ہے اور اسکے گھرانے کے تمام افراد گھر کے اندر رہی ہیں۔ ہم فوراً وہاں پہونچے۔ وہاں ہم نے واقعی ایک المناک نظارہ دیکھا۔ سیلاب کے پانی سے مکان کی آدھی کھڑکی ڈوب چکی تھی اور کھڑکی کے نصف بالائی حصے سے سر نکالے مسز ایلس بیٹھی جھانک رہی تھیں۔ انکی صحت بھی اچھی نہ تھی۔ دروازے کے قریب انکے ساتوں بچے بیٹھے تھے۔ سب سے بڑا بچہ ابھی چودہ سال کا بھی نہ ہوا ہوگا۔ مکان کے ایک حصے میں سوّر اور بارہ تیرہ مویشی تھے۔ بغل کے کمرے میں گھرانے کے افراد رہتے تھے۔ پانی پلنگ کی پٹیوں سے صرف دو انچ نیچے تھا۔ آتشدان پانی میں ڈوب چکا تھا۔ اور کھانا پکانے کیلئے آگ کا انتظام اسی آتشدان کے اوپر کیا گیا تھا۔ کسی بھی لمحہ مکان کے گرنے کا خطرہ تھا۔ جو ایک طرف سے تو گرنا شروع ہو ہی گیا تھا۔ دراصل پوری عمارت ہی کھوکھلی معلوم ہوتی تھی۔ جیسے ہی کشتی مکان کے قریب پہونچی مسٹر ایلس ایک چھوٹی سی ڈونگی میں بیٹھ کر باہر آئے۔ جنرل یارک نے کہا "ہم آپکی امداد کرنے آئے ہیں ٹامس ڈیموکریٹ کی کشتی آپکے لئے تیار ہے جو آپکے بیوی بچوں کو فوراً پہاڑی پر پہونچا دیگی۔ اسکے بعد پیر کے دن آپکے تمام مویشیوں کو لیجانے کیلئے بیڑہ بھیجا جائے گا کیونکہ اس سے پہلے ہم لوگوں کو فرصت نہ مل سکے گی۔ حالانکہ وہ خود اور انکی بیوی اتنے خطرہ میں تھے اور انکی حالت قابلِ رحم تھی پھر بھی وہ اپنی جگہ

کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ وہ سوموار تک ضرور انتظار کرینگے۔ اس سے پہلے مکان اگر گرتا ہے تو گر جائے۔ دروازے کے قریب کھڑے انکے بچے بھی بالکل مطمئن نظر آتے تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس خطرہ میں وہ پھنسے ہوئے تھے اسکا انھیں ذرّہ برابر بھی احساس نہیں تھا۔ ابھی تو میں نے آپ کو اس بہادری کی صرف دو ہی مثالیں سنائیں۔ لیکن اس قسم کی مثالیں عام تھیں۔ ہفتوں کی نظربندی و تنہائی اور مصیبتوں کے بعد بھی لوگ اپنے مکانوں سے چمٹے ہوئے تھے اور بحد مجبوری کے عالم میں ہی انھیں چھوڑنے کیلئے تیار ہوتے تھے۔ وہ بھی اسوقت جبکہ پانی کی سطح اور مکان کی چھتوں کے بیچ اتنی گنجائش بھی باقی رہتی تھی کہ وہ اپنے کھڑے ہونے کیلئے مچان ہی بنا لیں۔ یہ امر ناقابلِ فہم ہی سہی مگر یہ حقیقت ہے کہ انھیں اپنی قیام جائے رہائش کی جتنی فکر تھی اتنی شاید اپنی حفاظت کی نہیں تھی۔

ایلس کے مکان سے ہم اوسولڈ کے مکان پر پہونچے۔ یہاں ایک بیڑہ مویشی باڑے سے لگا کھڑا تھا اور اسکے کوٹھے پر پندرہ جانور پانی میں کھڑے تھے۔ جب انھیں مچان پر کھڑا کیا گیا تو ان کے سر دروازے سے اوپر تھے۔ اسلئے مکان کے سامنے کا کچھ حصہ توڑے بغیر انکو باہر نکالنا ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا کلہاڑیاں منگوائی گئیں۔ اور ضرورت کیطابق راستہ بنایا گیا بڑی محنت اور جانفشانی کے بعد گھوڑوں اور خچروں کو بحفاظت تمام بیڑے پر سوار کرایا گیا۔

ہم جہاں بھی ٹھہرتے ہمیشہ تین چار یا اس سے بھی زیادہ ڈونگیاں ہمارے پاس آ آکر ہمیں خبر دیتیں کہ کہاں کتنے مویشی سیلاب میں پھنسے ہوئے ہیں جنھیں نکالنا کی ضرورت ہے حالانکہ لوگوں نے اپنے بہت سے مویشی ہمارے پہونچنے سے پہلے ہی پہاڑیوں پر پہونچا دئے تھے۔ پھر بھی ایک بہت بڑی تعداد اب بھی باقی رہ گئی تھی امید ہے کہ جنرل پارک جو ان تھک محنت و جانفشانی سے کام کر رہے ہیں انکو منگل وار تک صنوبر کی پہاڑی پر پہنچا دینگے۔

دریائے بلیک کے کنارے کنارے بیسوں کسان ہماری کشتی کے پاس آئے اور انھوں نے ہمیں اپنی مصیبت بھری داستانیں سنائیں یہ قصّے ویسے ہی غمناک اور مصیبتوں سے بھرے ہوئے ہیں جیسے کہ ہم پہلے سے سنتے آئے ہیں۔ ایک بوڑھا کسان جو اس دریا کے کنارے ۱۸۴۴ء سے رہتا ہے بیان کرتا ہے کہ اس سے پیشتر اتنا پانی کبھی نہیں چڑھا اسکے ایک چوتھائی سے زیادہ جانور سیلاب کی نذر ہوگئے مگر پھر بھی اسے کوئی پریشانی نہ تھی۔ درصل لوگ اوّل تو کام میں آنیوالے جانوروں کی حفاظت کرتے

ہیں اور اگر انھیں کہیں محفوظ جگہ ملجاتی ہے تو وہاں یہ اپنے گھوڑے اور خچروں کو بھیج دیتے ہیں سیلاب کا پانی برابر چڑھ رہا ہے کل رات دو انچ اور چڑھ گیا مجبور ہوکر لوگ مویشیوں کو نکالکر پہاڑی پر پہونچا رہے ہیں اسی وجہ سے جنرل پارک کے کام کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے۔ دن نکلنے سے رات گئے تک وہ کبھی یہاں، کبھی وہاں گھومتے رہتے ہیں اپنی ہمدردی اور مہربانی کے سلوک سے لوگوں کا دل بڑھاتے ہیں اور انھیں صبر سے حالات کا مقابلہ کرنیکی ہمت دلاتے ہیں۔ ٹھنڈے دماغ سے یہ سوچتے ہیں کہ انھیں کیا کرنا ہے۔ اسی سلسلہ میں نیو اورلینز کے ایک سوداگر کی کہانی دریائے مسی سپی کی وادی میں ہر جگہ مشہور ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پچھلے چند برسوں سے اس علاقہ کے کسان سوداگر سے لین دین کرتے تھے اور انمیں بہت سے آدمیوں کا روپیہ اس آدمی کے پاس جمع تھا جب سیلاب آیا تو ان لوگوں نے کھانا، قہوہ اور روزمرہ کی چھوٹی موٹی ضروریات کیلئے اسے لکھا ان خطوں کا جواب نہیں آیا۔ تب اسے پھر لکھا گیا مگر اس سوداگر نے ان پرانے گاہکوں کو جنکی فصلیں سیلاب کی نذر ہوچکی تھیں انکی ضروری چیزوں کو مہیا کرنے سے انکار کردیا گیا۔ یہ بتانے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی کہ یہ سوداگر اب دریائے بلیک پر واقع بستیوں میں کافی بدنام ہے۔

وہ پہاڑیاں جو دریائے بلیک پر آدمیوں اور جانوروں کی پناہ گاہوں کے طور پر استعمال ہورہی ہیں دریائے بلیک سے چوبیس میل دور کنکا بولا کے کلیسائی حلقے میں واقع ہیں۔

بیڑے کو جانوروں سے بھر کر ہینسے ٹی۔ ایس ہوپ کے گھرانیکے ساتوں ممبروں کو کشتی پر سوار کرایا کیونکہ ان لوگوں کیلئے اب اور زیادہ اپنے مکان میں ٹھہرنا ممکن نہ تھا اب ہم انھیں دریائے ٹینل میں پرٹھاؤ کی طرف پہاڑیوں پر لئے جا رہے ہیں۔

سیلاب برابر بڑھ رہا ہے۔

ٹرائے بوقت دوپہر، ۲۰ مارچ سنہ ۱۸۸۲ء

یہاں سیلاب ہر چوبیس گھنٹے میں ساڑھے تین انچ بڑھ رہا ہے اور اب تو بارش بھی ہونے لگی ہے۔ جس سے سیلاب کی رفتار اور بھی تیز ہوجائیگی جنرل پارک کا خیال ہے کہ اب ہمیں انسانوں کی زندگی بچانیکی فکر کرنی چاہیئے کیونکہ پانی کے بڑھ جانے کی وجہ سے بہت سے مکانوں کے گرنے کا خطرہ بڑھ گیا تھا۔ ہم چند لمحوں کے اندر اندر تین ساس کے چڑھاؤ کی طرف روانہ ہوجائیں گے۔ جہاں سے لوٹ کر ہم دریائے بلیک کے بہاؤ کیطرف

روانہ ہونگے۔ تاکہ وہاں لوگوں کو انکے مکانوں سے نکال کر محفوظ جگہ پہونچادیں۔ یہاں دخانی کشتیاں نہ ہونیکی وجہ سے لوگوں کو جلد جلد نکال کر لیجانا ممکن نہیں ہے۔ جنرل کے پاس صرف تین کشتیاں اور چند بیڑے ہیں لیکن جانوروں کی نکاسی کیلئے ان کشتیوں کی مانگ اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ ہر جگہ جلد نہیں پہونچ سکتیں۔ سب کشتیاں دن اور رات کام میں لگی ہوئی ہیں اور سوسی تو لگاتار مصروف عمل ہے اور مشکل سے ہی کسی ایک جگہ پر گھنٹہ ٹھہر رکتی ہے۔ طغیانی کی وجہ سے ٹرینٹی شہر کی حالت نازک اور خطرناک ہے اور ہر لمحہ یہ اندیشہ ہورہا ہے کہ مکان تو ضرور سیلاب میں بہہ جائینگے۔ شہر ٹرائے کچھ اونچائی پر ہے لیکن پھر بھی سارا شہر پانی میں ڈوبا ہوا ہے۔ جو اطلاعات ہم پہونچی ہیں ان سے معلوم ہوا ہے کہ یہاں ایک عورت بچہ سمیت سیلاب میں بہہ گئی اور دو کیبنیں بھی پانی کے ریلے سے کٹ کر بہنے لگیں۔ انکے مکین وہی لوگ تھے جنھوں نے پرسوں انھیں چھوڑنے سے انکار کردیا تھا واقعی لوگوں کی لاچاری اور بے بسی کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

ابھی تک ڈیلیا اسٹیمر کی کوئی خبر نہیں ملی اسکے بارے میں یہ گمان کیا جاتا ہے کہ یہ وہی جہاز ہوگا جو کل کے طوفان میں کٹا ہوا لاجھیل میں ڈوب گیا تھا۔ آج اسکو یہاں پہونچ جانا چاہیئے تھا لیکن وہ ابھی تک تو آیا نہیں۔ یہاں ڈاک اور رسل و رسائل کا سلسلہ بھی غیر یقینی ہوگیا ہے۔ اور یہ خبر بھی میں ایک ڈونگی کے ذریعہ ہنجر بھیج رہا ہوں تاکہ یہ آپ لوگوں تک پہنچ جائے۔ تباہ شدہ فصلوں وغیرہ کے بارے میں صحیح صحیح تخمینہ لگانا ممکن ہے۔ کیونکہ جن لوگوں کو اسکے متعلق تفصیل سے علم تھا وہ تو یہاں سے کہیں اور منتقل ہو چکے ہیں۔ اور جو باقی رہ گئے ہیں انکو اس علاقہ کی پیداوار کے متعلق اچھی طرح علم نہیں ہے۔

جنرل پارک کی خواہش ہے کہ میں آپ تک یہ خبر پہونچا دوں کہ آپ راشن کی پہلے سے دگنی مقدار فوراً بھجوا دیں۔ اسوقت لوگوں کی تعداد کا اندازہ لگانا ممکن نہیں ہے کیونکہ طغیانی کا زور بڑھ جانیکی وجہ سے لوگ پہاڑوں کی طرف برابر بھاگے چلے آرہے ہیں۔ واقعی یہاں لوگوں میں بڑی ہلچل مچ گئی ہے اور انکے حوصلے پست ہو چکے ہیں۔ علاقے میں مکمل ابتری پھیل چکی ہے جسکا اندازہ صرف دیکھنے سے ہی لگ سکتا ہے۔

راشن جمع کرنیکا مرکز ٹرائے رکھا گیا ہے اگر گردونواح کے کسی بھی علاقے کیلئے راشن اور

کسی جگہ بھیجدیا گیا تو یہ یقینی نہیں ہے کہ وہاں سے تقسیم ہو سکے گا۔ اسلئے ہر چیز بڑا تے ہی یہیں بھیجی جائے۔ جنرل نے سو خیمے منگوائے ہیں لیکن اگر سب لوگ جو اسوقت گھر چھوڑ کر بھاگ نکلے ہیں ان ہی پہاڑیوں پر آگئے تو وہ دو سو خیموں کی ضرورت ہو گی۔

ضمیمہ (ب)

دریائے مسی سپی کی نشیبی زرخیز وادی کی حالت جنگ کے فوراً بعد بگڑ گئی۔ یہاں جنگ کا بڑا تباہ کن اور قابلِ افسوس اثر ہوا۔ غلام جنکو لوگ اپنی جائداد تصور کرتے تھے اب غائب ہونے لگے۔ اور تعمیر کا جو کام غلاموں نے کیا تھا وہ یا تو بالکل مسمار ہو گیا یا بری طرح شکستہ ہو گیا۔ اس پشتے کو خاص طور سے نقصان پہنچا جو سیلاب سے بچاؤ کیلئے بنایا گیا تھا۔

وہ حضرات جنھوں نے اس علاقے کے حالات کو جاننے کی کوشش نہیں کی سوچتے ہونگے کہ کئی ریاستوں کو جنگ کے بعد ضروری کام مثلاً پشتوں کی مرمت یا انکی از سر نو تعمیر فوراً شروع کرنی چاہیئے تھی۔ لیکن جہاں کے عوام اٹھارہ سے تیس فیصدی سود پر روپیہ قرض لیکر زیر بار رہتے ہوں اور اپنی فصلوں کو بونے سے پہلے ہی رہن رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہوں تاکہ اُس روپیہ سے وہ اپنی ضروریات زندگی کو سو فیصدی نفع دیکر خرید سکیں وہاں ریاست کی گورنمنٹ انکی حالت کو کیسے سدھار سکتی ہے۔

اس بات کی وضاحت کی زیادہ ضرورت نہیں ہے کہ دریائے مسی سپی پر پشتے بنانے کا کام ریاست ہائے متحدہ کی قومی حکومت کرنا چاہیئے ریاستوں کو یہ کام نہیں سونپنا چاہیئے۔ دریا سب ریاستوں کی مشترکہ ملکیت ہے۔ اس کے حصے کر کے علیحدہ علیحدہ ریاستوں کو اسکا انتظام نہیں سونپا جا سکتا۔ اور یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ جو ریاستیں دریا کے انتظام میں دلچسپی رکھتی ہیں وہی ملکر کوئی ضروری اقدام اٹھا سکیں کیونکہ انکے پاس اتنے ذرائع نہیں ہیں۔ دراصل یہ کام دریا کے چڑھاؤ پر کافی اوپر سے شروع ہونا چاہیئے اور اگر زیادہ دور سے نہیں تو کم از کم کیرو سے تو شروع ہونا ہی چاہیئے۔

اور پھر کل دریا پر یہ کام یکساں طور پر ایک عام منصوبہ کے تحت ہونا چاہیئے۔

اس مسئلہ کو تفصیلاً سمجھنے کیلئے کسی فنی یا سائنٹیفک تعلیم کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ صرف تھوڑی سی توجہ اور کچھ وقت درکار ہوگا جب دریائے مسی سپی کے متعلق اس قسم کا کمیشن موجود ہو جسمیں مختلف شعبوں کے لائق اور قابل اشخاص اور ماہرین فن شامل ہیں تو دریا کی کسی تعمیر یا نگرانی کے کام سے متعلق کمیشن کے ممبران کی رائے مانی جانی چاہیئے اور انکے فیصلے پر عمل ہونا چاہیئے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ سوقت یہ بورڈ بڑے قابل اشخاص پر مشتمل ہے جسمیں ریاسہائے متحدہ کے انجینیر جنرل گلمور، جنرل گومشاک اور جنرل سوٹر، پروفیسر ہنری مچل (جو علم بحار اور انہار کے مانے ہوئے عالم ہیں) ریاست لوئی آنا کا سرکاری انجینیر بی۔ بی ہیرڈ اور جیمس بی ایاڈس (جس نے نیو اورلینز کے بندرگاہ پر کئی کامیاب پل بنا کر اپنی قابلیت کا ثبوت دیا ہے) اور انڈیانا کے منصف ٹیلر شامل ہیں۔

لہذا کوئی کتنا ہی ہوشیار اور قابل نقاد کیوں نہ ہو، ہ ایسے قابل اور ماہرین فن کے بورڈ کے فیصلے پر نکتہ چینی کرنیکی گستاخی نہیں کریگا۔

ایسا قابل بورڈ اصلاح کیلئے جو تجویزیں پیش کریگا وہ انجینیروں کے تجربوں پر مبنی ہونگی نیز انمیں ہمارے روزمرہ کے تجربوں اور ہماری موجودہ ضرورتوں کا بھی لحاظ ہوگا۔ جسطرح کائنات کے مشاہدے سے معلوم ہوتا ہے کہ ندی کے کنارے اُگے ہوئے درخت ساحل کو بھی مضبوط بناتے ہیں اور ندی کی گہرائی کیلئے بھی مفید ثابت ہوتے ہیں مثلاً ہرے بھرے پیڑ تو نشو ونما پاکر اپنی موٹی موٹی جڑوں سے ساحل کو سخت بناتے ہیں جبکہ پرانے اور کھوکھلے درخت ساحل کے ڈھالوں پر گر کر پشتے کا کام دیتے ہیں جس سے کنارے کی مٹی پانی میں گرنے نہیں پاتی اور پانی کی گہرائی بدستور رہتی ہے، ٹھیک اُسی طرح انجینیروں کے منصوبوں میں درختوں کی نشو ونما اور ٹھوں اور جھاڑیوں کی موجودگی سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

یہ منصوبہ بنایا گیا ہے کہ جہاں دریا کا پاٹ بہت زیادہ وہاں اُسے گھنی جھاڑیوں کی باڑھ لگا کر کم کیا جائے۔ کنارے پاس یہ باڑھ کم اونچی ہو مگر جوں جوں ان جھاڑیوں کے ارد گرد دریا کی مٹی جمع ہوتی رہے اُسے اونچا کر دینا چاہیئے۔ پھر اُسے پیچھے کی طرف ڈھلوان بنانا چاہیئے تاکہ باڑھ کے ساتھ ساتھ بید کے درخت آسانی سے اُگ سکیں اس کام میں بہت سی تفصیلات درکار ہونگی کہ یہ کہاں کس شکل کے بنائے جائیں اور کسطرح انکی ترتیب دی جائے کہ انکے ذریعہ ایک مصنوعی

بندرگاہ بنجائے۔ اور بھی کتنی باتیں اسی طرح کی ہیں مگر ایسی تفصیلات سے مضمون بڑا دقیق اور پیچیدہ ہوجائیگا۔ عموماً دریا کے پھیلاؤ کو کم کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی مگر ہر موڑ پر جہاں بھی ساحل خمیدہ ہوگا، اُسے دریا کے دھارے کی تیزی سے بچانے کیلئے پختہ اور مستحکم بنانا ہوگا۔ اسیطرح دوسری طرف کے ساحل کی بھی جہاں وہ کمزور ہوگا حفاظت کرنی ہوگی باڑ کھڑی کرنیکی ضرورت زمانہ قدیم سے محسوس ہوتی رہی ہے اسے دریا میں دیوار کھڑی کرنا کہا جاتا ہے۔ باڑھ زیادہ تر جھاڑیوں کی ہی ہوتی ہے جسے لوہے کے تاروں سے باندھ دیا جاتا ہے یا اُن پر چٹائیاں باندھی جاتی ہیں۔ یہ کام دریائے مسوری میں نہایت آسانی سے کیا گیا ہے اور کہیں کہیں تو یہ جھاڑیاں دریا کی لائی ہوئی مٹی سے بقدر ڈھک گئی ہیں اور اُن پر اتنی کثرت سے بید کے درخت اُگ آئے ہیں کہ اب وہ باڑھیں بالکل پختہ اور پائدار معلوم ہوتی ہیں۔ انکے اوپر کی چٹائیوں کو دریا کی دھار سے بچانے کیلئے کنکر اور پتھر کا بھی استعمال کرنا پڑتا ہے۔ کسی کسی جگہ جہاں دریا بلندی سے گرتا ہے وہاں دریا کی تہہ میں کنکر اور پتھر بچھا دئے جاتے تھے

جو کوئی دریائے رائن میں سفر کر چکا ہے اس نے یہ دیکھا ہوگا کہ وہاں بھی جگہ جگہ اسی طرح کی باڑھیں لگائی گئی ہیں جنکا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے۔ دراصل یورپ کے بیشتر دریاؤں میں، جو سیلابی مٹی کو بہاؤ کیساتھ لاتے رہتے ہیں، اسی طرح کی باڑھوں کا انتظام کیا گیا ہے تاکہ یہ جہاز رانی کے قابل ہوسکیں اور انمیں سے آبپاشی کیلئے نہریں نکالی جاسکیں۔

ساحل کی فصیل کی تکمیل پشتے سے ہوتی ہے حالانکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ پشتہ فصیل سے ملا کر ہی بنایا جائے بلکہ فصیل سے کچھ فاصلہ پر بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن ملا کر بنانے سے ساحل پر یہ مُنڈیر کا کام دیتا ہے۔ دریا پایاب ہو یا چڑھا ہوا ہو، دونوں حالتوں میں اسکی پانی کی سطح کا اندازہ لگانا مشکل ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ کھود کھود کر دریا کو کسی جگہ پر ہمیشہ کیلئے اتنا گہرا بنادیں جس سے پانی کی سطح ہمیشہ برابر اونچی رہے جبتک کہ ایسا انتظام سارے دریا میں نہ کیا جائے۔ اسکے علاوہ غیر معمولی طغیانی سے بچاؤ کیلئے بھی کچھ انتظام ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے دریا کے پشتہ کو خطرہ رہتا ہے اور اسکے زور سے ساحلی فصیلیں ٹوٹ سکتی ہیں۔

عام اصول یہ ہوتا ہے کہ اگر دریا کا پاٹ بڑا ہوگا اور اسکی تہہ میں مٹی بھی زیادہ ہوگی تو پانی کے بہاؤ کی تیزی میں کمی ہوجائیگی اور جس جگہ کاٹ زیادہ ہوگی وہاں ڈھلان بھی بنجائینگے۔

مگر جب دریا تنگ اور گہرا ہوتا ہے تو ڈھلان بننے کا امکان بہت کم ہوتا ہے کیونکہ دریا کے پانی کے حجم کے تناسب سے اسمیں رکاوٹ پیدا کرنیوالی سطح یا پھیلاؤ کم ہوتا ہے پشتے اور ساحلی فصیلیں جو سیلاب کی روک تھام کیلئے بنائی جاتی ہیں ان سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ دریا میں کناروں کی مٹی نہیں گرنے پاتی اسلئے پانی کی اونچائی فی الفور بڑھ جاتی ہے اور بہاؤ تیز ہو جانے کیوجہ سے پانی کا حجم بڑھ جاتا ہے اور جب کناروں پر پشتے ہونیکی وجہ سے پانی کناروں کے اوپر نہیں جاسکتا تو وہ دریا کی تہہ کو کاٹتا رہتا ہے اور دریا کی گہرائی اسطرح بڑھتی رہتی ہے۔ اسلئے دریا کے راستے کی تعمیر میں اسطرح کی اصلاح کرتے رہنا چاہیئے جس سے پانی کی سطح زیادہ اونچی نہ اٹھے۔ دریائے مسی سپی پر جو پشتے بنائے گئے ہیں ان سے ساحلی فصیلوں کے بغیر بھی بہت فائدہ ہوا ہے۔ اسی لئے کمیشن نے جو رپورٹ دی ہے اسمیں کسی کو کسی قسم کا شک وشبہ نہیں ہونا چاہیئے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اگر پہلے کے پشتوں کیساتھ ساحلی فصیلیں بھی بنادی جاتیں اور اسطرح پانی روکنے کا انتظام مکمل کر دیا جاتا تو آج مسی سپی میں جہاں جہاں اتھلا پانی ہے وہاں بھی جہازرانی بہ آسانی ہوسکتی اور گردونواح کا علاقہ طغیانی سے محفوظ رہتا۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ اسطرح روک تھام کر دینے سے ڈھلان رفتہ رفتہ ہموار ہو جائینگے اور پشتوں کی ضرورت نہیں رہے گی بلکہ خیال یہ ہے کہ اسطرح دونوں طرف سے محدود ہو جانیکی وجہ سے دریا ایک گہری نالی بنکر زیادہ مفید ثابت ہوگا اور اسمیں معاون دریاؤں کے پانی گرنے سے جو باڑھ آیا کریگی اسکا پانی بھی معمولی اونچائی کے پشتوں کو بغیر ضرر پہونچائے آگے بڑھ جایا کریگا۔ ظاہر ہے کہ دریا کا جہازرانی کیلئے مفید ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ سیلاب کے دوران میں برساتی پانی میں زیادہ مٹی ہونے کے باوجود جہاز چلتے رہیں۔ البتہ سیلاب اگر غیر معمولی ہے تو دوسری بات ہے۔

یہ سوچنا کہ مسی سپی کے سیلاب کو دریا سے نہریں نکال کر کم کیا جاسکتا ہے عین حماقت ہے۔ ایسے سنسنی خیز منصوبے وہی لوگ بتاتے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے کوئی انجینیر ایسے منصوبوں کی تائید نہیں کریگا۔ البتہ اگر دریا کی تہہ لوہے کی ہوتی تو بیشک اسمیں سے فالتو پانی کی نکاسی ضروری ہو جاتی لیکن جیسا کہ سب جانتے ہیں دریا کی تہ کافی پانی جذب کر لیتی ہے اسلئے پانی

کے نکاس کی سب سے عمدہ اور بہترین شکل ایک گہرا راستہ ہے کیونکہ اس سے پانی کا گھیر کم رہتا ہے اور اسکے حجم کا تناسب ٹھیک رہتا ہے۔ لہٰذا اس سے زیادہ غیر معقول اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ ہم دریا سے نہریں نکالکر اسکے زور کو کم کردیں۔

مذکورہ بالا بیان میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ جہانتک مسئلہ کی اہمیت اجازت دے اسکے عام اصولوں کو نیز دریا کی اصلاح کے طریقۂ عمل کو جسکو مسی سپی کمیشن نے اختیار کیا ہے بڑے اختصار کیساتھ بیان کیا جائے۔

مصنف کو اس بات کا خوف ہے کہ ایک ایسے مسئلہ کے بارے میں اصولوں کا انکشاف کرنا جسکے لئے اعلیٰ درجے کی سائنسی مہارت کی ضرورت ہو "گستاخی پر محمول کیا جائیگا" لیکن یہ ایسا مسئلہ ہے جو ریاستہائے متحدہ کے ہر شہری کیلئے باعثِ دلچسپی ہے نیز از سرِ نو تعمیر کے کاموں میں ایسی تجویزوں کی بھی اشد ضرورت ہے اور اس طریقۂ کار کو مقبول بھی کرنا چاہیئے۔ یہ تو تاوان کا سا معاملہ ہے جسمیں کسی کا بھی فائدہ اور نہ کسی کے نقصان کی تلافی کا سوال ہے لیکن اگر جنگ سے دریا کو کبھی کوئی نقصان پہونچتا ہے تو پوری قوم کو اس کی مرمت کرانی ہوگی۔

ضمیمہ (ج)

کپتان بیسل ہال کی کتاب کا ریاست ہائے متحدہ میں خیر مقدم۔

اب جبکہ ہم اپنے سفر کے اختتام پر آگئے ہیں تو میری خواہش ہے کہ اس بیان کو ختم کرنے سے پہلے ایک بار پھر میں اُس بات کا ذکر کردوں جو امریکنوں کے قومی کردار میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے اور جو بہت عجیب و غریب ہے اور وہ ہے انکا اپنے متعلق ہر کہی ہوئی یا لکھی ہوئی بات کو جاننے کا بے پناہ اشتیاق۔ اسکی بہترین مثال یہ ہے کہ جیسے ہی کپتان بیسل ہال کی کتاب "شمالی امریکہ کی سیاحت" شائع ہوئی، یہاں ہر طبقے کے آدمی نے اُسے پڑھا اور اس سے متاثر ہوا۔ اس کتاب میں امریکی لوگوں کے خلاف

بزکتہ چینی کی گئی تھی جس سے یہاں کے عوام کو صدمہ پہونچا اور جو کم از کم دو سال تک رہا کیونکہ دو سال بعد جولائی ۱۸۳۱ء میں جب میں وہاں سے لوٹا تو اسوقت بھی لوگوں کے دل و دماغ پر اس صدمہ کا اثر تھا۔

جب کتاب شائع ہوئی تو اسوقت میں سسناٹی میں تھا لیکن مجھے اسکی ایک جلد حاصل کرنے میں کافی عرصہ لگا۔ مجھے یہ کتاب جولائی ۱۸۳۰ء ملسکی کیونکہ جس کتب فروش سے میں نے اس کتاب کے ایک نسخے کیلئے فرمائش کی تھی اس نے مجھے بتایا کہ جبتک اُسے کتاب کے مضمون کا پتہ نہیں تھا وہ اسے دھڑا دھڑ بیچتا رہا تھا لیکن جب اُسے اُسکے مضمون کا پتہ لگا تو اُسنے جو چند نسخے اسکے پاس رہ گئے تھے انکو کسی قیمت پر بیچنا منظور نہ کیا مگر اسکے دیگر ہم پیشہ لوگ اتنے خوددار اور وطن پرست نہیں تھے وہ نفع کی خاطر اس کتاب کو برابر بیچتے رہے کیونکہ اس کتاب کی مانگ بہت تھی۔ شہر، قصبہ، گاؤں، ہر جگہ یہ پڑھی جاتی تھی حتیٰ کہ لوگ اسے دخانی کشتی میں سفر کرتے ہوئے یا تھیٹر ہال میں بیٹھے ہوئے بھی پڑھتے تھے اس کا چرچا جنگ کے نعرے کے مانند سارے ملک میں پھیل گیا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی شہرت کسی دوسری چیز کی کبھی نہیں دیکھی۔ میرے خیال سے کسی چیز کو مقبولیت دینے میں جوش و خروش دکھانا یا اسکے بارے میں دوسروں کی ملامت کو سنکر ناراض ہونا اچھے اخلاق کی نشانی ہے مگر جس جوش و خروش سے کپتان ہال کی کتاب کا امریکہ میں استقبال کیا گیا وہ غیر معمولی ہی نہیں بلکہ غیر ضروری بھی اور مجھے ڈر ہے کہ اگر لوگوں کے جذبات حد سے اسقدر تجاوز کر جائیں تو یہ انکی ضعیف الاعتقادی ہی نہیں بلکہ حماقت کہلائے گی۔

جب کچھ ایسے لوگوں نے اس پر اپنی رائے دی جن کی رائے کسی اور شعبے میں قابل قدر تھی مجھے بہت تعجب ہوا۔ قومی معاملات پر نکتہ چینی لوگوں کو اکثر بری لگتی ہے لیکن مجھے ایسا کوئی اور واقعہ نہیں جب لوگ جذبات سے اسطرح مغلوب ہو کر عقل سلیم کو بالائے طاق رکھ بیٹھے ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ امریکی لوگوں میں انصاف پسندی نہیں ہے یا یہ کہ وہ کسی چیز کا آزادانہ یا فراخدلانہ جائزہ نہیں لے سکتے کیونکہ (کم از کم اس بارے میں تو) ان اوصاف کی ان سے توقع ہی نہیں تھی۔ کئی دوسرے ممالک کے باشندوں کو تنگ مزاج کہا جاتا ہے مگر ریاست ہائے متحدہ کے لوگوں میں تو غالباً قوت برداشت بالکل نہیں ہے، اگر ہوا چلنے لگتی ہے تو انھیں جھرجھری آجاتی ہے اور جبتک ہوا کی

خوشگواری کی تعریف نہ کی جائے وہ انھیں موافق نہیں آتی، اسلئے تعجب کی بات نہیں کہ جب ایک محقق اور مشہور و معروف سیاح بیسل ہال نے جسکی بات سب سننا چاہتے تھے، اپنے مشاہدات میں امریکیوں کے اخلاق پر سخت نکتہ چینی کی تو ان میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ لوگ نہ صرف بیحد غصہ ہوئے بلکہ مصنف کی نکتہ چینی کی گئی من گھڑت وجوہات گھڑ لی گئیں۔ لوگ اعلانیہ کہنے لگے کہ ہال صاحب کی کتاب میں شروع سے لیکر آخر تک ایک لفظ بھی صحیح نہیں ہے (اور یہ بات وہ تقریباً ہر بار جب بھی کتاب کا ذکر آتا تھا کہتے تھے) مگر اس سے بھی جب انھیں اطمینان نہ ہوا تو پورا ملک اس بات کی تحقیق میں لگ گیا کہ کپتان ہال ریاست ہائے متحدہ کیوں آئے تھے اور انھوں نے یہ کتاب کیوں شائع کرائی۔

میں نے امریکن لوگوں کو کچھ ایسی سنجیدگی سے جیسے وہ کوئی سرکاری خبرنامہ نشر کر رہے ہوں۔ یہ بھی کہتے سُنا ہے کہ کپتان ہال کو برٹش گورنمنٹ نے صرف اس لئے بھیجا تھا کہ وہ اس بات کی جانچ کریں کہ انگلینڈ میں ریاست ہائے متحدہ کے متعلق جو خوش فہمی ہے وہ کہاں تک بجا ہے۔ دراصل مقصد یہ تھا کہ کپتان موصوف اپنی نکتہ چینی سے انگلینڈ والوں کا نظریہ امریکن لوگوں کے بارے میں خراب کر دیں۔ یہ بھی مشہور کیا گیا کہ کپتان ہال کو انگلینڈ کے محکمۂ مالیات کی طرف بھیجا گیا تھا اور اسی محکمہ کے ایما پر انھوں امریکنوں پر یہ نکتہ چینی کی ہے۔

میں اسے محض چند لوگوں کی رائے نہیں مانتا کیونکہ اسمیں عوام کے ایک بہت بڑے طبقے کے جذبات شامل ہیں۔ دراصل یہاں کے لوگوں کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنی ثنا و توصیف کے علاوہ کسی بات کو سُننا ہی نہیں چاہتے اور نہ وہ یہ برداشت کر سکتے ہیں کہ کوئی شخص انکی یا انکے ملک کی کسی قسم کی عیب جوئی کرے خواہ تنقید کرنیوالا کتنی ہی ایمانداری اور صدق دلی سے انکی خامیاں بتا رہا ہو۔

میرا خیال ہے کہ بہت سے امریکی تبصرے اور تنقید سالے انگلینڈ میں کافی مقبول ہیں؛ اسلئے مجھے اس بات کی ضرورت نہیں کہ میں انکا ذکر یہاں کروں لیکن مجھے یہ تعجب ضرور ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی نے یہ تکلیف گوارا کیوں نہیں کی کہ وہ اوبیدیا[1] کے کلمات کفر کا ترجمہ امریکہ کی ٹکسالی زبان میں کر ڈالتا اگر کسی نے ایسا کیا ہوتا تو لوگوں کو محسوس ہوتا کہ اوبیدیا کے کلمات کفر کے مقابلے میں کپتان بیسل ہال کی تنقید یا عیب جوئی کچھ بھی نہیں ہے۔

---

1 Obedian

یہ بیان کرنا میرے لئے مشکل ہے کہ کس تجسس اور کتنی محنت و جانفشانی سے میں نے بیسل ہال کی ضخیم کتابوں کا مطالعہ کیا اور اس بات پر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ لوگوں نے کپتان ہال کے بیان کو غلط سمجھا۔ میری رائے میں انکی کتاب کا جملہ بھی مبالغہ آمیز نہیں ہے بلکہ میں تو یہ کہونگا کہ جو شخص بھی اس ملک کے لوگوں سے واقف ہے اسے کپتان صاحب کی کتاب سے یہ یقیناً معلوم ہوجائیگا کہ انھوں نے امریکنوں میں بہت سی خوبیاں بھی بتائی ہیں اور انکو سراہا ہے۔ جہاں جہاں کپتان موصوف نے اس ملک کی تعریف کی ہے انکے انداز میں بے ساختگی اور مسرت کا پہلو نمایاں ہے اور جہاں انھیں کوئی خامی نظر آئی ہے اسکا اظہار انھوں نے بڑے ضبط کیساتھ بادلِ ناخواستہ کیا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جذبۂ حب الوطنی کے تحت انھوں نے اس ملک کی خامیوں کو اسلئے بہت واضح طور پر بیان کیا ہے تاکہ انگلینڈ والے اس سے سبق حاصل کریں اور امریکنوں کا صحیح اندازہ لگا سکیں۔

دراصل کپتان ہال کو اس ملک کے حالات کا جائزہ لینے کے لئے بہت سی آسانیاں فراہم تھیں۔ ملک کی نامور اور مشہور ہستیوں کے نام وہ تعارفی خطوط لیکر آئے تھے علاوہ بریں انکی اپنی شہرت اتنی زیادہ تھی کہ انکا ریاستہائے متحدہ میں ہر جگہ اور ہر شہر میں بہت پاک خیر مقدم ہوا اور انھیں ہاتھوں ہاتھ لیاگیا اور سر آنکھوں پر بٹھایا گیا۔ لہٰذا انھوں نے تو یہاں کے خوبصورت پہلو ہی دیکھے ہیں۔ انھیں اتنی فرصت کہاں ملی کہ وہ یہاں کے بے آراستہ گھروں کو یا یہاں کے گنواروں اور جاہلوں کو بھی دیکھتے جو عموماً ہر جگہ ملتے ہیں اور جنھیں مجھے اور میرے گھر والوں کو اکثر دیکھنے کا اتفاق ہوتا ہے۔

کپتان ہال کے پاس یہاں کی سرکار اور اسکے قوانین سے کماحقہٗ واقفیت حاصل کرنے کیلئے یقیناً نادر مواقع تھے نیز انھیں یہاں کے بہت سے ممتاز لوگوں کیساتھ بات چیت کرکے اس موضوع پر تبصرہ سننے کا بھی کافی موقع ملا اور کپتان موصوف نے واقعی ان سب مواقع کا فائدہ بھی اٹھایا۔ انکی باریک بین نگاہ نے کوئی ایسی بات نہ چھوڑی جسکا انھوں نے اچھی طرح تجزیہ نہ کیا ہو اور یہ کام صرف ایک تجربہ کار سیاح ہی جو فلسفیانہ نگاہ بھی رکھتا ہو کرسکتا ہے۔ انہی وجوہات سے کپتان صاحب تصانیف اتنی دلچسپ اور گراں قدر ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اور کوئی سیاح کپتان صاحب جیسا محقق اور تجربہ کار ہوتا لیکن اسکے پاس ریاستہائے متحدہ کے معاشرہ کو سمجھنے کیلئے عوام کی عملی زندگی کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہ ہوتا تو وہ اس ملک کے لوگوں کے اخلاق کے بارے میں اور بھی ادنیٰ رائے ظاہر کرتا۔

مجھے نہ صرف اس بات کا احساس ہے بلکہ یقین بھی ہے اگر کپتان صاحب ضبط سے کام نہ لیتے تو امریکنوں کے خلاق کیمتعلق انکی نکتہ چینی اور بھی واضح اور سخت ہوتی مگر انھوں نے واقعی بڑے ضبط سے کام لیا خصوصاً جبکہ وہ امریکنوں کی خلاق کی خامیوں سے اچھی طرح واقف تھے کیونکہ انکی واقفیت کے اور بھی ذرائع تھے دراصل انھوں نے یہ اصول اپنایا کہ انکی کتاب سے ناظرین کو امریکہ کے معاشرے کے بارے میں صحیح علم ہو جائے اور ساتھ ہی ساتھ امریکنوں کی دلآزاری بھی کم سے کم ہو۔ اس اصول کے پیش نظر وہ اپنی رائے کا تو اظہار کرتے ہیں مگر اپنی رائے زیادہ واضح نہیں کرتے بلکہ ناظرین خود بخود نتیجہ نکال لیتے ہیں اور محسوس کرنے لگتے ہیں کہ مصنف اپنی رائے میں حق بجانب ہے لیکن وہ تفصیلات سے احتراز کرتا ہے تاکہ امریکنوں میں غم و غصہ کی لہر نہ دوڑ جائے۔

اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ میری رائے بھی ایکسو بیس لاکھ حبشیوں سے نفرت پر مبنی ہے تو میں یہ سننے کو تیار ہوں لیکن اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ یہ سب میری قیاس آرائیاں ہیں یا میں نے گپیں ہانکی ہیں تو اس سلسلے میں مجھے گالیاں سننے کو بھی انکا میں سزاوار نہیں۔

دراصل جس حقیقت کو کپتان ہال محسوس کرتے ہیں اور صاف صاف بیان کر دیتے ہیں اُسے امریکن طنز سمجھتے ہیں اور مصنف کی صدق دلی پر اعتماد نہیں کرتے انکی اس رواداری کو کہ جن امریکنوں نے انکی اتنی خاطر و مدارات کی ہے انھیں انکی ذات سے جہانتک ہو سکے تکلیف نہ پہونچے، وہ لوگ تصنع سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ یہ بات خوب جانتے ہیں اور اپنے دلونکے اندر محسوس بھی کرتے ہیں کہ کپتان ہال اگر چاہتے تو انکی اس سے کہیں زیادہ پردہ دری کر سکتے تھے کیونکہ وہ انکی خامیونکو بہت اچھی طرح جانتے تھے پھر بھی یہ لوگ ڈھونگ رچتے ہیں کہ کپتان ہال نے انکے معاشرتی نظام کی خامیوں کو مبالغہ کیساتھ پیش کیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے انکے ساتھ بڑی رعایت کی ہے ہو سکتا ہے کہ یہ رعایت انھوں نے مصلحتاً کی ہو مگر دراصل امریکی اسکے مستحق نہیں تھے۔ علاوہ ازیں کپتان موصوف نے جہاں تک ہو سکا امریکنوں کی خوبیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔

تتمہ ۲

بولتا ہوا سر

شمال کے کسی دور افتادہ علاقہ میں ایک آدمی اور اسکی بہن رہا کرتے تھے جنہوں نے کبھی کسی انسان کو نہ دیکھا تھا۔ آدمی کو گھر سے باہر جانے کی کبھی کبھار ہی ضرورت پڑتی تھی۔ کیونکہ جب اسکو خوراک کی ضرورت ہوتی تو وہ

اپنی رہائش گاہ سے ذرا دُور جا کر کسی خاص جگہ پر اپنے تیر گاڑ آتا جنکے پھل زمین کے اندر رہتے۔ پھر وہ اپنی بہن کو ان تیروں کا نشان پتہ بتا دیتا اور بہن ہر صبح انکی تلاش میں نکلتی اور ہمیشہ اسے ہر تیر کسی نہ کسی ہرن کے دل کے آر پار ملتا۔ اُسے کبھی نا اُمید نہیں لوٹنا پڑتا۔ اسکو صرف اتنا کرنا پڑتا کہ ہرنوں کو گھسیٹ کر وہ انھیں اپنے گھر لے آئے اور انکا گوشت پکا دے جس سے وہ دونوں اپنا پیٹ بھر لیتے۔ وقت گذرتا گیا اور وہ لڑکی جوان ہو گئی۔ ایکدن اسکے بھائی نے جس کا نام ایا مو تھا اس سے کہا "بہن اب تم بیمار پڑو گی لہٰذا میری نصیحت دھیان سے سنو اگر تم نے دھیان نہیں دیا تو ہو سکتا ہے کہ میں مارا جاؤنگا تم اپنا آگ جلانے کا سامان لیجاؤ اور کہیں دُور جا کر رہو اور اپنا چولہا الگ جلاؤ جب تمہیں خوراک کی ضرورت ہوگی تو میں تمہیں وہ جگہ بتا دیا کرونگا جہاں تمہیں شکار مِل جایا کریگا۔ تم اپنا کھانا خود تیار کرنا اور میں اپنا خود۔ جب تم بیمار پڑو تو اس مکان کے نزدیک آنیکی کوشش نہ کرنا اور نہ ہی اپنے استعمال کئے ہوئے برتن یہاں لانا۔ جس سامان کی تمہیں ضرورت ہو وہ اپنی کمر کی پیٹی سے ہمیشہ باندھے رہنا۔ نہ جانے تمہیں کب گھر چھوڑنا پڑے۔ رہ گئی میری بات تو جہاں تک ہو سکیگا میں بھی اپنی دیکھ بھال کرنیکی کوشش کرونگا۔" اسکی بہن نے وعدہ کیا کہ وہ اسکے ہر حکم کی تعمیل کریگی۔

تھوڑی دیر بعد ہی اسکے بھائی کو کسی کام سے باہر جانا پڑا وہ کٹیا میں اکیلی تھی اور اپنے سر میں کنگھی کر رہی تھی جیسے ہی اس نے پیٹی کھولی جسمیں سامان بندھا ہوا تھا وہ لمحہ آگیا جسکا اسکے بھائی نے تذکرہ کیا تھا وہ کٹیا سے باہر بھاگی لیکن جلدی میں پیٹی اٹھانا بھول گئی۔ اب وہ واپس جانیسے ڈری اور کچھ دیر کھڑی سوچتی رہی آخر کار اُسنے طے کیا وہ کٹیا میں جا کر پیٹی لے آئے۔ کیونکہ اس نے سوچا کہ میرا بھائی تو باہر ہے اور اُسے لمبے سفر کیلئے ہی تو وہاں جانا ہے نا۔ پیٹی اٹھا لائے۔ یہ سوچکر واپس گئی اور جلدی سے اندر گھسکر اُسنے پیٹی اٹھالی۔ مگر جیسے ہی وہ باہر آرہی تھی اسکا بھائی اُسے آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ کیا معاملہ ہے اس نے کہا "آہ! کیا میں نے تمہیں احتیاط برتنے کیلئے نہیں کہا تھا؟ لیکن اب تم نے مجھے مار ڈالا ہے۔" بہن اپنے راستہ چل دی۔ لیکن اسکے بھائی نے اس سے کہا "اب تم وہاں جا کر کیا کروگی؟ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی گیا اب اندر جاؤ اور وہیں رہو جہاں تم ہمیشہ رہتی آئی ہو۔ جی نہ جانے اب تمہارا کیا حشر ہو تم نے میری جان تو لے ہی لی۔"

تب اُسنے اپنا شکاری لبادہ اور ہتھیار وغیرہ اُتار کر الگ رکھدیئے۔ اسکے دونوں پیر سیاہ پڑنے لگے۔ اور اسکے لئے اپنی جگہ سے جنبش کرنا مشکل ہو گیا۔ مرنے سے پہلے اس نے اپنی بہن کو ہدایت کر دی کہ اُسے ترکش جگہ رکھنا چاہیئے تاکہ اُسے ہمیشہ اپنی خوراک ملتی رہے۔ ورم اور جلن بڑھ رہی تھی اور اب اسکی پہلی پسلی کے قریب پہونچ

جکی تھی۔ اس نے کہا "بہن میرا وقت نزدیک ہے جیسا میں کہہ رہا ہوں تم ویسا ہی کرنا تم نے میرا دوائیوں کا
تھیلا دیکھا ہی ہے۔ جسکے ساتھ میرا لڑائی کا ڈنڈا بھی بندھا ہوا ہے۔ اس تھیلے میں میری تمام دوائیاں اور
لڑائی کے ہتھیار نیز بیئر رنگ کی وارنش رکھی ہوئی ہے۔ جیسے ہی ورم میرے سینے تک آئے تم میرے اس ڈنڈے
کو اٹھا لینا۔ اسکا ایک سرا تیز اور نوکیلا ہے۔ تم اسی سے میرے سر کو دھڑ سے الگ کر دینا۔ جب یہ تن سے جدا
ہو جائے تو میری گردن کو تھیلے میں رکھ دینا اور تھیلے کو ایک سرے پر کھلا رکھنا۔ پھر تھیلے کو اسی جگہ پر لٹکا دینا جہاں
سے تم نے اُسے اُتارا ہے میرے تیر اور کمان کو ہرگز نہ کھولنا۔ انہیں سے آخری ایک تیر تم لے لینا جس سے تم اپنی
خوراک حاصل کر سکوگی۔ باقی تیروں کو میرے تھیلے میں باندھ دینا۔ تب اسکو اسطرح لٹکانا کہ میری آنکھیں
دروازے کی طرف ہوں اور میں دروازے کو دیکھتا رہوں"۔ بہن نے پھر اسکے حکم کی تعمیل کرنیکا وعدہ کیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد اسکے سینے پر بھی ورم آگیا۔ تب اس نے کہا "اب تم ڈنڈا اٹھاؤ اور میرا سر اُتار دو"۔
وہ خوفزدہ تھی لیکن آدمی نے کہا "ہمت سے کام لو۔ وار کرو۔ یہ کہتے ہی اُسکے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ بہن نے
ہمت کرکے وار کیا اور سر کاٹ ڈالا۔ اب سر نے کہا" اب مجھے وہیں رکھو جہاں میں نے تمہیں بتایا تھا"۔ اور
ڈرتے ڈرتے بہن نے اسکے حکم کے بموجب عمل کیا۔ سر میں جان اب بھی موجود تھی۔ ہمیشہ کی طرح وہ گھر میں چاروں
طرف دیکھتا اور اپنی بہن کو ایسی جگہ جانیکا حکم دیتا جہاں اسکے خیال میں اُسے مطلوبہ گوشت مل سکتا تھا۔ لیکن
سر نے کہا" وہ وقت بھی دُور نہیں ہے جب میں اپنی حالت سے آزاد ہو جاؤنگا۔ مگر تب مجھے بہت سی تکالیف
اور مصائب سے گذرنا پڑیگا۔ چونکہ بڑے دیوتا کا یہی حکم ہے۔ لہٰذا مجھے ان سب مصیبتوں کو بڑے صبر و تحمل سے
برداشت کرنا چاہیئے"۔ اب ہم سر کے ذکر کو یہیں چھوڑتے ہیں۔

ملک کے کسی حصے میں ایک گاؤں تھا جہاں جنگجو قبائلیوں کے بہت سے قبیلے رہتے تھے اس گاؤں میں
دس بھائیوں کا ایک خاندان رہتا تھا۔ ایک موسم بہار میں سب سے چھوٹے بھائی نے اپنے منہ پر سیاہ رنگ
مل لیا۔ اور برت رکھا۔ اسکے خواب اسکے حق میں نیک شگون ثابت ہوئے تھے۔ ایکدن وہ اپنا برت ختم کرکے رات
میں چھپ کر اپنے بھائیوں کے پاس گیا۔ تاکہ گاؤں والا کوئی اُسے نہ دیکھ سکے اور نہ ان بھائیوں کی باتیں سن
سکے اور نہ یہ جان سکے کہ انکا کس سمت میں جانیکا ارادہ ہے۔ حالانکہ انکے ڈھول کی آواز سبکو سنائی دی لیکن یہ تو
گاؤں کیلئے روزمرّہ کا معمول تھا حسب معمول رسومات ادا کرکے اُسنے اپنے بھائیوں کو بتایا کہ اسکے خواب ان کیلئے
کسقدر فائدہ مند ثابت ہونگے۔ اور یہ کہا کہ اس نے سبکو یہ جاننے کیلئے بلایا ہے کہ وہ اسکے ساتھ لڑائی کی ایک

ہم پر چلینگے یا نہیں سبھی نے جواب دیا کہ وہ ضرور اسکا ساتھ دینگے۔ بڑے سے تیسرا بھائی جو ابنی بوالعجبیوں کیلئے مشہور تھا اپنا جنگی ڈنڈا لے آیا جب اسکے بھائی نے بولنا بند کر دیا تو وہ اچھلا اور اس نے کہا "میں دشمنوں پر اس طرح وار کرونگا" اور یہ کہکر اس نے سامنے ایک کھمبے پر زور سے وار کیا۔ اور بڑے زور سے قہقہہ لگایا۔ دوسرے بھائیوں سے اس نے کہا "بھئی مدجی کیوس ذرا آہستہ بولو دوسرے کے گھر میں تو احتیاط برتنی ہی چاہیئے" لہذا وہ بیٹھ گیا۔ تب سب نے باری باری ڈھول پر اپنے اپنے گیت گائے۔ آخر میں ایک دعوت بھی اڑائی۔ سب سے چھوٹے بھائی نے سب سے کہا کہ وہ اپنے منصوبے اپنی بیویوں کو ہرگز نہ بتائیں اور سفر کی تیاری خفیہ طور پر کریں۔

انھوں نے اسکی بات کو مان لیا اور ویسا ہی کرنیکا وعدہ کیا۔ مدجی کیوس نے سب سے پہلے اپنی رضامندی دیدی۔ اب انکے جانیکا وقت قریب آگیا تھا۔ سب سے کہدیا گیا تھا کہ فلاں رات کو فلاں جگہ جمع ہو جائیں جہاں سے وہ فوراً اپنی مہم پر روانہ ہو جائینگے۔ مدجی کیوس بیچ بیچ کر اپنے ہرن کی کھال کے جوتوں کے بارے میں دریافت کر رہا تھا۔ کئی بار اسکی بیوی نے اس سے پوچھا کہ وہ ہرن کی کھال کے جوتوں کا تم کیا کرو گے۔ تم نے تو اچھے خاصے جوتے بھی رکھے ہیں" اس نے کہا "جلدی بتاؤ۔ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیئے کہ ہم لوگ ایک جنگ کی مہم پر جا رہے ہیں اسلئے جلدی کرو" اسطرح اس نے سارا راز فاش کر دیا۔ اسی رات کو وہ اکٹھے ہوئے اور مہم پر روانہ ہو گئے۔ زمین برف سے ڈھکی ہوئی تھی اور وہ تمام رات چلتے رہے۔ کیونکہ انھیں خوف تھا کہ دوسرے لوگ کہیں انکا پیچھا نہ کرنے لگیں۔ جب دن نکل آیا تو جو رہنما تھا اس نے برف اٹھا کر گیند بنائی اور اسکو ہوا میں اچھال کر کہا "میں نے خواب میں اسطرح برف کو گرتے ہوئے دیکھا تھا۔ تاکہ میرا پتہ و نشان دوسروں کو نہ ملسکے" اسکے بعد اس نے ان سے کہا کہ وہ ایکدوسرے کے بالکل قریب ہی رہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بچھڑ جائیں کیونکہ برفباری بہت شدید تھی اور قریب قریب چلتے ہوئے بھی وہ ایکدوسرے کو بڑی دقت سے دیکھ سکتے تھے برف تمام دن اور تمام رات گرتی رہی اسلئے کسی کیلئے انکا پیچھا کرنا یا سراغ لگانا بہت مشکل تھا۔

وہ لگاتار کئی دن تک چلتے رہے مدجی کیوس سب سے پیچھے رہتا تھا۔ ایکدن وہ اچانک دوڑ کر آیا اور اس نے ساساکوئی کا جنگی نعرہ بلند کیا۔ اور اپنے ڈنڈے کو ایک درخت پر دے مارا جس سے درخت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر گیا۔ جیسے کہ اس پر بجلی گر پڑی ہو وہ بولا "بھائیوں جو مجھ سے لڑنے آئیں گے میں انکو اسطرح ختم کر دونگا" سردار نے جواب دیا "مدجی کیوس ذرا صبر سے کام لو جس دشمن کا مقابلہ تم کرنے جا رہے ہو اسے اتنا کمزور مت سمجھو۔"

Mudjikewis

مدجی کیوس پیچھے ہٹ کر سوچنے لگا۔ "وہ دشمن کون ہوسکتا ہے جسکے پاس یہ ہمیں لئے جا رہا ہے"۔ وہ مارے ڈر کے چپ ہوگیا۔ وہ رات دن چلتے رہے اور ایک وسیع میدان میں نکل آئے جسکی سرحد پر انسانی ہڈیاں دھوپ میں پڑی سفید ہورہی تھیں۔ سردار نے کہا "یہ اُن لوگوں کی ہڈیاں ہیں جو ہم سے قبل مہم پر گئے تھے۔ اور انمیں سے کوئی زندہ نہیں لوٹا جو آکر اپنی مصیبت کی کہانی سناتا۔ اب پھر مدجی کیوس سے نہ رہا گیا۔ اور آگے دوڑ کر اس نے پھر اپنا پہلے والا جنگی نعرہ لگایا۔ اور آگے بڑھ کر ایک بڑی چٹان پر جو وہاں میدان میں کھڑی تھی اس نے ڈنڈا مارا اور وہ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ پھر نہایت غرور سے اس نے کہا "دیکھو بھائی جس دشمن سے ہم مقابلہ کرنے جا رہے ہیں اسکا میں یہی حشر کرونگا"۔ ایکبار پھر سردار نے اس سے کہا "بھائی ذرا تسلی کر جس دشمن کے پاس میں تمہیں لیجا رہا ہوں کہاں وہ اور کہاں یہ چٹان"۔

مدجی کیوس پیچھے ہٹ کر سوچنے لگا۔ مجھے حیرت ہورہی ہے کہ وہ کون دشمن ہوسکتا ہے۔ جس پر یہ حملہ کرنے جا رہا ہے"۔ اور وہ مارے ڈر کے گھبرا گیا۔ ابھی تک انھیں ان بزرگوں کی ہڈیاں دکھائی دے رہی تھیں جو اُن سے پہلے وہاں جا چکے تھے جہاں یہ لوگ اب جا رہے تھے۔ انمیں کچھ تو پیچھے لوٹ کر وہاں تک پہونچ گئے جہاں ان لوگوں نے سب سے پہلے ہڈیاں دیکھی تھیں۔ لیکن اس جگہ سے آگے کوئی بھی نہیں نکل سکا۔ آخر کار وہ ایک اونچی جگہ پر آگئے۔ جہاں سے انھوں نے دور ایک پہاڑ پر ایک سوتے ہوئے دیو پیکر ریچھ کو بآسانی پہچان لیا۔ انکے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ لیکن ریچھ اتنا عظیم تھا کہ وہ انکو دور سے ہی دکھائی دیتا تھا۔ نوجوان سردار نے کہا "وہ دیکھو یہی وہ موذی ہے جس سے لڑنے میں تمہیں یہاں لایا ہوں۔ یہیں سے ہمارے مصائب شروع ہونگے۔ کیونکہ وہ پہلا مینیٹو دیوتا ہے۔ اسکے پاس ہی وہ قیمتی وامپم[1] ہے جسکو حاصل کرنے کیلئے ان بہادروں نے اپنی جانیں قربان کیں جنکی ہڈیاں ہم نے ابھی دیکھی تھیں۔ تمہیں خوفزدہ نہیں ہونا چاہئے۔ بہادری اور ہمت سے کام لو۔ ریچھ ہمیں سوتا ہوا ملیگا۔ یہ کہکر وہ نوجوان آگے بڑھا۔ اور اسنے جانور کی گردن میں پڑی ہوئی پیٹی کو چھوا اور کہا "یہی چیز ہمیں حاصل کرنی ہے۔ اسی میں وہ وامپم موجود ہے"۔ تب انھوں نے بڑے بھائی سے کہا کہ وہ کوشش کرے اور کسی طرح گھسیٹ کر پیٹی کو اس جانور کے سر سے نکالدے۔ کیونکہ وہ ابھی گہری نیند سویا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مگر کئی بھائیوں کی کوششیں بیسود ثابت ہوئیں۔ تب سب سے چھوٹے بھائی سے بڑے کی باری آئی اس نے کوشش کی اور پیٹی قریب قریب اس دیو پیکر کے سر پر آگئی لیکن وہ اس سے آگے نہ نکال

---

[1] صدف سے بنی ہوئی لڑیاں جنھیں شمالی امریکہ کے انڈین آرائش کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

سکا۔ اب سب سے چھوٹے بھائی نے جو انکا رہنما تھا کوشش کی اور وہ اسمیں کامیاب ہوگیا۔ اسنے پیٹی کو سب سے بڑے بھائی کی کمر پر لاد کر کہا " اب ہمیں بھاگ جانا چاہیئے " اور وہ سب بھاگنے لگے۔ جب ایک آدمی پیٹی کے بوجھ سے تھک جاتا تو دوسرا اسکو اٹھا لیتا۔ اسی طرح وہ دوڑتے چلے گئے۔ یہاں تک وہ پہلے پہاڑوں کی ہڈیوں کو جو میدان میں پڑی تھیں پار کر گئے اور وہاں سے بھی کچھ دور آگے نکل گئے۔ تب انھوں نے پیچھے مڑ کر جو دیکھا تو انھیں وہ دیوہیکر آہستہ آہستہ اٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ کھڑے ہونے کے کچھ دیر بعد اسے محسوس ہوا کہ اسکا وامپم نکال لیا گیا ہے۔ فوراً ہی زور سے وہ غرایا۔ اسکی غراہٹ بجلی کی کڑک کی مانند تھی جس سے دھرتی کا سینہ کانپ اٹھا۔ ان بھائیوں نے بھی اسے سنا۔ انھوں نے اسے یہ کہتے ہوئے بھی سنا " وہ کون ہوسکتا ہے جس نے میری وامپم چرانیکی ہمت کی۔؟ زمین تو کیا میں اسے پاتال سے نکال لاؤنگا " یہ کہکر وہ انکا تعاقب کرنے کیلئے پہاڑی سے نیچے اترا۔ اسکی ہر چھلانگ سے زمین یوں کانپ اٹھتی تھی جیسے اسے تشنج کا دورہ پڑا ہو۔ جلد ہی وہ ان لوگوں تک پہونچ گیا۔ پیٹی ایکدوسرے کو دیتے ہوئے وہ ایکدوسرے کی ہمت بڑھا رہے تھے لیکن وہ بڑی تیزی سے ان تک پہونچ گیا۔ تب اس نوجوان رہنما نے کہا " بھائیو کیا تم میں سے کسی نے برت کے دنوں میں کسی دوست کی روح کو خواب میں دیکھا جسنے ایک سرپرست کی حیثیت سے مدد کی پیشکش کی ہو۔ سب لوگ خاموش تھے۔ اسنے کہا " خیر میں نے برت کے دنوں میں موت کے فوری خطرہ میں پھنس جانے کا خواب دیکھا تھا۔ تب مجھے ایک چھوٹی سی کٹیا دکھائی دی تھی جسکے اوپر سے دھواں نکل رہا تھا۔ اسمیں ایک بوڑھا آدمی رہتا تھا میں نے خواب میں اسے اپنی مدد کرتے ہوئے دیکھا۔ ہوسکتا ہے ابھی اسکی تصدیق ہو جائے۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور راستی نے اتنے زور سے چیخ ماری جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ آواز اسکے پیٹ کی انتہائی گہرائی سے نکل رہی ہو۔ جسکو چیکو دم کہا جاتا ہے۔ قدرے اونچی زمین پر کھڑے ہوکر اس نے کہا " دیکھو ایک کٹیا سے دھواں نکل رہا ہے۔" اسے دیکھکر ان لوگوں کی جان میں جان آگئی۔ اور وہ دوڑ کر اسکے اندر گھس گئے۔ رہنما نے بوڑھے آدمی سے جو کٹیا میں بیٹھا ہوا تھا کہا " منیٹو ہماری مدد کرو ہم آپ کی پناہ میں آئے ہیں نہیں تو وہ دیوہیکر ہمیں مار ڈالیگا " بوڑھے نے کہا " میرے بچو تم یہاں بیٹھو اور کھانا کھاؤ۔" پھر اس نے پوچھا " یہ مینیٹو کون ہے یہاں میرے سوائے کوئی مینیٹو نہیں ہے لیکن ذرا مجھے دیکھنے تو دو " یہ کہکر اس نے کٹیا کا دروازہ کھولا۔ تھوڑے ہی فاصلہ پر خشمناک جانور رک رک لمبی

Manito

چھلانگیں لگائے چلا آرہا ہے اس نے دروازہ بند کرلیا اس نے کہا "ہاں بیشک میرے بچّو وہ عظیم مینیٹو ہے۔ تمہاری وجہ سے میں مارا جاؤنگا لیکن تم نے مجھ سے پناہ مانگی ہے اور میں نے تمہاری مدد کرنیکا وعدہ کیا ہے اسلئے اب کچھ ہی کیوں نہ ہو میں تمہاری ہر قیمت پر حفاظت کرونگا۔ جب ریچھ دروازے کے سامنے آجائے تو تم کٹیا کے پچھلے دروازے سے باہر بھاگ جانا" پھر اس نے جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا ایک جانب ہاتھ بڑھایا اور اور ایک تھیلا اٹھا کر اسے کھولا۔ اسکے اندر سے دو کالے پتّے نکالے اور انکو اپنے سامنے رکھ لیا۔ پھر اس نے کہا "میں جب کبھی لڑتا ہوں تو ان پتّوں کا استعمال کرتا ہوں" تب اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ایک پتّے کو تھپکنا شروع کیا۔ پتّہ پھولنے لگا اور اسکی جسامت اسقدر بڑھ گئی کہ وہ کٹیا میں سمانیکے قابل نہ رہا۔ اسکے لمبے اور مضبوط دانت بھی نکل آئے جب اسکا مزید پھیلنا بند ہو گیا تو وہ غرایا اور اسی لمحہ خود بخود کود کر دروازے سے باہر نکل گیا اور ریچھ پر ٹوٹ پڑا جو کہ اگلی ہی چھلانگ میں کٹیا پر پہنچنے والا تھا۔ دونوں جانوروں میں بڑی خوفناک لڑائی ہوئی خونخوار دیووں کی غرّاہٹوں سے آسمان گونج اٹھا اب دوسرا پتا بھی میدان میں کود پڑا۔ لڑائی شروع ہوتے ہی سب بھائیوں نے بوڑھے کی نصیحت پر عمل کیا اور وہ کٹیا کی دوسری طرف سے نکل بھاگے۔ ابھی وہ تھوڑی دور بھی نہ جانے پائے تھے کہ انھوں نے پہلے کتّے کی دردناک چیخ سنی جو موت کے گھاٹ اتر چکا تھا۔ اور اسکے کچھ ہی دیر بعد دوسرے کتّے کے چیخنے کی آواز آئی۔ اسکا بھی وہی حشر ہوا جو پہلے کتّے کا ہوا تھا تب نوجوان سردار نے کہا "اب بوڑھے کا بھی یہی حشر ہوگا۔ اسلئے یہاں سے بھاگ چلو نہیں جلد ہی ریچھ ہمارے پیچھے بھی آجائیگا۔ انھیں بوڑھے نے کھانا تو کھلا ہی دیا تھا لہٰذا تازہ دم ہو کر وہ بھاگ کھڑے ہوئے لیکن جلد ہی انھیں ریچھ آتا ہوا نظر آیا اور وہ برابر انکا تعاقب کر رہا تھا پھر نوجوان سردار نے اپنے بھائیوں سے دریافت کیا۔ کہ وہ اپنی حفاظت کیلئے کچھ کرسکتے ہیں یا نہیں سبکے سب خاموش رہے۔ نوجوان نے پھر آگے دوڑ کر پہلے کی طرح عمل کیا۔ اور وہ چلّا کر بولا "میں نے ایک خواب دیکھا تھا کہ جب میں مصیبت گھرا ہوا تھا تو ایک بوڑھے آدمی نے میری مدد کی جو مینیٹو دیوتا تھا۔ ہم جلد ہی اسکی کٹیا پر پہونچ جائینگے" لہٰذا ہمت کرتے ہوئے سب لوگ ادھر آگے بڑھے۔ کچھ اور آگے جانیکے بعد انھیں بوڑھے مینیٹو کی کٹیا دکھائی دی۔ وہ فوراً وہاں گھس گئے اور اسکو یہ بتا کر کہ ایک مینیٹو انکا پیچھا کر رہا ہے انھوں نے اس سے پناہ چاہی بوڑھے آدمی نے انکے سامنے گوشت رکھ کر کہا "تم اسے کھاؤ۔ لیکن یہ کونسا مینیٹو ہے؟ دنیا میں میرے علاوہ کوئی مینیٹو نہیں ہے اور نہ ہی دنیا میں کوئی ایسی شے ہے جس سے میں ڈرتا ہوں" مگر جیسے جیسے دیو پیکر ریچھ بڑھتا آرہا تھا زمین اسکے قدموں تلے کانپ رہی تھی۔ بوڑھے آدمی نے دروازہ کھولا اور دیکھا کہ ریچھ چلا آرہا ہے۔

اس نے آہستہ سے دروازہ بند کر دیا۔ اور کہا "ہاں میرے بچو تم نے میرے لئے مصیبت کھڑی کر دی ہے۔ پھر اپنے دوا ئیوں کے تھیلے اس نے چھوٹے چھوٹے لڑائی کے ڈنڈے نکالے جو کالے پتھر کے تھے۔ اور ان جوانوں سے کہا کہ کٹیا کے دوسرے دروازے سے نکل کر بھاگ جائیں جیسے ہی اسنے ڈنڈوں کو ہاتھ لگایا وہ لمبے ہو گئے اور جیسے ہی ریچھ دروازے پر پہنچا بوڑھا آدمی باہر نکلا تب اسنے ایک ڈنڈے کو ریچھ پر دے مارا۔ ڈنڈے کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے مگر ریچھ بھی لڑکھڑا گیا۔ پھر اسنے ریچھ کو دوسرا ڈنڈا مارا۔ وہ بھی ٹوٹ گیا لیکن ریچھ بھی بیہوش ہو گیا۔ بوڑھے آدمی کا ہر وار بجلی کی کڑک کی طرح سنائی دیتا تھا اور ریچھ کی غراہٹوں سے آسمان گونجنے لگتا تھا۔

ابتک وہ نوجوان لوگ کچھ دور بھاگ چکے تھے پھر جو انھوں نے مڑ کر دیکھا تو ریچھ ضربوں کے باوجود پھر سے اٹھتا ہوا دکھائی دیا اسنے پنجے پھیلائے اور جلد ہی اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا قصہ کوتاہ اس بوڑھے آدمی کا بھی وہی حشر ہوا جو پہلے بوڑھے کا ہوا تھا کیونکہ جیسے ہی ریچھ نے اسکو پھاڑا۔ انھوں نے اسکے چیخنے کی آواز بھی سنی۔ اب وہ خونخوار جانور پھر ان نوجوانوں کے پیچھے بھاگا۔ وہ تیزی سے انکو پکڑنے ہی والا تھا مگر ان نوجوانوں نے ہمت نہ ہاری اور بھاگے چلے گئے۔ لیکن اب ریچھ اسقدر قریب آگیا تھا۔ کہ نوجوان سردار کو ایکبار پھر اپنے بھائیوں سے پہلے کی طرح دریافت کرنا پڑا کہ انکے پاس بچنے کی کوئی ترکیب ہے یا نہیں۔ لیکن وہ کچھ نہ بتا سکے۔ پھر اسنے کہا۔

"اچھا میرے نیک خواب بھی اب جلد ختم ہونے والے ہیں۔ اب میرے پاس صرف ایک خواب اور رہ گیا ہے۔" پھر وہ پہلے کی طرح دوڑ کر آگے گیا۔ اور اسنے اپنے ہمزاد کو اپنی مدد کیلئے بلا لیا۔ اس نے کہا "ایک بار میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ جب میں مصیبتوں میں بری طرح پھنسا ہوا تھا تو ایک بڑی جھیل کے پاس پہنچ گیا۔ جسکے کنارے ایک چھوٹی کشتی تھی جو تھوڑی سی پانی سے باہر تھی۔ اسمیں دس چپو لگے ہوئے تھے۔ جنکو فوراً استعمال کیا جا سکتا تھا اسلئے تم ڈھونڈو تاکہ ہم جلد ہی وہیں پہونچ جائینگے۔" اور ایسا ہی ہوا۔ وہ فوراً جھیل پر پہونچ گئے وہ مشکل سے ہی جھیل کے بیچ میں پہونچ پائے ہونگے کہ جھیل کے کنارے پر ریچھ بھی پہونچ گیا۔ اسنے پچھلے پیروں پر کھڑے ہو کر چاروں طرف دیکھا اور پانی میں گھسکر چلنے لگا۔ لیکن اسکے پاؤں پانی میں نہ جم سکے اسلئے وہ باہر نکل آیا اور اسنے جھیل کے گرد چکر کاٹنے شروع اس دوران میں وہ لوگ جھیل کے وسط میں ساکت کھڑے رہے۔ اور ریچھ کی نقل و حرکت پر غور کرتے رہے ریچھ چاروں طرف چکر کاٹ کر بالآخر اسی جگہ پہونچ گیا جہاں سے وہ چلا تھا پھر اس نے پانی پینا شروع کر دیا اور انھوں نے دیکھا کہ جھیل میں ایکدم تلاطم برپا ہو گیا اور پانی اسکے کھلے منہ کی طرف تیزی سے بہنے لگا ہے اب انکے رہبر نے جوش میں آکر کہا "آؤ جلدی سے کشتی کو دوسرے کنارے پر لے چلیں" جب وہ دوسرے کنارے سے تھوڑی

ہی دُور رہ گئے تو پانی کی رفتار سقدر تیز ہو گئی کہ وہ پیچھے کی طرف کھنچے چلے آئے اور انکی دوسرے کنارے پر پہنچنے کی تمام کوششیں بیکار ہو گئیں۔

تب رہبر نے ان سے کہا کہ وہ حالات کا مردانہ وار مقابلہ کریں۔ اُسنے کہا "مدجی کیوس اب تمہاری جوانمردی کے جوہر دکھانے کا وقت آ گیا ہے۔ ہمت سے کام لو اور کشتی کے سامنے بیٹھ جاؤ اور جیسے ہی کشتی اس کے منہ کے سامنے پہونچے تم اپنے ڈنڈے کی طاقت کو اسکے سر پر آزماؤ" وہ راضی ہو گیا اور ریچھ وار کرنے کے لئے تیار ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اور رہبر نے جو کشتی کو چلا رہا تھا اس دیو پیکر کے کھلے منہ کی طرف کشتی کو کھینا شروع کر دیا۔

بڑی تیزی کیساتھ بڑھتے ہوئے وہ اسکے منہ میں جانے ہی والے تھے کہ مدجی کیوس نے ایک بھرپور وار ریچھ کے سر پر کیا۔ اور ساسا کوین کا جنگی نعرہ لگایا۔ ریچھ کے بازو چوٹ کی ضرب سے دُہرے ہو گئے اور وہ ضرب کے صدمہ سے بیہوش ہو کر گر پڑا۔ لیکن اس سے قبل کہ مدجی کیوس دوسرا وار کرتا اس دیو پیکر نے سارا پانی جو اس نے پیا تھا بڑے زور سے نکالا۔ یا پانی کے زور سے کشتی دوسرے کنارے کی طرف بڑی تیزی سے پہونچ گئی۔ اور جیسے ہی کشتی کنارے پر جا لگی وہ لوگ فوراً ہی اسکو چھوڑ کر پھر بھاگنے لگے اور یہانتک بھاگے کہ تھک کر چور ہو گئے۔ زمین پھر کانپنے لگی اور جلد ہی انھوں نے دیکھا کہ ریچھ پھر سرپٹ انکے پیچھے بھاگا چلا آ رہا ہے انکے حوصلے پست ہو گئے۔ اور وہ زندگی سے نا اُمید ہو گئے پھر بھی رہبر نے ہمت سے کام لیا۔ اور اپنے عمل اور تقریر سے بھائیوں کو جوش دلایا۔ اور ایک بار پھر ان سے پوچھا آیا وہ اپنی جان بچانے کیلئے کچھ کر سکتے ہیں یا نہیں۔ مگر پہلے کی طرح وہ سب خاموش رہے۔ اب اس نے کہا "میں آخری بار اپنے ہمزاد کو مدد کیلئے بلا رہا ہوں اور اگر ابکی بار بھی ہم کامیاب نہ ہو سکے تو ہماری قسمت ہی خراب سمجھو" چنانچہ اس نے آگے دوڑ کر بڑے سچے دل سے اپنے ہمزاد کو یاد کیا اور نعرہ لگایا۔ اس نے اپنے بھائیوں کو بتایا کہ ہم جلد ہی ایسی جگہ پہونچ جائینگے جہاں میرا ہمزاد رہتا ہے اس پر مجھے بڑا بھروسہ ہے گھبراؤ مت۔ نہیں تو تمہارے دل پر ڈر کا بھوت سوار ہو جائے گا۔ جلد ہی ہم ہمزاد کے گھر تک پہونچ جائینگے" پھر وہ چلایا "دوڑو تیز دوڑو"

اب ہم آیاموکی طرف لوٹتے ہیں۔ اس تمام عرصے میں وہ سر برابر اسی حالت میں لٹکا رہا جسمیں ہم اُسے چھوڑ آئے تھے وہ اپنی بہن کو ہدایتیں دیتا رہا کہ وہ اپنا کھانا حاصل کرنے کیلئے جادو کے تیر کہاں جا جا کے رکھے مگر اب وہ خاصے لمبے لمبے وقفے کے بعد بولتا تھا ایکدن بہن نے دیکھا کہ سر کی آنکھیں چمک اٹھیں جیسے

اُسے کوئی بڑی خوشی ہوئی ہو آخر کار وہ بولا "بہن تم نے مجھے بڑی مصیبت میں ڈالدیا ہے اور میری حالت بڑی قابل رحم ہے۔ جلد اور بہت جلد کچھ جوان آدمیوں کی جماعت یہاں آئیگی اور مجھ سے مدد کی خواہاں ہوگی لیکن آہ میں کیا کرسکتا ہوں اگر زندہ اور صحیح و سالم ہوتا تو انکی مدد بجوشی کرتا۔ پھر بھی تم دو تیر لیجاؤ اور انکو وہیں لگا دو جہاں تم نے ابتک دوسرے تیر لگائے ہیں۔ اور انکے آنے سے پہلے گوشت پکا کر رکھ لو۔ جب تم انکے آنیکی آواز سنو اور وہ مجھے آواز دیں تو تم باہر نکل کر ان سے کہنا کہ افسوس وہ تو بہت دن ہوئے ایک حادثہ کا شکار ہوگیا اور یہ میری وجہ سے ہوا۔ اس پر بھی اگر وہ قریب آجائیں تو ان سے اندر آنے کیلئے کہنا اور انکے سامنے گوشت رکھدینا اور اب جو ہدایت میں تمہیں دوں اس پر سختی سے عمل کرنا جب ریچھ قریب آجائے تو تم باہر جاکر اسکا مقابلہ کرنا۔ اسوقت تم میرا دوائیوں کا تھیلا، تیر اور کمان اور میرا سر اپنے ساتھ رکھو گی۔ تھیلے کے بند کھولدینا اور میرے رنگ و روغن میرے لڑائی کیوقت کام آنیوالے عقابی پر، میرے سوکھے ہوئے بالوں کا گچھا اور جو کچھ بھی اس تھیلے میں ہو اپنے سامنے پھیلا کر رکھ لینا اور جیسے ہی ریچھ قریب آئے تم ایک ایک کرکے ہر چیز کو اٹھانا اور اس سے کہنا یہ میرے مرحوم بھائی کا روغن ہے اسی طرح ہر چیز کیساتھ یہی کہتی جانا اور جتنی دور تم پھینک سکو ہر چیز کو پھینکتی جانا۔ ان چیزوں کے اثر سے وہ لڑکھڑانے لگے گا۔ اسکی مکمل تباہی کیلئے تم میرے سر کو اٹھا لینا۔ اور اسکو بھی تم سے جتنی دور پھینکا جائے پھینک دینا۔ اور زور سے چیخ کر کہنا "دیکھ یہ میرے بھائی کا سر ہے" تب وہ بیہوش ہوکر گر جائیگا۔ اسوقت تک وہ لوگ کھانا کھاکر فارغ ہوچکیں گے لہٰذا تم انکو اپنی مدد کیلئے بلا لینا پھر تم اس ریچھ کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کردینا بلکہ بالکل چھوٹی چھوٹی بوٹیاں بنا دینا اور چاروں سمتوں میں بکھیر دینا کیونکہ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو وہ پھر دوبارہ زندہ ہوجائے گا۔" بہن نے وعدہ کیا کہ جیسا اس نے کہا ہے وہ ویسا ہی کریگی وہ گوشت بنا ہی پائی تھی کہ اُسے پارٹی کے لیڈر کی آواز سنائی دی جو اپنا موکو مدد کیلئے پکار رہا تھا۔ عورت باہر آئی اور جیسی کہ اسکے بھائی نے اسے ہدایت کی تھی اس نے ویسا ہی کہدیا لیکن چونکہ ریچھ انکا تعاقب کر رہا تھا اسلئے وہ مکان کے اندر پناہ چاہتے تھے عورت نے انھیں اندر لیجاکر انکے سامنے گوشت رکھدیا۔ جب وہ کھانا کھا رہے تھے تو انھوں نے ریچھ کی آواز سنی۔ چنانچہ عورت دوائیوں کے تھیلے کو کھولکر اور سر کو ہاتھ میں تھام کر ریچھ کے مقابلے کو بالکل تیار ہوگئی جب ریچھ وہاں پہونچ گیا تو عورت نے ویسا ہی کیا جیسی اُسے ہدایت دی گئی تھی۔ اس نے تیر اور روغن

پھینکنا شروع کیا۔ ریچھ لڑکھڑانے لگا لیکن وہ آگے بڑھکر عورت کے بالکل قریب آگیا۔ لہٰذا حسب ہدایت عورت نے سر اٹھایا اور جتنی دُور وہ اُسے پھینک سکتی تھی اس نے اُسے پھینک دیا۔ جیسے ہی سر زمین پر لڑھکا شدت جذبات سے اسکے منہ اور ناک سے خون بہنے لگا۔ یہ منظر بڑا بھیانک تھا۔ ریچھ لڑکھڑاتا ہوا خوفناک چیخ کیساتھ گر پڑا۔ اب عورت مدد کیلئے چلائی۔ جوان مرد بھاگتے ہوئے باہر آگئے اب انکی قوت و توانائی بحال ہو چکی تھی۔

مدجی کیوس نے آگے بڑھکر ایک نعرہ لگایا اس نے ریچھ کے سر پر ایک وار کیا اور پھر وار پر وار کرتا گیا۔ یہاں تک کہ اسکے سر کا قیمہ بن گیا۔ دوسرے بھائیوں نے جلدی جلدی اسکی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کر ڈالیں جنکو انھوں نے ہر سمت میں پھینکدیا۔ جب وہ اس کام میں مشغول تھے تو اتفاقاً انھوں نے اسطرف دیکھا جدہر بوٹیاں پھینکی تھیں۔ انھیں یہ دیکھکر بڑی حیرت ہوئی کہ ان بوٹیوں سے پیدا ہو ہو کر ہر سمت چھوٹے چھوٹے کالے ریچھ جیسے کہ آجکل عام طور پر دکھائی دیتے ہیں بھاگے جا رہے تھے۔ لہٰذا سارے ملک میں ہر جگہ یہ سیاہ جانور پھیل گئے غالباً اسی قوی ہیکل ریچھ سے آجکل کے ریچھوں کی نسل نکلی ہے۔

اسطرح اپنے دشمن کو زیر کرکے وہ کٹیا میں واپس آئے۔ اس دوران میں عورت نے ان سب چیزوں کو اکٹھا کیا جو اس نے معرکہ میں استعمال کی تھیں اور سر کو بھی اٹھایا۔ اور سب کو دوبارہ تھیلے میں رکھدیا لیکن سر دوبارہ نہیں بولا غالباً اس دیوپیکر کو مغلوب کرنے میں وہ تھک گیا تھا۔

ادھر ان دسوں بھائیوں کو سفر کرتے کرتے ایک زمانہ گذر گیا تھا اور وہ گھر سے دُور بھی بہت نکل آئے تھے۔ اسلئے انھوں نے اپنے دیش لوٹنے کا خیال ہی چھوڑ دیا اور چونکہ یہاں شکار بھی کثرت سے ملجانیکی اُمید تھی لہٰذا انھوں نے یہیں رہنے کا ارادہ کرلیا۔ ایکدن وہ شکار کھیلتے کھیلتے کٹیا سے کچھ دُور نکل گئے اور داسیم کو عورت کے پاس ہی چھوڑ گئے شکار بھی انھیں خوب ملا اور بہت تفریح رہی آپس میں خوب ہنسی مذاق ہوتا رہا جیسا کہ اسوقت ہوتا ہے جب کچھ نوجوان مل بیٹھیں۔ انمیں سے ایک بولا "ہم اکیلے ہی اس تفریح سے خوش ہو رہے ہیں چلو چلکر بہن سے کہیں کہ وہ ہمیں اُس سر کو یہاں لانیکی اجازت دیدے کیونکہ وہ ابھی تک زندہ ہے شاید وہ ہماری باتوں سے محظوظ ہو اور ہمارے ہنسی مذاق میں شامل ہونا پسند کرے اور پھر بہن کو کھانا بھی تو پہنچانا ہے۔" اسلئے وہ وہاں گئے اور عورت سے سر کو اپنے ساتھ لیجانے کیلئے درخواست کی اُس نے انھیں اجازت دیدی چنانچہ وہ سر کو اپنی شکا

گاہ میں لیگئے۔ اور انھوں نے اُسے خوش کرنیکی ہر ممکن کوشش کی لیکن ہمیں انھیں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی البتہ کبھی کبھی اس سر کی آنکھوں سے خوشی نمودار ہونے لگتی تھی۔ ایکدن جب وہ لوگ اپنی قیام گاہ میں اپنی تفریح میں مصروف تھے ان پر کچھ اجنبی قبائلیوں نے حملہ کردیا۔ یہ جھوٹی سی جنگ بہت دیر تک جاری رہی اور اسمیں بہت کشت و خون ہوا۔ انکے بہت سے دشمن موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے لیکن وہ پھر بھی ان لوگوں سے تیس گنا زیادہ تھے یہ نوجوان جی توڑ کر لڑے لیکن سب مارے گئے تب حملہ آور ایک اونچے مقام تک پیچھے ہٹ گئے تاکہ وہ اپنے آدمیوں کو اکٹھا کر سکیں اور اپنے شہیدوں اور لاپتہ ساتھیوں کا شمار کر سکیں۔ انکا ایک جوان باہر رہ گیا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو تلاش کرتا ہوا اس مقام پر پہونچ گیا جہاں وہ سر لٹکا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ صرف ایک سر میں زندگی کے آثار موجود ہیں وہ حیرت اور خوف سے اسے دیکھتا رہا آخرکار اس نے تھیلے کو اُتار کر کھولا۔ خوبصورت پروں کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا اور اُسنے ایک پَر اپنے سر میں لگا بھی لیا۔

وہاں سے چلکر وہ اپنی پارٹی کے پاس پہونچا تمام راستہ پَر اسکے سر پر بڑی شان سے لہراتا رہا۔ وہاں پہونچکر اس نے سر اور تھیلے کو زمین پر رکھ دیا اور اپنے لوگوں سے تمام ماجرا بیان کیا۔ کہ کیسے اُسے وہ سر ملا تھا اور یہ بھی بتایا کہ تھیلے میں روغن اور پَر بھرے ہوئے ہیں وہ سب لوگ سر کو دیکھنے لگے اور اس سے کھیلنے لگے۔ کئی جوانوں نے رنگ و روغن بلکہ خود کو رنگا اور انمیں سے ایک نے سر کو بالوں سے اٹھا لیا اور کہا "دیکھو او کمینے تیرے سب رنگ و روغن ہمارے بہادر نوجوان استعمال کر رہے ہیں۔" لیکن پَر اتنے خوبصورت اور دلکش تھے کہ انمیں سے کئی لوگوں نے انھیں اپنے سروں پر لگا لیا اور پھر انھوں نے سر کو ذلیل کرنیکی غرض سے ہر طرح کی گالیاں بکیں۔ لیکن انکو اس کا معاوضہ دینا پڑا کہ جس جس نے ان پروں کو استعمال کیا تھا وہ سب خود بخود گر کر ہلاک ہو گئے تب انکے سردار نے حکم دیا کہ سر کے علاوہ اور سب چیزیں پھینکدی جائیں۔ اور کہا کہ ہم گھر پہونچکر سوچینگے کہ ہمیں اس سر کا کیا کرنا ہے ہم اسکی آنکھوں کو ہمیشہ کیلئے بند کرنیکی کوشش کرینگے۔

گھر پہونچکر وہ اس سر کو اپنے دیوان خانے میں لیگئے جہاں آگ کے اوپر اسکو خام چمڑے کی رسّی سے باندھکر لٹکا دیا۔ آگ کی گرمی سے رسّی سکڑ کر کستی جاتی تھی تب انھوں نے کہا "آؤ کوشش کریں کہ

اسکی آنکھیں ہمیشہ کیلئے بند کردیں۔

ادھر بہن کئی دنوں تک ان جوانوں اور سر کی واپسی کا انتظار کرتی رہی آخر کار جب اس سے نہ رہا گیا تو وہ سر کی تلاش میں نکلی اس نے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر ان جوانوں کو مرے ہوئے پایا۔ انکے جسم زخموں سے چھلنی ہو رہے تھے۔ انکے چاروں طرف مختلف سمتوں میں کچھ اور لوگ بھی وہاں مرے ہوئے پڑے ملے۔ اس نے سر اور تھیلے کو تلاش کیا۔ لیکن وہ اسکو کہیں بھی نہ ملے اسکی چیخ نکل گئی اور وہ رونے لگی۔ اس نے اپنے منہ پر سیاہی مل لی۔ تب وہ چاروں طرف دوڑی دوڑی پھری۔ یہانتک کہ وہ اس جگہ پہنچ گئی جہاں سے سر کو لیجایا گیا تھا۔ اسکو وہاں جادو کی کمان اور تیر ملے جنھیں ان جوانوں نے انکے وصف سے واقف نہ ہونیکی وجہ سے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ اس نے اپنے دلمیں تہیہ کرلیا کہ وہ اپنے بھائی کے سر کو ضرور ڈھونڈیگی گھومتے پھرتے وہ ایک اونچے مقام پر پہونچی جہاں اس تھیلے کے کچھ پر اور روغن بکھرے پڑے تھے۔ انکو اس نے احتیاط سے اکٹھا کرکے ایک درخت کی شاخ پر رکھدیا تاکہ وہ واپسی میں انھیں ساتھ لیجاسکے۔

شام کیوقت وہ ایک بہت بڑے دیہات کے سرے والے مکان پر پہنچی یہاں اس نے ایک جادو کا استعمال کیا جسے قبائلی لوگ اسوقت استعمال کرتے تھے جب انھیں کسی جگہ اپنا استقبال کرانا ہوتا تھا۔ پھر اس نے ایک بوڑھے مرد اور عورت کی کٹیا پر جاکر دستک دی جہاں اسکا بڑی شفقت سے استقبال ہوا۔ اس نے ان سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ بوڑھے نے اسکی مدد کرنیکا وعدہ کیا۔ اُسنے بتایا کہ سر دیوان خانے میں آگ کے اوپر لٹکا ہوا ہے اور گاؤں کے سردار اپنے بہادر نوجوانوں کیساتھ برابر پہرہ دے رہے ہیں۔ سردار یہاں مینیٹو سے کم حیثیت نہیں رکھتے عورت نے کہا کہ وہ صرف اپنے بھائی کے سر کو ایک نظر دیکھنا چاہتی ہے اگر وہ اس مکان کے دروازے تک پہنچ جائے تو اُسے بڑی تسلی ہوگی کیونکہ طاقت کے بل پر تو سر کو واپس لانا اسکے بس کی بات نہیں تھی۔ قبائلی نے کہا "تم میرے ساتھ آؤ میں تمہیں وہاں لے چلونگا۔" وہ دونوں وہاں جاکر دروازے کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ دیوان خانہ بہادروں سے بھرا ہوا تھا جو اسوقت کھیل تماشے میں مشغول تھے وہ مسلسل آگ جلائے جارہے تھے۔ تاکہ سر کو دھواں دے دیکر خشک گوشت بناکر کھائیں انھوں نے سر کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا۔ اور یہ نہ جانتے ہوئے کہ یہ کس وجہ سے ایسا ہوا ایک شخص بولا " ہا! ہا! اب اس پر دھوئیں کا اثر ہونے لگا ہے۔ بہن نے دروازے سے اُوپر دیکھا۔ اور جیسے ہی بہن بھائی کی آنکھیں چار ہوئیں تو سر کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور گالوں پر بہنے لگے۔ سرداروں نے سر سے کہا ہم نے سوچا تھا کہ ہم بالآخر تمہیں کچھ نہ کچھ کرنے پر مجبور کرہی دینگے۔ پھر وہ اپنے ساتھیوں سے جو اسکے اردگرد

کھڑے تھے بولا "دیکھو۔ دیکھو سر کی طرف دیکھو کیسے آنسو بہا رہا ہے"۔ وہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے اور اس پر فقرے کسنے شروع کر دیئے۔ سردار نے گھوم کر دیکھا تو ایک عورت کو وہاں کھڑا پایا۔ پھر کچھ رک کر اس نے اس آدمی سے جو اسکے ساتھ آیا تھا پوچھا "اس عورت کو تمہارے پاس کون لایا ہے اس سے پہلے میں نے کبھی گاؤں میں اسے نہیں دیکھا"۔ آدمی نے جواب دیا "جناب آپ نے دیکھا ہے۔ یہ میری رشتہ دار ہے مگر باہر بہت کم نکلتی ہے۔ یہ میرے گھر ہی ٹھہری ہوئی ہے اس نے مجھ سے یہاں میرے ساتھ آنے کی اجازت مانگی تھی"۔ کمرہ کے اندر ایک ایسا آدمی بیٹھا تھا جو ان لوگوں میں سے تھا جنکی عادت ہمیشہ شیخی بگھارنے اور دوسروں پر رعب دکھانے کی ہوتی ہے اس نے کہا "ارے میں اس عورت سے اکثر ملتا ہوں اور قریب قریب ہر روز رات کو میں اسکے گھر اس سے عشق کرنے جایا کرتا ہوں"۔ دوسرے سب لوگ اسکی بات پر ہنس پڑے اور پھر اپنے کھیل تماشے میں مشغول ہو گئے۔ وہ جوان آدمی یہ نہیں جانتا تھا کہ اسکے اسطرح جھوٹ بولنے سے فائدہ عورت کو ہی پہونچ رہا تھا کیونکہ اسطرح وہ دشمنوں سے بچ گئی۔

تب وہ اس آدمی کے گھر واپس آئی اور وہاں سے فوراً اپنے دیہات کیلئے روانہ ہو گئی۔ وہ اس جگہ آئی جہاں اسکے منہ بولے بھائیوں کے مردہ جسم پڑے ہوئے تھے اس نے ان سب کو ایک جگہ لٹا کر انکے پیر جنوب کی سمت کر دیئے۔ پھر ایک کلہاڑی جو اسکے پاس تھی لیکر اس نے ہوا میں اچھالی اور چلائی "بھائیو اسکے نیچے سے فوراً اٹھ جاؤ ورنہ یہ تمہارے اوپر گر جائیگی"۔ یہ عمل اس نے تین بار کیا۔ اور تیسری بار سب اٹھ کر اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے۔

مُدجی کیوس نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے انگڑائی لی اور کہا "ارے کیا میں بہت دیر تک سوتا رہا۔ مگر ایک دوسرے بھائی نے کہا "نہیں ہرگز نہیں کیا تمہیں معلوم نہیں کہ ہم سب قتل کر دیئے گئے تھے؟ اور اس بہن نے ہمیں دوبارہ زندگی عطا کی ہے"۔ پھر ان جوانوں نے اپنے مرے ہوئے دشمنوں کے جسم اٹھائے اور انہیں جلا دیا۔ اسکے فوراً بعد ہی وہ عورت ان کیلئے بیویوں کی تلاش میں کسی دور دیہات میں چلی گئی۔ اور وہ دس نوجوان عورتوں کو ساتھ لیکر واپس آئی۔ اس نے ہر نوجوان کو ایک ایک عورت سونپ دی۔ مدجی کیوس بے چینی سے ادھر ادھر چکر کاٹ رہا تھا کیونکہ اسے اندیشہ یہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے وہ بیوی نہ ملجائے جسکو وہ چاہتا ہے۔ لیکن اسے مایوس نہ ہونا پڑا کیونکہ من چاہی عورت ہی اسکے حصے میں آ گئی اور ان سبکے جوڑے ٹھیک بنگئے کیونکہ یہ سب جادو کی کرامات تھی۔ دراصل انکی وہ بہن جادوگرنی تھی۔ بعد ازاں وہ لوگ ایک بڑے

مکان میں جاکر رہنے لگے۔ انکی بہن نے اپنی بھاوجوں سے کہا کہ سب عورتیں باری باری ہر شب کو اسکے بھائی کے سر کے پاس جایا کریں گی اور اسے کھولنے کی کوشش کیا کریں گی بھاوجوں نے وعدہ کیا کہ اس کام کو وہ دل و جان سے کرینگی۔ سب سے بڑی بھاوج نے پہلے کوشش کی اور وہ ہوا کی تیزی سے اڑتی اور شور مچاتی ہوئی وہاں سے روانہ ہوگئی۔

صبح ہوتے ہوتے وہ واپس آئی مگر اپنے مقصد میں ناکامیاب رہی کیونکہ وہ اُن گرہوں میں سے ایک ہی کو کھول سکی تھی۔ اسی طرح سب عورتیں باری باری جاتی رہیں۔ اور ہر عورت ایک گرہ کھولتی رہی لیکن جب سب سے چھوٹی گئی تو اس نے پہنچتے ہی اپنا کام شروع کردیا۔ حالانکہ دیوان خانہ ہمیشہ لوگوں سے بھرا رہتا تھا پھر بھی ان لوگوں کو باہر کا کوئی شخص آتا ہوا دکھائی نہ دیا۔ کیونکہ دس راتوں سے دھواں بجائے اُوپر چڑھنے کے کمرے میں بھر جاتا تھا جسکی وجہ سے ہال میں کوئی نہیں ٹھہرتا تھا۔ اور اس آخری رات میں تو سب وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ لہٰذا اس نوجوان عورت کو سر لانے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔

نوجوان آدمیوں اور اسکی بہن نے دور سے ہی عورت کو ہوا میں تیزی سے آتے ہوئے دیکھا اور یہ کہتے ہوئے بھی سن لیا "ہمارے بھائی کے جسم کو تیار کردو۔" وہ لوگ فوراً ہی اس چھوٹی کٹیا کی طرف بھاگے جہاں ایا مو کا سیاہ جسم رکھا ہوا تھا۔ اسکی بہن نے لاش کی گردن کا وہ حصّہ جہاں سے ایا مو کا سر جُدا کیا گیا تھا چھیلنا شروع کردیا اور اس نے اُسے اتنا چھیل ڈالا کہ وہاں سے خون نکلنے لگا اور دوسرے لوگوں نے جو وہاں موجود تھے ایا موں کے جسم پر دوائیاں مَل مَل کر اسکی سیاہی دور کردی۔ اسی دوران میں اس عورت نے جو ایا مو کا سر لیکر آئی تھی سر کی گردن کی طرف کا حصّہ اتنا چھیل ڈالا کہ وہاں سے بھی خون نکلنے لگا۔

اب انھوں نے ایا مو کے سر کو اسکے جسم پر جما دیا اور دوائیوں سے اور کئی دوسرے طریقوں سے اُسے پھر زندہ کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اسکی پہلی جیسی بہادری اور خوبصورتی پھر عود کر آئی اور سب لوگ اپنی مصیبتوں کے مبارک اختتام پر خوشیاں منانے لگے۔ بعدازاں کچھ مدت تک سب لوگ ہنسی خوشی وہاں رہتے رہے۔ پھر ایکدن ایا مو نے کہا "اب میں وامپم کو تقسیم کرونگا۔ لہٰذا اس نے اس پیٹی کو جس میں وامپم رکھا تھا اٹھایا۔ اس نے بڑے بھائی سے شروعات کرکے سب کو وامپم تقسیم کیا اور سب کو مساوی

حصّہ دیا لیکن سب سے چھوٹے بھائی کو سب سے شاندار اور خوبصورت حصّہ ملا کیونکہ بیٹی کے سب سے نیچے کا حصّہ وامیم کا سب سے زیادہ قیمتی اور نادر حصّہ تھا۔

تب آیاموئے اُن سبکو یہ بتایا کہ چونکہ وہ سب ایک بار مر چکے ہیں اور انکو دوبارہ زندگی عطا کی گئی اسلئے اب وہ لافانی ہو چکے ہیں لہٰذا انکو اُس کائنات میں جو انسانوں کی پہونچ سے باہر ہے مختلف منصبوں پر تعینات کر دیا گیا ہے۔ صرف مدجی کیبوس کا مقام ظاہر کر دیا گیا ہے۔ اُسے مغربی ہوا کو ملانے کا کام ملا ہے اور اسے عموماً کیبیوں کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اسکو ہمیشہ ایک ہی جگہ رہنا پڑیگا۔

پھر اباآمو نے ان سب کو ہدایت کی کہ جہاں تک ہو سکے وہ زمین کے لوگوں کی بھلائی کرنے میں کوتاہی نہ کریں اور اپنی مصیبتوں اور تکلیفوں کو جو انھیں وامیم کے حاصل کرنے میں پیش آئی ہیں فراموش کر دیں اور دنیا کے ہر شخص کو بڑی فراخدلی کیساتھ نعمتیں دیں۔ اس نے انھیں یہ بھی نصیحت کی کہ وہ ان لڑیوں کو متبرک سمجھیں۔ اِن کے سفید دانے امن کی نشانی ہیں اور کالے دانے جنگ اور برائیوں کی علامت ہیں۔

تب وہ سب روحیں خوشی خوشی گاتی اور شور مچاتی ہوئی اپنے اپنے مقامات کو جو نہایت اونچائی پر واقع ہیں اڑ گئیں۔ آیامو اور اس کی بہن اباموکوا نیچے تحت الثریٰ میں چلے گئے۔

Kebeyun